مجموعہ فتاویٰ علمائے احناف

فتاویٰ عثمانی

جلد اوّل

کتاب الایمان والعقائد تا ختم کتاب الجنائز

جمع و ترتیب

مولانا اللہ تعالیٰ بن مولانا نور احمد

مکتبہ معارف القرآن کراچی

فتاویٰ عثمانی

پینتالیس ۴۵ سالہ خود نوشتہ فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ عثمانی

جلد اوّل

کتاب الایمان والعقائد، کتاب السنۃ والبدعۃ، کتاب العلم والتاریخ، کتاب التفسیر، کتاب الحدیث، کتاب الدعوۃ والتبلیغ، کتاب التصوف، کتاب الذکر والدعاء، کتاب حقوق المعاشرۃ، کتاب السیر والمناقب، کتاب الطہارات، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجنائز

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

ترتیب و تخریج

مولانا محمد زبیر حق نواز

استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

(Quranic Studies Publishers)

جملہ حقوقِ ملکیت بحق مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴ محفوظ ہیں

بااہتمام	:	خضر اشفاق قاسمی
طبع جدید	:	ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ، اپریل 2010ء
مطبع	:	احمد برادرز پرنٹرز، کراچی۔
ناشر	:	مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴ (Quranic Studies Publishers)
فون	:	(021) 35031565, 35031566
ویب سائٹ	:	www.onlineshariah.com www.quranicpublishers.com
ای میل	:	info@quranicpublishers.com

ملنے کے پتے:

- مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
  فون: 35031565, 35031566
- ادارۃ المعارف کراچی ۱۴
  فون: 35032020 - 35049733

فہرستِ موضوعات فتاویٰ عثمانی جلد اوّل صفحہ نمبر

پیش لفظ ۳۳
عرضِ مرتب ۳۶
﴿کتاب الإیمان والعقائد﴾ ۴۳
(ایمان وعقائد کا بیان)
﴿فصل فی المتفرّقات﴾
(ایمان وعقائد سے متعلق متفرق مسائل کا بیان)
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کے نقش کو چومنے، اس جیسے نعل پہننے اور اس کے احترام کا حکم ۴۵
کفار کے نابالغ بچوں کا کیا حکم ہے؟ ۴۹
سوشلزم کی حمایت کرنے والے کا حکم ۴۹
اسمائے حسنیٰ میں سے کون سے اسماء بندوں کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں؟ ۵۰
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ''یا محمدؐ'' کے الفاظ لکھنا ۵۲
اگر کسی کو چھ کلمے یاد نہ ہوں تو اس کا کیا حکم ہے؟ ۵۳
کلمۂ طیبہ کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھنا ۵۴
شعراء کا اپنے کلام میں غیر اللہ کو خطاب کرنا ۵۵
کپڑے میں انبیاء علیہم السلام کی تصویر بنانا ۵۷
شعر میں غیر اللہ کو خطاب کرنا ۵۸
قادیانیوں کی عبادت گاہ کو مسجد کہنے کی ممانعت ۵۹
حیاتِ انبیاء علیہم السلام، حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام اور سماعِ موتیٰ سے متعلق مختلف سوالات ۶۰
''اسلامی سوشلزم'' سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی شرعی حیثیت ۶۳
کیا جنت میں کفار داخل ہوسکتے ہیں؟ ۶۴
وحدت الوجود کا مطلب ۶۶
مسئلہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام ۶۶

موضوعات — صفحہ نمبر

بلاتحقیق مسئلہ بیان کرنا ۶۷
کسی انجمن کے رُکنیت فارم میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانے کا حکم .. ۶۸
کیا قیامت کے دن جانوروں کا بھی محاسبہ ہوگا؟ ۶۸
کیا جنت میں عورتوں کو رُؤیتِ باری ہوگی؟ ۶۸
عقیدۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۷۰
شیخ احمد کے مروّجہ وصیت نامہ کا حکم ۷۱
جب جنت میں شیطان نہیں جاسکتا تو اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا کیسے دیا؟ ۷۱

﴿فصل فی کلمات الکفر وأفعال الکفر وما یکون کفرًا وما لا یکون کفرًا﴾ ۷۲

(کفریہ وغیر کفریہ کلمات اور افعال سے متعلق مسائل کا بیان)

موسیقی سننے والے کو کافر کہنا ۷۲
کسی کافر ملک کا ویزا حاصل کرنے کے لئے ویزا فارم میں اپنے آپ کو قادیانی لکھنے کا حکم ۷۲
قادیانیت سے براءت اور کسی مسلمان کو قادیانی کہنے کا حکم ۷۵
علماء کو بُرا بھلا کہنے والے کا حکم ۷۶
حدیث کے ناقابلِ اعتبار ہونے اور جہنم کے دائمی نہ ہونے کا عقیدہ رکھنا ۷۷
مسلمان کو کافر کہنے والے کا حکم ۷۸
''اگر فلاں کام کروں تو کافر ہوجاؤں'' کہنے کا حکم ۷۹
''میں ہندو ہوں'' کہنے کا حکم ۷۹
اذان کی گستاخی کا حکم ۸۰
''میں کافر ہوجاؤں گا، پتھروں کی پوجا کروں گا، اللہ تعالیٰ سے لڑائی کروں گا'' وغیرہ الفاظ کہنے کا حکم ۸۰
قرآنِ کریم میں لفظی تحریف کا عقیدہ رکھنا اور استدلال میں حضرت کشمیریؒ کی عبارت پیش کرنا... ۸۱
ایک طنزیہ مضمون میں اللہ تعالیٰ کی شان میں نامناسب الفاظ استعمال کرنے کا حکم ۸۳

موضوعات	صفحہ نمبر
قادیانیوں کے ''لاہوری گروپ'' سے تعلق رکھنے والے شخص کے چند کفریہ عقائد کا حکم.....	۸۵
﴿فصل فی الفِرَق والأحزاب الاسلامیة والباطلة والأشخاص المتعلقین بها﴾	۸۶
(مختلف اسلامی وغیر اسلامی فرقوں اور ان سے متعلق شخصیات کے بیان میں)	
''الہدیٰ انٹرنیشنل'' کے افکار وعقائد کا حکم.....	۸۶
بریلوی فرقے کا تعارف اور حکم (عربی فتویٰ).....	۹۱
غلام احمد پرویز کے پیروکار کا حکم.....	۹۲
فکرِ ولی اللّٰہی تحریک کا حکم.....	۹۳
''گروپ آف لبرل مسلمز تحریک'' کے قیام پر حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے.....	۹۶
روافض کو علی الاطلاق کافر نہ قرار دینے کی وجہ.....	۹۷
سرسیّد احمد خان کے نظریات اور تبلیغی جماعت کے بارے میں حکم.....	۹۸
﴿کتاب السُّنَّة والبدعة﴾	۹۹
(سنت اور بدعت سے متعلق مسائل کا بیان)	
فرض نماز کے بعد "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ" پڑھنا.....	۱۰۱
نیاز فاتحہ کا حکم.....	۱۰۱
کسی بزرگ کے مزار پر اجتماعی قرآن خوانی کرنا.....	۱۰۲
ختمِ قرآن کے موقع پر مسجد میں چراغاں کرنا اور مٹھائی تقسیم کرنا.....	۱۰۲
سفر کرکے [illegible] کے مزار کی زیارت کرنا.....	۱۰۲
فرض نماز اور عیدین کے بعد مصافحہ ومعانقہ کا حکم.....	۱۰۳
نماز کے بعد یا مہمان سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا.....	۱۰۴
میّت کے سرہانے بیٹھ کر یا قبرستان لے جاتے وقت کلمہ پڑھنا.....	۱۰۴
کفن پر کلمۂ طیبہ لکھنا.....	۱۰۵
جشنِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت.....	۱۰۵

موضوعات	صفحہ نمبر
شادی کے موقع پر لوگوں کو سفید پگڑیاں دینا، ختنہ کے موقع پر لوگوں کو جمع کرنا	۱۰۶
نماز کے بعد مصافحہ کرنے کا حکم	۱۰۷
بزرگ یا پیر کی نیاز اور میّت کی مختلف رُسومات کا حکم	۱۰۷
عرس اور برسی کی شرعی حیثیت	۱۰۸
نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا	۱۰۸
نکاح کے وقت دُولہا کا سہرا باندھنا	۱۰۹
کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھنا	۱۰۹
عہدنامہ قبر میں رکھنے کا حکم	۱۰۹
قبر پر تلقین کا حکم	۱۱۰
مسجد میں بلند آواز سے دُرود وسلام، نعت اور میلاد منعقد کرنا	۱۱۰
قبر پر اذان دینے کا حکم	۱۱۰
اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم	۱۱۱
نماز کے بعد بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم	۱۱۲
نماز اور درس کے بعد مصافحہ کرنا	۱۱۲
امام صاحب کا نمازِ جنازہ کے بعد دُعا نہ مانگنا	۱۱۳
دفن کے بعد قبر پر اذان دینے کا حکم	۱۱۳
دُعا کے آخر میں "صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا" پڑھ کر بلند آواز سے دُرود شریف پڑھنے کا حکم...	۱۱۴
ما حكم قراءة الصلوٰة والسلام جهرًا بعد صلوٰة الجمعة؟ (جمعہ کے بعد بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے پر عربی میں مفصل فتویٰ)	۱۱۴
نماز کے بعد دُرود شریف پڑھنے کا حکم	۱۱۶
نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا	۱۱۶
حیلۂ اِسقاط کا حکم	۱۱۶
میّت کے ساتھ قبرستان تک قرآن مجید لے جانا	۱۱۷
نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگنا	۱۱۷

موضوعات — صفحہ نمبر

میّت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا ۱۱۷
مروّجہ حیلۂ اِسقاط کا حکم ۱۱۸
رمضان کی ۲۳ تاریخ کو بعد از تراویح سورۂ عنکبوت اور سورۂ رُوم پڑھنا ۱۱۸
حیلۂ اِسقاط اور میّت کے لئے تین دن خیرات کرنے کا حکم ۱۱۹
قبرستان میں قرآن مجید لے جا کر پڑھنا ۱۱۹
اہلِ قبور سے توسل پکڑنا ۱۲۰
جماعت کے بعد امام سے مصافحہ کرنا ۱۲۰
درسِ قرآن کے شروع میں دُرود شریف پڑھوانا ۱۲۱
مسجد میں چراغاں کا حکم ۱۲۱
شہدائے کربلا کے مزارات کی شبیہ بنانا ۱۲۱
تعزیہ سازی، سبیل لگانا، تعزیہ کو جلانا وغیرہ کا حکم ۱۲۲
بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اور مسجد میں چراغاں کرنے کا حکم ۱۲۳
تعزیہ کے بوسے کو حجرِ اسود کے بوسے پر قیاس کرنا، مختلف مقامات میں قمری تقویم مختلف ہونے کی بناء پر لیلۃ القدر ہر مقام پر اپنے مطلع کے لحاظ سے ہوتی ہے ۱۲۴
غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز کا حکم ۱۲۵
پندرہ شعبان یا معراج کے موقع پر مسجد میں چراغاں کا حکم ۱۲۵
ختمِ گیارھویں اور کونڈے کا حکم ۱۲۶

﴿کتاب العلم والتاریخ والطب﴾ ۱۲۷

﴿فصل فی المتفرقات﴾
(علم، تاریخ اور طب کے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

کیا کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا حقیقی بیٹا تھا؟ ۱۲۹
''اجماع اور بابِ اجتہاد'' نامی کتاب کا حکم، نیز اجماع کی حقیقت کیا ہے؟ ۱۲۹
کیا روزے کی حکمت وہی ہے جو نماز کی ہے؟ ۱۳۴

موضوعات — صفحہ نمبر

بعض شرعی اَحکام کی مصلحتیں ۱۳۶

اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ ''شخص'' استعمال کرنے کا حکم، اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات طاہر تھے؟ ۱۳۸

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟ ۱۴۰

اُحد اور حراء سے متعلق دو واقعات کے زمانے کی تعیین، اور کیا علامہ ابنِ تیمیہؒ حافظ مزیؒ کے شاگرد تھے؟ ۱۴۰

خواتین کے لئے میڈیکل اور ہوم اکنامکس کی تعلیم حاصل کرنا کیسا ہے؟ ۱۴۳

خطوط میں بسم اللہ، ابجد اور ہندسوں میں لکھنے کی شرعی حیثیت اور اس طریقے کی ایجاد کی تاریخ ۱۴۴

حدیث ''کنت کنزًا مخفیًا'' کی تحقیق اور تخلیقِ عالم کے سلسلے میں کئی وساوس اور شبہات کے جوابات ۱۴۵

قومِ لوطؑ کی جس بستی کو اُلٹا گیا تھا اس کی تعیین میں رائے کا اختلاف ۱۵۰

نبوّت اور وحی کی کیا حقیقت ہے؟ ۱۵۱

کیا موجودہ سائنسی تحقیقات قرآن وحدیث سے متعارض ہیں؟ ۱۵۱

احرام کے فوائد اور اثرات کی شرعی حیثیت ۱۵۴

اجتہاد کی شرائط اور موجودہ دور میں کسی کو مجتہد قرار دینا ۱۵۷

جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے واقعہ کا انکار کرنا ۱۵۸

بقدرِ ضرورت علمِ دین سیکھنے کے لئے ایک مطالعاتی نصاب کا خاکہ ۱۵۸

کلمۂ طیبہ میں لفظ ''محمد'' پر رفع، اور اذان میں اس پر نصب کی وجہ ۱۶۰

میڈیکل کالج میں ڈاکٹری کی مخلوط تعلیم اور پوشیدہ انسانی اعضاء کے معائنے سے متعلق متعدّد مسائل ۱۶۰

(بنو ہاشم، بنو اُمیہ، جنگِ جمل، جنگِ صفین، حضرت حسینؓ، حضرت معاویہؓ اور یزید سے متعلق متعدّد سوالات کے جوابات) ۱۷۱

کیا بنو ہاشم اپنے کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے؟ ۱۷۱

قبولِ اسلام کے بعد بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی خاندانی رنجشوں کی کیفیت ۱۷۲

موضوعات　　صفحہ نمبر

کیا حضرت علیؓ نے خلافت کے لئے خلفائے سابقہ کے اتباع کی شرط سے انکار کردیا تھا؟..... ۱۷۲
قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ کرنے والوں کا حقیقی مقصد قصاصِ عثمانؓ تھا یا حضرت علیؓ کو خلافت سے روکنا؟..... ۱۷۲
حضرت معاویہؓ کے کردار کا تاریخی وشرعی جائزہ..... ۱۷۲
کیا حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی میں بزورِ ولی عہدی کی بیعت لی تھی؟..... ۱۷۳
یزید کے لئے ولایتِ عہد کی بیعت لینے کا شرعی حکم..... ۱۷۳
حضرت معاویہؓ کے عہد میں یزید پر شرعی حد کیوں جاری نہیں کی گئی؟..... ۱۷۳
یزید کا حکم؟ اور کیا حضرت معاویہؓ کے عہد میں مجالسِ غناء عام تھیں؟..... ۱۷۳
حضرت حسینؓ کے نام کوفیوں کے خطوط میں کیا بات درج تھی؟..... ۱۷۴
فاسق حکمران کے خلاف حضرت حسینؓ کے خروج و جہاد کی شرعی حیثیت..... ۱۷۴
کیا یزید نے اپنی مملکت میں غیر اسلامی دستور جاری کیا تھا؟..... ۱۷۴
یزید کے خلاف جدوجہد میں دیگر صحابہ کرامؓ کیوں شریک نہیں ہوئے؟..... ۱۷۵
حضرت حسینؓ کی طرف سے جہاد اور مقابلے کے فیصلے کی وجہ..... ۱۷۵
تاریخِ اسلام کو روایات کی تحقیق کے ساتھ ازسرِنو مرتب کرنے کی ضرورت..... ۱۷۵
کس قسم کی غلطی کو ''اجتہادی غلطی'' قرار دیا جائے گا؟..... ۱۸۱
﴿فصل فی تعلیم القراٰن وتعظیمه وتلاوته﴾ ۱۸۴
(قرآنِ کریم کی تعلیم، تعظیم، تلاوت اور آداب سے متعلق مسائل کے بیان میں)
قصص القرآن کی فلم بندی کا شرعی حکم..... ۱۸۴
ماہواری کی حالت میں تلاوت، کلمہ اور دُرود پڑھنے کا حکم..... ۱۸۶
قرآنی آیات والے اخبارات کی بے حرمتی کرنا..... ۸۷
جن کتابوں میں قرآنی آیات بھی ہوں، انہیں حالتِ حیض میں پڑھنا اور چھونا، اور حالتِ حیض میں تلاوت واذکار جائز ہیں یا نہیں؟..... ۱۸۷
شبینہ کی محفلوں میں لاؤڈ اسپیکر پر تلاوت، اس پر اُجرت اور سجدۂ تلاوت وغیرہ سے متعلق چند سوالات کے جوابات..... ۱۸۸

موضوعات	صفحہ نمبر
قرآنی آیات والے اخباری تراشوں کی بے حرمتی کرنا	۱۹۰
حفص کے علاوہ کسی اور قراءت میں تلاوت کا حکم	۱۹۱
سات قراءتوں کے مطابق تلاوتِ قرآن کا حکم	۱۹۱
قرآنِ کریم کو چومنے کا حکم	۱۹۲
ٹیپ ریکارڈ پر تلاوتِ قرآن سننے کا حکم	۱۹۲
تلاوت کے موقع پر نیند آنا	۱۹۳
قرآنی آیات والے اخبارات و کاغذات کی بے حرمتی کا حکم	۱۹۳
قرآنِ کریم کے بوسیدہ اوراق کا حکم	۱۹۴
تلاوت سننے میں قاری کی خوش الحانی کی طرف متوجہ ہونا اور ایک ہی سانس میں کئی آیات پڑھنے کو وجہِ فضیلت سمجھنا	۱۹۵
قرآنِ کریم کو بغیر وضو کے چھونے کا حکم	۱۹۶
روزے سے متعلق قرآنی آیتِ مبارکہ، ماہِ رمضان میں پیش آنے والے اہم واقعات، حضور ﷺ کا حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دَور کرنا	۱۹۷
قرآن نہ پڑھے ہوئے شخص کے لئے الفاظ پر صرف اُنگلی پھیرنے کا حکم	۱۹۸
دینیات کی کتابوں کو بغیر وضو چھونے کا حکم	۱۹۸
قرآنی آیات کی کثرت والی کتاب کو بغیر وضو چھونا جائز نہیں	۱۹۸
قرآنِ کریم حفظ کرنے کے بعد بھول جانے والے کا کیا حکم ہے؟	۱۹۹
پیشاب سے سورۂ فاتحہ لکھنا سخت حرام ہے	۲۰۰
﴿کتاب التفسیر وما یتعلق بالقرآن﴾	۲۰۱
(قرآنِ کریم کے ترجمہ اور تفسیر سے متعلق مسائل کا بیان)	
"اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ" الآیۃ کے مفہوم و معنی کی تحقیق	۲۰۳
عالمِ دین کا تفسیر سنانا	۲۰۴
قیامت کے وقت کی تعیین سے متعلق قرآنی آیت پر ایک سوال کا جواب	۲۰۴

موضوعات صفحہ نمبر

پکتھال کے انگریزی ترجمے کا حکم ۲۰۵

تفسیر معارف القرآن میں ''اِلَّا کُنَّا عَلَیْکُمْ شُھُوْدًا'' الآیۃ کے ترجمے کی تحقیق ۲۰۶

مُعوّذتین کے قرآنِ کریم کا حصہ ہونے سے متعلق حضرت ابنِ مسعودؓ کے عقیدے کی مفصل تحقیق ۲۰۷

''اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ'' الآیۃ کی تفسیر ۲۱۳

''تفہیم القرآن'' کا بغیر تنقید کے مطالعہ کرنا ۲۱۴

سب سے پہلی تفسیر کون سی ہے؟ ۲۱۴

جناب مودودی صاحب کا حضرت داؤد علیہ السلام کے قصے میں اوریاء کی بیوی کا واقعہ ذکر کرنا... ۲۱۶

''وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ .... الخ'' میں قنوت کا معنی ''قراءت'' سے کرنا ۲۱۸

قرآنِ کریم کو رسمِ عثمانی کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں لکھنا ۲۱۸

وحی سے متعلق مقدمہ معارف القرآن کی ایک عبارت کی وضاحت ۲۱۹

﴿کتاب الحدیث وما یتعلق بہ﴾ ۲۲۱

(حدیث اور اس سے متعلق مسائل کا بیان)

مرسل حدیث کی حجیت سے متعلق احناف کا موقف ۲۲۳

''من جدّد قبرًا ومثّل مثالًا ....الخ'' حدیث ہے یا نہیں؟ ۲۲۴

سندِ حدیث میں لفظِ ''نا'' کا مطلب ۲۲۴

ہندوستان سے فرحت بخش ہوا آنے سے متعلق حدیث کی تحقیق ۲۲۵

مطالعے کے لئے حدیث کی مستند کتب ۲۲۵

طوالتِ عمر کی فضیلت میں ایک حدیث ۲۲۵

اثرِ صحابی نقل کرنے کے بعد ''أو کما قال رضی اللہ عنہ'' کہنا ۲۲۶

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی پر لمبا دُرود پڑھنا ۲۲۶

کیا حدیث کے پڑھنے پر بھی ''تلاوت'' کا لفظ بولا جاسکتا ہے؟ ۲۲۶

ایک حدیث یا مقولہ؟ ۲۲۷

موضوعات	صفحہ نمبر
بظاہر دو متعارض احادیث میں تطبیق (فارسی)	۲۲۷
رأی الحنفیة فی قبول الأحادیث الضعیفة فی فضائل الأعمال (فضائلِ اعمال میں ضعیف احادیث قبول کرنے میں حنفیہ کی رائے سے متعلق عربی فتویٰ)	۲۲۹
''لن تجتمع أمتی علی الضلالة'' کے بعد ''فان أجمعت أمتی علی الضلالة ....الخ'' کے الفاظ حدیث میں ہیں یا نہیں؟	۲۳۱
حدیث ''بُعِثْتُ اِلَی الْأَسْوَدِ وَالْأَحْمَرِ'' کی تحقیق؟	۲۳۲
عمامہ کی فضیلت میں حدیث	۲۳۳
﴿کتاب ما یتعلق بالدعوة والتبلیغ﴾	۲۳۵
(دعوت وتبلیغ کے مسائل)	
تبلیغ اور جہاد کے فرضِ عین اور فرضِ کفایہ سے متعلق تحقیق اور مروّجہ تبلیغی جماعت اور اس میں اوقات لگانے کی شرعی حیثیت	۲۳۷
عورتوں کے لئے تبلیغی اجتماع میں شرکت کا حکم	۲۴۲
جو خود دین کا پابند نہ ہو، کیا وہ تبلیغ کرسکتا ہے؟	۲۴۳
ایک حدیث کی رُو سے تبلیغ کو ترک کرنے کا حکم	۲۴۳
والدین کی اجازت کے بغیر تبلیغ یا کسی اور سفر پر جانے کا حکم	۲۴۳
تبلیغ میں وقت لگانے کے ساتھ حقوق العباد ادا کرنا لازم ہے	۲۴۶
بعض تبلیغی واعظوں کی طرف سے غیر محتاط باتوں کی بناء پر تبلیغی جماعت کو ترک کرنا	۲۴۶
﴿کتاب التصوّف والکشف والالهام والرّؤیاء﴾	۲۴۷
(تصوّف، کشف، الہام اور خوابوں سے متعلق مسائل کا بیان)	
شیطان کا خواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں نہ آسکنا	۲۴۹
بزرگ سے ملاقات کے موقع پر خود اپنے ہاتھ کو چومنا	۲۴۹
کشفِ قبور اور انوار وتجلیات کے مشاہدے کی شرعی حیثیت	۲۵۰
بغیر عمل کے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا حسنِ ظن رکھنا	۲۵۰

موضوعات	صفحہ نمبر
شیخِ طریقت کے لئے کیا شرائط ہیں؟	۲۵۱
خواب کی وجہ سے قبر کو اُکھاڑنا	۲۵۲
خواب کی قسمیں اور خواب میں شیطانی خیالات واوہام اور رُؤیائے صادقہ میں فرق کی تدبیر	۲۵۲
کیا بینک ملازم رہتے ہوئے شیخِ کامل بن سکتا ہے؟	۲۵۳
ایک خواب کی حقیقت	۲۵۴
قطب اور ابدال کی حقیقت، اور کیا زمین میں چار قطب ہوتے ہیں؟	۲۵۴
سلسلۂ قادریہ کے افراد میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی رُوح کے حلول کا عقیدہ	۲۵۵
﴿کتاب الذکر والدعاء والتعویذات﴾	۲۵۷
(ذکر، دُعا اور تعویذات کے بیان میں)	
دُعا کس قسم کی عبادت ہے؟	۲۵۹
عزّت حاصل کرنے کے لئے ''یا عزیز'' کا وظیفہ پڑھنا	۲۵۹
ذکر جہراً افضل ہے یا سراً؟	۲۶۰
''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ احداً صمداً'' والی حدیث صحیح ہے یا نہیں؟	۲۶۱
ایک مہمل وظیفہ	۲۶۲
وسیلہ اختیار کرکے دُعا کرنا کیسا ہے؟	۲۶۲
فرض نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھی جانے والی دُعا کا حکم	۲۶۳
اسمِ اعظم سے کیا مراد ہے؟	۲۶۴
سجدے کی حالت میں دُعا مانگنے کا حکم	۲۶۴
مسجد میں بلند آواز سے فضائل کی کتاب پڑھنا	۲۶۵
دورانِ تلاوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آنے پر دُرود شریف پڑھنے کا حکم	۲۶۵
نماز کے بعد ''اِنَّ اللہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ'' بلند آواز سے پڑھنا	۲۶۶
جنات کو قید کرنے یا جلانے کا حکم	۲۶۸
جنیہ سے انسان کے نکاح کا حکم، اور انسانوں پر جنات کے اثرات کی شرعی حیثیت	۲۶۹

موضوعات	صفحہ نمبر
بے پردہ خاتون سے جھاڑ پھونک کرانے کا حکم	۲۷۴
چور یا گم شدہ چیز معلوم کرنے کے لئے منتر اور ٹوٹکے معتبر ہیں یا نہیں؟	۲۷۶
قبرستان میں قبلہ رُو ہوکر ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنا	۲۷۶
تعویذ کے ذریعہ علاج کرانے کا حکم	۲۷۷
قرآنِ کریم کے نقش کے علاوہ کسی اور تعویذ کا حکم	۲۷۹
ماہواری کی حالت میں تلاوت اور ذکر کا حکم	۲۷۹
اسمِ ''بدوح'' کی تحقیق	۲۷۹
ناچاقی دُور کرنے کے لئے شوہر پر تعویذ کرنے کا حکم	۲۸۰
رمضان میں تراویح کے بعد وعظ کرنے اور چالیس مرتبہ صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم	۲۸۰
کیا ظاہری اسباب نہ ہونے کی صورت میں بھی دُعا کا اثر ہوتا ہے؟	۲۸۱
اسمِ اعظم سے کیا مراد ہے؟	۲۸۱
روزہ اِفطار کے وقت دُعا زیادہ قبول ہوتی ہے	۲۸۲
تعویذ میں اگر کوئی خلافِ شرع بات نہ ہو تو جائز ہے	۲۸۲
''عملِ حاضرات'' کی شرعی حیثیت	۲۸۲
''بدیع العالم'' نام رکھنے اور صرف ''اِلّا اللہ'' کا ذکر کرنے کا حکم	۲۸۳
﴿کتاب حقوق المعاشرۃ وآدابھا﴾	۲۸۵
(حقوقِ معاشرت اور اس کے آداب)	
گھریلو ناچاقی اور والد کی سخت مزاجی کا حل، اور طلاق کے معاملے میں والد کی اطاعت واجب ہے یا نہیں؟	۲۸۷
شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر جانا، جائز اَمر میں شوہر کی اطاعت واجب ہے	۲۹۰
گھر میں ٹیلی ویژن لانے کے لئے باپ کو گھر سے نکالنا، عالم کا والد اور بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرنا	۲۹۱
غیبت کے چرچوں کی وجہ سے پڑوسیوں کے گھر آمد و رفت سے رُکنا	۲۹۲

موضوعات	صفحہ نمبر
ناجائز اُمور میں باپ کی اطاعت کا حکم	۲۹۲
والدہ کے حکم سے بیوی کو طلاق دینے کا حکم	۲۹۳
مرزائیوں سے تعلق رکھنے والے رشتہ داروں سے تعلق کا حکم	۲۹۴
اُستاذ کو گالی دینے کا حکم	۲۹۵
والدین اور اساتذہ کے لئے تعظیماً کھڑے ہونے کی شرعی حیثیت	۲۹۵
والدین کے کہنے پر بلا عذرِ شرعی، بیوی کو طلاق دینے کا حکم	۲۹۵
بھائی بہنوں سے بیوی کی ملاقات پر پابندی لگانے کا حکم	۲۹۶
﴿کتاب السیر والمناقب﴾	۲۹۷
(انبیاء اور مختلف شخصیات کے حالات ومناقب)	
قسطنطنیہ پر حملے میں شرکت کی بناء پر یزید کے جنتی ہونے کا عقیدہ رکھنا	۲۹۹
قبیلۂ ''جون'' کی عورت اُمیمہ بنت شراحبیل سے متعلق شیعوں کا من گھڑت قصہ	۳۰۱
بعض تاریخی روایات کی بنیاد پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حق میں بدگمانی کرنا	۳۰۲
حضرت فاطمہؓ کے نکاح کی تاریخ	۳۰۳
حضرت خدیجہؓ کے مال سے تجارت کرنے پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی کمیشن مقرر تھا؟	۳۰۴
حضرت معاویہؓ کے بارے میں کتاب ''شہیدِ کربلا'' اور بعض اکابر کی عبارات کا جواب	۳۰۴
حضرت عباسؓ کی اولاد سادات میں شامل ہے	۳۰۶
یزید کے بارے میں جنتی ہونے کا عقیدہ	۳
یزید کے نام کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' لکھنا	۳۰۷
کیا حضرت یوسف علیہ السلام کا زلیخا سے نکاح ہوگیا تھا؟	۳۰۷
کیا یزید بن معاویہؒ پر لعنت بھیجنا ثواب ہے؟	۳۰۸
پاک رحموں اور پاک صلبوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا مطلب	۳۰۸
علامہ ابنِ تیمیہؒ کے بارے میں جمہور علماء کی رائے	۳۰۸
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا حکم	۳۰۹

موضوعات	صفحہ نمبر
﴿کتاب الطهارة﴾	۳۱۱
(طہارت کا بیان)	
﴿فصل فی الوضوء والغسل والتیمّم﴾	۳۱۳
(وضو، غسل اور تیمّم کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب ومکروہات کا بیان)	
جنازے کے لئے کئے گئے وضو سے فرائضِ پنج گانہ پڑھ سکتے ہیں	۳۱۳
غسل خانے میں بات کرنے کا حکم	۳۱۳
دانت میں چاندی بھری ہوئی ہو تو وضو اور غسل کا حکم	۳۱۴
برہنہ ہوکر غسل کرنا	۳۱۵
گردن کے مسح کی شرعی حیثیت	۳۱۵
مرض کی وجہ سے پانی نقصان دہ ہو تو تیمّم کیا جاسکتا ہے	۳۱۵
غسل کے بعد دوبارہ وضو کا حکم	۳۱۶
﴿فصل فی النّجاسات وأحکام التطهیر﴾	۳۱۷
(نجاسات کے اَحکام اور پاکی کا طریقہ)	
ناپاک رُوئی کو پاک کرنے کا طریقہ	۳۱۷
تیل کو پاک کرنے کا طریقہ	۳۱۷
تطہیرِ اشیاء کے طریقوں کی تعداد اور مکمل تفصیل	۳۱۸
مٹی، تیل پاک ہے	۳۲۰
بیت الخلاء کے لوٹے سے طہارت حاصل کی جاسکتی ہے	۳۲۰
دھوبی کے دُھلے ہوئے کپڑوں کا حکم	۳۲۰
کتے کی دباغت شدہ کھال پاک ہے	۳۲۱
کیا دھوبی سے کپڑے دُھلانے کے بعد دوبارہ دھونا ضروری ہے؟	۳۲۲
دھوبی سے کپڑا دُھلوانے کے بعد کیا دوبارہ پاک کرنا ضروری ہے؟ اور کیا کپڑا پاک کرتے وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا ضروری ہے؟	۳۲۲

موضوعات　　صفحہ نمبر

ہاتھی کی سونڈ سے نکلنے والے پانی کا حکم، مچھلی کا پِتّہ پاک ہے یا نہیں؟ ۳۲۲
ہاتھ پر نجاست لگنے کی صورت میں کتنی مرتبہ دھونا لازم ہے؟ ۳۲۴
جوتے یا چپل وغیرہ کو وضو خانے میں دھونے کا حکم ۳۲۴

﴿فصل فی أحکام الماء﴾ ۳۲۵
(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق مسائل کا بیان)

تالاب سے پانی لیتے وقت اگر گھڑے میں مینگنی آجائے تو کیا کرے؟ ۳۲۵
''دہ در دہ'' حوض میں نجاست گرنے کا حکم ۳۲۵
کنویں میں سانپ گرنے کی صورت میں کیا حکم ہے؟ ۳۲۶
کیا ٹینکی سے آنے والا پانی ''ماءِ جاری'' کے حکم میں ہے؟ ۳۲۷
ہندو خاکروب کی دھوئی ہوئی جگہ پر نماز پڑھنے کا حکم ۳۲۹

﴿فصل فی أحکام الجنب والمعذور﴾ ۳۳۰
(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

غسلِ جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری نہیں ۳۳۰
حالتِ جنابت میں دُرود شریف پڑھنے کا حکم ۳۳۰
جنابت کی حالت میں قرآن چھونے کا حکم ۳۳۱
ایک ہی شب میں دوبارہ ہم بستری کے لئے غسلِ جنابت ضروری نہیں ۳۳۱
کئی مرتبہ ہم بستری کے بعد ایک غسلِ جنابت کافی ہے ۳۳۲
ایک ہی شب میں دوبارہ ہم بستری سے پہلے اگر غسل نہ کرے تو کیا حکم ہے؟ ۳۳۲
پیشاب کے قطروں کی بناء پر کپڑے کی پاکی اور وضو کا حکم ۳۳۳
''لیکوریا'' کے پانی کا حکم اور اس سے متعلق متعدّد مسائل ۳۳۳

﴿فصل فی الاستنجاء﴾ ۳۳۵
(استنجاء کے مسائل کا بیان)

کیا طہارت کے لئے ڈھیلا اور پانی دونوں استعمال کرنا ضروری ہے؟ ۳۳۵

موضوعات صفحہ نمبر

پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا مسنون ہے، اور صرف پانی کا استعمال بھی کافی ہے..... ۳۳۵

﴿فصل فی المسح علی الخفین﴾ ۳۳۷

(موزوں پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

مروّجہ موزوں پر مسح کا مسئلہ..... ۳۳۷

نائیلون کی مروّجہ جرابوں اور سوتی جرابوں پر مسح کا حکم..... ۳۴۸

﴿کتاب الصلوٰۃ﴾ ۳۴۹

(مسائلِ نماز)

﴿فصل فی مواقیت الصلوٰۃ﴾ ۳۵۱

(اوقاتِ نماز سے متعلق مسائل کا بیان)

دارالعلوم کراچی کے نقشۂ اوقاتِ نماز میں صبحِ صادق کے وقت پر اعتراض اور اس کا جواب..... ۳۵۱

انتہاءِ زوال اور ابتداءِ ظہر میں فاصلے کی مقدار..... ۳۵۷

حنبلی مسلک میں زوال سے پہلے جمعہ کا وقت اور اس کی بناء پر حنفی مقتدی کے لئے حکم..... ۳۵۷

ظہر کا وقت..... ۳۵۸

کینیڈا میں عصر اور عشاء کا وقت..... ۳۵۸

عصر میں اصفرارِ شمس تک تأخیر، عشاء کا وقت..... ۳۵۹

نمازِ فجر میں اِسفار افضل ہے..... ۳۶۰

شرعی رات کی تحقیق..... ۳۶۱

عشاء میں جلدی کا حکم..... ۳۶۱

رمضان میں عشاء اور صبحِ صادق کا وقت..... ۳۶۲

سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نماز پڑھنا..... ۳۶۲

صبحِ صادق کے وقت پر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ سے اختلاف کی تحقیق (عربی فتویٰ)..... ۳۶۳

عصر کی نماز کے لئے ساڑھے چار بجے کا وقت مقرر کرنا..... ۳۶۳

موضوعات	صفحہ نمبر
﴿فصل فی الأذان﴾	۳۶۵
(اذان سے متعلق مسائل کا بیان)	
اذان میں تجوید کی غلطی کا حکم	۳۶۵
اذان سے پہلے دُرود وسلام پڑھنے کا حکم	۳۶۵
جمعہ کی اذانِ ثانی کہاں دی جائے؟	۳۶۶
سیاسی مقاصد کے لئے اذان دینے کا حکم	۳۶۷
﴿فصل فی شروط الصلوٰۃ وأرکانها وواجباتها وسننها وآدابها﴾	۳۶۸
(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کے بیان میں)	
سمتِ قبلہ کا مطلب	۳۶۸
حالتِ اِحرام میں جاءِ نماز پر سجدہ کا حکم	۳۶۸
ٹرین میں فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا	۳۶۹
سجدے میں پیشانی کے ساتھ ناک رکھنے سے متعلق بہشتی زیور اور احسن الفتاویٰ میں تعارض کی تحقیق	۳۶۹
امام کا تکبیر کے وقت بیٹھے رہنا اور ''حی علی الفلاح'' پر کھڑا ہونا	۲۷۱
تکبیر کے دوران نمازی کب کھڑے ہوں؟	۳۷۲
تکبیر کے دوران مقتدی کب کھڑے ہوں؟	۳۷۳
نماز کے لئے کیسا لباس پہننا ضروری ہے؟ اور صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھانے کا حکم	۳۷۳
ایک طرف سلام نہ پھیرنے سے نماز دُرست ہوگی یا نہیں؟	۳۷۴
نماز میں ثناء اور دُرود شریف پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟	۳۷۵
تسمیہ، سورۂ فاتحہ سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟	۳۷۶
باجماعت نماز ادا کرنا سنت ہے یا واجب؟	۳۷۶
اِستقبالِ قبلہ شرط ہے، اِستقبالِ قبلہ کی نیت شرط نہیں	۳۷۷
بیٹھ کر نماز پڑھنے کے دوران کھڑے ہوجانا	۳۷۹

موضوعات	صفحہ نمبر
﴿فصل فی الامامة و الجماعة﴾ (امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)	۳۸۰
امامت کی نیت کا طریقہ	۳۸۰
امام کے شرعی اوصاف	۳۸۰
جس کا علم زیادہ ہو، اسے امام بنانا افضل ہے	۳۸۲
شرعی مسئلے کو نہ ماننے والے کی امامت کا حکم	۳۸۲
بدکردار شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم	۳۸۳
کسی ناجائز فعل سے منع کرنے پر امامت سے معزول کرنا	۳۸۴
جس امام سے مقتدی راضی نہ ہوں، اس کی امامت کا حکم	۳۸۵
علمائے دیوبند کے عقائد سے جزوی اختلاف رکھنے والے ایک امام کی امامت سے متعلق تفصیلی فتویٰ	۳۸۶
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر ماننے والے کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا حکم	۳۹۳
داڑھی منڈانے والے کو امام بنانا	۳۹۳
داڑھی مونڈنے والے کو امام بنانے کا حکم	۳۹۳
ایک مشت سے کم داڑھی والے کی امامت کا حکم	۳۹۴
ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کی اقتداء میں نماز کا حکم	۳۹۴
ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کے پیچھے نماز کا حکم	۳۹۴
عرش پر اللہ تعالیٰ کے جسمانی قیام کا عقیدہ رکھنے والے شخص کی امامت کا حکم	۳۹۵
معراجِ جسمانی کے قائل کی اقتداء میں نماز کا حکم	۳۹۶
شیعہ کے پیچھے نماز پڑھنا	۳۹۷
شیعہ سے اپنی بیٹی کا نکاح کرانے والے کے پیچھے نماز کا حکم	۳۹۷
لواطت کے مرتکب کی امامت کا حکم	۳۹۸
گالی دینے والے کو امام بنانے کا حکم	۳۹۹
امام کی بُرائی کرنے والے کا اسی امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا	۳۹۹
فسقیہ افعال کے مرتکب کو امام بنانا	۴۰۰

موضوعات	صفحہ نمبر

گالی گلوچ کرنے والے شخص کو امام بنانے کا حکم ۴۰۰

کس مسجد کے امام کے پیچھے نماز پڑھنا اَوْلیٰ ہے؟ ۴۰۱

تصویر کھینچنے اور کھنچوانے والے کی اقتداء میں نماز کا حکم ۴۰۱

جھوٹ بولنے والے کے پیچھے نماز کا حکم ۴۰۲

بدعتی اور مجہول پڑھنے والے کی اقتداء کا حکم ۴۰۲

جماعتِ اسلامی کے رکن کی اقتداء میں نماز کا حکم ۴۰۳

لڑکی کو بیچنے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم ۴۰۴

خائن شخص کو امام بنانے کا حکم ۴۰۵

ماموں سے ناراض شخص کے پیچھے نماز پڑھنا ۴۰۵

بے خبری میں بریلوی امام کی اقتداء میں نماز پڑھ لی تو کیا حکم ہے؟ ۴۰۵

جرگے کا فیصلہ مقدم ہے یا باجماعت نماز؟ ۴۰۶

شور جھگڑے کی بناء پر جماعت کی نماز توڑنا ۴۰۶

سیاسی اختلاف کی بناء پر امامت سے معزول کرنا ۴۰۷

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ''عالم الغیب'' اور ''حاضر و ناظر'' ماننے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم ۴۰۷

مسجد کی دُوسری منزل پر جماعت کرانے کا حکم ۴۰۸

امام اگر سائبان کے نیچے کھڑا ہو اور مقتدی پیچھے تو کیا حکم ہے؟ ۴۰۸

کیا امام، امامت سے اُستاذ بن جاتا ہے؟ ۴۰۸

ریڈیو سننے والے کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا حکم ۴۰۹

بلاثبوت زنا کی تہمت لگانے والے کے پیچھے نماز کا حکم ۴۰۹

امام کا امامت برقرار رکھنے کے لئے چند شرائط لگانے کا حکم ۴۱۰

کشفِ قبور کے قائل کی اقتداء میں نماز کا حکم ۴۱۰

جھوٹ بولنے والے اور مسجد کا سامان اپنے گھر میں استعمال کرنے والے امام کی اقتداء کا حکم .. ۴۱۱

اپنے اُوپر عائد شدہ مختلف الزامات کے دُرست جوابات دینے والے امام کی اقتداء کا حکم ۴۱۲

موضوعات	صفحہ نمبر
ایک امام کی امامت سے متعلق تفصیلی استفتاء اور اس کا جواب	۴۱۵
﴿فصل فی المسبوق واللّاحق﴾	۴۱۹
(مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان)	
مسبوق، سجدۂ سہو کے لئے امام کے سلام میں شرکت نہ کرے	۴۱۹
مسبوق کی نماز کا طریقہ	۴۱۹
مسبوق اپنی نماز کس طرح پوری کرے؟	۴۲۰
مسبوق کی ثناء سے متعلق شرح وقایہ کی ایک عبارت کی تحقیق	۴۲۰
امام کے سلام کی صورت میں مسبوق تشہد پورا کرے گا یا نہیں؟	۴۲۱
﴿فصل فیما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیھا﴾	۴۲۳
(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)	
پہلی صف میں نابالغ بچے کا کھڑا کرنا	۴۲۳
آدھی آستین والی قمیص میں نماز پڑھنا	۴۲۳
تصویر والے کمرے میں نماز پڑھنے کا حکم	۴۲۴
محاذات کی دو صورتوں کی تفصیل اور حکم	۴۲۴
برآمدے میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں	۴۲۶
بغیر سترہ کے نمازی کے آگے سے گزرنے کی تفصیل	۴۲۶
کندھوں تک بال بڑھا کر رکھنے والوں کی نماز ہوتی ہے یا نہیں؟	۴۲۷
﴿فصل فی القراءۃ ومسائل زلۃ القاری﴾	۴۲۸
(نماز میں قراءت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)	
سورۂ فاتحہ کے بعد "رَبِّ اغفر لی" کہنا	۴۲۸
بیماری کی وجہ سے نماز میں الفاظ ادا نہ کرسکے تو کیا حکم ہے؟	۴۲۸
فاتحہ خلف الامام کا حکم	۴۲۹
ضؔ کا مخرج	۴۲۹

موضوعات — صفحہ نمبر

ضؔ کا مخرج ۴۳۰

"وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ" کے بجائے "وَالْمُشْرِكِيْنَ" پڑھنے کا حکم ۴۳۰

تین چھوٹی آیات کے برابر آدھی آیت پڑھنے سے نماز ہوجائے گی ۴۳۱

نماز میں مجہول قراءت کرنا ۴۳۱

بیچ میں چھوٹی سورت چھوڑ کر قراءت کرنا ۴۳۲

فجر کی پہلی رکعت کو دُوسری رکعت سے طویل کرنا، قراءت میں متعدّد غلطیوں کا حکم ۴۳۲

﴿فصل فی السنن والنوافل﴾ ۴۳۴

(سنن اور نوافل نمازوں کے بیان میں)

نمازِ اِشراق و چاشت دو، دو رکعت کرکے پڑھ سکتے ہیں ۴۳۴

تحیۃ المسجد واجب ہے یا مستحب؟ ۴۳۴

سنت مؤکدہ کا ترک ۴۳۵

جمعہ کی سنتوں کی تعداد ۴۳۵

جمعہ کی سنتوں کی تعداد، سنتِ غیر مؤکدہ پڑھنے کا طریقہ ۴۳۷

صبحِ صادق اور فجر کے بعد نوافل پڑھنے کا حکم ۴۳۷

سنتِ مؤکدہ کو بلا عذر ترک کرنا ۴۳۷

زوال سے پہلے جمعہ کی سنتیں پڑھنا ۴۳۸

صلوٰۃ التسبیح کی جماعت کا حکم ۴۳۸

تہجد کی نیت کس طرح کریں؟ ۴۳۹

شبِ قدر کی نوافل کا طریقہ ۴۳۹

سنن ونوافل گھر میں پڑھنی چاہئیں یا مسجد میں؟ ۴۴۰

فجر کی سنتیں چھوٹ جائیں تو کیا حکم ہے؟ ۴۴۰

فجر کے فرض شروع ہونے کے بعد سنتیں کس وقت تک ادا کی جاسکتی ہیں؟ ۴۴۱

سننِ مؤکدہ کو بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا ۴۴۲

توڑی ہوئی نفل نماز اور طواف ونذر کی نماز میں قیام کا حکم ۴۴۳

موضوعات	صفحہ نمبر
نوافل کی جماعت میں لوگوں کی شرکت کا اہتمام کرنا	۴۴۴
رمضان میں نفل کی جماعت	۴۴۵
﴿فصل فی التراویح﴾	۴۵۹
(تراویح اور شبینہ سے متعلق مسائل)	
چار تراویح کے بعد وقفے میں کیا پڑھنا چاہئے؟	۴۵۹
تراویح پر اُجرت کا مسئلہ	۴۵۹
تراویح پر اُجرت لینا	۴۶۰
تراویح پر اُجرت لینے کا حکم	۴۶۰
شبینہ کا حکم	۴۶۱
تراویح پر اُجرت کا مسئلہ، جماعت کے ساتھ فرض نہ پڑھنے والا تراویح میں امام بن سکتا ہے یا نہیں؟	۴۶۲
۲۳ویں رات میں سورۂ عنکبوت اور رُوم پڑھنا	۴۶۲
شبینہ کا حکم	۴۶۳
شبینہ کا حکم	۴۶۳
شبینہ کا حکم، جائز شبینہ کس طرح ہوسکتا ہے؟	۴۶۴
شبینہ کے جواز کی شرائط	۴۶۴
تراویح میں تین بار سورۂ اِخلاص پڑھنا	۴۶۵
تراویح میں قرآن پڑھے جانے کے باوجود الگ سے "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے تراویح پڑھنا	۴۶۶
تراویح کو ضروری نہ سمجھنا اور بلا عذر تراویح ترک کرنا	۴۶۶
تراویح میں ایک مرتبہ ختمِ قرآن سنت ہے	۴۶۶
تراویح سے متعلق متعدّد مسائل	۴۶۷
داڑھی منڈانے والے کی اقتداء میں تراویح پڑھنا	۴۶۹
کھڑے ہوکر تراویح پڑھنے کے بعد عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھنا	۴۶۹

موضوعات — صفحہ نمبر

تراویح کی رکعتوں کی تعداد ۴۷۰

تراویح میں شرکت کے لئے عورتوں کا مسجد جانا ۴۷۱

﴿فصل فی الوتر﴾ ۴۷۲

(وتر سے متعلق مسائل)

وتر کا وقت اور طریقہ ۴۷۲

شافعی امام کے پیچھے حنفی کے وتر پڑھنے کا حکم ۴۷۳

شافعی کے پیچھے حنفی کا وتر پڑھنا ۴۷۴

مسجد میں دوجگہ تراویح ہونے کی بناء پر وتر کی دو جماعتوں کا حکم ۴۷۵

وتر میں دُعائے قنوت بھول جائے تو کیا حکم ہے؟ ۴۷۵

﴿فصل فی قضاء الفوائت﴾ ۴۷۶

(قضا نمازوں سے متعلق مسائل کا بیان)

حیض کی مخصوص صورت کی بناء پر نمازوں کی قضا ۴۷۶

فوت شدہ نمازوں کی قضا لازم ہے ۴۷۶

قضائے عمری کی شرعی حیثیت ۴۷۷

ایامِ حیض کی نمازوں کی قضا لازم نہیں ۴۸۷

قضا نمازوں کی ادائیگی ضروری ہے ۴۸۷

﴿فصل فی سجود السھو﴾ ۴۸۸

(سجدۂ سہو کے مسائل کا بیان)

سورۂ فاتحہ، سورۃ اور رکعتوں میں شک کی دوصورتوں کا حکم ۴۸۸

قراءت میں عدمِ ترتیب سے سجدۂ سہو لازم نہیں ۴۸۹

تسمیہ کے ترک سے سجدۂ سہو لازم نہیں ۴۹۰

تاخیرِ رکن کی وہ مقدار جس سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے ۴۹۰

مونوعات	صفحہ نمبر
تأخیرِ رکن کی کتنی مقدار سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے؟ (مفصل تحقیق)	۴۹۱
بھولے سے سلام پھیر لینے کے بعد سجدۂ سہو کب تک کر سکتے ہیں؟	۴۹۴
چار رکعت والی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیرنے کی صورت میں سجدۂ سہو کے وجوب سے متعلق فقہاء کی عبارات میں تضاد کی تحقیق	۴۹۴
﴿فصل فی سجود التلاوۃ﴾	۴۹۶
(سجدۂ تلاوت کے مسائل کا بیان)	
امام کے سجدۂ تلاوت کا پتہ نہ چلنے کی بناء پر مقتدی رُکوع میں رہ کر اُٹھ گیا تو کیا حکم ہے؟	۴۹۶
لاؤڈ اسپیکر پر آیتِ سجدہ سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوگا	۴۹۷
﴿باب صلوٰۃ المریض والمسافر﴾	۴۹۸
(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)	
نمازِ قصر کہاں سے شروع کرے؟ کیا اپنے شہر میں قصر کرسکتا ہے یا نہیں؟	۴۹۸
زوجہ اور عقار کو وطنیت کا معیار بنانے پر فتح القدیر اور البحر الرائق کی عبارات کی تحقیق	۴۹۸
وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت کا معیار (فارسی)	۵۰۱
وطنِ اصلی سے مکمل طور پر منتقل ہوجانے کے بعد دوبارہ وطن آنے کی صورت میں قصر کا حکم	۵۰۲
فوج کی پوسٹنگ کی تبدیلی کی بناء پر نمازِ قصر سے متعلق چند سوالات کے جوابات	۵۰۳
شرعی معذور کی نماز کا حکم	۵۰۴
معذور کی نماز کا حکم	۵۰۵
معذور کے لئے وضو کا حکم	۵۰۶
شرعی معذور کی تعریف اور عذر کا معیار	۵۰۶
قطرے کا مریض کپڑا دیکھے بغیر نماز پڑھے تو کیا حکم ہے؟	۵۰۸
﴿فصل فی الجمعۃ﴾	۵۰۹
(جمعہ کے متعلق مسائل کا بیان)	
حنفیہ کے نزدیک نمازِ جمعہ کے لئے شہر کا وجود ضروری ہے	۵۰۹

موضوعات — صفحہ نمبر

دورانِ خطبہ تشہد کی ہیئت پر بیٹھ کر ہاتھ باندھنا ۵۰۹
خطبے کے دوران نفل نماز پڑھنے کا حکم ۵۱۰
خطبے کے دوران خاموش رہنا واجب ہے ۵۱۱
جمعہ کی اذانِ ثانی امام اور منبر کے سامنے دینی چاہئے ۵۱۱
جمعہ کے دن نماز سے قبل تقریر کرنے کا حکم ۵۱۲
جمعہ کا خطبہ اور نماز الگ الگ اشخاص پڑھائیں تو کیا حکم ہے؟ ۵۱۲
بستی میں جمعہ فرض نہ سمجھنے والے امام کے لئے کسی دُوسرے شخص سے نمازِ جمعہ پڑھوانا ۵۱۳
قریۂ کبیرہ میں نمازِ جمعہ ۵۱۳
قریۂ صغیرہ میں جمعہ کا حکم (فارسی) ۵۱۳
خطبۂ جمعہ کے دوران ہاتھ میں عصا لینے کی شرعی حیثیت ۵۱۴
امروٹ شریف میں نمازِ جمعہ کا حکم ۵۱۵
صحتِ جمعہ کے لئے شہر یا قریۂ کبیرہ ہونا ضروری ہے ۵۱۷
گھر میں نمازِ جمعہ پڑھانے کا حکم ۵۱۸
کراچی سے اٹھائیس میل دُور قصبہ ''کاٹھور آباد'' میں جمعہ کا حکم ۵۱۸
کیا صحراء میں جمعہ فرض ہے؟ ۵۲۲
ایک قصبہ میں نمازِ جمعہ کا حکم ۵۲۳
جیلوں، چھاؤنیوں اور ایئرپورٹ پر نمازِ جمعہ ۵۲۳
ائمۂ حرمین کی اقتداء میں کھلے میدانوں میں پڑھی جانے والی جمعہ کی نمازوں کا حکم ۵۲۹
خطبۂ جمعہ میں کسی بزرگ کا مقولہ شامل کرنا ۵۲۹
پنج وقتہ نماز کے لئے بنائی گئی جگہ میں جمعہ کا حکم ۵۳۰
ترکِ سعی کے گناہ سے بچنے کے لئے اذانِ اوّل کو تقریر سے مؤخر کرنے کا حکم ۵۳۰
جمعہ کی اذانِ اوّل کے بعد بیع وشراء وغیرہ ممنوع کاموں کے ارتکاب سے لوگوں کو بچانے کے لئے کیا اذانِ اوّل کو مؤخر کرنا جائز ہے؟ ۵۳۵

موضوعات	صفحہ نمبر
﴿فصل فی العیدین﴾ (عیدین کے متعلق مسائل کا بیان)	۵۴۷
نمازِ عید کے بعد دُعا مانگی جائے یا خطبہ کے بعد؟	۵۴۷
تکبیراتِ تشریق کے بارے میں امامِ اعظمؒ اور صاحبینؒ میں اختلاف کی تحقیق	۵۴۷
عرب امارات میں عید کی نماز پڑھ کر آنے والے کے لئے پاکستان میں دوبارہ نمازِ عید پڑھنے کا حکم، اور ایسا شخص شوال کے نفلی روزے کب سے شروع کرے؟	۵۴۹
حنفیوں کا غیر مقلد کی اقتداء میں نمازِ عید پڑھنے کا حکم	۵۵۰
ایک ہی مقام پر عید کی دو جماعتیں کرانے کی دو صورتوں کا حکم	۵۵۰
جگہ کی تنگی کی بناء پر ایک ہی جگہ عید کی دو جماعتوں کا حکم	۵۵۲
نمازِ عید کے بعد دُعا ہو یا خطبے کے بعد؟	۵۵۲
نمازِ عید میں تکبیرات چھوڑ کر امام سورۂ فاتحہ شروع کردے تو کیا حکم ہے؟	۵۵۳
﴿فصل فی المسائل الجدیدۃ والمتفرقۃ المتعلقۃ بالصلوٰۃ﴾ (نماز سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)	۵۵۴
نماز میں اسپیکر کا استعمال	۵۵۴
کیا لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہوجاتی ہے؟	۵۵۵
کیا لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھنے میں زیادہ ثواب ہے؟	۵۵۵
مسجد میں خانۂ کعبہ ومسجدِ نبوی کی تصاویر آویزاں ہوں تو ایسی صورت میں نماز کا حکم	۵۵۵
مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کے شرعی اَحکام	۵۵۶
نماز میں (آلۂ مکبّر الصوت) اسپیکر کے استعمال کی شرعی حیثیت	۵۵۷
تراویح میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا حکم اور اسپیکر میں تراویح کے دوران آیتِ سجدہ آنے والی ہو تو کیا کیا جائے؟	۵۵۹
ریل میں دورانِ سفر نماز کیسے پڑھی جائے؟	۵۵۹
ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنا جائز ہے	۵۶۰
بے نمازی کا حکم	۵۶۰

موضوعات	صفحہ نمبر
﴿کتاب الجنائز﴾	۵۶۱
(نمازِ جنازہ اور تجہیز وتکفین کے مسائل)	
نمازِ جنازہ پڑھانے میں کس امام کو مقدم کیا جائے گا؟	۵۶۳
مرد نہ ہونے کی صورت میں کیا عورت پر نمازِ جنازہ پڑھنا لازم ہے؟	۵۶۳
جنازہ لے جاتے وقت چالیس قدم گن کر میّت کو ایصالِ ثواب کرنے کا حکم	۵۶۴
مردے کو دو مرتبہ غسل دینے کی رسم	۵۶۴
بیوی کے انتقال کے بعد شوہر کے لئے اس کا چہرہ دیکھنا کیسا ہے؟	۵۶۴
مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم	۵۶۵
مسجد میں نمازِ جنازہ کا حکم (فارسی)	۵۶۶
لحد گر جانے کی وجہ سے دوبارہ قبر بنانے کا حکم	۵۶۶
میّت کو غسل دینے کے بعد جسم سے خون نکلنے کی صورت میں شرعی حکم	۵۶۷
میّت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم	۵۶۷
نمازِ جنازہ شروع کرنے سے پہلے امام کا نیت وغیرہ بتانا	۵۶۹
میّت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم	۵۷۰
میّت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر منتقل کرنے کا حکم اور مجتہد فیہ اُمور میں نکیر کے درجات	۵۷۱
پیدائش کے فوراً بعد مرنے والے بچے کے نام رکھنے، نمازِ جنازہ اور تجہیز وتکفین کے اَحکام	۵۸۵
دار الحرب میں مرنے والے مسلمان پر شرعی اَحکام جاری ہوں گے	۵۸۶
دفن کے وقت کفن کی گرہ کھولنے کی حکمت میں حاشیہ شرح وقایہ اور دیگر فقہاءؒ کی عبارات میں تضاد کی تحقیق	۵۸۷
﴿فصل فی ایصال الثواب﴾	۵۸۸
(ایصالِ ثواب سے متعلق مسائل کا بیان)	
ایصالِ ثواب کے لئے صدقۂ جاریہ میں کون سی چیز بہتر ہے؟	۵۹۰
عقیدۂ ایصالِ ثواب	۵۹۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ، أَمَّا بَعْدُ:

جب سے آنکھ کھلی، والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے فیض سے گھر میں فتویٰ اور استفتاء کا چرچا دیکھا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے فقہی مسائل گھر کے ان تذکروں کی بنا پر یاد ہوگئے، لیکن کسی کو مسئلہ بتانے یا لکھ کر دینے سے دِل ہمیشہ ڈرتا رہا، اور مدرسہ میں پڑھنے کے زمانے میں کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ کسی وقت فتویٰ لکھنے کی کوئی ذمہ داری سر پر آنے والی ہے۔ ۱۳۷۷ھ میں جب میں دارالعلوم کراچی میں ہدایہ اوّلین وغیرہ پڑھتا تھا اور میری عمر (قمری حساب سے) پندرہ سال تھی، شعبان و رمضان کی تعطیلات کے زمانے میں اُستاذِ مکرّم حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ روزانہ ہمارے گھر پر تشریف لاکر فتویٰ کا کام کیا کرتے تھے، میں بکثرت اُن کے پاس جا بیٹھتا، اور ان کے لکھے ہوئے فتاویٰ پڑھتا رہتا۔ ایک روز حضرتؒ نے ایک استفتاء مجھے دے کر فرمایا کہ ''بتاؤ اس سوال کا کیا جواب ہوگا؟'' مسئلہ طلاق کا تھا اور سیدھا سادا تھا، میں نے صحیح جواب دے دیا، حضرتؒ نے فرمایا ''بس اب یہی جواب اس استفتاء پر لکھ دو۔'' جب لکھنے کا نام آیا تو میرا دِل ڈرنے لگا، لیکن حضرت اُستاذؒ نے ہمت بندھائی، میں نے جواب لکھ دیا، اور دستخط کی جگہ چھوڑ دی، حضرتؒ نے اس تحریری جواب کی تصویب فرمائی اور خود دستخط فرمادیئے۔

اس کے بعد ۱۳۷۹ھ (مطابق ۱۹۵۸ء) میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے پاس مشکوٰۃ شریف پڑھنی شروع کی تو حضرتؒ نے ترغیب دی کہ میں اور برادر مکرّم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم کتابوں سے مسائل کے جوابات نکالنے کی مشق کریں، چنانچہ اسی زمانے میں حضرتؒ کچھ سوالات دے دیتے تھے اور کتبِ فقہ سے ان کے جوابات نکالنے کا حکم دیتے، ہم کتابوں سے جوابات تلاش کرکے اکثر زبانی اور کبھی تحریری طور پر حضرتؒ کی خدمت میں پیش کرتے، اور وہ ان کی تصویب یا اصلاح فرمادیتے۔

اسی سال جب شعبان و رمضان کی تعطیلات میں گھر جانا ہوا تو حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کے پاس رمضان میں جماعتِ تہجد کے جواز و عدمِ جواز سے متعلق ایک استفتاء آیا ہوا تھا، اور حضرت

والد صاحبؒ اس کا جواب تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے، انہوں نے مجھے حکم دیا کہ اس مسئلے کے بارے میں کتبِ فقہ کی مراجعت کر کے متعلقہ عبارتیں جمع کروں۔ میں نے یہ عبارتیں جمع کیں، اور حضرتؒ سے عرض کیا کہ ''اگر اجازت ہو تو ان عبارتوں کی روشنی میں جو مسئلہ سمجھ میں آرہا ہے، اسے بطورِ تجویز قلم بند کرلوں، پھر آپ ان کی اصلاح فرمادیں۔'' حضرتؒ نے اجازت دے دی، اور میں نے اپنی بساط کے مطابق جواب لکھ کر حضرتؒ کی خدمت میں پیش کیا، جس پر حضرتؒ نے معمولی ترمیم و اصلاح کے بعد تصدیق فرمادی، یہ پہلا باقاعدہ فتویٰ تھا جو بندہ نے لکھا اور بعد میں شائع بھی ہوا۔

دورۂ حدیث کے سال میں بھی حضرت مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے پاس مسائل کے استخراج کی مشق جاری رہی، یہاں تک کہ دورۂ حدیث کے بعد باقاعدہ تخصّص فی الافتاء میں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کے پاس فتویٰ نویسی کی مشق شروع کی۔ اُسی وقت یہ اندازہ بھی ہوا کہ فتویٰ کا کام صرف جزئیات یاد کرنے یا کتابوں کی مراجعت کا نام نہیں ہے، بلکہ اس میں اور بھی بہت سے اُصول مدِنظر رکھنے پڑھتے ہیں، اور ان میں سے بہت سی باتیں ایسی ہیں جو لگے بندھے قواعد کے علاوہ مفتی کے اپنے ملکۂ فقہیہ اور اس کے مزاج و مذاق سے تعلق رکھتی ہیں جو صرف کتابیں پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے کسی ماہر مفتی کی طویل صحبت کی بھی ضرورت ہے۔

تخصّص کے بعد بھی دارالعلوم میں تدریسی خدمات کے ساتھ تقریباً روزانہ کچھ وقت دارالافتاء میں فتویٰ نویسی کے لئے مخصوص رہا، اور اس طرح بفضلہٖ تعالیٰ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کی نگرانی و سرپرستی میں ۱۳۹۶ھ تک فتویٰ کی خدمت کا سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ دارالافتاء کی مستقل ذمہ داری تو دُوسرے مفتی حضرات کے سپرد رہی، لیکن کچھ وقت اپنا بھی لگتا رہا، اور جب کبھی ڈاک زیادہ جمع ہوجاتی یا فتویٰ لکھنے والوں کی کمی ہوتی تو حضرت والد صاحب قدس سرہٗ بندے کو کچھ عرصہ کے لئے تدریس کے علاوہ دُوسرے کام چھڑوا کر فتویٰ کی خدمت پر لگادیتے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحبؒ مدینہ منوّرہ ہجرت فرما گئے، اور برادر مکرّم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم پر دارالعلوم کے انتظامی اُمور کی ذمہ داریاں آپڑیں، اور دارالافتاء کے بعض دیگر رفقاء بھی اپنی مجبوریوں کی وجہ سے مستعفی ہوگئے، اس لئے عرصۂ دراز تک دارالافتاء اور درجۂ تخصّص کی نگرانی کا کام بندہ کے سپرد رہا، اور خود فتویٰ لکھنے کے علاوہ درجۂ تخصّص کے طلبہ کے لکھے ہوئے فتاویٰ پر نظرِ ثانی اور اصلاح کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

اس طرح مختلف زمانوں میں بندے کے لکھے ہوئے فتاویٰ، دارالعلوم کے نقلِ فتاویٰ کے بہت سے رجسٹروں میں بکھرے ہوئے ہیں، مجھے کبھی یہ خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ میں فتاویٰ کا کوئی مجموعہ مرتب

کر کے شائع کروں۔ خیال یہ تھا کہ دارالعلوم کراچی سے جاری ہونے والے فتاویٰ کا جو مجموعہ زیرِ ترتیب ہے، اسی میں یہ فتاویٰ بھی آجائیں گے۔ لیکن عزیز گرامی مولانا محمد زبیر حق نواز صاحب نے - جو دارالعلوم کراچی ہی کے فاضل و متخصص اور اب ماشاء اللہ اُستاذ و رفیق دارالافتاء ہیں- اپنے طور پر میرے لکھے ہوئے فتاویٰ کو مختلف رجسٹروں سے جمع کرنا شروع کردیا، اور اس کام کا ایک معتد بہ حصہ مکمل کرنے کے بعد بندہ کو مطلع کیا، میں نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر کام کی تکمیل کی اجازت دیدی۔

ماشاء اللہ مولانا محمد زبیر صاحب خود ذی استعداد عالم ہیں، اور انہوں نے نہایت عرق ریزی سے دارالعلوم کراچی کے پرانے رجسٹروں سے، جن میں سے بعض بہت بوسیدہ ہو چکے تھے، فتاویٰ ڈھونڈ نکالے، اور نہ صرف ان کا انتخاب کر کے ان کو ابواب میں مرتب کیا، بلکہ ان کے حوالوں کی تخریج کا کام بھی بڑی جانفشانی اور سلیقے کے ساتھ انجام دیا، جس سے اس مجموعے کی افادیت بہت بڑھ گئی۔ دِل سے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزِ موصوف کی اس محنت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائیں، اور ان کی عمر، علم اور عمل میں برکت عطا فرما کر انہیں مزید علمی و دینی خدمات کے لئے موفق فرمائیں، آمین۔

مجھے اپنی موجودہ مصروفیات اور اسفار کی کثرت کی بنا پر بہت دقتِ نظر سے تو ان فتاویٰ پر نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا، لیکن ان کا اکثر حصہ میں نے سرسری نظر سے دیکھ لیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید رکھتا ہوں کہ ان شاء اللہ ان کی اشاعت فائدے سے خالی نہ ہوگی۔

اپنے مشائخ کی ہدایت کے مطابق فتویٰ لکھتے وقت اس ذمہ داری کی نزاکت اور سنگینی کا احساس رہتا ہے، اور اپنی بساط کے مطابق احتیاط کی بھی کوشش رہتی ہے، لیکن یہ ذمہ داری ہی ایسی ہے کہ ہر وقت ڈر بھی لگا رہتا ہے کہ کوئی غلطی قابلِ گرفت نہ ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دُعا ہے کہ اس ذمہ داری کی انجام دہی میں اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو اپنے فضل و کرم سے معاف فرمادیں، اور اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرما کر اسے قارئین کے لئے نافع بنادیں، آمین۔

اہلِ علم سے بھی درخواست ہے کہ اگر کوئی غلطی سامنے آئے تو بندہ کو متنبہ فرمادیں، ان شاء اللہ حق واضح ہوجانے کے بعد اسے قبول کرنے میں تأمل نہ ہوگا۔ البتہ نصوصِ فقہیہ کی تعبیر و تشریح میں اختلافِ رائے دُوسری چیز ہے، جو ہر دور میں ہوتا رہا ہے، ایسے مواقع پر بھی بفضلہٖ تعالیٰ اپنے ذہن کو قوتِ دلیل کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ پاتا ہوں اور یہ دُعا کرتا رہتا ہوں کہ: "اَللّٰھُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَأَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ"۔

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

جامعہ دارالعلوم کراچی

۱۱/ذوالحجہ ۱۴۲۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، أَمَّا بَعْدُ:

اُستاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی ذاتِ گرامی محتاجِ تعارف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفضل اور تقویٰ وطہارت کے جس بلند مقام سے نوازا ہے، عصرِ حاضر میں اس کی مثال نہیں ملتی، جدید وقدیم علوم میں مہارت نے جہاں آپ کو اکابر کے لئے قابلِ صد رشک شخصیت بنادیا ہے، وہاں علم، تواضع اور سادگی کے حسین امتزاج نے آپ کو عوام کے لئے ہر دِل عزیز اور پُرکشش علمی ورُوحانی شخصیت بنادیا ہے۔

آپ تصوّف اور دعوت وارشاد میں حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اور عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمہ اللہ کے علوم ومعارف کے ترجمان، اور علمِ فقہ، تفسیر اور علوم القرآن میں اپنے عظیم اور جلیل القدر والد ماجد مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے جانشین اور علمِ حدیث میں محدث العصر علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی علمی روایات کے حامل اور امین ہیں۔

دیگر علوم وفنون کی طرح فقہ اور فتویٰ کے میدان میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ سے بہت بڑا کام لیا ہے، اس سلسلے میں تکملہ فتح الملہم کی فقہی مباحث، بحوث قضایا فقہیہ معاصرہ، فقہی مقالات، اَحکام الاوراق النقدیۃ، عدالتی فیصلے، ملکیتِ زمین کی تحدید، وغیرہ فقہی میدان میں آپ کی نہایت اہم اور گراں قدر علمی وتحقیقی کتب ہیں، جدید مسائل میں آپ کی رائے کو عالمِ اسلام میں انتہائی مستند سمجھا جاتا ہے اور فقہی مجالس اور محاضرات میں آپ کی رائے کا نہ صرف پاک وہند میں بلکہ دُنیائے عرب میں بھی خصوصی وزن محسوس کیا جاتا ہے۔

معاشیات کے میدان میں آپ ان چند گنی چنی شخصیات میں سرِفہرست ہیں جن کی بدولت

آج الحمدللہ دُنیا میں اسلامی بینکنگ کا ایک بلاک وجود میں آرہا ہے، جس میں بفضل اللہ مسلسل ترقی اور پیش رفت ہورہی ہے۔

فقہی میدان میں آپ کی خدمات کا ایک بہت بڑا حصہ ہزاروں کی تعداد میں آپ کے لکھے ہوئے ان ''فتاویٰ'' کا ہے، جو آپ نے پچھلے تقریباً پینتالیس سالوں میں تحریر فرمائے ہیں، مگر حضرتِ والا کی یہ عظیم الشان علمی، تحقیقی اور فقہی خدمت، شائع نہ ہونے کی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہی اور اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکی۔

اگرچہ آپ نے اپنی اعلیٰ علمی صلاحیت کی بناء پر زمانۂ طالب علمی میں ہی فتاویٰ لکھنے شروع کردیئے تھے، (جس میں ''رمضان میں نفل کی جماعت'' سے متعلق ایک مفصل تحقیقی فتویٰ وہ ہے جو آپ نے صرف سولہ سال کی عمر میں لکھا، جبکہ آپ ابھی ضابطہ کے فارغ التحصیل بھی نہیں ہوئے تھے بلکہ موقوف علیہ میں پڑھتے تھے) مگر درجۂ تخصّص اور اس سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے والد ماجدؒ کی زیرِ نگرانی باقاعدہ فتویٰ لکھنا شروع کیا اور اس وقت سے اب تک بحمدہٖ تعالیٰ یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ اس پورے عرصے کے تقریباً تمام فتاویٰ دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے نقلِ فتاویٰ کے قدیم و جدید رجسٹروں میں محفوظ ہیں، مگر چونکہ بالکل ابتداء میں دارالافتاء میں فتاویٰ محفوظ رکھنے کا کوئی باقاعدہ اور منظّم انتظام نہ تھا، اس لئے دارالافتاء کے بعض دیگر فتاویٰ کی طرح حضرتِ والا دامت برکاتہم کے شروع کے کچھ فتاویٰ بھی محفوظ نہ رہے۔

بہرحال اس کے باوجود حضرت کے ہزاروں خودنوشتہ فتاویٰ، نقلِ فتاویٰ کے مختلف رجسٹروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

بندہ کے دِل میں حضرت کے فتاویٰ کو جمع وترتیب دینے کا خیال اس طرح پیدا ہوا کہ چند اہم عنوانات پر مشتمل ایسے فتاویٰ جو مفصل اور مدلل ہیں اور ان کی نشاندہی دارالافتاء کے نئے نظام کے مطابق تبویب کے رجسٹروں میں کی گئی ہے، ایک مرتبہ احقر نے ان چند فتاویٰ کو جمع کرکے حضرت کی خدمت میں پیش کیا کہ اگر انہیں شائع کردیا جائے تو مناسب رہے گا، حضرتِ والا نے ان فتاویٰ کو دیکھ کر فرمایا کہ ''اگر سب فتاویٰ جمع ہوجاتے تو اچھا تھا۔'' احقر نے اسی وقت حضرت کے سامنے دِل میں یہ عزم کرلیا کہ ان شاء اللہ بندہ یہ خدمت ضرور سرانجام دے گا۔ چنانچہ آج سے تقریباً چار سال قبل اللہ تعالیٰ کا نام لے کر یہ کام شروع کردیا۔

جب رجسٹروں سے یہ فتاویٰ جمع کرنا شروع کئے تو کئی مشکلات درپیش ہوئیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ دِلچسپ بات یہ ہوئی کہ ان فتاویٰ کو جمع کرنے کا داعیہ بھی مضبوط ہوتا گیا، ابتدائی طور پر

مشکلات تو یہ پیش آئیں کہ پینتیس، چالیس سال پہلے بعض رجسٹر اب اتنے بوسیدہ ہو چکے تھے کہ ان کے ایک ایک صفحے کو پلٹنا، دیکھنا اور پھر ان سے فوٹو لینا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ جلدوں کو دیمک لگ چکی تھی، بیچ سے کئی کئی صفحات پھٹے ہوئے اور بعض بالکل غائب تھے، بچا کھچا جو مواد زمانے کی دست بُرد سے محفوظ رہا وہ انتہائی بوسیدہ ہو چکا تھا۔ ایسے خستہ رجسٹر بندہ خود فوٹو اسٹیٹ والے کے پاس لے جاتا اور گھنٹوں دُکان پر کھڑے ہو کر انتہائی احتیاط سے ایک ایک صفحے کو پلٹ کر فوٹو اسٹیٹ کرواتا۔

مگر اس مشکل کے ساتھ ساتھ جو حیرت انگیز بات سامنے آئی وہ یہ کہ انہی خستہ اور بوسیدہ رجسٹروں میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے ایسے مفصل فتاویٰ موجود تھے جو اپنے موضوع پر جامع ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی محقق اور مدلل ہیں۔ اور چند ایسے موضوعات پر بھی حضرت کے تحقیقی فتاویٰ سامنے آئے جن پر دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے کئی ساتھیوں کو فتاویٰ لکھتے وقت تحقیق کی ضرورت پیش آئی اور وہ ساتھی ہفتوں بلکہ مہینوں اس سلسلے میں پریشان رہے، جبکہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس ذخیرے میں ان موضوعات پر پہلے سے تیار شدہ محقق فتاویٰ موجود تھے، مگر پردۂ خفاء میں ہونے کی وجہ سے ان سے استفادہ ممکن نہ تھا۔

جب اس طرح کے کئی فتاویٰ وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے، تو دِل میں یہ داعیہ شدید تر ہوتا گیا کہ یہ اہم فقہی ذخیرہ فوری طور پر منظرِ عام پر آنا چاہئے، لہٰذا حتی المقدور جلد ہی سن ۱۳۸۲ھ سے اب تک کے فتاویٰ جمع کئے اور صرف وہی فتاویٰ جمع کئے جو حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اپنے لکھے ہوئے ہیں، ورنہ وہ فتاویٰ جن پر حضرت کے تصدیقی دستخط ہیں وہ اس مجموعے سے کئی گنا زیادہ ہیں۔

حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کی اقسام

دراصل حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کو درج ذیل چار قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میں سے پہلی تین قسم کے فتاویٰ اس مجموعے میں شامل کئے گئے ہیں:

۱:- وہ فتاویٰ جو دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے باقاعدہ جاری کئے گئے اور دارالافتاء کے نقلِ فتاویٰ کے رجسٹروں میں ان فتاویٰ کا اندراج ہے۔

۲:- سن ۱۳۸۷ھ و ۱۳۸۸ھ کے زمانے میں ''البلاغ'' میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کا ایک دِلچسپ علمی سلسلہ ''آپ کے سوال'' کے عنوان سے چلا تھا، جس میں بہت سے لوگ ''البلاغ'' کی معرفت آپ کے پاس سوالات بھیجتے تھے اور حضرت ''البلاغ'' میں ان کے جوابات دیا کرتے تھے، ان میں بعض انتہائی مفصل اور محقق جوابات بھی ہیں۔ ''البلاغ'' سے وہ تمام فتاویٰ بھی اس

مجموعے میں شامل کئے گئے ہیں، اور چونکہ ان فتاویٰ کا دارالافتاء کے رجسٹروں میں باقاعدہ اندراج نہیں ہوا تھا اس لئے ان فتاویٰ کا کوئی نمبر بھی موجود نہیں تھا، جو لکھا جاتا۔ تاہم حاشیہ میں ایسے فتاویٰ کی نشاندہی کردی گئی ہے۔

۳:- حسنِ اتفاق سے ان فتاویٰ کی جمع وترتیب کے دوران حضرتِ والا دامت برکاتہم کو ایک دن اپنے گھر سے اپنے درجۂ تخصص کے زمانے کی ''تمرینِ افتاء'' کی کاپی مل گئی جو حضرت نے احقر کو عنایت فرمائی۔ اس کاپی میں حضرت کے تحریر فرمودہ تمام فتاویٰ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تصحیح وتصدیق شدہ ہیں۔ ان میں بعض مفصل اور مدلل فتاویٰ بھی ہیں۔ مثلاً اس پہلی جلد میں ''تطہیرِ اشیاء کے طریقوں کی تعداد اور تفصیل'' کے عنوان پر جو فتویٰ ہے وہ اسی کاپی سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح دُوسری جلد میں ''حجِ صرورہ'' سے متعلق ایک تفصیلی فتویٰ آنے والا ہے۔

اس کاپی کے تمام فتاویٰ بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

۴:- حضرت نے اپنے کئی متعلقین کو ان کے خطوط کے جوابات میں بھی کئی فقہی سوالات کے جوابات عنایت فرمائے ہیں مگر حضرت کے ذاتی نوعیت کے خطوط کا چونکہ دارالافتاء میں اندراج نہیں ہوتا لہٰذا ایسے فتاویٰ اس مجموعہ میں شامل نہیں ہوسکے۔

مذکورہ چار قسموں میں سے ظاہر ہے کہ کثیر تعداد پہلی قسم کے فتاویٰ کی ہے جو دارالافتاء سے جاری کئے گئے، ان سب کو اس مجموعے میں شامل کرنے کے بعد بھی یہ سمجھنا دُرست نہ ہوگا کہ یہ حضرتِ والا کے تمام فتاویٰ ہیں، کیونکہ رجسٹروں سے ان فتاویٰ کو جمع کرنے کے دوران ایک افسوس ناک بات یہ سامنے آئی کہ سنہ ۱۳۸۴ھ و ۱۳۸۵ھ کا زمانہ جو حضرت کے فتاویٰ لکھنے کے عروج کا زمانہ تھا اور اس وقت دارالافتاء دارالعلوم میں فتاویٰ کے نقل کا انتظام بھی موجود تھا مگر اس کے باوجود بعض ناقلینِ فتاویٰ نے کئی ضخیم رجسٹروں میں فتاویٰ نقل کرتے وقت فتویٰ کے آخر میں مجیب کا نام ہی نہیں لکھا، عجیب بات یہ ہے کہ ہر سوال کے بعد سائل اور مستفتی کا نام تو بالالتزام لکھا ہے مگر فتویٰ کے آخر میں مجیب کا نام چھوڑ دیا۔

ایسے رجسٹر جب سامنے آئے تو بہت افسوس ہوا کہ ان رجسٹروں میں کئی طویل اور مفصل ومحقق فتاویٰ موجود ہیں، مگر مجیب کی تعیین وتمییز نہ ہونے کی وجہ سے اب یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ اس میں کون سا فتویٰ کس شخصیت کا ہے؟ ادھر ان فتاویٰ کے مجیب کی تعیین وتمییز کا اب کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے لئے اپنی بے پناہ علمی مصروفیات کی بناء پر ان رجسٹروں کے ایک ایک صفحے کو جانچنا تقریباً ناممکن ہے اور فتاویٰ نقل کرنے والے حضرات میں سے بعض کا اب انتقال بھی ہوچکا ہے، وہ ہوں بھی تو اب یہ تعیین مشکل ہے کہ کون سا فتویٰ کس شخصیت کا لکھا ہوا ہے؟ ایسے فتاویٰ کی تبویب کا

کام کرنے والے متخصّصین کے مقالوں کو بھی دیکھا، ان حضرات نے بھی مجیب کی تعیین کے بغیر ان پر کام کیا ہے، لہٰذا مجبوراً ایسے رجسٹروں میں موجود حضرت کے کئی نامعلوم فتاویٰ بھی اس مجموعے میں شامل نہیں کئے جاسکے۔ اب جب کبھی دارالافتاء دارالعلوم کے تمام عمومی فتاویٰ شائع ہوئے تو شاید ان میں یہ فتاویٰ بھی شائع ہوکر سامنے آسکیں۔ لہٰذا بعض فتاویٰ، شروع میں نقل کا انتظام نہ ہونے کی بناء پر، اور بعض مذکورہ صورتِ حال کی بناء پر اس مجموعہ میں شامل نہیں ہوسکے، اس لئے یہ سمجھنا دُرست نہ ہوگا کہ یہ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے تمام فتاویٰ ہیں۔

طریقۂ کار

پہلے مرحلے میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے دستیاب تمام فتاویٰ کو جمع کیا گیا، اور دُوسرے مرحلے میں ان تمام فتاویٰ کو ان کے موضوعات کے اعتبار سے الگ الگ کرکے فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق رکھا گیا، اور اس میں جس فتویٰ میں صرف ایک سوال اور جواب ہے اسے تو متعلقہ موضوع اور باب میں رکھنا آسان تھا، مگر بہت سارے فتاویٰ ایسے ہیں کہ ان میں مستفتی نے الگ الگ موضوع سے متعلق کئی سوالات کئے ہیں اور ان میں ہر سوال، جواب کا باب اور موضوع الگ ہے، چونکہ ایک ہی کاغذ پر ہونے کی وجہ سے انہیں الگ الگ رکھنا ممکن نہ تھا، لہٰذا ایسے کئی فتاویٰ کو ہاتھ سے الگ لکھا گیا۔

جمع وترتیب کے بعد تیسرے مرحلے میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان فتاویٰ میں موجود حوالوں کی تخریج کی جائے، کیونکہ سن ۱۳۸۷ھ وغیرہ کے زمانے میں فتاویٰ شامیہ کا کوئی استنبولی نسخہ رائج تھا، جبکہ آج کل ''ایچ ایم سعید'' کا نسخہ متداول ہے، لہٰذا اسی نسخے کے مطابق شامی کی عبارات کی تخریج کی گئی ہے، چنانچہ بعض جگہوں پر ''ایچ ایم سعید'' کا پورا لفظ اور کہیں صرف ''سعید'' کا لفظ لکھا گیا ہے، جس سے یہی مراد ہے۔ اسی طرح تفسیر، حدیث اور فقہ کی دیگر کتب کا بھی یہی معاملہ ہے، لہٰذا ان کتب کے ان نسخوں کے مطابق تخریج کی گئی ہے جو نسخے ہمارے دیار میں رائج اور متداول ہیں۔ چنانچہ ہر عبارت کے شروع یا آخر میں کتاب کے نام کے ساتھ ساتھ مطبع وغیرہ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی علمی فائدے کے پیشِ نظر اس کی تائید میں مزید حوالہ جات بھی لگائے گئے ہیں، کہیں پر عبارات اور کہیں صرف دیگر فقہی کتب کے صفحہ نمبر وغیرہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

چوتھے مرحلے میں یہ کام کیا گیا کہ جہاں فتویٰ میں کوئی حوالہ موجود نہیں تھا، وہاں پر حاشیے میں اس فتویٰ کے حوالے لکھ دیئے گئے ہیں، اور تخریج وتعلیق اور اضافۂ حوالہ جات کا یہ سارا کام متعلقہ فتویٰ کے نیچے حاشیے میں کیا گیا ہے، اور ترتیب یہ رکھی ہے کہ سب سے پہلے سوال، پھر جواب اور جواب میں

جہاں جہاں ضرورت تھی وہاں حاشیہ نمبر لگایا گیا ہے، پھر اسی فتویٰ کے نیچے لکیر لگا کر حاشیہ میں حوالے اور عبارات درج کی گئی ہیں۔

اور ہر فتویٰ کے آخر میں تاریخ بھی درج کردی گئی ہے، اور جس فتویٰ پر اکابر میں سے کسی کے دستخط ہیں وہاں ان حضرات کے نام ذکر کردیئے گئے ہیں، اور مصدق کے دستخط بھی چونکہ عموماً اسی تاریخ یا اس سے ایک آدھ دن بعد میں ہوا کرتے ہیں، لہٰذا مصدق کے نام کے نیچے تاریخ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے صرف حضرتِ والا دامت برکاتہم کے نام کے نیچے تاریخ درج کی گئی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب فتاویٰ پُرانے رجسٹروں سے فوٹو اسٹیٹ کرائے گئے تھے اور فوٹو اسٹیٹ کرتے وقت اصل توجہ فتویٰ پر رہی اور تاریخ بعض اوقات صفحہ کے ایک طرف دائیں یا بائیں حصے میں درج ہوتی تھی، اس لئے بعض فتاویٰ کی فوٹو اسٹیٹ میں تاریخ آنے سے رہ گئی، لہٰذا ایسے فتاویٰ میں اندازے سے تاریخ لکھی گئی ہے، لیکن ایسے فتاویٰ کی تعداد بہت کم ہے۔

ہر فتویٰ کے آخر میں تاریخ کے نیچے ''فتویٰ نمبر'' بھی لکھا گیا ہے، اس فتویٰ نمبر سے دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے نقلِ فتاویٰ کے رجسٹروں کا نمبر مراد ہے، اور یہ نمبر لکھنے کی غرض یہ ہے کہ اگر کبھی دارالافتاء کا کوئی ساتھی اصل کی طرف مراجعت کرنا چاہے تو بوقتِ ضرورت یہ مراجعت ممکن ہو۔ تاہم بعض فتاویٰ کی فوٹو اسٹیٹ میں ''فتویٰ نمبر'' نہ آسکنے کی بناء پر ایسے فتاویٰ کے آخر میں فتویٰ کا نمبر نہیں دیا جاسکا، مگر ایسے فتاویٰ کی تعداد بھی بہت کم ہے۔

خصوصیات

❊ چونکہ حضرتِ والا اپنے مزاج و مذاق کی بناء پر حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہم اللہ کی علمی روایات کے امین ہیں، لہٰذا ان حضرات کی طرح حضرت کے فتاویٰ کی بھی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں الحمدللہ تحقیق اور اعتدال کا وصف نمایاں ہے۔

❊ اس مجموعے میں جدید مسائل پر بھی کئی فتاویٰ ہیں، پہلی جلد میں نسبتاً کم ہیں، جبکہ بعد کی جلدوں میں خصوصاً ''فقہ المعاملات'' جس پر حضرت کو خصوصی دسترس حاصل ہے، سے متعلق کئی جدید فتاویٰ ہیں۔

❊ ویسے تو عوام وخواص کے نزدیک حضرتِ والا کی رائے کو انتہائی محقق و مستند سمجھا جاتا ہے اور کسی فتویٰ کے مستند ہونے کے لئے حضرت کی تصدیق کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے، مگر ان فتاویٰ کی ایک

زائد خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں سے کئی فتاویٰ پر مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا سبحان محمود صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے تصدیقی دستخط موجود ہیں، جس سے ان فتاویٰ کے درجۂ استناد میں مزید تقویت پیدا ہوجاتی ہے۔

❊ فتویٰ میں حضرتِ والا دامت برکاتہم کے تحریر فرمودہ حوالہ جات اور اس کے ساتھ ساتھ حواشی میں ذکر کردہ عبارات اور حوالوں کی بناء پر عوام کے علاوہ اہلِ علم، خصوصاً اہلِ فتویٰ کے لئے بھی اس ذخیرے سے بھرپور علمی وتحقیقی استفادہ آسان ہوگیا ہے۔

احقر کی سوچ اور اندازے کے مطابق یہ کام بہت پہلے منظرِ عام پر آجانا چاہئے تھا، اس کی ترتیب، تخریج اور اضافۂ حوالہ جات کا کام بھی بہت پہلے ہوچکا ہوتا، مگر کمپوزنگ میں اغلاط کی کثرت، اور بار بار کی تصحیح وغیرہ کی بناء پر یہ کام مؤخر ہوتا چلا گیا، بالآخر کافی عرصہ خود کمپوزر کے پاس بیٹھ کر تصحیح کرواکر پہلی جلد کا کام مکمل کیا، اس طرح یہ کام احقر کے اندازے سے تقریباً دو سال تأخیر سے منظرِ عام پر آرہا ہے۔

اس کے باوجود اس میں کہیں نفسِ مضمون کی، کہیں حوالے اور عبارت کی، اور کہیں کمپوزنگ کی غلطیوں کا امکان موجود ہے، اس طرح کی تمام تر غلطیوں کی ذمہ داری احقر پر ہے، حضرتِ والا دامت برکاتہم کی ذات اس سے بَری ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ ایسی غلطیوں سے احقر کو مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشنوں میں ان کی تصحیح کی جاسکے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کو ان کے مقاصدِ حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور انہیں بعافیت عمرِ دراز عطا فرماکر ان کا سایہ تادیر ہم سب پر قائم رکھیں، آمین۔

آخر میں قارئین سے احقر، اس کے والدین اور اساتذہ کے لئے بھی دُعاؤں کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عافیتِ دارین عطا فرمائیں۔

اور اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنے دربار میں شرفِ قبول سے نواز کر ہمارے لئے اسے ذخیرۂ آخرت بنائیں، آمین۔ انه علی ما یشاء قدیر وبالإجابة جدیر.

احقر

محمد زبیر حق نواز

اُستاذ ورفیق دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی

۱۴۲۵/۱۰/۲۷ھ

کتاب الإیمان والعقائد

(ایمان وعقائد کا بیان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿فصل فی المتفرّقات﴾

(ایمان وعقائد سے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کے نقش کو چومنے، اس جیسے نعل پہننے اور اس کے احترام کا حکم

سوال:- مکرّم ومحترم جناب مفتی صاحب، دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، اما بعد!

۱:- جو چیز سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر سے متصل ہوگئی، اس کی برکات کا انکار تو کوئی جاہل یا ملحد ہی کرے گا، لیکن اس شے کی مثل ہاتھ سے تیار کرلی جائے تو کیا اس میں بھی وہ برکت آجاتی ہے؟ بالفاظ دیگر متبرک شے کی تصویر بھی متبرک ہوتی ہے؟

۲:- آج کل سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کا نقشہ بہت عام ہوگیا، لوگ اس کو چومتے ہیں، برکت کے لئے سر پر رکھتے ہیں، اس کی کیا حیثیت ہے؟ اس نقشے کی یہ حیثیت مُسلَّم کہ اس سے آپ صلی علیہ وسلم کے نعل مبارک کی صورت معلوم ہوگئی، روایاتِ حدیث میں مذکور نعل کا سمجھنا آسان ہوگیا۔

۳:- کیا اس نقشے کے مطابق نعل بنواکر استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ادا ہمارے لئے نمونہ ہے، آپؐ کی پگڑی جیسی پگڑی، قمیص جیسی قمیص بنوانا، پہننا سب باعثِ سعادت اور محبت کا تقاضا ہے، کیا آپؐ کے جوتے جیسا جوتا پہننا بھی محبت کا تقاضا ہے یا نہیں؟

۴:- نیز یہ بھی قابلِ دریافت ہے کہ یہ نقشہ اس وقت عام مروّج تھا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا؟ آپؐ کا نعل مبارک صحابہ رضوان اللہ علیہم کے زمانے میں موجود تھا، دیگر مستعمل کپڑوں، برتنوں کی طرح اس کو سنبھال کر رکھا گیا۔ جن حضرات کے پاس یہ موجود نہیں تھا، کیا کسی روایت سے ثابت ہے کہ وہ لوگ کاغذ پر اس کی صورت بنا کر برکت حاصل کرتے ہوں؟ اگر ثابت نہ ہو تو آج اس کو باعثِ ثواب سمجھنا، سفر میں ساتھ رکھنا، برکت کے لئے دُکانوں، مکانوں پر لگانا کیا بدعت نہیں ہوگا؟

۵:- روضۂ اقدس کی صحیح تصویر یعنی فوٹو، بیت اللہ کی صحیح تصویر بھی باعثِ برکت ہے یا نہیں؟ اب لوگ ان کپڑوں اور قالینوں پر نماز پڑھنا بے ادبی سمجھنے لگ گئے ہیں جن پر روضۂ اقدس کی تصویر ہو، اس کی کیا حیثیت ہے؟

۶:- اب نقشِ خاتم بھی شائع ہوگیا ہے، لوگ اس کے تصوّر کو انوار و برکات کا باعث سمجھنے لگے ہیں، اس کی کیا شرعی حیثیت ہے؟ مجھے خطرہ ہے کہ غالی لوگوں کی طرف سے جلد ہی آپؐ کی اُونٹنی اور بغل اور حمار کی مثل شائع ہوکر ان کا بھی احترام نہ شروع ہوجائے۔ میرے غیر مرتب الفاظ کو اپنے مرتب الفاظ میں منتقل کر کے سوال و جواب اپنے ماہنامہ ''البلاغ'' میں شائع فرمادیں تو میرے جیسے کئی متحیر لوگوں کی رہنمائی ہوجائے گی۔

والسلام

عبدالمجید غفرلہٗ

باب العلوم، کبروڑ پکا

بخدمتِ اقدس جناب مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ کا مفصل استفتاء نعل مبارک کے نقشے کے بارے میں کافی عرصہ پہلے مل گیا تھا، وہ برابر زیرِ غور رہا، آخر میں مشورے کے لئے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی کی خدمتِ گرامی میں پیش کیا، ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضرتِ والا خود جواب تحریر فرمانے کے لئے تیار ہوگئے، چنانچہ یہ جواب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی کا لکھا ہوا ہے۔

والسلام

بندہ عبدالرؤف سکھروی

۱۴۱۶/۷/۲۰ھ

مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا عبدالمجید صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب کے نام آیا تھا، انہوں نے احقر کو مشورے کے لئے بھیجا، احقر نے جو کچھ سمجھ میں آیا، لکھ دیا، اور آنجناب کی خدمت میں اس خیال سے ارسال کر رہا ہوں کہ اگر کوئی غلطی ہوگی تو آنجناب اس پر متنبہ فرمائیں گے۔

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی

۱۴۱۶/۶/۲۰ھ

جواب ۱، ۲:- شاید جناب کے علم میں ہوگا کہ حکیم الاُمت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''زاد السعید'' میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کا نقشہ شائع فرمایا تھا اور اس کو سر پر رکھ کر دُعا کرنے کی بھی فی الجملہ ترغیب دی تھی، اور اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا تھا، بعد میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر حضرتؒ سے خط و کتابت کی جو کفایت المفتی[1] جلد:۲ صفحہ:۶۱ تا ۶۹ اور امداد الفتاویٰ[2] جلد:۴ صفحہ:۳۲۸ تا ۳۳۲ میں مکمل شائع ہوچکی ہے۔ اس خط و کتابت کے مطالعے سے مسئلے کی شرعی حیثیت بڑی حد تک واضح ہوجاتی ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آثارِ متبرکہ کا تعلق ہے جو آپؐ کے زیرِ استعمال رہے ہوں یا آپؐ کے جسمِ اطہر سے مس ہوئے ہوں، ان سے تبرک یا انہیں بوسہ دینا یا سر پر رکھنا متعدّد صحابہ کرامؓ اور علمائے متقدمین سے ثابت ہے، اور جیسا کہ خود آنجناب نے ذکر فرمایا ہے وہ محلِ اشکال نہیں۔ البتہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آثارِ متبرکہ کی کوئی تصویر بنائی جائے یا اس کا کوئی نقشہ بنایا جائے تو وہ اگرچہ اصل آثار کے مساوی نہ ہوگا، لیکن چونکہ اصل کے ساتھ مشابہت اور مشاکلت کی وجہ سے اس کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فی الجملہ ایک نسبت حاصل ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اپنے شوقِ طبعی اور محبت کے داعیہ سے اس کا بھی ادب کرے اور اسی محبت کے داعیہ سے اسے بوسہ دے یا آنکھوں سے لگائے تو فی نفسہٖ اس کی ممانعت پر بھی کوئی دلیل نہیں، لہٰذا فی نفسہٖ ایسا کرنا مباح ہوگا، بلکہ جس محبت کے داعیہ سے ایسا کیا جارہا ہے وہ محبت ان شاء اللہ موجبِ اجر بھی ہوگی بشرطیکہ اس خاص عمل کو بذاتہٖ عبادت نہ سمجھا جائے، کیونکہ عبادت کے لئے ثبوتِ شرعی درکار ہے۔ البتہ جواز کے لئے کسی مستقل دلیل کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے لئے ممانعت کی دلیل نہ ہونا بھی کافی ہے۔ اور اس تفصیل میں دونوں صورتیں شامل ہیں، خواہ نقش اصل کے بالکلیہ مطابق ہو یا بالکلیہ مطابق نہ ہو، کیونکہ مشابہت کی وجہ سے فی الجملہ نسبت دونوں کو حاصل ہے۔

یہ تو مسئلے کی اصل حقیقت تھی، لیکن چونکہ ان نازک حدود کو سمجھنا اور ان کی نزاکت کو ملحوظ رکھنا عوام کے لئے مشکل معلوم ہوتا ہے، اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس میں حدود سے تجاوز نہ ہوجائے، مثلاً یہ کہ ان اعمال کو بذاتہٖ عبادت سمجھا جانے لگے یا ادب و تعظیم میں حدود سے تجاوز ہوکر مشرکانہ افعال یا اعتقادات اس کے ساتھ نہ مل جائیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان نقشوں کی عمومی تشہیر اور ان کی طرف ترغیب وغیرہ سے اجتناب ہی کیا جائے، اس لئے حضرت حکیم الاُمت قدس اللہ سرہٗ نے اپنے

---

(۱) کفایت المفتی ج:۲ ص:۹۱ تا ۹۹ (طبع جدید دار الاشاعت)

(۲) امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۷۴ تا ۳۷۹ و ۵۳۳ تا ۵۳۶ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)

رسالہ "نیل الشفاء بنعل المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم" سے بعد میں رُجوع فرمالیا تھا۔

خلاصہ یہ کہ تشہیر کی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہئے، لیکن اگر کوئی شخص حدود میں رہ کر مذکورہ افعال کرتا ہے تو اس پر نکیر بھی دُرست نہیں۔

۳:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعل شریف جیسی نعل بنواکر پہننے کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں فقہائے کرامؒ کی کوئی تصریح تو نہیں دیکھی، البتہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ معاملہ ذوق کا ہے، اور مذاق مختلف ہوسکتے ہیں، ایک مذاق یہ ہے کہ جس چیز کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے آثارِ متبرکہ میں سے کسی کے ساتھ مشابہت حاصل ہو وہ تو سر اور آنکھوں پر رکھنے کی چیز ہے، نہ یہ کہ اس کو پاؤں میں استعمال کیا جائے، لہٰذا اگر کوئی شخص اس مذاق کے تحت اسے پہننے سے احتراز کرے تو یہ اس کے مذاقِ تعظیم ومحبت کا تقاضا ہے جس پر وہ قابلِ ملامت نہیں، جیسا کہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کے بارے میں منقول ہے کہ سبز رنگ کا جوتا بھی اس لئے نہیں پہنتے تھے کہ گنبدِ خضراء کا رنگ سبز ہے۔ اور دُوسرا مذاق یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل اور ہر ادا میں حتی الامکان حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کی نقل اُتارنے کی کوشش کرے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس جیسا لباس پہنے، اور اس نقطۂ نظر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک جیسا نعل بنواکر پہنے اور مقصود اِتباع ہو تو بظاہر اس پر بھی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ یہ بھی محبت کا تقاضا ہے۔ چونکہ اس کا مقصود اِتباع ہے، اس لئے بظاہر اس میں اہانت کا بھی کوئی پہلو نہیں۔ چنانچہ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہ کہیں منقول نہیں کہ انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک جیسے جوتے پہننے سے احتراز کا اہتمام کیا ہو، بالخصوص جبکہ اس دور میں جوتوں کی اوضاع میں اتنا تنوّع بھی نہیں تھا، لہٰذا جیسا عرض کیا گیا یہ ذوق کی بات ہے اور کوئی ذوق قابلِ ملامت نہیں۔

۴:- یہ بات تلاش کے باوجود نہیں مل سکی کہ آیا یہ نقشہ عام مروّج تھا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔

۵، ۶:- روضۂ اقدس یا بیت اللہ کی صحیح تصویر کا حکم بھی قریب، قریب ایسا ہی ہے کہ ان کو اصل کے ساتھ تشابہ کی ایک نسبتِ قویہ حاصل ہے، نیز انہیں دیکھ کر اس کا اِستحضار قوی ہوتا ہے، لہٰذا ان کا احترام کرنا چاہئے، یعنی ان کو کسی موضعِ اہانت میں استعمال کرنا دُرست نہیں، جہاں تک ان کے باعثِ برکت ہونے کا تعلق ہے، یہ بات واضح ہے کہ کسی جگہ ان کے لگانے سے ان شعائر کا بار بار اِستحضار ہوتا ہے، اور یہ اِستحضار یقیناً باعثِ برکت ہے۔

جانمازوں پر فی نفسہ کسی بھی قسم کے نقش پسندیدہ نہیں، لیکن اگر کسی جائے نماز پر حرمین شریفین

میں سے کسی کی تصویر اس طرح بنی ہوئی ہے کہ وہ پاؤں کے نیچے نہیں آتی تو اس میں بھی اہانت کا کوئی پہلو نہیں، البتہ موضعِ سجود میں بیت اللہ کے سوا کسی اور چیز کی تصویر بالخصوص روضۂ اقدس کی شبیہ میں چونکہ ایہام خلافِ مقصود کا ہوسکتا ہے اس لئے اس سے احتراز مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۷:- نقشِ خاتم کے بارے میں بھی وہی تفصیل ہے جو نقشِ نعلین کے بارے میں عرض کی گئی، البتہ ظاہر ہے کہ ان غیر ذی رُوح اشیاء کے نقوش پر ذی رُوح کے نقوش کو ہرگز قیاس نہیں کیا جاسکتا، کہ ذی رُوح کا نقش یا تصویر بہرصورت ممنوع ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۶/۶/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۰۳/۱۰۰)

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴

۱۴۱۶/۷/۲۱ھ

کفار کے نابالغ بچوں کا کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک بچہ کافر کے گھر پیدا ہوا اور بچپن ہی میں مرگیا، کیا یہ بچہ جنت میں جائے گا یا نہیں؟

جواب:- کافروں کے گھر پیدا ہونے والا بچہ جس کے ماں باپ دونوں کافر ہوں، دُنیوی اَحکام کے لحاظ سے کافروں ہی کے حکم میں ہوتا ہے، لیکن آخرت کے اَحکام کے لحاظ سے اس کا کیا ہوگا؟ جنت میں جائے گا یا جہنم میں؟ اس کے بارے میں علماء کا اختلاف رہا ہے،[1] صحیح علم اللہ ہی کو ہے، اور اس مسئلے پر دین کا کوئی عملی مسئلہ موقوف نہیں، لہٰذا اس کی کھود کرید میں پڑنا ٹھیک نہیں۔

"من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه"۔[2]

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۲۴/۲۷ ہ)

سوشلزم کی حمایت کرنے والے کا حکم

سوال:- سوشلزم کی حمایت کرنے والے (سوشلزم معاشرہ جو کہ اسلام کے خلاف ہے) کا شریعت کی رُو سے کیا مقام ہے؟

۲:- نظامِ مصطفیٰ پر قربان ہونے والے اور مخالفینِ نظامِ مصطفیٰ کا کیا مقام ہے؟

جواب ۱:- سوشلزم کی حمایت اگر اس بناء پر کی جائے کہ سوشلزم کا معاشی پروگرام (معاذ اللہ) اسلام کی معاشی تعلیمات سے افضل ہے، تو یہ صریح کفر ہے، اور اگر اس لحاظ سے کی جائے کہ اسلام کے

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ شامیة "مطلب فی أطفال المشرکین" ج:۲ ص:۱۹۲ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) جامع الترمذی ابواب الزهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ج:۲ ص:۵۵ (طبع فاروقی کتب خانه)

اَحکام صرف عبادات وغیرہ سے متعلق ہیں، اور معیشت میں اسلام کے اَحکام واجب التعمیل نہیں تو یہ بھی صریح کفر ہے۔ اور اگر اس غلط فہمی کی بناء پر کی جائے کہ اسلام کے معاشی اَحکام سوشلزم کے معاشی اَحکام کے (معاذ اللہ) موافق ہیں تو شدید گمراہی ہے، یہ تمام عقائد بہرصورت باطل اور واجب الترک ہیں، اور ان سے توبہ واجب ہے۔

۲:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور اَحکام پر قربان ہونا موجبِ صد اَجر وفضیلت اور بہت بڑی سعادت ہے، اور اس کی مخالفت کفر اور بدترین شقاوت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۷/۶/۱۳۹۷ھ

اسمائے حسنیٰ میں سے کون سے اسماء بندوں کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں؟

سوال:- آج کل عموماً باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ ''عبد'' کے اضافے کے ساتھ نام رکھے جاتے ہیں، مگر عموماً غفلت کی وجہ سے مسمّٰی کو بدون ''عبد'' کے پکارا جاتا ہے، حالانکہ بعض اسماء، باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً عبدالرزّاق وغیرہ، اندریں احوال اپنی جستجو کے مطابق فیض الباری ج:۴ ص:۴۲۳ سے اسمائے حسنیٰ درج کر رہا ہوں، تحقیق فرمائیں کہ کون سے اسماء، باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، کہ ان کو بدون ''عبد'' کے مخلوق کے لئے استعمال کرنا گناہِ کبیرہ ہے، اگر ان کے علاوہ اور کوئی اسماء ہوں تو وہ بھی درج فرمائیں مع تحقیق کے، نیز اسماء کے شروع یا آخر میں ''محمد'' یا ''احمد'' یا ''اللہ'' کا اضافہ کیسا ہے؟ مثلاً محمد متکبر، خالق احمد، محمداللہ، احمد رزّاق۔

اللہ، الرحمٰن، الرحیم، الملک، القدّوس، السّلام، المؤمن، المهیمن، العزیز، الجبّار، المتکبّر، الخالق، البارئ، المصوّر، الغفّار، القهّار، التوّاب، الوهّاب، الخلّاق، الرزّاق، الفتّاح، الحلیم، العلیم، العظیم، الواسع، الحکیم، الحیّ، القیّوم، السمیع، البصیر، اللّطیف، الخبیر، العلیّ، الکبیر، المحیط، القدیر، المولیٰ، النصیر، الکریم، الرقیب، القریب، المجیب، الحفیظ، المقیت، الودود، المجید، الوارث، الشهید، الولیّ، الحمید، الحقّ، المبین، الغنیّ، المالک، القویّ، المتین، الشدید، القادر، المقتدر، القاهر، الکافی، الشاکر، المستعان، الفاطر، البدیع، الفاخر، الأوّل، الآخر، الظاهر، الباطن، الکفیل، الغالب، الحکم، العالم، الرفیع، الحافظ، المنتقم، القائم، المحیی، الجامع، المالیک، المتعالی، النور، الهادی،

الغفور، الشكور، العفوّ، الرءوف، الاكرام، الأعلىٰ، البر، الخفيّ، الرَّبّ، الاله، الأحد، الصّمد، الذى لم يلد، ولم يولد، ولم يكن له كفوا أحد.

جواب:- کسی کتاب میں یہ تفصیل تو نظر سے نہیں گزری کہ کون کون سے اسمائے حسنیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہیں، اور کون سے اسماء کا اطلاق دُوسروں پر ہوسکتا ہے، لیکن مندرجہ ذیل عبارتوں سے اس کا ایک اُصول معلوم ہوتا ہے:-

تفسیر رُوح المعانی میں علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں: "وذكر غير واحد من العلماء أن هذه الأسماء .... تنقسم قسمة أخرى الى ما لا يجوز اطلاقه على غيره سبحانه وتعالىٰ كالله والرحمٰن، وما يجوز كالرحيم، والكريم." (رُوح المعانی ج:۹ ص:۱۲۳ طبع مکتبہ رشیدیہ لاہور)

اور درمختار میں ہے: "وجاز التسمية بعليّ ورشيد من الأسماء المشتركة، ويراد فى حقنا غير ما يراد فى حق الله تعالىٰ. وفى رد المحتار: الذى فى التاترخانية عن السراجية التسمية باسم يوجد فى كتاب الله تعالىٰ كالعليّ والكبير والرشيد والبديع جائزة .... الخ."[1] (شامی ج:۵ ص:۲۶۸)۔

وفى الفتاوىٰ الهندية: التسمية باسم لم يذكره الله تعالىٰ فى عباده ولا ذكره رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا استعمله المسلمون تكلموا فيه، والأولىٰ أن لا يفعل كذا فى المحيط.[2] (فتاویٰ عالمگیریة ص: ۳۶۲ حظر و اباحت باب ۲۲)۔

اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

اسمائے حسنیٰ میں بعض نام ایسے بھی ہیں جن کو خود قرآن و حدیث میں دُوسرے لوگوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے استعمال کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں۔ تو جن ناموں کا استعمال غیراللہ کے لئے قرآن و حدیث سے ثابت ہے وہ نام تو اوروں کے لئے بھی استعمال ہوسکتے ہیں جیسے رحیم، رشید، علی، کریم، عزیز وغیرہ۔ اور اسمائے حسنیٰ میں سے وہ نام جن کا غیراللہ کے لئے استعمال کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں، ان کو غیراللہ کے لئے استعمال کرنا اِلحادِ مذکور میں داخل اور ناجائز وحرام ہے۔

(معارف القرآن ج:۴ ص:۱۳۲ سورۂ اعراف:۱۸۰)

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار (الحظر والاباحة) ج:۶ ص:۴۱۷ (طبع سعيد).

(۲) ج:۵ ص:۳۶۲ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

ان عبارتوں سے اس بارے میں یہ اُصول مستنبط ہوتے ہیں:-

نمبر۱:- وہ اسمائے حسنیٰ جو باری تعالیٰ کے اسمِ ذات ہوں یا صرف باری تعالیٰ کی صفاتِ مخصوصہ کے معنی ہی میں استعمال ہوتے ہوں، ان کا استعمال غیر اللہ کے لئے کسی حال جائز نہیں، مثلاً: اللہ، الرحمٰن، القدوس، الجبّار، المتکبّر، الخالق، البارئ، المصوّر، الرزّاق، الغفّار، القهّار، التوّاب، الوهّاب، الخلّاق، الفتّاح، القیّوم، الرّبّ، المحیط، المليک، الغفور، الأحد، الصّمد، الحق، القادر المحیی.

۲:- وہ اسمائے حسنیٰ جو باری تعالیٰ کی صفاتِ خاصہ کے علاوہ دُوسرے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہوں اور دُوسرے معنی کے لحاظ سے ان کا اطلاق غیر اللہ پر کیا جاسکتا ہو، ان میں تفصیل یہ ہے کہ اگر قرآن و حدیث، تعاملِ اُمت یا عرفِ عام میں ان اسماء سے غیر اللہ کا نام رکھنا ثابت ہو تو ایسا نام رکھنے میں مضائقہ نہیں، مثلاً: عزیز، علی، کریم، رحیم، عظیم، رشید، کبیر، بدیع، کفیل، ہادی، واسع، حکیم وغیرہ، اور جن اسمائے حسنیٰ سے نام رکھنا نہ قرآن و حدیث سے ثابت ہو اور نہ مسلمانوں میں معمول رہا ہو، غیر اللہ کو ایسے نام دینے سے پرہیز لازم ہے۔

۳:- مذکورہ دو اُصولوں سے یہ اُصول خود بخود نکل آیا کہ جن اسمائے حسنیٰ کے بارے میں یہ تحقیق نہ ہو کہ قرآن و حدیث، تعاملِ اُمت یا عرف میں وہ غیر اللہ کے لئے استعمال ہوئے ہیں یا نہیں؟ ایسے نام رکھنے سے بھی پرہیز لازم ہے، کیونکہ اسمائے حسنیٰ میں اصل یہ ہے کہ ان سے غیر اللہ کا نام رکھنا جائز نہ ہو، جواز کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔

ان اُصولوں پر تمام اسمائے حسنیٰ کے بارے میں عمل کیا جائے، تاہم یہ جواب چونکہ قواعد سے لکھا ہے اور ہر ہر نام کے بارے میں اسلام کی کوئی تصریح احقر کو نہیں ملی، اس لئے اگر اس میں دُوسرے اہلِ علم سے بھی استصواب کرلیا جائے تو بہتر ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۷/۶/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۶۴ ب)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ''یا محمد'' کے الفاظ لکھنا

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع اس مسئلے میں کہ ایک مسجد جسے اب سے تقریباً پچیّس سال قبل تعمیر کیا گیا تھا، اور وقتِ تعمیر جس میں ''یا اللہ'' اور ''یا محمد'' کے الفاظ بھی کندہ کرائے گئے تھے اور پچیّس سال سے مسلسل موجود تھے، لیکن سوءِ اتفاق سے ایک نئے امام صاحب مسجد میں تشریف لائے اور انہوں نے لفظ ''یا'' مسمار کردیا۔ اب جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا مسجد میں کندہ

کسی لفظ کو یا مسجد کے کسی حصے کو منہدم کیا جاسکتا ہے؟ کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟ اگر ''یا اللہ''، ''یا محمد'' کے الفاظ کو بعینہٖ برقرار رکھا جائے تو اس میں کوئی شرعی قباحت موجود تھی؟ براہِ کرم مذکورہ بالا استفتاء کا مستند و معتبر جواب عطا فرما کر ممنون فرمایئے، ساتھ ہی ساتھ اس بارے میں یہ بھی بتائیں کہ اس نازیبا حرکت اور گستاخی کا کفارہ کیا ادا کیا جائے؟

جواب:- حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ''یا محمد'' کے الفاظ لکھنا بے ادبی ہے، اس نام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی سوائے بعض کفار و مشرکین کے کوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پکارتا تھا، اور کفار بھی اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس بے ادبی کو گوارا نہ کرتے تھے بلکہ کنیت سے پکارتے تھے، اس کے علاوہ اس نداء میں عقیدۂ فاسدہ کا ایہام ہے، اس لئے یہ لفظ اس طرح لکھنا دُرست نہیں۔[1] اگر کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے خیال سے اس کے ساتھ لفظ ''یا'' مٹادیا تو اس کو مسجد کی بے ادبی یا گستاخی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہ تعظیمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و محبتِ رسول کا تقاضا تھا جو اس نے کیا، البتہ اس کی وجہ سے اگر مسجد میں کوئی بدزیبی پیدا ہوگئی یا مرمت کی ضرورت پڑگئی ہو تو اسی شخص کو چاہئے کہ مسجد کی مرمت کرادے، اور اگر وہ تنگ دست ہو تو دُوسرے مسلمانوں کو اس معاملے میں اس کی مدد کرنی چاہئے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۸/۹/۱۳۸۸ھ
(فتویٰ نمبر ۱۶۵۸/۳۰ د)

اگر کسی کو چھ کلمے یاد نہ ہوں تو اس کا کیا حکم ہے؟

سوال:- جب کوئی آدمی کلمۂ توحید پڑھ لے تو وہ مسلمان ہوگیا، پھر عام طور پر جو مشہور ہے اور نماز و وظائف کے چھوٹے چھوٹے رسالوں میں جو چھ کلمے لکھے ہوئے ہیں اور عام طور سے بچوں کو یاد کرائے جاتے ہیں، کیا یہ کلمے بھی اسلام کی بنیاد شمار کئے جائیں گے یا نہیں؟ اگر یہ کلمے کسی کو یاد نہ ہوں تو اس کے اسلام میں فرق ہوگا یا نہیں؟

اور پانچویں کلمے کے الفاظ میں فرق ہے، بعض رسالوں میں ''أستغفر الله ربی من کل ذنب أذنبته .... الخ''، اور بعض رسالوں میں ''أستغفر الله أنت ربی وأنا عبدک .... الخ'' ہے، دُوسری قسم کے الفاظ عام نہیں ہیں، اس کی وجہ سے دو آدمیوں میں لڑائی ہو رہی ہے، براہِ کرم اس کی وضاحت فرمادیں۔

---

(۱) ''لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا. الآية (سورة النور: ۶۳) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۴۵۵۔ (محمد زبیر حق نواز)

جواب: – اسلام کی بنیاد دراصل ان عقائد پر ہے جو ایمانِ مفصل میں بیان کئے گئے ہیں، لہٰذا ان عقائد پر ایمان رکھنا تو مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے۔[1] اسی طرح کلمۂ توحید یا کلمۂ شہادت چونکہ اپنے عقائد کا اجمالی اعلان ہے، اس لئے یہ ہر مسلمان کو یاد ہونا چاہئے، باقی جو کلمات نماز وغیرہ کی کتابوں میں لکھے ہیں، انہیں بچوں کی تعلیم کی آسانی کے لئے لکھ دیا گیا ہے، ورنہ درحقیقت ان کا وہ مقام نہیں جو کلمۂ توحید، کلمۂ شہادت یا ایمانِ مفصل کا ہے۔ اگر یہ کلمات کسی کو یاد نہ ہوں تو اس سے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا،[2] البتہ چونکہ ان کلمات کا پڑھنا بہت موجبِ اَجر وثواب ہے اور مسلمانوں کو ان کا ورد رکھنا چاہئے اس لئے بچوں کو یہ تمام کلمات سکھادینے چاہئیں، اور کلمۂ اِستغفار میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ احادیث میں اِستغفار کے مختلف صیغے وارد ہوئے ہیں، ان میں سے جو صیغہ بھی پڑھ لیا جائے مقصود حاصل ہے، کیونکہ معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے دُرود شریف کے مختلف صیغے احادیث سے ثابت ہیں، لہٰذا اس مسئلے پر لڑائی جھگڑا کرنا انتہائی غلط ہے، مسلمانوں کو اس طرح کے نزاعات سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۷/۱۱/۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۵۳/۲۷ و)

کلمۂ طیبہ کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھنا

سوال: – کیا کلمۂ طیبہ کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھنا جائز ہے یا کلمۂ طیبہ صرف ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ'' ہی ہے؟ بندہ کلمہ کے ساتھ زیادتی کی بناء پر ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھنے سے روکتا ہے، صرف اس خدشے سے کہ کلمہ میں اضافہ جائز نہیں ہے، کیا میرا یہ روکنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب: – کلمہ تو ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ'' ہی ہے، لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(۱،۲) ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصل کا مأخذ قرآنِ کریم کی بعض آیات اور احادیث ہیں، جن میں سے ایک حدیث ترمذی ج:۲ ص:۸۵ (طبع مکتبہ فاروقی) میں موجود ہے: قال: أن تؤمن باللہ وملئکته وکتبه ورسله والیوم الأخر والقدر خیرہ وشرہ، الحدیث. وکذا فی حدیث علیؓ فی الترمذی. اور مشہور شش کلموں کا مأخذ درج ذیل کتبِ احادیث ہیں۔ ۱:- کلمۂ طیبہ، کنز العمال فصل الشهادتین، رقم الحدیث: ۱۷۴ ج: ۱ ص: ۵۵ (طبع مؤسسة الرسالة بیروت) و مشکوة المصابیح کتاب الایمان، الفصل الأوّل ج: ۱ ص: ۱۲ حدیث: ۲ (طبع قدیمی کتب خانه)، کلمۂ طیبہ کے الفاظ متفرقاً قرآنِ کریم میں بھی آئے ہیں، تفصیل کے لئے فتاویٰ محمودیہ ج:۶ ص:۴۳ دیکھئے۔ ۲:- کلمۂ شہادت، الصحیح للبخاریؒ، باب ما یتخیر من الدعاء بعد التشهد ج: ۱ ص: ۱۱۵ (طبع قدیمی کتب خانه) ۔ ۳:- کلمۂ تمجید، الصحیح لمسلمؒ، باب فضل التهلیل والتسلیم والدعاء ج: ۲ ص: ۳۴۵۔ ۴:- کلمۂ توحید، جامع الترمذی ج: ۲ ص: ۱۸۰ (طبع میر محمد کتب خانه) ۔ ۵:- سیّد الاستغفار، الصحیح للبخاریؒ، کتاب الدعوات فی باب أفضل الاستغفار ج: ۲ ص: ۹۳۳ (طبع قدیمی کتب خانه)۔ ۶:- رَدِّ کفر، مسند أحمد ج: ۵ ص: ۴۵۱ (طبع المکتب الاسلامی بیروت)۔ اس کے علاوہ ان کلمات کے الفاظ متفرقہ دیگر بے شمار احادیث میں وارد ہوئے ہیں، ان کی ترتیب، اسماء، تعداد اور نمبر آسانی کے لئے ہیں، درحقیقت ان کلموں کے معانی پر ایمان لانا ضروری اور مطلوب ہے۔ (محمد زبیر)

کا اسم گرامی جب بھی لیا جائے تو اس پر دُرود شریف پڑھنا احادیث سے ثابت ہے، اس لئے اگر کلمہ کے بعد ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھ دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ اس میں یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہتے وقت لہجہ کچھ بدل لیا جائے تاکہ کلمہ پر اضافے کا شبہ نہ ہو۔

واللہ اعلم

۱۳/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۸۰/ ۲۸ الف)

شعراء کا اپنے کلام میں غیر اللہ کو خطاب کرنا

سوال:- ایک جگہ دو شخص آپس میں محوِ گفتگو تھے، اشخاصِ مذکورہ میں سے ایک شخص کا کہنا تھا کہ شاعری خواہ مجازی ہو یا حقیقی، ان دونوں کا اثر شاعر کے عقائد پر ہوتا ہے، جس طرح سے آج کل عامی شاعر جن کی شاعری بالکل غیر سنجیدہ اور اخلاق سے گری ہوئی ہوتی ہے یہاں تک کہ شاعر کا اپنے فرضی محبوب کو خدا کے ہم پلہ قرار دینے، یا موسم یا دُوسرے موضوعات پر مبالغانہ انداز میں اپنے تخیل کو پیش کرنے سے شاعر کے عقائد اس کے زد میں آتے ہیں اور اس پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے، یہاں تک کہ شاعر اپنے تخیل کو غلط انداز میں بیان کرنے کی وجہ سے گناہ اور بسا اوقات گناہِ عظیم کا مرتکب قرار پاتا ہے۔ یہ بات کہاں تک دُرست ہے؟

۲:- لیکن اس کے برعکس دُوسرے شخص کا کہنا یہ ہے کہ شاعری خواہ مجازی ہو یا حقیقی، محض تخیل ہے، اور تخیل کا حقیقت سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی ربط نہیں۔

مہربانی فرما کر اس سوال کا جواب دیں کہ اشخاصِ مذکورہ میں سے کون صحیح ہے اور کون غلطی پر ہے؟ سادہ، عام فہم، مدلل، جامع، مفصل اور اگر کہیں عربی کی عبارت ہو تو اس کے بعد ترجمے کے ساتھ اس طرح جلد سے جلد ارقام فرمائیں کہ حجت تام ہو، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خط کو موصول ہوئے کئی ماہ گزر گئے، لیکن میں مسلسل سفر اور مصروفیات کی بناء پر جواب نہ دے سکا، اب بمشکل تمام اتنا وقت نکال سکا ہوں کہ جواب لکھوں۔

آپ نے خاص دو صاحبان کی گفتگو نقل کی ہے، ان میں سے کسی کی بات بھی علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے، اور وہ یہ کہ اگر شاعر اپنے کلام میں ایسا مجاز یا استعارہ استعمال کرتا ہے جس کی نظیریں اہلِ زبان میں معروف ومشہور ہوں اور دُوسرے قرائن وشواہد سے یہ بھی معلوم ہو کہ شاعر نے یہ بات مجاز واستعارہ کے طور پر کہی ہے، حقیقت سمجھ کر نہیں کہی، تب تو ایسا مجاز واستعارہ

جائز ہے، اور اس کی بنیاد پر انسان کو بدعقیدہ نہیں کہا جاسکتا، اس کے برخلاف اگر مجاز و استعارہ اس نوعیت کا ہے کہ اہلِ زبان میں اس کی نظیریں معروف نہیں ہیں یا پھر دُوسرے قرائن وشواہد سے معلوم ہے کہ شاعر نے یہ بات مجاز کے طور پر نہیں کہی بلکہ حقیقت سمجھ کر کہی ہے تو اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کا عقیدہ یہی ہے۔

مثلاً حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجرِ مکی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ اشعار منسوب ہیں کہ:-

یا رسول اللہ! انظر حالنا، یا رسول اللہ! اسمع قالنا، حالانکہ یہ بات حضرت حاجی صاحبؒ کے حالات اور ان کی کتابوں وغیرہ سے معلوم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرح حاضر و ناظر نہیں سمجھتے تھے، اس لئے یہاں یہ کہا جائے گا کہ ان اشعار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطاب کیا گیا ہے، وہ مجازاً کیا گیا ہے، اور یہ ایک معروف شاعرانہ روایت ہے کہ شاعر بہت سی غیرموجود اشیاء کو تخیل میں موجود فرض کرکے ان سے خطاب کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات دریاؤں، پہاڑوں اور شہروں کو بھی خطاب کرتا ہے۔ گویا حضرت حاجی صاحبؒ کا یہ مجاز ایسا ہے کہ اہلِ زبان کے کلام میں اس کی نظیریں موجود ہیں، لہٰذا اس سے فسادِ عقیدہ لازم نہیں آتا۔ ہاں! اگر کوئی ایسا شخص یہ بات کہے جس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ بطور مجاز یہ بات نہیں کہہ رہا ہے بلکہ اس کے نزدیک حقیقی عقیدہ ہی یہی ہے تو پھر فسادِ عقیدہ لازم آجائے گا۔[1]

اس کے برخلاف بعض مبالغے یا مجاز ایسے ہوتے ہیں کہ اہلِ زبان میں اس کی معروف نظیریں نہیں ہوتیں، مثلاً کسی مخلوق کو خالق سے تشبیہ دینا یا کسی مخلوق کے اوصاف کو بڑھا چڑھا کر اسے خالق کے ساتھ ملا دینا، اس قسم کے مبالغے اور استعارے چونکہ متعارف نہیں ہوتے اور دین و مذہب کا پاس رکھنے والے لوگ ان کو ہمیشہ بے ادبی اور غلط سمجھتے ہیں، اس لئے ایسے مبالغوں اور استعاروں سے فسادِ عقیدہ کا شبہ ہوتا ہے، اور وہ ناجائز ہیں، چونکہ اس میں مجاز و مبالغہ کا احتمال ہوتا ہے اس لئے محض اس کی بناء پر کسی کو کافر کہنے میں احتیاط کرنی چاہئے تاوقتیکہ وہ اپنے عقیدے کی خود وضاحت نہ کردے۔

ھٰذا ما عندی واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

۱۵/۴/۱۳۸۴ھ

(فتویٰ نمبر ۳۸۹/۲۹ الف)

---

(۱) مسئلہ مذکورہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۰۴، وامداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۸۵

کپڑے میں انبیاء علیہم السلام کی تصویر بنانا

سوال:- محترم جناب مفتی جسٹس تقی عثمانی صاحب (دارالعلوم کورنگی کراچی)

جنابِ عالی!

محمد فاروق ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کورنگی کراچی میں ایک ڈیزائن کپڑے پر چھپائی/ پرنٹنگ کے لئے سپرز ٹاؤلرز پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی کی جانب سے آیا، اور سپر ٹاؤلرز کے ڈیزائن کے عین مطابق چھاپ کر دے دیا گیا۔ عام طور پر ہم ٹیکنیکل اُمور کے علاوہ (مثلاً کلر میچنگ وغیرہ) پارٹیوں کے مطلوبہ ڈیزائنز کے دیگر اُمور سے واسطہ نہیں رکھتے، اور کسی غور وخوض کے بغیر آرڈر کی تکمیل کر دیتے ہیں۔

نادانستہ طور پر اس ڈیزائن کے چھپ جانے کے بعد شکوک وشبہات پیدا ہوئے ہیں، اس ڈیزائن میں چرند پرند، آبی جانور اور کارٹون انسانوں کے انداز میں دو انسانی شبیہیں بھی ہیں، اور اس ڈیزائن پر Noahs ark بھی لکھا ہوا ہے۔

یہ ڈیزائن آپ کے سامنے پیش کرنے کے بعد آپ اس پر فتویٰ صادر فرمادیں تاکہ اگر توہین، گستاخی سرزد ہوگئی ہو تو جو بھی کفارہ ہے، ادا کر دیا جائے۔ اور ہم اعلانیہ طور پر صدقِ دِل سے اپنی نادانستہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں، اور عہد کرتے ہیں کہ آئندہ ہر ممکن احتیاط سے کام لیں گے۔

تابعدار محمد احمد علی خان
ڈپٹی ملز منیجر

جواب:- کسی جاندار کی تصویر بنانا بذاتِ خود ایک ناجائز کام ہے، بالخصوص کسی پیغمبر کی خیالی تصویر بنانا تو انتہا درجے کی بے ادبی ہے، جس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنی چاہئے، اور ایسی بے ادبی پر مشتمل تصویر کو شائع کر کے لوگوں میں پھیلانا مزید وبال کا موجب ہے، لیکن اگر آپ نے واقعۃً نادانستگی میں یہ تصویریں اس طرح چھاپ دیں کہ آپ کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ اس میں کیا ہے؟ تو آپ پر مندرجہ ذیل اُمور فوری طور پر واجب ہیں:-

۱:- سب سے پہلے صدقِ دِل سے اپنے اس عمل پر توبہ و اِستغفار کریں، اور آئندہ کے لئے اس قسم کے معاملات میں تیقظ اور بیدار مغزی سے کام کرنے کا عہد واہتمام کریں۔

۲:- اس کپڑے کا جتنا اسٹاک موجود ہو، اس کی سپلائی روک کر ان تصاویر کو مٹائیں، اور اگر مٹ نہ سکیں تو ان کو جلادیں۔

۳:- اگر کپڑا اس کمپنی کے پاس جاچکا ہے جس نے آپ سے چھپوایا تھا تو اس کو ایسے کپڑے کی سپلائی سے روکنے کے لئے اپنا پورا اثر و رُسوخ استعمال کریں، اور اگر وہ اس کی سپلائی سے باز نہ آئیں تو آپ ان سے براءت کا اظہار و اعلان کریں۔

۴:- اس کپڑے کی چھپائی کی جو اُجرت آپ نے وصول کی ہے، وہ مکمل طور پر صدقہ کریں۔

واللہ اعلم

۱۴۱۴/۹/۶ھ

شعر میں غیر اللہ کو خطاب کرنا

سوال:-

لے جلد خبر کہ ہاں ابھی تک
سینے میں اِک آگ سی دبی ہے
کشتی یہ بھنور میں آپھنسی ہے
لے جلد خبر مریضِ غم کی
اب اس کا یہ سانس آخری ہے

زید کہتا ہے ایسے کلمات غیر اللہ کے لئے استعمال نہ کرنے چاہئیں جن سے عقائد میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ، مذکورہ اشعار ایسے ہی ہیں، لیکن عمر اپنے عقائد کی بناء پر ان اشعار کو دُرست سمجھتا ہے، کیونکہ عمر نے اپنے مرشد کی وفات کے بعد یہ اشعار کہے۔ اب ان دونوں میں سے کون حق پر ہے، باطل کے لئے شرعی کیا حکم ہے؟ برائے مہربانی جواب عنایت فرمائیں۔

جواب:- شعر میں بکثرت مجاز و استعارہ کا استعمال ہوتا ہے، اور شاعر بسا اوقات ان اشیاء کو بھی مخاطب کرتا ہے جو سننے اور جواب دینے کی اہلیت نہیں رکھتیں، مثلاً دریا، پہاڑ وغیرہ، یہ خطاب تخیلی ہوتا ہے، حقیقی نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اس انداز سے شعر میں غیر اللہ کو خطاب کرے اور مقصد حقیقۃً اس کے مشکل کشا یا فریاد رس ہونے کا عقیدہ نہ ہو، بلکہ تخیلی طور پر مجازاً و استعارۃً خطاب کرنا ہو تو ایسے اشعار میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر مشرکانہ عقیدے کے ساتھ ایسے اشعار ان کے حقیقی معنی پر اعتقاد رکھتے ہوئے کہے اور پڑھے جائیں تو حرام ہیں۔ پس مندرجہ بالا اشعار اگر کسی صحیح العقیدہ شخص نے کہے ہیں تو ان میں کچھ حرج نہیں، البتہ اگر فاسد عقیدے کے ساتھ کہے ہیں تو حرام ہیں، اور عوام میں ایسے

اشعار کی تشہیر بہرصورت منع ہے کہ فسادِ عقیدہ کا اندیشہ ہے۔[1]

سوال نمبر۲:-

اے رسولِ کبریا فریاد ہے
یا محمد مصطفیٰ فریاد ہے
سخت مشکل میں پھنسا ہوں آج کل
اے میرے مشکل کشا فریاد ہے

زید ان اشعار کو دُرست مانتا ہے، اور عمر اسے شرک قرار دیتا ہے، قول کس کا دُرست ہے؟ اور شعر کہنے والے کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- ان اشعار میں بھی وہی تفصیل ہے جو اُوپر بیان کی گئی۔[2] واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲۴ رمضان ۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۲۸۶/۳۱ د)

قادیانیوں کی عبادت گاہ کو مسجد کہنے کی ممانعت

سوال:- قادیانی جماعت کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور کیا قادیانی اپنی مسجد بنا سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ قانوناً وشرعاً کیا حکم ہے؟ اور کیا ایسے فیصلوں کا قانون بنانا دُرست ہے کہ جس میں قادیانیوں کو اپنی عبادت گاہ مسجد کے نام سے بنانے کی اجازت دی گئی ہو؟

سائل: امام مسجد سبیل، نیوٹاؤن

جواب:- مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار، خواہ قادیانی ہوں یا لاہوری باجماعِ اُمت دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، اور ان کا دینِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس حقیقتِ واقعی کو ستمبر ۱۹۷۴ء میں آئینی طور پر بھی تسلیم کرلیا گیا ہے، اور اس غرض کے لئے پاکستان کے دستور میں ایسی ترمیم کردی گئی ہے جس پر ملک کے تمام مسلمان متفق ہیں۔

اس ترمیم کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مرزائیوں کو شعارِ اسلام و مسلمین کے اختیار کرنے

(۱،۲) حکیم الاُمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ''بارادۂ استعانت واستغاثہ یا باعتقاد حاضر ناظر ہونے کے منہی عنہ ہے، اور بدون اس اعتقاد کے محض شوقاً واستلذاذاً ماذون فیہ ہے، چونکہ اشعار پڑھنے کی غرض محض اظہارِ شوق واستلذاذ ہوتا ہے اس لئے نقل میں توسع کیا گیا، لیکن اگر کسی جگہ اس کے خلاف دیکھا جائے گا، منع کردیا جائے گا۔ (دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۸۵) اور فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۰۴ میں ہے: ''یا رسول اللہ کبریا فریاد ہے.... یا محمد مصطفیٰ فریاد ہے....الخ'' ایسے الفاظ محبت وخلوت میں پڑھے بایں خیال کہ حق تعالیٰ آپؐ کی ذات کو مطلع فرمادیوے یا محض محبت سے بلا کسی خیال کے جائز ہیں، اور بعقیدۂ علم الغیب اور فریادرس ہونے کے شرک ہیں، اور مجامع میں منع ہیں کہ عوام کے عقیدے کو فاسد کرتے ہیں، لہٰذا مکروہ ہوں گے۔ (محمد زبیر حق نواز)

سے روکا جائے، خاص طور سے کسی بھی مذہب کی عبادت گاہ اس مذہب کا ایک امتیازی نشان ہوتی ہے، جس سے اس مذہب اور اہلِ مذہب کی شناخت میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ ''مسجد'' مسلمانوں کی اس عبادت گاہ کا نام ہے جو صرف اور صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہو، کسی دُوسرے مذہب کے پیروؤں کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اپنی عبادت گاہ کو ''مسجد'' کا نام دے کر لوگوں کو مغالطہ دیں اور ان کی گمراہی کا باعث ہوں، بالخصوص مرزائیوں کا معاملہ یہ ہے کہ مدّت دراز تک اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرکے ناواقف لوگوں کو فریب دیتے رہے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر انہیں ''مسجد'' کے نام سے اپنی عبادت گاہ تعمیر کرنے یا اسے اس نام پر برقرار رکھنے کی اجازت دی جائے تو اس کا صریح نتیجہ عام مسلمانوں کے لئے سخت فریب میں مبتلا ہونے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا، اور پاکستان جیسی اسلامی مملکت میں ایسے فریب کو گوارا نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا احقر کی رائے میں وہ تمام فیصلے جن میں قادیانیوں یا لاہوریوں کو ''مسجد'' کے نام سے عبادت گاہ بنانے کی اجازت دی گئی ہے، قرآن وسنت، شریعتِ اسلامی اور مصالحِ مسلمین کے یکسر خلاف ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۹/۱۰/۱۸ھ

احقر اس تحریر کی تصدیق وتائید کرتا ہے

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳۹۹/۱۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۷۳۳ د)

حیاتِ انبیاء علیہم السلام، حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام اور سماعِ موتیٰ سے متعلق مختلف سوالات

سوال ۱:- حیاتِ انبیاء کے بارے میں احادیثِ صحیحہ نے کیا فرمایا ہے؟ کیا انبیاء قبر میں اسی دُنیوی حیات سے زندہ ہیں اور رُوح مقامِ رفیق اعلیٰ میں ہے؟ یا جسد کے ساتھ انبیاء کا قبروں میں نماز پڑھنا آیا ہے؟ آیا اسی جسد کے ساتھ پڑھتے ہیں یا جسدِ مثالی کے ساتھ؟ نیز حیاتِ انبیاء کا منکر شریعت میں کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب:- آپ کے سوالات کے مختصر جوابات[1] درج ذیل ہیں، لیکن ان مسائل پر تدقیقات میں پڑنا دُرست نہیں، ان سوالوں کے جواب پر دین کا کوئی عملی حکم موقوف نہیں ہے، نہ ان کی تحقیق کا ہمیں مکلّف کیا گیا ہے، لہٰذا اپنے اوقات کو ان مسائل کو معلوم کرنے میں صَرف کرنا چاہئے جن کا براہِ راست تعلق عملی زندگی سے ہے، حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من حسن اسلام

---

(۱) یہ مختلف سوالات اور ان کے جوابات آگے آرہے ہیں۔

المرء ترکه ما لا یعنیه"۔[۱] اس تمہید کے بعد مختصر جوابات لکھے جاتے ہیں، مگر ان پر بحث وتمحیص کا دروازہ نہ کھولا جائے۔

ا:- انبیاء علیہم السلام کی حیات، حیاتِ برزخی ہے[۲]، لیکن یہ حیاتِ برزخی عام مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے، اس میں رُوح کا رشتہ جسد کے ساتھ اتنا زیادہ قوی رہتا ہے کہ اسے حیاتِ دُنیویہ کے ساتھ بہت قرب ہے، اور اس کی بنا پر ان پر مطلقاً احیاء کا اطلاق کیا جاتا ہے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی نہ میراث تقسیم ہوتی ہے، نہ ان کی ازواجِ مطہرات سے بعد میں کوئی نکاح کرسکتا ہے، اب یہ قوّت کس درجے کی ہے؟ اس کا صحیح علم اللہ ہی کو ہے اور اس کی کُنہ جاننے کی کوشش اور فضول تحقیقات کی ضرورت نہیں، اور انبیاء کا قبر میں نماز پڑھنا بظاہر اجساد کے ساتھ ہی ہے۔[۳]

س۲:- معراج کی رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور تخفیفِ نماز کے بارے میں گفتگو صرف رُوح سے ہوئی تھی یا رُوح مع الجسد سے؟

ج۲:- احادیث میں اس کی تصریح نہیں ہے، لیکن اطلاقات سے ظاہر یہ ہے کہ جسد کے ساتھ ہوئی تھی۔

س۳:- شبِ معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا معاملہ جمیع انبیاء کے لئے مسجدِ اقصیٰ میں صرف رُوحوں کے لئے ہوا تھا یا کہ رُوح مع الاجساد تھے؟

ج۳:- اس کی بھی روایات میں تصریح نہیں ہے، بظاہر اجساد کے ساتھ ہی ہے، واللہ اعلم۔

س۴:- حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بقیدِ حیات ہیں، کیا اس نماز میں مع الجسد شریک ہوئے تھے یا صرف رُوح نے شرکت فرمائی تھی؟

---

(۱) جامع الترمذی ابواب الزهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ج:۲ ص:۵۵ (طبع فاروقی کتب خانه).

(۲، ۳) وفی شفاء السقام للسبکیؒ ص:۱۸۰ (طبع مکتبه نوریه رضویه): ولحیاة الأنبیاء بعد موتهم شواهد من الأحادیث الصحیحة. وفی الصحیح للامام مسلمؒ ج:۲ ص:۲۶۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن أنس بن مالکؓ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: اتیت -وفی روایة هداب- مررت علی موسیٰ لیلة أسری بی عند الکثیب الأحمر وهو قائم یصلی فی قبره. وفی القول البدیع للسخاویؒ: السادسة، رسول الله حی علی الدّوام ص:۱۶۷ (طبع مکتبه علمیه مدینه منوره) یؤخذ من هذه الأحادیث أنه صلی الله علیه وسلم حیٌّ علی الدوام، وذلک أنه محال عادة أن یخلو الوجود کله من واحد یسلم علیه فی لیلٍ ونهارٍ ونحن نؤمن ونتصدق بأنه صلی الله علیه وسلم حیٌّ یرزق فی قبره وأن جسده الشریف لا تأکله الأرض، والاجماع علی هذا .... وقد جمع البیهقی جزأً فی حیاة الأنبیاء علیهم السلام فی قبورهم، واستدل بغالب ما تقدم وبحدیث أنس رضی الله عنه: الأنبیاء أحیاء فی قبورهم یصلّون .... الخ. وقال العلامة السبکیؒ فی شفاء السقام ص:۱۹۱ (طبع مکتبه نوریه رضویه) وهی ثابتة للروح بلا اشکال والجسد ... فان الصلوٰة تستدعی جسدًا حیًّا، وکذلک الصفات المذکورة فی الأنبیاء لیلة الاسراء کلها صفات الأجسام ولا یلزم من کونها حیاة حقیقیة ان تکون الأبدان معها کما کانت فی الدنیا من الاحتیاج الی الطعام والشراب .... وغیر ذلک من صفات الأجسام التی نشاهدها بل قد یکون لها حکم اٰخر، فلیس فی العقل ما یمنع من اثبات الحیاة الحقیقیة لهم. وکذا فی أحکام القرآن للعلامة التهانوی رحمه الله تعالیٰ (ج:۳ ص:۱۷۰) و رد المحتار ج:۴ ص:۱۵۱.

ج۴:- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسد و رُوح دونوں کے ساتھ زندہ ہونا قرآنِ کریم میں مصرّح ہے،(۱) اس لئے ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مع الجسد والروح ہوئی۔

س۵:- عام مسلمانوں کو جب قبر میں دفنایا جاتا ہے اس کے بعد ان کی قبر پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے، کیا وہ سنتے ہیں؟ نفی کی صورت میں ان احادیث کا کیا جواب ہوگا جن میں ثبوت ہے؟

ج۵:- اصل یہ ہے کہ مردوں میں موت کے بعد سننے کی طاقت نہیں ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں تصریح ہے،(۲) لیکن جس وقت اللہ تعالیٰ کسی مصلحت سے انہیں کوئی آواز سنانا چاہے تو سنا دیتا ہے،(۳) حدیث میں جو جوتیوں کی آواز سننے کا ذکر ہے(۴) وہ اسی پر محمول ہے کہ اللہ تعالیٰ عبرت کے لئے اس کو آواز سنا دیتا ہے۔

س۶:- قبر سے کیا مراد ہے؟ آیا وہی لحد یا شق جس میں میّت کو دفنایا گیا ہے یا کوئی اور؟ عذابِ قبر کہاں ہوتا ہے؟ ملکَین کا سوال و جواب کہاں ہوتا ہے؟

ج۶:- قبر سے وہی قبر مراد ہے جس میں مردے کو دفن کیا گیا۔ سوالِ ملکَین کے وقت رُوح کو دوبارہ جسد میں داخل کیا جاتا ہے،(۵) اور پوری حقیقتِ حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔

س۷:- سماعِ موتیٰ میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف ہے، جمہور صحابہؓ کی رائے اثبات میں ہے یا نفی میں؟ امام ابوحنیفہؒ کی رائے کیا ہے؟

---

(۱) "اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ". الاٰية (آل عمران:۵۵). "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ." الاٰية (النساء:۱۵۷). تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ج:۲ ص:۷۶۔

(۲) قال الله تعالىٰ: "فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى" الاية. (سورة الروم: ۵۲).

(۳، ۴) "اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِى الْقُبُوْرِ" (سورة فاطر: ۲۲) وفى أحكام القران ج:۳ ص:۱۶۳ فانه تعالى بقدرته يسمع الأموات أصوات الأحياء اذا شاء ويهدى من يشاء ويضل من يشاء .... الخ. وفى الصحيح للبخارىّ باب الميّت يسمع خفق النعال ج:۱ ص:۱۷۸ (طبع قديمى كتب خانه) عن أنس رضى الله عنه عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: العبد اذا وضع فى قبره وتولى وذهب أصحابه حتى انه ليسمع قرع نعالهم أتاه ملكان، الحديث. وفيه أيضًا ج:۱ ص:۱۸۳ (طبع مذكور) قال نافع ان ابن عمرؓ أخبره قال: أطلع النبى صلى الله عليه وسلم على أهل القليب فقال: وجدتم ما وعد ربكم حقًّا؟ فقيل له: تدعو أمواتا؟ فقال: ما أنتم بأسمع منهم ولكن لا يجيبون. وعن عائشة رضى الله عنها قالت: انما قال النبى صلى الله عليه وسلم: انهم ليعلمون الآن ان ما كنت أقول لهم حق، وقد قال الله تعالىٰ: "اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى". وفى أحكام القران للعلامة التهانوى رحمة الله عليه (ج:۳ ص:۱۶۳) قوله أن مسئلة سماع الموتى وعدمه من المسائل التى وقع الخلاف فيها .... وفيه أيضا ج:۳ ص:۱۶۵ قال العبد الضعيف (المفتى الأعظم باكستان قدس الله سرهٗ) والذى ذكره فى الروح من طوائف أهل العلم وذكر ابن عبدالبر ان الأكثرين على ذلك يعنى سماعهم فى الجملة هو الحق الحقيق بالقبول، واليه يرشد صيغة القران وشان النزول، وبه تتوافق الروايات من الصحابة والرسول صلى الله عليه وسلم وهو مختار مشائخنا دامت بركاتهم ما هبت الدبور والقبول .... الخ.

(۵) وفيه أيضا ج:۳ ص:۱۸۱ مذهب أهل السنة والجماعة أن أرواح الموتى ترد فى بعض الأوقات من العلّيين أو من سجّين الى أجسادهم فى قبورهم عند ارادة الله تعالى وخصوصًا ليلة الجمعة ويجلسون ويتحدثون وينعم أهل النعيم ويعذب أهل العذاب. (محمد زبیر حق نواز)

ج ۷:- امام ابوحنیفہؒ کی رائے صحیح قول کے مطابق وہی ہے جو نمبر ۵ میں لکھی گئی۔

س ۸:- عام مسلمانوں کی قبر پر قرآن خوانی بلا معاوضہ جائز ہے یا نہیں؟ جائز ہونے کی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ کا کوئی عمل، جس کا ذکر حدیث میں ہو۔

ج ۸:- ایصالِ ثواب کے لئے قبر پر قرآن خوانی جائز ہے بشرطیکہ کسی دن کی تخصیص نہ ہو اور اس پر کوئی معاوضہ طے نہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۹/۱۹ الف)

''اسلامی سوشلزم'' سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی شرعی حیثیت

سوال:- اسلامی سوشلزم کیا ہے؟ اور کیا موجودہ حالات میں اس کو قبول کرنا ہمارے لئے دُرست ہے؟

قاضی نذیر احمد سونڈ، ضلع ٹھٹھہ

جواب:- کچھ عرصے سے ہمارے معاشرے میں یہ وبا چل نکلی ہے کہ مغرب سے آئے ہوئے ہر غلط یا صحیح نظریے کے ساتھ صرف ''اسلامی'' کا نام لگا کر اسے بزعم خود ''مشرف بہ اسلام'' کرلیا جاتا ہے، پھر اس کی تبلیغ شروع کردی جاتی ہے، اسلامی سوشلزم کا نعرہ بھی ایسا ہی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور سوشلزم زندگی کے دو بالکل مختلف نظام ہیں، جن میں مطابقت ممکن نہیں، سوشلزم درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام کی ہلاکت آفرینیوں کا ایک جذباتی رَدِّ عمل ہے، جو بجائے خود اتنا ہی مضر اور خطرناک ہے جتنا سرمایہ دارانہ نظام، سوشلزم کی بنیاد انفرادی ملکیت کے انکار پر ہے، سرمایہ دارانہ نظام میں غریبوں کے خون چوسنے کا جو ظالمانہ کھیل کھیلا گیا، اس سے متأثر ہوکر سوشلزم کے علَم برداروں نے انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کردیا، حالانکہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوسکا کہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہوگئے، اور ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آگیا، جو پورے استبداد کے ساتھ دولت کے ایک بڑے ذخیرے سے کھیلتا ہے، رہا بیچارا مزدور سو وہ سوشلزم میں بھی اتنا ہی بے بس ہے جتنا سرمایہ داری میں تھا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے سرمایہ داری کی خرابیوں کا علاج انفرادی ملکیت کا خاتمہ نہیں ہے، بلکہ انفرادی ملکیت کی خودغرضی اور بے لگامی کو ختم کرنا ہے، چنانچہ اسلام میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن سود کی حرمت اور زکوٰۃ، صدقات، نفقات، کفارات، عشر وخراج اور وراثت وغیرہ کے اَحکام کے ذریعہ اس نے اس ملکیت کو حدود کا پابند بنادیا ہے۔

اس سے واضح ہوگیا کہ سوشلزم کی بنیاد جس نظریئے پر قائم ہے، اسلام اس بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے دونوں میں نظریاتی مصالحت کا کوئی امکان نہیں، اسلام سوشلزم نہیں بن سکتا، اور سوشلزم اسلام نہیں کہلاسکتا، لہٰذا ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ ایک مہمل نعرہ ہے، جو دونوں معاشی نظاموں یا کم از کم اسلامی نظامِ معیشت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ پاکستان میں ہماری ضرورت ''اسلام'' ہے، ''سوشلزم'' نہیں۔

واللہ اعلم

۲۰ رشوال ۱۳۸۷ھ[1]

کیا جنت میں کفار داخل ہوسکتے ہیں؟

سوال: – آج کل بعض لوگوں کا ذہن اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ صرف مسلمان ہی جنت میں جائیں گے، وہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اگر اچھے کام کرتا ہے تو جنت کا مستحق ہے۔ واضح رہے کہ یہ خیالات میرے عقیدے میں شامل نہیں ہیں، میں صرف اسلام کو سچا مذہب مانتا ہوں، لیکن بہتر ہو کہ ایسے لوگوں کے شبہات کا ازالہ ''البلاغ'' کے ذریعہ کردیا جائے۔

جواب: – ان لوگوں کا یہ شبہ درحقیقت ایک بنیادی بات کو ذہن میں نہ رکھنے کا نتیجہ ہے، اور وہ یہ کہ اس کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے؟ اور جنت وجہنم کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ قرآنِ کریم کی تعلیم یہ ہے کہ یہ دُنیا ایک ''دار الامتحان'' ہے، جنت اس امتحان کی کامیابی کا صلہ ہے، دوزخ ناکامی کی سزا۔ اور ''ایمان'' اس امتحان میں کامیابی کی بنیادی شرط اور وہ ''لازمی سوال'' ہے، جسے حل کئے بغیر کوئی شخص کامیاب نہیں ہوسکتا، اس لئے جنت کا حصول ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔

دُنیا میں روزمرّہ جن امتحانات سے ہمارا سابقہ رہتا ہے، ان پر ہی اگر آپ غور فرمائیں تو واضح طور سے نظر آئے گا کہ ہر امتحان میں کچھ سوالات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اور ممتحن ان سوالات کو کامیابی کا مدار سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے سوالات ہوتے ہیں جنھیں حل نہ کرنے سے کامیابی کے درجے میں تو کمی ہوجاتی ہے، مگر وہ کامیابی اور ناکامی کے لئے فیصلہ کن نہیں ہوتے، اب اگر کوئی شخص پہلی قسم کے اہم سوالات کو تو بالکل چھوڑ دے یا انہیں بالکل غلط طریقے سے حل کرے، اور دُوسری قسم کے ضمنی سوالات صحیح طریقے سے حل کردے تو آپ خود ہی سوچئے کہ وہ شخص کامیاب ہوگا یا ناکام؟ ظاہر ہے کہ کوئی معقولیت پسند انسان ایسے شخص کو کامیاب قرار نہیں دے سکتا، اس لئے کہ اس نے اصلی بنیادی سوالات کو بالکل حل نہیں کیا۔ جو شخص اسلام کے بنیادی عقائد، توحید، رسالت، آخرت

---

(۱) یہ فتویٰ ماہنامہ ''البلاغ'' کے شمارہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

وغیرہ پر ایمان نہیں رکھتا، اور ساتھ ہی کچھ اچھے کام بھی کرتا ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔

اسی بات کو ایک دُوسرے طریقے سے بھی سمجھ لیجئے، دُنیا میں بہت سی چیزیں اپنی ذات کے اعتبار سے مفید ہوتی ہیں، لیکن کوئی دُوسری خراب چیز ان کے ساتھ مل کر ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ دُودھ، گھی، مکھن اپنی ذات کے اعتبار سے کتنی مقوّی غذائیں ہیں، لیکن اگر ان کے ساتھ سنکھیا ملادیا جائے تو یہی چیزیں مہلک بن جاتی ہیں۔ انسان کے اعمال و افعال کا بھی یہی حال ہے، کسی غریب کی روپے پیسے کے ذریعہ امداد کرنا کتنا مستحسن کام ہے، لیکن اگر اس سے مقصد محض دِکھاوا اور نام ونمود ہو تو یہ نیکی دُنیوی نقطۂ نظر سے بھی اکارت ہوجاتی ہے۔

قرآنِ کریم کا ارشاد یہی ہے کہ ''کفر'' وہ زہر ہے جو انسان کے تمام نیک اعمال کو اکارت کردیتا ہے، یہ اعمالِ خیر اگر ایمان کے ساتھ ہوں تو انسان کے درجات میں ترقی کا سبب بنتے ہیں، اور ان سے اس کی آخرت سنورتی ہے، لیکن اگر ان کے ساتھ کفر مل جائے تو وہ ان کو اسی طرح بیکار کردیتا ہے جیسے سنکھیا، دُودھ اور گھی کو، جو شخص خدا کا یا اس کی وحدانیت کا منکر ہو، اس کے رسولوں کو (معاذ اللہ) جھوٹا کہتا ہو اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کو من گھڑت بتاتا ہو، اور اس کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی کا سرے سے انکار کرتا ہو، اور اس قدر سنگین جرائم کے بعد وہ کوئی اچھا کام بھی کرلے تو اسے مستحقِ انعام قرار دینے میں آخر کیا معقولیت ہے؟ فرض کیجئے کہ ایک نہایت خوش اخلاق، محنتی اور ذہین شخص ہے جو اپنی مبنی برانصاف حکومت کے خلاف بغاوت کی سازش کرتا ہے، اس کے دُشمنوں سے مل کر ان کی مدد کرتا ہے، اس کے قانون کی کھلم کھلا توہین کرتا ہے، تو کیا محض اس کی خوش اخلاقی اس کو ان سنگین جرائم سے بری کرسکے گی؟ اور اگر حکومت اس کو موت کی سزا دے تو کیا کوئی انصاف پسند انسان حکومت کے اس فیصلے کو ظلم قرار دے سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں! اس کا جرم اتنا سنگین ہے کہ اس کی موجودگی میں اس کی خوش اخلاقی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اب آپ خود سوچ لیجئے کہ جو شخص خدا کا، اس کے رسولوں کا، اس کی کتابوں کا اور اس کے قوانین کا باغی ہو، اسے محض اس کی خوش اخلاقی کی بناء پر جنت کا مستحق کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے؟[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۲ رشوال ۱۳۸۷ھ[2]

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۴ ص:۲۳۷۔

(۲) یہ فتویٰ ماہنامہ ''البلاغ'' کے شمارہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

وحدت الوجود کا مطلب

سوال: – وحدت الوجود کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ عقیدہ کہاں تک دُرست ہے؟

جواب: – وحدۃ الوجود کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں حقیقی اور مکمل وجود صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے، اس کے سوا ہر وجود بے ثبات، فانی اور نامکمل ہے۔ ایک تو اس لئے کہ وہ ایک نہ ایک دن فنا ہوجائے گا، دُوسرے اس لئے کہ ہر شئ اپنے وجود میں ذاتِ باری تعالیٰ کی محتاج ہے، لہٰذا جتنی اشیاء ہمیں اس کائنات میں نظر آتی ہیں، انہیں اگرچہ وجود حاصل ہے، لیکن اللہ کے وجود کے سامنے اس وجود کی کوئی حقیقت نہیں، اس لئے وہ کالعدم ہے۔

اس کی نظیر یوں سمجھئے جیسے دن کے وقت آسمان پر سورج کے موجود ہونے کی وجہ سے ستارے نظر نہیں آتے، وہ اگرچہ موجود ہیں، لیکن سورج کا وجود ان پر اس طرح غالب ہوجاتا ہے کہ ان کا وجود نظر نہیں آتا۔

اسی طرح جس شخص کو اللہ نے حقیقت شناس نگاہ دی ہو وہ جب اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے وجود کی معرفت حاصل کرتا ہے تو تمام وجود اسے ہیچ، ماند، بلکہ کالعدم نظر آتے ہیں، بقول حضرت مجذوبؒ:

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

''وحدت الوجود'' کا یہ مطلب صاف، واضح اور دُرست ہے، اس سے آگے اس کی جو فلسفیانہ تعبیرات کی گئی ہیں، وہ بڑی خطرناک ہیں، اور اگر اس میں غلوّ ہوجائے تو اس عقیدے کی سرحدیں کفر تک سے جاملتی ہیں۔ اس لئے ایک مسلمان کو بس سیدھا سادا یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ کائنات میں حقیقی اور مکمل وجود اللہ تعالیٰ کا ہے، باقی ہر وجود نامکمل اور فانی ہے۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ[2]

مسئلہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام

سوال ۱: – عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لوازمِ ذات سے ہے یا نہیں؟

۲:– کیا انبیاء علیہم السلام کو نبوّت سے قبل بھی وہی عصمت حاصل ہوتی ہے جو کہ نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے؟

جواب ۱: – عصمت، انبیاء علیہم السلام کے لئے لازم ہے، اور ان سے کسی وقت بھی یہ صفت

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: شریعت وطریقت ص: ۳۱۰ مؤلفہ حکیم الاُمت حضرت تھانوی قدس سرہٗ۔

(۲) یہ فتویٰ ماہنامہ ''ابلاغ'' کے شمارہ جمادی الثانیہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

جدا نہیں ہوتی،[1] ان کی جن لغزشوں کا ذکر قرآنِ کریم وغیرہ میں آیا ہے، وہ سب خلافِ اَوْلیٰ باتیں تھیں جو شرعاً معصیت نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کو ان کی جلالتِ قدر کی وجہ سے ان پر بھی تنبیہ کی گئی۔[2]

۲:- صحیح یہ ہے کہ نبوّت سے قبل بھی انبیاء سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔[3]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۳۰۰ الف)

بلا تحقیق مسئلہ بیان کرنا

سوال:- اگر کوئی شخص بدون تحقیق کے مسئلہ بیان کرے اور مسائلِ شرعیہ کو نہ مانے اور اللہ تعالیٰ نے جو حصہ وارثوں کے لئے قرآن مجید میں مقرّر فرمایا ہے نہ مانے، اور کہے یہ دادی کا مسئلہ ہے، اور کسی عالم کو کافر کہے اور اس عالم کی ہر طرح آبروریزی کرے، غیبت کرے اور اس سے دُشمنی و بغض رکھے اور برادری میں تفرقہ ڈالے اور قوم کے درمیان فرقہ بندی اور مسجد میں فساد کرے، فسق و فجور کرے، ایسے شخص کے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟ اور وہ مسجد میں داخل ہوسکتا ہے؟ اور جو کسی کی حق تلفی کرے ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟

جواب:- ایسا شخص فاسق ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اسے نرمی سے سمجھائیں اور اگر نہ مانے تو اس سے بیزاری کا اظہار کریں، فرائض کے بارے میں وہ جو یہ کہتا ہے کہ: ''دادی کا مسئلہ ہے'' تو اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اور اس کے مسجد میں داخل ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ اس جملے کے مطلب پر موقوف ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۱ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۱ تا ۳) قال فی شرح الفقه الأكبر ص: ۷۲ والمختار عند جمهور أهل السنة العصمة عنها أی عن الصغائر والكبائر غير المنفردة خطأ أو سهوًا (الی) والحاصل ان أحدًا من أهل السنة لم يجوز ارتكاب السهی منهم عن قصد، ولكن بطريق السهو والنسيان ويسمّى ذلک زلة. وفيه أيضًا ص: ۷۱ وفی عصمتهم عن سائر الذنوب تفصيل وهو أنهم معصومون عن الكفر قبل الوحی وبعده بالاجماع. وكذا عن تعمده الكبائر عند الجمهور. نیز دیکھئے معارف القرآن ج:۱ ص:۱۹۵ ''مسئلہ عصمت انبیاء'' اور امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۴۰۷۔ (محمد زبیر)

کسی انجمن کے رُکنیت فارم میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانے کا حکم

سوال: – ایک انجمن کے رُکنیت فارم کی عبارت مندرجہ ذیل ہے، کیا اس میں سے کوئی شق پورا نہ ہونے پر ممبر گناہگار ہوگا یا نہیں؟ اور گناہ کیسا ہوگا؟ کبیرہ یا صغیرہ؟

> میں اللہ رَبّ العزّت اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ کر کے اقرار کرتا ہوں کہ مجھے بزمِ ہذا کے اغراض و مقاصد سے پورا پورا اتفاق ہے، اور میں بزم کی فیس مستقل ادا کرتا رہوں گا، اور میں دُوسرے کو رُکنیت کی رغبت دینا اور بزمِ ہذا کو مستحکم بنانا اپنا فرضِ عین سمجھوں گا، تبدیلیٔ رہائش سے آگاہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس عہد کی وفا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جواب: – پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کوئی عہد کرنا تو صحیح ہے، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کر عہد کرنا دُرست نہیں، کیونکہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے،[1] اور کوئی نبی یا ولی اس کا شریک نہیں، لہٰذا معاہدے کے مذکورہ بالا الفاظ میں ترمیم کرنی ضروری ہے۔ اس کے بعد جو شخص یہ معاہدہ کر کے فارم بھر دے گا اس پر اس عہد کی پابندی اس وقت تک لازم ہوگی جب تک وہ اس عہد سے دست بردار ہونے کا واضح اعلان نہ کر دے، اس دوران وہ ان میں سے کسی بات کی خلاف ورزی کرے گا تو گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، کیونکہ عہد کر کے اس کو پورا نہ کرنا گناہِ کبیرہ ہے، **لقولہ تعالیٰ:** "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ"۔[2] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۳۵۴ ہ)

کیا قیامت کے دن جانوروں کا بھی محاسبہ ہوگا؟ کیا جنت میں عورتوں کو رُؤیتِ باری ہوگی؟

سوال ۱: – قیامت کے دن جب انسانوں کو حساب و کتاب کے لئے اُٹھایا جائے گا تو کیا جن و اِنس کے علاوہ جانوروں کو بھی اُٹھایا جائے گا یا نہیں؟ حدیث میں سینگ والی بکری سے گنجی بکری کا بدلہ لینے کا ذکر آتا ہے۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ قیامت کے دن تمام جانوروں کو حساب وغیرہ کے

---

(۱) "وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ" الآية (الحديد: ۴). "مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَمَا كَانُوْا" (المجادلة: ۷).

(۲) سورة المائدة: ۱.

لئے اُٹھایا جائے گا، ایک صاحب جو عالم اور فاضل ہیں کہتے ہیں کہ ''قرآن وسنت سے صرف انسان کا مکلّف ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لئے ان کے علاوہ کسی اور مخلوق کا حساب وکتاب کے لئے اُٹھائے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ حدیث قابلِ تأویل ہے۔''

جواب ۱:- جانوروں کا ایک دُوسرے سے بدلہ لینا بعض احادیث سے ثابت ہے اور یہ غیر مکلّف ہونے کے منافی نہیں ہے،(۱) صرف مظالم کا حساب لے لیا جائے تو یہ بھی مستبعد نہیں، لیکن حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، اور چونکہ اس مسئلے کا تعلق انسان کے عمل سے نہیں ہے اس لئے اس کی بحث وتدقیق میں پڑنا فضول ہے۔

س۲:- جنت میں جیسے مردوں کو رُوئیتِ باری ہوگی، کیا اسی طرح عورتوں کو بھی ہوگی؟ اس ضمن میں ایک صاحب کی رائے یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کو اکٹھے رُوئیت نصیب ہوگی اور پردہ کا وہاں حکم نہ ہوگا، کیونکہ پردہ صرف دُنیا کے لئے ہے۔ دُوسرے صاحب کی رائے یہ ہے کہ جنت میں بھی پردہ ہوگا، اور عورتوں کو رُوئیتِ باری تعالیٰ نصیب نہ ہوگی، اور اگر ہوئی تو مردوں کے ساتھ نہ ہوگی۔

ج۲:- اکثر حضراتِ علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ رُوئیت عورتوں کو بھی ہوگی،(۲) جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے تصریح فرمائی ہے۔ باقی اس کی تفصیلات اللہ ہی جانتا ہے، اس قسم کی بحثوں میں پڑنے کے بجائے عملی مسائل معلوم کرنے میں وقت صَرف کیجئے۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۶۳۱ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی تفسیر رُوح المعانی (ج:۳۰ ص:۵۱) تحت الأیة: "وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ" .... ولا یحشر القیامة غیر الثقلین وقیل بعثت للقصاص فیحشر کل شیٔ حتی الذباب، وروی ذٰلک عن ابن عباسؓ أیضًا وعن قتادةؒ وجماعة وفی روایة عن الحبر تحشر الوحوش حتی یقتص من بعضها لبعض فیقتص للجمّا من القرنا ثم یقال لها: موتی، فتموت، وقیل اذا قضی بینها ردّت ترابا. وفیه أیضًا بعد أسطر ج:۳۰ ص:۵۱، ۵۲ فقد أخرج مسلم والترمذی عن أبی هریرةؓ فی هٰذه الأیة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لتؤدن الحقوق الی أهلها یوم القیامة حتّی یقاد للشاة الجماء من الشاة القرناء. اور مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہٗ "وَيَقُوْلُ الْكَافِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرَابًا" الآیۃ، کے تحت معارف القرآن ج:۸ ص:۶۵۹ میں تحریر فرماتے ہیں: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ: قیامت کے دن ساری زمین ایک سطح مستوی ہوجائے گی، جس میں انسان، جنات، زمین پر چلنے والے پالتو جانور اور وحشی جانور سب جمع کردیئے جائیں گے، اور جانوروں میں سے اگر کسی نے دُوسرے پر ظلم دُنیا میں کیا تھا تو اس سے اس کا انتقام دِلوایا جائے گا، یہاں تک کہ اگر کسی سینگ والی بکری نے بے سینگ بکری کو مارا تھا تو آج اس کا بھی بدلہ دِلوایا جائے گا، جب اس سے فراغت ہوگی تو سب جانوروں کو حکم ہوگا کہ مٹی ہوجاؤ، وہ سب مٹی ہوجائیں گے۔ اس وقت کافر لوگ یہ تمنا کریں گے کہ کاش! ہم بھی جانور ہوتے اور اس وقت مٹی ہوجاتے، حساب وکتاب اور جہنم کی سزا سے بچ جاتے۔'' وکذا فی رُوح المعانی ج:۳۰ ص:۲۲.

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: اعتقاد أهل السنة والجماعة للامام ابن الحسن بن منصور الطبری اللالکائی ص:۵۰۳ تا ۵۷۸۔

عقیدۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سوال: -محترم مولانا محمد تقی عثمانی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نے ایک خط آنجناب کو ارسال کیا تھا، لیکن جواب سے محروم رہا، اس خط میں یہ مذکور تھا کہ قرآن کے مطالعے سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مسلمان عام طور سے دینی معاملات میں اَحکامِ قرآن کے خلاف عمل کر رہے ہیں، ایسا کیوں ہے؟ یہ میں سمجھ نہیں سکا۔

قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہر شخص کو موت آتی ہے، اور پھر وہ قیامت کے دن اُٹھایا جائے گا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر اچھی طرح اس کی وضاحت کردی تھی، لیکن عام مسلمان حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حیاتِ اولیاء کے قائل ہیں، اور ان کے تصرفات کے عجیب وغریب واقعات بیان کرتے رہتے ہیں۔

جواب: -مکرمی ومحترمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا پہلا خط مجھے ملنا یاد نہیں، بہرکیف! آپ کے سوال کا جواب عرض ذیل ہے:-

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سمیت تمام مخلوقات کو موت آتی ہے، البتہ موت کے بعد ہر انسان کو برزخی زندگی سے واسطہ پڑتا ہے، برزخی زندگی کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان کی رُوح کا اس کے جسم سے کسی قدر تعلق رہتا ہے، یہ تعلق عام انسانوں میں بھی ہوتا ہے، مگر اتنا کم کہ اس کے اثرات محسوس نہیں ہوتے۔ شہداء کی ارواح کا تعلق ان کے جسم سے عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے قرآنِ کریم نے انہیں احیاء قرار دیا ہے،(۱) اور انبیائے کرام کا درجہ شہداء سے بھی بلند ہے، اس لئے احادیث کے مطابق اِن کی ارواح کا تعلق جسم سے سب سے زیادہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ ان کی میراث بھی تقسیم نہیں ہوتی اور ان کے ازواج کا نکاح بھی دُوسرا نہیں ہوسکتا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے،(۲) چونکہ ان کی ارواح کا تعلق سب سے زیادہ ہوتا ہے، اس لئے شہداء کی طرح انہیں بھی احیاء قرار دیا گیا ہے، مگر یہ حیات اس طرح کی نہیں ہے جیسی انہیں موت سے پہلے حاصل تھی، نیز قرآن وسنت میں اس کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس حالت میں انبیائے کرام علیہم السلام کو دُوسروں پر تصرف کا کوئی اختیار حاصل ہے، اگر کسی نے کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ دیکھا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی صورتِ مثالی ہوسکتی ہے جس کا ان کو علم ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۲۲/۸/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۵۰۵)

---

(۱) "ولا تقولوا لمن يقتل في سبيل الله امواتٌ بل احياءٌ ولكن لا تشعرون." (البقرة: ۱۵۴)

(۲) "ولا ان تنكحوا ازواجه من بعده ابدا." (الأحزاب: ۵۳)

شیخ احمد کے مروّجہ وصیت نامہ کا حکم

سوال:- جو اشتہار کبھی کبھار لوگ شائع کرتے ہیں، یعنی وہ معروف وصیت نامہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کے خادم کی طرف منسوب ہوتا ہے، اس میں جو کچھ تحریر ہے وہ دُرست ہے یا نہیں؟ مثلاً جو اس کو پڑھے گا وہ اس کو شائع کرے، اگر ایسا نہیں کرے گا تو نقصان اُٹھائے گا، انکار کرنے والا سخت عذاب میں مبتلا ہوگا، جو پڑھ کر شائع نہ کرے مسلمان نہ رہے گا۔

جواب:- منسلکہ وصیت نامہ میں بنیادی طور سے جو بات کہی گئی ہے کہ مسلمان اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور اسلامی اَحکام کے مطابق زندگی گزاریں، وہ بالکل صحیح اور دُرست ہے۔ اس کی جتنی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے بہتر ہے، لیکن پڑھنے والے کے ذمہ خاص تعداد میں بعینہٖ اسی وصیت نامہ کو شائع کرنے کو لازمی قرار دینا، اور جو نہ کرسکے اس کو نقصان کی دھمکی دینا شرعاً اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۹۰/۱۸ الف)

یہ وصیت نامہ سالہا سال سے شائع ہوتا ہے، جس کو تقریباً ۸۰ سال گزر چکے ہیں، کسی شخص نے خود ہی بنالیا ہے، روضۂ اطہر کا کوئی خادم شیخ احمد نہ اب ہے، نہ اُس وقت تھا جب یہ وصیت نامہ نیا نیا شائع ہوا تھا، اُس وقت علماء نے تحقیق کی تھی۔ لہٰذا نقصان کی دھمکی کی کوئی پروا نہ کریں۔

محمد عاشق الٰہی بلند شہری عفی عنہ

جب جنت میں شیطان نہیں جاسکتا تو اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا کیسے دیا؟

سوال:- جنت کے اندر تو شیطان نہیں جاسکتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا پھر کیسے دیا؟ اور دھوکا صرف آدم علیہ السلام کو دیا یا آدم وحوا علیہما السلام دونوں کو دیا؟ اور پہلے کس کو دیا؟

جواب:- قرآنِ کریم میں صراحت ہے کہ شیطان نے وسوسہ ڈالا[1]، اور اس کام کے لئے جنت میں جانا کیا ضروری تھا؟

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۰۳ ب)

---

(۱) "فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ" الآية. (سورة الأعراف: ۲۰).

﴿فصل فی کلمات الکفر وأفعال الکفر وما یکون کفرًا وما لا یکون کفرًا﴾

(کفریہ وغیر کفریہ کلمات اور افعال سے متعلق مسائل کا بیان)

موسیقی سننے والے کو کافر کہنا

سوال ۱:- کیا میراسی، گانا گانے والے کافر ہیں؟

۲:- اگر نہیں تو ہمارے ہاں ایک صاحب انہیں کافر کہتے ہیں، کیا یہ دُرست ہے؟

جواب ۱:- آلاتِ موسیقی میں مشغولیت سخت گناہ ہے، احادیث میں اس پر شدید وعید آئی ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو اس سے بچنا لازم ہے،(۱) لیکن اس گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہوتا تاوقتیکہ اس کے عقائد کفریہ نہ ہوں۔

۲:- جن صاحب نے میراسیوں کو کافر کہا ہے، انہوں نے سخت غلطی کی، انہیں توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے۔(۲)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

کسی کافر ملک کا ویزا حاصل کرنے کے لئے ویزا فارم میں اپنے آپ کو قادیانی لکھنے کا حکم

سوال:- خدا کرے حضرت بعافیتِ کاملہ ہوں، ان دنوں یہ مسئلہ زیرِ غور ہے کہ بعض مسلمان کسی کافر ملک کا ویزا سہولت سے حاصل کرنے کے لئے یا کسی اور دُنیاوی مصلحت کے لئے پاسپورٹ اور ویزا کے فارم میں اپنے آپ کو قادیانی لکھ دیتے ہیں۔ اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ یہ انتہائی قبیح حرکت اور بڑا گناہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے شخص کی تکفیر کی جائے گی یا نہیں؟ یہاں دارالافتاء میں

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی کتاب ''اسلام اور موسیقی''۔

(۲) وفی مشکوٰة المصابیح باب حفظ اللسان والغیبة والشتم ج:۲ ص:۴۱۱ رقم الحدیث:۴۸۱۴ (طبع قدیمی کتب خانه) سباب المسلم فسوق وقتاله کفر. وفی جامع الترمذی ج:۲ ص:۸۸ (طبع فاروقی کتب خانه) عن ابن عمرؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: أیما رجل قال لأخیه کافر، فقد باء بها أحدهما. هٰذا حدیث صحیح.

اس سلسلے میں استفتاء بھی آیا ہوا ہے، اس سلسلے میں غور کرنے سے جو نقطۂ نظر سامنے آیا ہے اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔ آخر میں چند متعلقہ عبارات بھی ذکر کردی گئی ہیں، جناب سے درخواست ہے کہ اپنی رائے گرامی سے مطلع فرمائیں۔

۱:- کسی کلمے کے موجبِ کفر ہونے، نہ ہونے میں اختلاف ہو تو احتیاط عدمِ تکفیر میں ہوتی ہے۔

۲:- جو کلمہ فی نفسہٖ موجبِ کفر ہو اس کے تلفظ و تکلم کی کئی صورتیں ہیں۔

۱:- ناسیاً یا خاطئاً تکلم ہو، اس صورت میں بالاتفاق تکفیر نہیں کی جائے گی۔

۲:- عامداً تکلم ہو، معلوم ہوتا ہے کہ عمد سے مراد یہ ہے کہ تکلم کا قصد بھی ہو، اس کلمے کے موجبِ کفر ہونے کا علم بھی ہو اور کفر کا ارادہ بھی ہو، اس صورت میں بالاتفاق تکفیر کی جائے گی۔

۳:- جاہلاً تکلم ہو، یعنی تکلم تو ارادے سے ہو، مگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس سے آدمی کافر ہوجاتا ہے، اس صورت میں اختلاف ہے، تکفیر و عدمِ تکفیر دونوں قول ہیں۔

۴:- ہازلاً تکلم ہو، یعنی تکلم تو ارادے سے ہو اور اس کے موجبِ کفر ہونے کا علم بھی تھا، مگر ایقاعِ حکم یعنی کفر کا ارادہ نہیں تھا، اس صورت میں تکفیر کی جاتی ہے۔

۵:- لاعباً تکلم ہو، یعنی بطور استہزاء کے کلمۂ کفر کہا جائے، یہ استخفافِ ایمان ہے اور اس کی بھی تکفیر کی جاتی ہے۔

اس تفصیل کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے آپ کو قادیانی لکھتے ہوئے اگر علم ہو کہ یہ باعثِ کفر ہے، لیکن اعتقاد کفر نہ ہو تو یہ لاعباً یا ہازلاً تکلم قرار پائے گا اور اس صورت میں تکفیر ہوگی، اور اگر موجبِ کفر ہونے کا علم نہ ہوتے ہوئے لکھا گیا ہے تو اختلاف کی بناء پر احتیاط اس میں ہے کہ تکفیر نہ کی جائے۔

چند عبارات یہ ہیں:-

فی البحر: وفی فتح القدیر: ومن هزل بلفظ كفر ارتد وان لم يعتقده للاستخفاف، فهو ككفر العناد والألفاظ التی يكفر بها تعرف فی الفتاویٰ اهـ. (ج:۵ ص:۱۲۰ طبع ایچ ایم سعید).

وفی الفتاویٰ الخيرية: وفی الفتاویٰ اذا أطلق الرجل كلمة الكفر عمدًا لٰكنه لم يعتقد الكفر قال بعض أصحابنا: لا يكفر لأن الكفر يتعلق بالضمير ولم يعقد الضمير على الكفر وقال بعضهم: يكفر، وهو الصحيح عندی، لأنه استخف بذنبه اهـ. وفی الخلاصة: اذا كان فی المسئلة وجوه توجب التكفير ووجه واحد يمنع التكفير، فعلى المفتی أن يميل الى الوجه الذی يمنع التكفير تحسينًا للظن بالمسلم. زاد فی البزازية الا اذا خرج بارادته موجب الكفر فلا ينفعه التأويل حينئذ. وفی التاترخانية: لا يكفر بالمحتمل، لأن الكفر نهاية فی

العقوبة، فيستدعى نهاية فى الجناية، ومع الاحتمال لا نهاية اهـ. قال فى البحر: والحاصل أن من تكلم بكلمة الكفر هازلًا أو لاعبًا كفر عند الكل، ولا اعتبار باعتقاده كما صرح به قاضى خان فى فتاواه. ومن تكلم بها خطأ أو مكرها لا يكفر عند الكل، ومن تكلم بها عامدا عالما كفر بها عند الكل، ومن تكلم بها اختيارا جاهلًا بأنها كفر ففيه اختلاف، والذى تحرر أنه لا يفتى بتكفير مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن أو كان فى كفره اختلاف ولو رواية ضعيفة، فعلى هذا فأكثر ألفاظ التكفير المذكورة لا يفتى بالتكفير بها، ولقد ألزمت نفسى أن لا أفتى بشئ منها، والله أعلم. (الخيرية على هامش الفتاوىٰ تنقيح الحامدية ج: ۱ ص: ۱۷۷)۔[1]

وفى أحكام القرآن للجصاص: ولأن الفرق بين الجد والهزل أن الجاد قاصد الى اللفظ والى ايقاع حكمه، والهازل قاصد الى اللفظ غير مريد لايقاع حكمه. (ج: ۳ ص: ۱۹۳)۔[2]

وفى التفسيرات الأحمدية: وكذا غير المكره اذا أجرى على لسانه كلمة الكفر استهزاء أو جهلًا يكون كافرًا، فيكون الاية دليلًا على أن ركن الايمان التصديق والاقرار جميعًا، ولكن التصديق لا يحتمل السقوط بحال، والاقرار يحتمله فى حالة الاكراه. (ص: ۵۰۱)۔[3]

پھر دو باتیں اور قابلِ غور ہیں، ایک یہ کہ عام لوگوں کی دینی گرفت اس قدر ڈھیلی ہوچکی ہے کہ تکفیر کا فتویٰ معلوم ہونے کے باوجود بھی بہت سے دُنیاوی مفاد کو ترجیح دیں گے اور یہ حرکت نہیں چھوڑیں گے، اور تکفیر کے فتویٰ کا علم ہوجانے کے بعد یہ حرکت بہرحال کفر ہوگی، تو تکفیر کا فتویٰ دینے کی صورت میں بظاہر یہ مضائقہ ہے کہ کفر سے بچنے کا جو ایک راستہ تھا وہ بھی بند ہوجائے گا ..... دُوسری بات یہ کہ اگر تکفیر نہ کی جائے تو خطرہ ہے کہ تکفیر نہ کرنا اس حرکت کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوگا۔ ان دونوں باتوں پر غور کرتے ہوئے تقاضائے مصلحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ بتاتے یا لکھتے ہوئے صاف تکفیر تو نہ کی جائے تاکہ پہلا حرج لازم نہ آئے، البتہ مذمت و وعید کے الفاظ سخت بتائے جائیں، لیکن یہ بھی تب دُرست ہوگا کہ فقہی طور پر اس کی گنجائش ہو۔

جواب:- کسی کافر ملک کا ویزہ حاصل کرنے کے لئے یا کسی اور دُنیوی مصلحت کے لئے پاسپورٹ اور ویزا فارم پر مذہب کے خانے میں کسی مسلمان کا دیدہ دانستہ اپنے آپ کو قادیانی لکھنا، صراحۃً کافر مذہب کی طرف اپنی نسبت کرنا ہے، جو سراسر موجبِ کفر ہے، اگر کوئی ایسا کرلے تو ایسے شخص پر واجب ہے کہ فوراً صدقِ دِل سے توبہ کرلے اور تجدیدِ ایمان کرے، اور آئندہ ایسا کرنے سے مکمل پرہیز کرے۔

---

(۱) طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔ (۲) طبع سہیل اکیڈمی لاہور۔ (۳) مطبع کریمی بمبئی۔

آپ نے خط میں جو عباراتِ فقہاء تحریر کی ہیں، ان کا مذکورہ مسئلہ سے تعلق نہیں، اور کسی دُنیاوی غرض سے اپنے آپ کو غیر مسلم ظاہر کرنے کے بارے میں تلاشِ بسیار کے باوجود کوئی واضح تصریح بھی نہیں ملی، البتہ درج ذیل جزئیات سے بیان کردہ حکم کی تائید ہوتی ہے:-

فی الهندية: مسلم قال: أنا ملحد، يكفر، ولو قال: ما علمت أنه كفر، لا يعزر بهذا.....

وفی اليتيمة: سألت والدی عن رجل قال: أنا فرعون أو ابليس، فحينئذ يكفر كذا فی التاتارخانية.(۱)

فی الهندية: مسلم رأى نصرانية سمينة فتمنى أن يكون هو نصرانيًا حتّى يتزوجها يكفر، كذا فی المحيط. (ج:۲ ص:۲۷۷)۔(۲)

واللہ اعلم

بندہ عبدالرؤف سکھروی

۱۴۱۴/۶/۲۱ھ

یہ جواب احقر کی ہدایت پر لکھا گیا ہے، دراصل کوئی کلمۂ کفر کہنا اور بات ہے، اور اپنے آپ کو کسی معروف کافر مذہب کی طرف منسوب کرنا اور بات ہے۔ جو عبارات تحریر کی گئی ہیں وہ اوّل الذکر صورت سے متعلق ہیں، ثانی الذکر سے نہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں احقر کا رُجحان اسی طرف ہے کہ پاسپورٹ پر مذہب کے خانے میں اپنے آپ کو ''مسلمان'' کے بجائے قادیانی یا کسی اور مذہب کا پیرو لکھوانا جو ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے، موجبِ کفر ہے، جس سے توبہ اور تجدیدِ ایمان ضروری ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۴/۶/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۳/۲۵)

قادیانیت سے براءت اور کسی مسلمان کو قادیانی کہنے کا حکم

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

من مسمّٰی بشیر احمد شاہ ولد سیّد محمد اسماعیل شاہ سکنہ سمارو شہر ضلع نوپاکر سندھ مندرجہ ذیل عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے سب فرشتوں اور اس کی سب کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر کی بھلائی اور بُرائی پر اور مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھائے جانے پر ایمان رکھتا ہوں، ایمانِ مجمل اور مفصل پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میں حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ میں خاتم النبیین

---

(۱) الفتاویٰ الهندية ج:۲ ص:۲۷۹ (طبع مكتبه رشيديه).

(۲) الفتاویٰ الهندية ج:۲ ص:۲۸۰ (طبع مكتبه رشيديه).

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوّت پر مکمل اور غیر مشروط طور پر ایمان رکھتا ہوں، اور یہ کہ میں کسی ایسے شخص کا پیروکار نہیں ہوں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس لفظ کے کسی بھی مفہوم یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعوے دار ہو، اور نہ ہی ایسے دعویدار کو پیغمبر یا مذہبی مصلح مانتا ہوں، نہ قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ سے تعلق رکھتا ہوں یا خود کو احمدی کہتا ہوں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص کسی معنی کے لحاظ یا اعتبار سے نبی یا مذہبی مصلح ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کو اور اس کے ماننے والوں کو مرتد و کافر جانتا ہوں۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے ماننے والے احمدی اور لاہوری گروپ سب کو غیر مسلم اور اسلام سے خارج ہونے پر ایمان رکھتا ہوں۔ میرا یہ بیان حلفیہ ہے اور میں کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر بالکل صحیح اور دُرست تحریر کرتا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرے مندرجہ بالا عقیدے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فتویٰ صادر فرمائیں کہ:-

۱:- عقیدے کے اعتبار سے میں شریعتِ محمدیہ کے مطابق مسلمان ہوں یا نہیں؟

۲:- کیا مجھے قادیانی کہا جانا دُرست ہے؟

۳:- اگر کوئی شخص مجھے قادیانی کہتا ہے تو شریعتِ محمدیہ میں اس کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- اگر آپ کے وہی عقائد ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، اور ان کے علاوہ کوئی فاسد عقیدہ بھی نہیں رکھتے، تو آپ بلاشبہ مسلمان ہیں۔

۲:- مندرجۂ سوال عقائد کا حامل شخص قادیانی نہیں ہوسکتا، اس کو قادیانی کہنا ہرگز دُرست نہیں۔

۳:- کسی مسلمان کو بلاوجہ قادیانی کہنا سخت گناہ ہے،[1] اگر ناواقفیت یا بے احتیاطی سے کہا ہے تو اسے فوراً توبہ کرنی چاہئے، اور اگر کسی غلط فہمی کی بناء پر کہا ہے تو اس کی غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۷/۸/۱۴۰۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴/۱۴۴۴ ح)

علماء کو بُرا بھلا کہنے والے کا حکم

سوال:- ایک شخص علمائے دین کو لوطی کہتا ہے، اور کہتا ہے کہ دین فروشی ان کا پیشہ ہے، اور علمِ دین پڑھا کر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، علمائے دین بدمعاش ہیں، مدارسِ عربیہ گمراہی کے اَڈّے

---

(۱) وفی مشکوة المصابیح "باب حفظ اللسان والغیبة والشتم" ج:۲ ص:۴۱۱ رقم الحدیث:۴۸۱۴ سباب المسلم فسوق وقتاله کفر. وفی الهدایة ج:۲ ص:۵۳۵ (طبع مکتبه شرکت علمیه) وکذا اذا قذف مسلمًا بغیر الزنا، فقال: یا فاسق أو یا کافر، فوجب التعذیر.

ہیں، اور مسجدوں کو اصطبل خانہ قرار دے اور مزید لغویات و بیہودہ باتوں کا کہنا اس وقت مذکورہ شخص کا پیشہ بن گیا ہے، اور موصوف عاقل، بالغ و ذی فہم آدمی ہے۔ اب شرعاً اس شخص کا کیا حکم ہے؟

جواب: - مذکورہ کلمات سخت گستاخانہ ہیں، اور تحقیق کے بغیر علماء کی پوری جماعت کو اس قسم کے قبیح و شنیع کلمات کہنا نہ صرف بدترین فسق اور گمراہی ہے، بلکہ ان کلمات کے کلماتِ کفریہ ہونے کا اندیشہ ہے۔[1] مذکورہ شخص پر واجب ہے کہ فوراً ان کلمات سے صدقِ دِل کے ساتھ اعلانیہ توبہ کرے بلکہ اسے احتیاطاً تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح بھی کرلینی چاہئے، اور جب تک وہ اپنے اس عمل سے توبہ نہ کرلے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھیں۔[2]

واللہ اعلم

۲۳/۳/۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۴۰۵ ب)

حدیث کے ناقابلِ اعتبار ہونے اور جہنم کے دائمی نہ ہونے کا عقیدہ رکھنا

سوال: - کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیانِ شرع مندرجہ ذیل مسئلے میں کہ:-

۱:- ہمارے علاقے کے بعض حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ وقت میں حدیث کا جو ذخیرہ ہے وہ غیر معتبر اور جلانے کے قابل ہے۔ (معاذ اللہ)

۲:- ایک اور عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ جنت دائمی اور غیر فانی ہے، مگر جہنم دائمی و ابدی نہیں ہے، یعنی جہنم ایک مدّت کے بعد فانی اور غیر ابدی ہے، اور کہتے ہیں کہ اس کی انتہاء ہونے کے بعد انسان سارے کے سارے یعنی مشرک و کافر رحمت (جنت) میں جائیں گے اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں "ان رحمتی سبقت علی غضبی" اور ساتھ ساتھ مولانا شبلی نعمانی کی کتاب سیرت النبی چہارم میں دوزخ کی انتہاء کے مبحث لوگوں کو دِکھا دِکھا کر لوگوں کے ذہنوں کو خراب کرتے جا رہے ہیں، اب آپ بتائیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ شریعتِ محمدی کے مطابق ہے یا نہیں؟

جواب: - مذکورہ عقائد سخت گمراہانہ عقائد ہیں۔ پہلا عقیدہ کہ سارا ذخیرۂ حدیث (معاذ اللہ)

---

(۱) وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۸۸ (مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) (ألفاظ الكفر) من أبغض عالمًا بغير سبب ظاهر خيف عليه الكفر. وراجع أيضًا شرح الفقه الأكبر لمُلّا على القاری ص:۴۷۰ (طبع دار الاشاعت الاسلامیه بیروت).

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ رشیدیه ص:۶۸ و امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۳۹۳ و امداد الأحكام ج:۱ ص:۱۲۵.

نا قابلِ اعتبار ہے، کفریہ عقیدہ ہے، جس کے بعد انسان دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے،[1] اور دُوسرے عقیدے پر بھی کفر کا اندیشہ ہے۔ ایسے عقائد کے شخص سے جب تک وہ توبہ نہ کرے دوستانہ خصوصی تعلقات نہ رکھنا چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۹/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۲۷۲ د)

مسلمان کو کافر کہنے والے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ مسمّٰی مولانا ذاکراللہ سواتی حال ساکن لوند خوردہ آدہ نے اس بارے میں فتویٰ جاری کیا ہے کہ انجمن اشاعت التوحید والسنّت کے افراد سب کافر اور ان کی عورتوں سے نکاح ناجائز ہے، اور محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ اور ابنِ تیمیہؒ اور اسماعیل شہیدؒ اور دیوبندیوں کو بھی کافر کہتے ہیں، کیا مولانا موصوف اس فتویٰ کی رُو سے کافر ہے یا نہیں؟

جواب:- کسی مسلمان کا کافر کہنا سخت گناہ ہے، اور جو شخص ایسا کہے وہ فاسق ہے،[2] لیکن اس غلطی کی بناء پر اسے مطلقاً کافر بھی نہیں کہا جاسکتا،[3] تاوقتیکہ اس کے دُوسرے بنیادی عقائد خراب نہ ہوں، البتہ خطرۂ کفر سے خالی نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۰۱/۷/۵ھ

---

(۱) وفی البزازیة علی هامش الهندیة ج:۶ ص:۳۲۸ (طبع مکتبه حقانیه پشاور) اذا استخف بسنة أو حدیث من أحادیثه علیه السلام کفر. وفی الهندیة ج:۲ ص:۲۶۵ (طبع مکتبه رشیدیه کوئته) (الباب التاسع، أحکام المرتدین) من أنکر المتواتر فقد کفر، ومن أنکر المشهور یکفر عند البعض. وقال عیسی ابن ابان: یضلل ولا یکفر وهو الصحیح، ومن أنکر خبر الواحد لا یکفر غیر أنه یأثم بترک القبول. وفی شرح الفقه الأکبر ص:۴۷۳ (طبع دار البشائر الاسلامیة بیروت، فصل فی العلم والعلماء) من قال لفقیه یذکر شیئًا من العلم أو یروی حدیثًا صحیحًا أی ثابتًا لا موضوعا: هذا لیس بشئ، کفر .... الخ.

(۲) وفی مشکوة المصابیح باب حفظ اللسان والغیبة والشتم ج:۲ ص:۴۱۱، رقم الحدیث:۴۸۱۴ (طبع قدیمی کتب خانه) سباب المسلم فسوق وقتاله کفر.

(۳) عن ابن عمرؓ عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: أیما رجل قال لأخیه: کافر، فقد باء بها أحدهما. هذا حدیث صحیح، جامع الترمذی ج:۲ ص:۸۸ (طبع فاروقی کتب خانه). وفی اللمعات والطیبی: انه محمول علی المستحل لذلک .... أو لأنه فعل مثل فعل الکافر. (حواله مذکوره) وفی الدر المختار ج:۴ ص:۲۲۹، ۲۳۰ واعلم أنه لا یفتی بکفر مسلم أمکن حمل کلامه علی محمل حسن أو کان فی کفره خلاف، ولو کان ذلک روایة ضعیفة. وقال الشامیؒ تحت مطلب فی حکم من شتم دین مسلم (ج:۴ ص:۲۳۰): ثم ان مقتضی کلامهم أیضًا أنه لا یکفر بشتم دین مسلم أی لا یحکم بکفره لامکان التأویل، ثم رأیته فی جامع الفصولین حیث قال بعد کلام أقول، وعلی هذا ینبغی أن یکفر من شتم دین مسلم ولکن یمکن التأویل بأن مراده أخلاقه الردیئة ومعاملته القبیحة لا حقیقة دین الاسلام فینبغی أن لا یکفر حینئذ، والله تعالی أعلم.

''اگر فلاں کام کروں تو کافر ہوجاؤں'' کہنے کا حکم

سوال:- اگر بیوی نے کئی مرتبہ کہا: اب بھی نماز نہیں پڑھی تو "من ترک الصلاة متعمدًا فقد کفر"، یا اگر بیوی نے کہہ دیا کہ: ''فلاں کام کروں تو کافر ہوجاؤں'' اور وہ کام کردیا یا بھول کر کوئی کفریہ فقرہ کہہ دیا (کفر حاصل کرنے کی غرض سے نہیں) تو کیا ان صورتوں میں وہ کافر ہوجائے گی یا طلاق ہوجائے گی؟

جواب:- جان بوجھ کر نماز چھوڑنا انتہائی شدید گناہ ہے، لیکن اس سے انسان کافر نہیں ہوتا،(۱) اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ ''میں اگر فلاں کام کروں تو کافر ہوجاؤں'' تو اتنا کہنے سے بھی کافر نہیں ہوتا، اور اگر وہ کام کرلے تب بھی کافر نہیں ہوتا، اِلّا یہ کہ وہ سمجھتا ہو کہ یہ کام کرنے سے میں واقعی کافر ہوجاؤں گا اور پھر بھی کفر پر راضی ہوکر وہ کام کرلے۔

لما فی الدر المختار: وان فعل کذا فهو کافر، والأصح أن الحالف لم یکفر علقه بماض أو آت ان کان عنده فی اعتقاده أنه یمین، وان کان عنده أنه یکفر فی الحلف یکفر فیهما. (شامی ج:۳ ص:۵۵)۔(۲)

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۰۶/۲۸ ب)

''میں ہندو ہوں'' کہنے کا حکم

سوال:- اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے کہ جس سے کہا جائے کہ رمضان کا مہینہ ہے، قرآن پاک کی تلاوت کیوں نہیں کرتا؟ تو مسلمان نہیں ہے؟ تو اس کا جواب یہ دے: ''ہاں! میں مسلمان نہیں ہوں بلکہ ہندو یا سکھ ہوں۔'' کیا وہ مسلمان رہتا ہے اور اس کا نکاح باقی رہتا ہے؟

جواب:- یہ کلمہ کہ ''ہاں میں مسلمان نہیں ہوں، ہندو یا سکھ ہوں'' کلمۂ کفر ہے، اور اگر اس کا

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۳۵ وتارکها عمدًا مجانةً أی تکاسلاً فاسق .... الخ. وکذا فی شرح المسلم للنووی ج:۱ ص:۶۱.

(۲) الدر المختار ج:۳ ص:۷۱۷، ۷۱۸. وفی البزازیة علی هامش الهندیة ج:۶ ص:۳۲۶ (طبع رشیدیه کوئٹه) ان فعل کذا فهو یهودی ثم أتی بالشرط ان کان عنده من أتی بهذا الشرط لا یکفر کانت علیه کفارة الحلف، وان حلف بهذه أعنی بقوله هو یهودی أو نصرانی أو مجوسی ان کان فعل کذا وقد کان فعله هو عالم بفعله لا یلزم الکفارة لأنه غموس وقد اختلفت الأجوبة فی کفره والمختار ما قال السرخسی وبکر انه ان کان کفرا عنده الحلف بهذا فهو کافر لأنه رضی بکفر نفسه، والرضا بکفر نفسه کفر بلا نزاع .... الخ.

وہی مطلب مراد تھا جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے تو انسان ان کلمات کے کہنے سے کافر ہوجاتا ہے،[1] ایسے شخص کو توبہ کے بعد ایمان کی تجدید اور نکاح کی تجدید کرنی لازم ہے، اور اگر مقصد کچھ اور تھا تو وہ لکھ کر دوبارہ سوال کرلیں۔ تجدید ایمان اور تجدید نکاح ہر صورت میں کرلینی چاہئے، کیونکہ یہ بڑا خطرناک اور سنگین جملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسی بات کہنے سے محفوظ رکھیں، آمین۔ واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۱۲ ج)

اذان کی گستاخی کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مؤذّن کے متعلق جو کہ پانچ وقت جامع مسجد میں اذان دیتا ہے، ۵-۶ دفعہ میرے سامنے کہا کہ: ''یہ مؤذّن صبح کے وقت زیادہ بکواس کرتا ہے، جس سے میری نیند میں خلل آتا ہے، اس کو منع کرو کہ صبح کے وقت اذان نہ دیا کرے۔'' ایک شخص نے اس شخص کو کسی بیمار کو انجکشن لگانے کا کہا تو اس نے کہا کہ: ''جب تک مؤذّن سے اذان بند نہیں کرائیں گے، بیمار کو انجکشن نہیں لگاؤں گا۔'' اس شخص کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:- جس شخص نے اذانِ فجر کے بارے میں ایسے گستاخانہ کلمات کہے ہوں وہ انتہائی بدعقیدہ معلوم ہوتا ہے، یہ کلمات کفر کے ہیں،[2] اس شخص کو چاہئے کہ فوراً اپنے ان کلمات سے توبہ کرکے ایمان کی تجدید کرے، اور جب تک وہ ایسا نہ کرے مسلمانوں کو اس سے خصوصی تعلقات نہ رکھنے چاہئیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۷۶ ج)

''میں کافر ہوجاؤں گا، پتھروں کی پوجا کروں گا، اللہ تعالیٰ سے لڑائی کروں گا'' وغیرہ الفاظ کہنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے چند آدمیوں کے درمیان یہ الفاظ کہے ہیں کہ: ''میں کافر ہوجاؤں

---

(۱) وفی الهندية ج:۲ ص:۲۷۹ مسلم قال: أنا ملحد، يكفر. ولو قال: ما علمت انه كفر، لا يعزر بهذا .... وفی اليتيمة: سألت والدی عن رجل قال: أنا فرعون أو ابليس فحينئذ يكفر، كذا فی التاتارخانية. وفی جامع الفصولين ج:۲ ص:۳۰۱ (طبع اسلامی كتب خانه) قال: هو يهودی أو نصرانی .... كفر .... لأنه رضاء بالكفر، وهو كفر، وعليه الفتوىٰ. وفی الهندية ج:۲ ص:۲۵۷ (أحكام المرتدين) ومن يرضی بكفر نفسه فقد كفر، وكذا فی التاتارخانية ج:۵ ص:۴۶۰.

(۲) وفی الهندية ج:۲ ص:۲۶۹ (مكتبه رشيديه كوئٹه) فی التخيير: مؤذّن أذّن فقال رجل: أين بانگ غوغا است، يكفر ان قال علىٰ وجه الانكار، وفی الفصول ولو سمع الأذان فقال: هذا صوت الجرس، يكفر كذا فی التتارخانية، وراجع أيضًا البحر الرائق ج:۵ ص:۱۲۲ أحكام المرتدين. (محمد زبير عفی عنه)

گا، پتھروں کی پوجا کروں گا، اور اللہ تعالیٰ سے لڑائی کروں گا، داڑھی کٹوادوں گا'' جب لوگوں نے گرفت کی تو اس نے چند آدمیوں کے سامنے کلمہ پڑھ کر جھوٹ بولا کہ میں نے ایسا نہیں کہا ہے، جبکہ اس کے اس قول کے پورے محلّہ والے گواہ ہیں، اور بغیر تصدیق کئے اس نے الزام تراشی بھی کی ہے، تصدیق کرنے پر محلّہ کے چند آدمیوں کے سامنے یہ اقرار کیا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، اب وہ معافی مانگ رہا ہے۔ اس کا شرعی فتویٰ کیا ہے اور وہ اب اپنے ''کافر ہوجاؤں گا.... الخ'' الفاظ سے توبہ کررہا ہے تو اس توبہ کی کیا صورت اختیار کی جائے؟

جواب: – صورتِ مسئولہ میں مذکورہ شخص نے یہ الفاظ کہہ کر سنگین گناہ کا ارتکاب کیا، اسے فوراً صدقِ دِل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے، توبہ کی صورت یہ ہے کہ صدقِ دِل سے اللہ تعالیٰ سے عرض کرے کہ: ''یا اللہ! میں نے مذکورہ کلمات کہہ کر سخت گمراہی کا ارتکاب کیا، میں اس پر بے حد نادم و شرمسار ہوں، آئندہ کے لئے ایسے کلمات سے اور ہر طرح کے کفریہ کلمات و اعمال سے براءت کا اظہار کرتا ہوں، یا اللہ! مجھے اپنے فضل سے معاف فرمادیجئے۔'' اس کے ساتھ ہی احتیاطاً ایمانِ مفصل کی شہادت اور اسلام کے سوا ہر دین سے اپنی مکمل براءت کا بھی لوگوں کے سامنے اظہار و اعلان کرے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۲۶۴ الف)

قرآنِ کریم میں لفظی تحریف کا عقیدہ رکھنا اور استدلال میں حضرت کشمیریؒ کی عبارت پیش کرنا

سوال: – باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

حضراتِ علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلۂ ذیل کے بارے میں کیا فرماتے ہیں:–

۱:– ہمارے علاقے میں ایک مولوی صاحب اپنے بیان میں کہا کرتا ہے کہ قرآن میں لفظی و معنوی دونوں قسم کی تحریفیں موجود ہیں۔ اور وہ مولوی صاحب اپنے قول کی تائید کے لئے درج ذیل عبارت نقل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بات علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی ایک کتاب میں لکھی ہے، کتاب کا نام نہیں بتایا ہے۔ عبارت درج ذیل ہے:–

''واعلم أن فی التحریف ثلاثة مذاهب، ذهب جماعة الی أن التحریف فی الکتب السماویة قد وقع بکل نحو فی اللفظ والمعنی جمیعًا، وهو الذی مال الیه ابن حزم، ....

وذهب جماعة انكار التحريف اللفظى رأسا فالتحريف عندهم كله معنوى، قلت يلزم على هٰذا المذهب أن يكون القرآن أيضًا محرفًا، فان التحريف المعنوى غير قليل فيه أيضًا، والذى تحقق عندى أن التحريف فيه لفظى أيضًا، أما أنه عن عمد منهم أو لمغلطة."

اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟

۲:- بیان کرنے والے مولوی صاحب کا شرعی حکم کیا ہے، آیا قابلِ امامت ہے یا نہیں؟ اور اس کا یہ عقیدہ، قرآن مجید کی آیت: "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" الآیة، کا مخالف ہے یا نہیں؟ نیز جس مصنف کی کتاب کا حوالہ پیش کر رہا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ مسلمان ہے یا مرتد؟ مدلل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

نوٹ:- شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم! ہمارے علاقے کے علماء و عوام آپ ہی کے فتویٰ پر اعتبار کرتے ہیں، لہٰذا آپ اپنے دست مبارک سے جواب تحریر فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ بینوا توجروا فضل جاوید حنفی باجوڑی

جواب:- قرآنِ کریم میں تحریفِ لفظی کا عقیدہ رکھنا کفر ہے، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ عبارت میں یہ فرمایا ہے کہ پچھلی کتبِ سماویہ کے بارے میں (یعنی تورات، انجیل، زبور کے بارے میں) جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان میں صرف تحریفِ معنوی ہوئی ہے، وہ غلط کہتے ہیں، کیونکہ کرنے والوں نے تو قرآنِ کریم میں بھی تحریفِ معنوی کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک پچھلی کتبِ سماویہ میں تحریفِ لفظی بھی ہوئی ہے۔ حضرتؒ کی یہ عبارت[1] پچھلی کتبِ سماویہ سے متعلق ہے،[2] لہٰذا اس عبارت سے قرآنِ کریم کی تحریفِ لفظی کا عقیدہ

(۲،۱) حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی مذکورہ عبارت "فیض الباری" ج:۳ ص:۳۹۵ کی ہے۔ حضرت کشمیریؒ نے یہ عبارت حضرت ابن عباسؓ سے منقول بخاری شریف "باب لا يسأل أهل الشرك عن الشهادة وغيرها" ج:۱ ص:۳۶۹ (طبع قدیمی کتب خانہ) کی اس روایت کی تشریح میں ذکر فرمائی ہے: "عن عبدالله بن عباس قال: يا معشر المسلمين! كيف تسألون أهل الكتب وكتابكم الذى أنزل على نبيه احدث الأخبار بالله تقرؤنه، لم يشب وقد حدثكم الله أن أهل الكتب بدلوا ما كتب الله وغيّروا بأيديهم الكتب، فقالوا: هو من عند الله ليشتروا به ثمنًا قليلًا، أفلا ينهاكم ما جاءكم من العلم عن مسألتهم ولا والله ما رأينا منهم رجلًا قط يسألكم عن الذى أنزل عليكم." اس روایت میں اہلِ کتاب کی تحریف کا ذکر ہے، اور حضرت کشمیریؒ نے بھی اپنی مذکورہ عبارت میں پچھلی کتبِ سماویہ میں اہلِ کتاب کی تحریف کا ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ اس عبارت میں "ان التحريف فى الكتب السماوية" کے الفاظ سے واضح ہے۔ اس کے بعد آخر میں "ان التحريف فيه لفظى" میں "فيه" کی ضمیر حدیث ابن عباسؓ میں "ما كتب الله" کی طرف راجع ہے، قرآن کی طرف نہیں کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ پچھلی کتبِ سماویہ میں ہی اختلافی مذاہب بیان کر رہے ہیں، اور پھر "والذى تحقق عندى" سے پچھلی کتب کی تحریف میں اختلافی مذاہب میں قولِ محقق ذکر فرما رہے ہیں، نیز اس سے اگلی عبارت "اما انه عن عمد منهم" میں "منهم" کی ضمیر غائب کا مرجع بھی حدیثِ ابنِ عباسؓ میں "اهل الكتاب" ہونا واضح ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

نکالنا قطعی گمراہی کی بات ہے، اور جو شخص قرآنِ کریم میں تحریفِ لفظی کا قائل ہو وہ مسلمان نہیں، کافر ہے۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز بھی نہیں ہوگی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۱/۳/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۴۱۸/۷۳)

ایک طنزیہ مضمون میں اللہ تعالیٰ کی شان میں نامناسب الفاظ استعمال کرنے کا حکم

سوال:- فتویٰ حاصل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک مصنف نے اپنے مضمون میں خدا کی شان میں گستاخی کی ہے، اس کے خلاف مقدمہ چلانا ہے۔ مندرجہ ذیل عبارات رسالہ ''الف لیلیٰ'' ڈائجسٹ کے صفحات: ۹۰ تا ۹۳ پر لکھی ہوئی ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے: ''چند دن ہوئے میں نے خواب میں دیکھا، مجھے ایسا لگا جیسے کوئی سوتے میں جگا رہا ہے، سر اُٹھایا تو ایک فرشتہ تھا، کہنے لگا: اچھے جرنلسٹ ہو، خدا کے دربار میں ہنگامہ ہے اور تم یہاں پڑے ہو۔ میں نے کہا: ''میرا ڈیئر تو کہتا ہے کہ صرف وزیروں اور زراعتی ناخداؤں کے ہاں جایا کرو، مگر تم کہتے ہو تو آج خدا کو بھی دیکھ لیتے ہیں، پتہ نہیں اس کی اسٹوری اخبار والے قبول کرتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ وہ ہماری پارٹی کا نہیں، ابلیس ہوتا تو دُوسری بات تھی۔

بہرحال میں نے اپنی ڈائری اور کیمرہ اُٹھایا اور چل پڑا، وہاں پہنچے تو دیکھا کہ واقعی ہنگامہ ہے، اللہ میاں تخت پر بیٹھے ہیں، نور کی رُوح پرور روشنی ہے، چاروں طرف فرشتے سجدے میں پڑے ہیں، پسِ منظر میں حمد وثنا کی موسیقی ہے، دھیمی دھیمی خوشبو کی لہریں اُٹھ رہی ہیں، مگر درمیان میں چند مغربی سائنسدان کھڑے گستاخانہ طریقے سے شور کر رہے ہیں۔

اس فرشتے نے کان میں کہا کہ: خدا سے بغاوت کر کے اپنی خودمختاری کا نوٹس دینے آئے ہیں، میں نے غور سے سنا تو ایک بڈھا سائنسدان چیخ رہا تھا۔

ہم کیوں مانیں تیری خدائی؟ کیا ہے تیرے پاس جو ہمارے پاس نہیں؟ تیری خدائی کی بنیاد صرف دو چیزوں پر ہے، ایک تخریب جو قہر اور عذاب بن کر آتی ہے اور دُوسری تخلیق۔ ہمارے پاس بھی یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔

ہمارے ایٹم بم آج تیری دُنیا کا ایسے انداز میں خاتمہ کر سکتے ہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر تو نے بھی آج تک تخریب نہ کی ہوگی، تو نے دُنیا کو قیامت کے دن حشر برپا کرنے کی دھمکی دے کر زیر کیا اور انہیں

مذہب کی زنجیروں میں جکڑا، وہی حشر ہم اپنے بموں سے برپا کر سکتے ہیں''.....(الخ تاص:۹۳-از ناقل)

تمام صفحات کی عبارات سے اللہ تعالیٰ کی تحقیر، توہین وتذلیل ہوتی ہے یانہیں؟ مسلمانوں کے عقیدے میں خلل پڑتا ہے یانہیں؟

نمبر۲،۳:- کیا اس عبارت سے کفر لازم آتا ہے یانہیں جو اُوپر (قوسین) میں نقل کی گئی ہے؟

نمبر۴:- ''کیا میں غلط کہہ رہا تھا اے خدا! میں نے جرأت کر کے پوچھ لیا، اللہ میاں نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی تخلیق پر شرم سے سر جھکالیا، تو عرفی میاں، مغرب کے سائنسدان اپنی صدیوں کی سائنسی ترقی سے خدا کا سر نہ جھاسکے اور ہم نے اس ملک کی بیس برس کی زندگی میں خدا کا سر جھکادیا ہے، ہم آگے ہیں یانہیں؟''

نمبر۵، ۶:- کیا ایسے مسلمانوں کو جو پاکستان میں رعایا کی حیثیت سے مقیم ہوں ان کی، عام مسلمانوں کی دِل آزاری اور باری تعالیٰ سے اس درجہ گستاخی کی بناء پر اگر ملکِ پاکستان کے دستور کی بنیاد پر ضربِ کاری لگ رہی ہو تو اس کو دستورِ اساسی کا منکر تصوّر کرنا چاہئے یانہیں؟ اور ملک کا اور خدا کا دُشمن اور ملک کا باغی سمجھنا چاہئے یانہیں؟

جواب:- اگرچہ منسلکہ مضمون ایک طنزیہ مضمون ہے، جس میں الفاظ کی حقیقت مراد نہیں ہوتی، لیکن طنزیہ انداز میں بھی اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسی باتیں کرنا، اور اس کی طرف ایسی فرضی باتیں منسوب کرنا سنگین گستاخی ہے، جس پر کفر کا بھی خوف ہے۔ لہٰذا ایسے مضمون لکھنے والے کو فوراً صدقِ دِل سے توبہ کرنی چاہئے۔ ایسے مضامین کی نشر واشاعت بالکل ناجائز ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی تخلیق اور اس کے کارخانۂ قدرت کو طنز ومزاح کا موضوع بنانا انتہائی خطرناک گناہ ہے۔ اگر کوئی شخص ایسے الفاظ کو حقیقت سمجھتا ہو تو اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔

لما فی العالمگیریة: یکفر اذا وصف اللہ تعالٰی بما لا یلیق به أو سخر باسم من أسمائه أو بأمر من أوامره أو أنکر وعده ووعیده أو جعل له شریکًا أو ولدًا أو زوجة أو نسبه الی الجهل أو العجز أو النقص، ویکفر بقوله: یجوز أن یفعل اللہ تعالٰی فعلًا لا حکمة فیه. (عالمگیریة ج:۲ ص:۲۵۸)[1]۔ اور اگر الفاظ کی حقیقت مقصود نہ ہو بلکہ صرف موجودہ دور کے انسانوں پر طنز مقصود ہو تو چونکہ تکفیرِ مسلم ایک سنگین معاملہ ہے، اس لئے تکفیر سے تو کفِ لسان کیا جائے گا،[2] لیکن اس کے سنگین گستاخی اور سخت گناہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس مضمون کے مصنف اور ناشر دونوں کو

---

(۱) الباب التاسع فی أحکام المرتدین (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

(۲) وفی الدر المختار ج:۴ ص:۲۲۹ (طبع ایچ ایم سعید) واعلم أنه لا یفتی بکفر مسلم أمکن حمل کلامه علی محمل حسن.

آخرت کے مؤاخذے کی فکر کر کے فوراً اس پر توبہ کرنی چاہئے، اور حکومت کو ایسے مضامین کی اشاعت کی اجازت ہرگز نہ دینی چاہئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۶ھ

قادیانیوں کے ''لاہوری گروپ'' سے تعلق رکھنے والے شخص کے چند کفریہ عقائد کا حکم

سوال:- ایک شخص کئی سال تک لاہوری، احمدیوں کے ایک تبلیغی رسالے کا ایڈیٹر رہتا ہے، اور اس کے عقائد یہ ہیں:-

الف:- ایک غیر عرب مسلمان کو (جو عربی نہیں جانتا) نماز میں اپنی مادری زبان میں قرآن کا ترجمہ جو لفظاً ہو پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے۔

ب:- امام ابوحنیفہؒ نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ ایک غیر عرب مسلمان جو عربی زبان نہیں جانتا نماز میں قرآن کا فارسی ترجمہ پڑھ سکتا ہے۔

ج:- محنت کش طبقہ (کسان اور مزدور) کے لئے روزہ رکھنا ضروری نہیں، اور یہ کہ رمضان کے روزوں کے لئے وقت اور مہینے کی پابندی بھی لازم نہیں ہے۔ کیا ایسے شخص کو مسلمان شمار کیا جانا چاہئے؟ اور کیا اسے کسی اسلامی ادارے کی نگرانی اور ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے جبکہ وہ اپنے عقائد کا تحریری وتقریری اظہار کرتا ہے؟

جواب:- اگر یہ صاحب اب بھی لاہوری، مرزائیوں کے عقائد سے متفق ہیں تب تو ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور اگر ان عقائد سے تائب ہو چکے ہیں تب بھی ان کا یہ عقیدہ کہ روزوں کے لئے وقت اور مہینے کی پابندی لازم نہیں ہے، کفریہ عقیدہ ہے،[2] اور غیر عرب کے لئے اپنی مادری زبان میں نماز کی اجازت بھی گمراہی ہے، امام ابوحنیفہؒ کی طرف جو بات انہوں نے منسوب کی ہے وہ بھی اس اطلاق کے ساتھ دُرست نہیں، امام صاحبؒ کا مطلب کچھ اور تھا،[3] اور ایسے شخص کو کسی اسلامی ادارے کی ذمہ داری سونپنا ہرگز دُرست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۰۸/۲۸ ج)

---

(۱) نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۹۳۔

(۲) ''أَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ'' (البقرة:۱۸۴)، ''فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ'' الآية (البقرة:۱۸۵).

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار مطلب فی حکم القرائة بالفارسية ج:۱ ص:۴۸۵ (طبع سعيد).

﴿فصل فی الفِرَق والأحزاب الإسلامیة والباطلة والأشخاص المتعلقین بها﴾

(مختلف اسلامی وغیر اسلامی فرقوں اور ان سے متعلق شخصیات کے بیان میں)

''الہدیٰ انٹرنیشنل'' کے افکار وعقائد کا حکم

سوال:- حضرت جناب مفتی صاحب، زیدت معالیہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

سائلہ نے اسلام آباد کے ایک ادارے ''الہدیٰ انٹرنیشنل'' سے ایک سالہ ڈپلومہ کورس اِن اسلامک اسٹڈیز (One Year Diploma Course in I.S) کیا ہے۔ سائلہ اس ادارے میں طلبِ علم کی جستجو میں گئی تھی اور ان کے خفیہ عقائد سے ناواقف تھی، ایک سالہ کورس کے بعد ان کے عقائد کچھ صحیح معلوم نہ ہوئے تو سوچا کہ علمائے کرام سے فتویٰ طلب کیا جائے، تاکہ اُمتِ مسلمہ کی بیٹیوں تک عقائدِ صحیحہ کو پہنچا کر ان کو گمراہی سے بچایا جاسکے۔ ہماری اُستاد اور ''الہدیٰ انٹرنیشنل'' کی نگران محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ کے نظریات کا نچوڑ پیشِ خدمت ہے۔

۱:- اِجماعِ اُمت سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کرنا۔

۲:- غیر مسلم اور اسلام بیزار طاقتوں کے نظریات کی ہم نوائی۔

۳:- تلبیسِ حق و باطل۔

۴:- فقہی اختلافات کے ذریعے دین میں شکوک وشبہات پیدا کرنا۔

۵:- آسان دین۔

۶:- آداب ومستحبات کو نظر انداز کرنا۔

اب ان بنیادی نکات کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:-

۱:- اِجماعِ اُمت سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کرنا:

۱:- قضائے عمری سنت سے ثابت نہیں، صرف توبہ کرلی جائے، قضا ادا کرنے کی ضرورت

نہیں ہے۔

۲:- ۳ طلاقوں کو ایک شمار کرنا۔

۳:- نفلی نمازوں، صلوٰۃ التسبیح، رمضان میں طاق راتوں خصوصاً ۲۷ویں شب میں اجتماعی عبادت کا اہتمام اور خواتین کے جمع ہونے پر زور دینا۔

۲:- غیر مسلم، اسلام بیزار طاقتوں کے خیالات کی ہم نوائی:

۱:- مولوی (عالم)، مدارس اور عربی زبان سے دُور رہیں۔

۲:- علماء، دین کو مشکل بناتے ہیں، آپس میں لڑتے ہیں، عوام کو فقہی بحثوں میں اُلجھاتے ہیں۔ بلکہ ایک موقع پر تو فرمایا کہ: اگر آپ کو کسی مسئلے میں صحیح حدیث نہ ملے تو ضعیف سے لیں، لیکن علماء کی بات نہ لیں۔

۳:- مدارس میں گرامر، زبان سکھانے، فقہی نظریات پڑھانے میں بہت وقت ضائع کیا جاتا ہے، قوم کو عربی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ لوگوں کو قرآن صرف ترجمے سے پڑھایا جائے۔

ایک موقع پر کہا (ان مدارس میں جو ۷، ۷، ۸، ۸ سال کے کورس کرائے جاتے ہیں، یہ دین کی رُوح کو پیدا نہیں کرتے، اپنی فقہ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں) اشارہ درسِ نظامی کی طرف ہے۔

۴:- وحیدالدین خان کی کتابیں طالب علموں کی تربیت کے لئے بہترین ہیں، نصاب میں بھی شامل ہیں اور اسٹالز پر بھی رکھی جاتی ہیں، کسی نے احساس دِلایا کہ ان کے بارے میں علماء کی رائے کیا ہے؟ تو کہا کہ: ''حکمت، مؤمن کی گمشدہ میراث ہے''۔

۳:- تلبیسِ حق و باطل:

۱:- تقلید شرک ہے، (لیکن کون سی برحق ہے اور کس وقت غلط ہے؟ یہ کبھی نہیں بتایا)۔

۲:- ضعیف حدیث پر عمل کرنا تقریباً ایک جرم بنا کر پیش کیا جاتا ہے (جب بخاری میں صحیح ترین احادیث کا مجموعہ ہے تو ضعیف کیوں قبول کی جائے؟)۔

۴:- فقہی اختلافات کے ذریعے دین میں شکوک وشبہات پیدا کرنا:

۱:- اپنا پیغام، مقصد اور متفق علیہ باتوں سے زیادہ زور دُوسرے مدارس اور علماء پر طعن وتشنیع۔

۲:- ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے بنیادی فرائض، سنتیں، مستحبات، مکروہات سکھانے سے زیادہ اختلافی مسائل میں اُلجھا دیا گیا، (پروپیگنڈا ہے کہ ہم کسی تعصب کا شکار نہیں اور صحیح حدیث کو پھیلا

رہے ہیں)۔

۳:- نماز کے اختلافی مسائل رفعِ یدین، فاتحہ خلف الامام، ایک وتر، عورتوں کو مسجد جانے کی ترغیب، عورتوں کی جماعت، ان سب پر صحیح حدیث کے حوالے سے زور دیا جاتا ہے۔

۴:- زکوٰۃ میں غلط مسائل بیان کئے جاتے ہیں، خواتین کو تملیک کا کچھ علم نہیں۔

۵:- آسان دین:

۱:- دین مشکل نہیں، مولویوں نے مشکل بنادیا ہے، دین کا کوئی مسئلہ کسی بھی امام سے لے لیں، اس طرح بھی ہم دین کے دائرے میں ہی رہتے ہیں۔

۲:- حدیث میں آتا ہے کہ آسانی پیدا کرو، تنگی نہ کرو، لہٰذا جس امام کی رائے آسان معلوم ہو وہ لے لیں۔

۳:- روزانہ یٰسین پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت نہیں، نوافل میں اصل صرف چاشت اور تہجد ہے، اِشراق اور اَوّابین کی کوئی حیثیت نہیں۔

۴:- دین آسان ہے، بال کٹوانے کی کوئی ممانعت نہیں، اُمہات المؤمنین میں سے ایک کے بال کٹے ہوئے تھے۔

۵:- دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ پکنک، پارٹیاں، اچھا لباس، زیورات کا شوق، محبت، مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللهِ۔

۶:- خواتین دین کو پھیلانے کے لئے گھر سے ضرور نکلیں۔

۷:- محترم کا اپنا عمل طالب علموں کے لئے حجت ہے، محرَم کے بغیر تبلیغی دوروں پر جانا، قیام اللیل کے لئے راتوں کو نکلنا، میڈیا کے ذریعے تبلیغ (ریڈیو، ٹی وی، آڈیو)۔

۸:- آداب و مستحبات کی رعایت نہیں، خواتین ناپاکی کی حالت میں بھی قرآن چھوتی ہیں، آیات پڑھتی ہیں، قرآن کی کلاس میں قرآن کے اُوپر نیچے ہونے کا احساس نہیں۔

۶:- متفرقات:

۱:- قرآن کا ترجمہ پڑھا کر ہر معاملے میں خود اجتہاد کی ترغیب دینا۔

۲:- قرآن و حدیث کے فہم کے لئے جو اکابر علمائے کرام نے علوم سیکھنے کی شرائط رکھی ہیں، ان کو بیکار، جاہلانہ باتیں اور سازش قرار دینا۔

۳:- کسی فارغ التحصیل طالبہ کے سامنے دین کا کوئی حکم یا مسئلہ رکھا جائے تو اس کا سوال یہ

ہوتا ہے کہ یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ گلی گلی، محلے محلے ''الہدیٰ'' کی برانچز کھلی ہوئی ہیں، اور ہر قسم کی طالبہ خواہ ابھی اس کی تجوید ہی دُرست نہ ہوئی ہو آگے پڑھا رہی ہے، اور لوگوں کو مسائل میں بھی اُلجھایا جارہا ہے۔

گھر کے مردوں کا تعلق عموماً مسجد سے ہے (جہاں نماز کا طریقہ فقہِ حنفی کے مطابق ہے)، گھر کی عورتیں مردوں سے اُلجھتی ہیں کہ ہمیں مساجد کے مولویوں پر اعتماد نہیں۔

مطلوبہ سوالات:

۱:- مذکورہ بالا تمام مسائل کی شرعی نقطۂ نظر سے وضاحت فرما کر مشکور فرمائیں۔

۲:- محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی کے اس طریقۂ کار کی شرعی حیثیت، نیز محترمہ کی گلاسگو یونیورسٹی سے پی.ایچ.ڈی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۳:- ان کے اس کورس میں شرکت کرنا، لوگوں کو اس کی دعوت دینا، اور ان سے تعاون کرنے کی شرعی نقطۂ نظر سے وضاحت فرمادیجئے، جزاکم اللہ خیرًا أحسن الجزاء۔

مستفتیہ مسز سیما افتخار
One Year Diploma Holder from
Al-Huda International
Islamabad

جواب: - سوال میں جن نظریات کا ذکر کیا گیا ہے، خواہ وہ کسی کے بھی نظریات ہوں، ان میں سے اکثر غلط ہیں، بعض واضح طور پر گمراہانہ ہیں، مثلاً: اِجماعِ اُمت کو اہمیت نہ دینا، تقلید کو علی الاطلاق شرک قرار دینا، جس کا مطلب یہ ہے کہ چودہ سو سال کی تاریخ میں اُمتِ مسلمہ کی اکثریت جو ائمۂ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید کرتی رہی ہے، وہ مشرک تھی، یا یہ کہنا کہ قضائے عمری فوت شدہ نمازوں کو قضا کرنے کی ضرورت نہیں،[1] صرف توبہ کافی ہے۔ بعض نظریات جمہور اُمت کے خلاف ہیں، مثلاً: تین طلاقوں کو ایک قرار دینا۔ بعض بدعت ہیں، مثلاً: صلوٰۃ التسبیح کی جماعت یا قیام اللیل کے لئے راتوں کو اہتمام کے ساتھ لوگوں کو نکالنا یا خواتین کو جماعت سے نماز پڑھنے کی ترغیب۔ بعض انتہائی گمراہ کن ہیں، مثلاً: قرآنِ کریم کو صرف ترجمے سے پڑھ کر پڑھنے والوں کو اجتہاد کی دعوت، یا اس بات پر لوگوں کو آمادہ کرنا کہ وہ جس مذہب میں آسانی پائیں، اپنی خواہشات کے مطابق اسے اختیار کرلیں، یا کسی کا اپنے عمل کو حجت قرار دینا۔ اور ان میں سے بعض نظریات فتنہ انگیز ہیں، مثلاً: علماء وفقہاء سے بدظن کرنا، دینی تعلیم کے جو ادارے اسلامی علوم کی وسیع وعمیق تعلیم کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ان کی

---

(۱) قضائے عمری سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے ''کتاب الصلوٰۃ، باب قضاء الفوائت'' میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

اہمیت ذہنوں سے کم کر کے مختصر کورس کو علمِ دین کے لئے کافی سمجھنا، نیز جو مسائل کسی امامِ مجتہد نے قرآن و حدیث سے اپنے گہرے علم کی بنیاد پر مستنبط کئے ہیں، ان کو باطل قرار دے کر اسے قرآن و حدیث کے خلاف قرار دینا اور اس پر اصرار کرنا۔

جو شخصیت یا ادارہ مذکورہ بالا نظریات رکھتا ہو، اور اس کی تعلیم وتبلیغ کرتا ہو، وہ نہ صرف یہ کہ بہت سے گمراہانہ، گمراہ کن یا فتنہ انگیز نظریات کا حامل ہے، بلکہ اس سے مسلمانوں کے درمیان افتراق و انتشار پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے، اور اگر کوئی شخص سہولتوں کی لالچ میں اس قسم کی کوششوں سے دین کے قریب آئے گا بھی، تو مذکورہ بالا فاسد نظریات کے نتیجے میں وہ گمراہی کا شکار ہوگا، لہٰذا جو ادارہ یا شخصیت ان نظریات کی حامل اور مبلغ ہو، اور اپنے دُروس میں اس قسم کی ذہن سازی کرتی ہو، اس کے درس میں شرکت کرنا اور اس کی دعوت دینا، ان نظریات کی تائید ہے جو کسی طرح جائز نہیں، خواہ اس کے پاس کسی قسم کی ڈگری ہو، اور گلاسگو یونیورسٹی کی ڈگری بذاتِ خود اسلامی علوم کے لحاظ سے کوئی قیمت نہیں رکھتی، بلکہ غیر مسلم ممالک کی یونیورسٹیوں میں مستشرقین نے اسلامی تحقیق کے نام پر اسلامی اَحکام میں شکوک وشبہات پیدا کرنے اور دین کی تحریف کا ایک سلسلہ عرصۂ دراز سے شروع کیا ہوا ہے۔

ان غیر مسلم مستشرقین نے، جنھیں ایمان تک کی توفیق نہیں ہوئی، اس قسم کے اکثر ادارے درحقیقت اسلام میں تحریف کرنے والے افراد تیار کرنے کے لئے قائم کئے ہیں، اور ان کے نصاب و نظام کو اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ اس کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے - اِلّا ما شاء اللہ - اکثر و بیشتر دجل وفریب کا شکار ہوکر عالم اسلام میں فتنے برپا کرتے ہیں۔ لہٰذا گلاسگو یونیورسٹی سے اسلامی علوم کی کوئی ڈگری نہ صرف یہ کہ کسی شخص کے مستند عالم ہونے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ اس سے اس کے دینی فہم کے بارے میں شکوک پیدا ہونا بھی بے جا نہیں۔

دُوسری طرف بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جنھوں نے ان یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کیں، اور عقائدِ فاسدہ کے زہر سے محفوظ رہے، اگرچہ ان کی تعداد کم ہے، لہٰذا یہ ڈگری نہ کسی کے مستند عالم ہونے کی علامت ہے، اور نہ محض اس ڈگری کی وجہ سے کسی کو مطعون کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ اس کے عقائد واعمال دُرست ہوں۔

مذکورہ بالا جواب ان نظریات پر مبنی ہے جو سائلہ نے اپنے استفتاء میں ذکر کئے ہیں، اب کون شخص ان نظریات کا کس حد تک قائل ہے؟ اس کی ذمہ داری جواب دہندہ پر نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۲/۴/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱/۴۸۶)

بریلوی فرقے کا تعارف اور حکم

(عربی فتویٰ)

السؤال:-

الحمد لله رب العالمين، والصلوٰة السلام على رسول الله واله وصحبه أجمعين.

شيخى الكريم العلامة محمد تقى العثمانى حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

كل عام وأنتم بخير، وتقبل الله منكم الطاعات، وأعاد الله هٰذا العيد عليكم وعلينا وعلى المسلمين باليمن والبركات. أرجو أن تكون وأسرتك وجميع أحبابك فى خير وعافية، كما أرجو المعذرة فى تأخر المراسلة، فقد انشغلت بالدراسة وأمور الأسرة والله المستعان.

أرسلت اليك رسالة وبطاقة معايدة فى عيد الفطر، فهل وصلاك؟

فهمت اشارتك وأرجو التوفيق، وهو شرف أن أقوم بترجمة كتاب لك، لكننى مشغول بالاعداد للدكتوراه فى حقوق التأليف، ومن أهم مراجعى كتابك (قضايا فقهية معاصرة) وسأقوم ان شاء الله بترجمة بعض كلامك، وأرسل اليك ما ترجمته فى حينه.

ما يقول الشيخ أيده الله فى الطريقة البريلوية، اذ لا توجد هٰذه الطريقة فى بلادنا، ولم أجد كتابا بالعربية يتحدث عنها سوى كتاب لأحد علماء نجد، وقد رأيته غير منصف مع غير البريلوية، فلم أثق فى حكمه أو نقله، فالرجاء بيان حالهم، فالناس بين محب غال أو مبغض قال، والله الهادى للصواب.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

محمد على محمد احداش

الجواب:-

الى فضيلة الأخ الكريم العلامة محمد على محمد احداش، حفظه الله تعالىٰ ورعاه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد:

فقد تسلمت بسرور رسالتك الكريمة، ودعوت لك بالتوفيق والنجاح، وأن يوفقك الله تعالىٰ لاتمام عملك كما يحبه ويرضاه، وقد سألتنى عن أمرين:-[1]

الأوّل: بالنسبة للطريقة البريلوية وان هؤلاء يتميزون عن جمهور المسلمين فى

---

(۱) والسؤال الثانى يتعلق بعقد الاجارة، وسيجئ فى بابه ان شاء الله. (محمد زبير)

بعض العقائد والأعمال المبتدعة، فمن عقائدهم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم عالم للغيب، ومطلع علىٰ جميع ما كان وما يكون، وأن روحه الشريفة متصرفة فى الناس بالنفع والضرر، وأن امامهم الشيخ أحمد رضا خان البريلوى نشر فتوى التكفير ضدّ علماء ديوبند، حتى قال: من لم يكفرهم فهو كافر. وذٰلک لأنهم نقدوا هٰذه العقائد، وقالوا: ان علم الغيب صفة الله سبحانه وتعالىٰ لا يشاركه أحد فيها، ولٰكنه سبحانه وتعالىٰ يطلع رسله علىٰ ما يشاء من أنباء الغيب. ومن أعمالهم المبتدعة أنهم يحتفلون بأعياد لم تثبت من القرآن والسنّة، ومع ذٰلک يعتقدونها مستحبة، بل قد يعاملونها معاملة الواجبات من النكير الشديد علىٰ من لا يشاركهم فيها، وكذٰلک اخترعوا تقاليد عند موت أحد، مثل أن يقوم أهل الميّت بدعوة الناس فى اليوم الثالث والعاشر والأربعين بعد وفاة مورثهم، وأن يصنع لهم طعاما ومن لم يفعل ذٰلک، فانه يلام أشد الملامة، وما الىٰ ذٰلک من البدعات الكثيرة.

والحديث عن هٰذه الطريقة يطول، ولٰكن ما ذكرته هو تصور جملى عن عقائدهم وأعمالهم، ويوجد فيهم من يفرط فيها ويلغو ويتعصب، ومن هو معتدل بالنسبة للأخرين.

والله سبحانه أعلم

محمد تقى العثمانى عفى عنه

١٤٢٦/١/٥هـ

غلام احمد پرویز کے پیروکار کا حکم

سوال:- استفتاء از علمائے شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلے میں کہ مشہور منکرِ حدیث غلام احمد پرویز جس کو جمہور علمائے اُمت نے کافر قرار دیا ہے، اس کا ایک پیروکار، ہم عقیدہ، ہم مسلک بلکہ مسلکِ پرویز کا مبلغ مرگیا ہے، جبکہ جمہور علمائے اُمت نے پرویز کے متبعین کو بھی خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ اس پرویزی پر اہلِ سنت والجماعت مسلمانوں کے ایک پیش امام نے نمازِ جنازہ پڑھائی، امامِ مذکور کا کیا حکم ہے؟ غلام احمد پرویز کا کیا حکم ہے؟ اور کس بناء پر اس پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے؟ اور کیا اس امام کی اقتداء دُرست ہے؟

جواب:- غلام احمد پرویز پر کفر کا فتویٰ ان کے عقائد ونظریات کی بنیاد پر لگایا گیا ہے،[1] لہٰذا جو شخص ان کے عقائد ونظریات سے متفق ہو، وہ بھی انہی کے حکم میں ہے۔ اور کافر ہونے کی بناء پر اس

---

(۱) تفصیل کے لئے رسالہ ''علمائے اُمت کا متفقہ فتویٰ پرویز کافر ہے'' ملاحظہ فرمائیں۔

پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں، اگر کسی امام صاحب نے غلط فہمی یا ناواقفیت کی وجہ سے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ اِستغفار کریں۔ ایسی صورت میں دُوسرے مسلمان اپنی عام نمازوں میں ان کی اقتداء کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ میّت کو پرویزی تسلیم کرنے کے باوجود اس عمل کی صحت پر اصرار کرتے ہیں تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا دُرست نہیں۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ
(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۴۶۳ الف)

فکرِ ولی اللّٰہی تحریک کا حکم

بعد از سلام عرض ہے کہ ہم خیریت سے ہیں، اور خداوند کریم سے آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتے ہیں۔

بعد از سلام عرض ہے کہ میں نے ایک عرض نامہ پہلے بھی بھیجا ہے، لیکن اس خط کا جواب ابھی تک نہیں ملا۔ عرض یہ ہے کہ ہم تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس فتویٰ کی حقیقت کیا ہے جو اس خط کے نیچے ہے، اور ہم نے مولانا شیخ الحدیث معزالحق کو عریضہ لکھا، انہوں نے یہ باتیں ہمیں لکھ کر دی ہیں۔ ہم نے یہاں کے مفتی رشید احمد صاحب کو کہا، انہوں نے کہا کہ علمائے کرام مشاورت عظمیٰ اور مفتیان صاحبان کے مشورے کے بعد بتائیں گے۔ یہ پُوچھنا چاہتے ہیں کہ چونکہ اس تنظیم کا گڑھ ہمارے نوشہرہ میں مسجد درزیاں ہے اور اس کا امام بھی یہاں مقرّر ہوگیا ہے، ہمیں بتائیں کہ ان کے پیچھے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ اور یہ کیسے لوگ ہیں؟ اور ان سے کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟

شکریہ
اہل مسجد درزیاں

مزاجِ گرامی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض یہ ہے کہ گزشتہ زمانے میں ہمارے مدرسے میں ایک عالم مسمّٰی مولوی خالد محمود، جو اپنے آپ کو تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی کی طرف منسوب کرتا ہے، شاہ ولی اللہؒ کا ترجمان بتلاتا ہے، حسبِ ذیل نوعیت کی باتیں کرتا رہتا ہے:-

۱:- مقصودِ اصلی قیامِ خلافت ہے، جب تک خلافت کا قیام نہ ہو اس وقت تک ایمان، اعمال، عبادات سب کچھ بیکار ہیں۔

۲:- مقصودِ اصلی اتباعِ رسالت میں مقصدِ بعثت خصوصاً "هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ" کے بموجب سپر پاورز کے خاتمے کو سمجھنا ہے۔ باقی انفرادی عادات و اطوار، وضع قطع، نشست و برخاست میں اتباعِ رسالت بے کار ہے، اس کا چنداں فائدہ نہیں۔

۳:- اعمال، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سے مقصود ہمہ جہتی تربیت فرد و معاشرہ ہے، لیکن زیادہ زور اجتماعی، سیاسی اور حکومتی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی تربیت پر ہے۔ اگر ان اعمال کا صرف رُوحانی حلقۂ اثر تسلیم کیا جائے تو باقی مذاہب کی عبادات سے اسلامی عبادات کا تفوق کیسے ثابت کیا جائے؟ کیونکہ رُوحانی اثرات تو یوگ (Mysticism) اور تصوّف و اِحسان وسلوک کے ایک جیسے ہیں۔

۴:- جزاء وسزا کا یہ تصوّر صرف متوسط اذہان کے لئے قابلِ قبول ہے، اعلیٰ اذہان کے لئے قابلِ فہم اور لائقِ قبول نہیں۔

۵:- قرآن، مولویوں کے سلوک کے نتیجے میں بازیچۂ اطفال بن گیا ہے، ماسوائے تعلیمِ الفاظ ومعانی، آگے کوئی تعلیم وتربیت نہیں، ذہن سازی نہیں۔ جب نظامِ قرآنی نہ ہو تو صرف الفاظ کے رٹنے کا کیا فائدہ؟ چنانچہ حفظِ قرآن ضیاعِ وقت ہے۔

۶:- علمائے عصر چونکہ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ناواقف ہیں، لہٰذا بقول امام محمدؒ (من لم یعرف أحوال زمانه فهو جاهل) جاہل ہیں۔ مدارس کے اندر تو ان کا حلقۂ اثر وارادت بڑا وسیع ہے، لیکن مدرسہ سے باہر بینک کے چوکیدار اور بس کے ایک معمولی سے ڈرائیور پر بھی ان کا بس نہیں چلتا۔ چنانچہ ان علماء کا معاشرے میں کوئی قابلِ قدر کردار نہیں، یہ علماء معاشرے کا عضوِ معطل ہیں۔

۷:- جنت کا عام ومعروف تصوّر کم فہمی کا نتیجہ ہے، اصل میں جنت دُنیا کا مستقبل ہے، دُنیا اس کی اساس ہے۔ چنانچہ جس پودے کا بیج کمزور ہو وہ پودا طاقت ور نہیں بن سکتا، جو دُنیا میں دُکھ دَرد، تکالیف ومصائب اور غربت وکسمپرسی میں گھرا ہوا ہو وہ آخرت میں کامیاب وخوشحال کیسے کہلا سکتا ہے؟

۸:- جنت سے متعلق عام احادیث محض خوش فہمی ہیں، جب بندہ کچھ نہ کر سکے تو پھر لازماً اسے جنت کا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ "کافر کو ملے حور وقصور اور مؤمن کو فقط وعدۂ حور"۔

۹:- امام مہدی کا تصوّر وعقیدہ بھی محض مردہ قوموں کا تخیل ہے۔

۱۰:- یأجوج ومأجوج چینی اور رُوسی عوام ہیں، ان سے متعلق معروف تصوّر ٹھیک نہیں۔

۱۱:- داڑھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بشری عادت ہی تو تھی، اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟

۱۲:- علمائے عصر کی پاکستانی تنظیمیں امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال ہو رہی ہیں۔

۱۳:- تبلیغی جماعت کی محنت کے نتیجے میں جو اسلام دُنیا میں آئے گا، اس پر چھاپ امریکی اور یورپی ہوگی، اور یوں مغربی دُنیا اس کا سہارا لے کر اپنے معاشی، سیاسی، سامراجی اہداف حاصل کرے گی۔

۱۴:- جہادِ افغانستان میں امریکہ نے غریب اور سادہ لوح مولویوں کو جہاد کا پُرفریب اور خوش کن جھانسہ دے کر اسلام کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا ہے۔

۱۵:- موجودہ اسلامی تصوّر امریکی خواہش کے زیرِ اثر پنپ چکا ہے، حالانکہ اگر مسلمان رُوس کا ساتھ دیتے تو رُوس ان کے لئے نسبتاً زیادہ دور رہتا، لیکن مسلمان ہمیشہ جذباتی رہا، مسلم جماعتوں کا جھکاؤ امریکہ کی جانب ہی رہا۔

۱۶:- تقدیر کا موجودہ اور معروف تصوّر بھی غلط ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے پُرانی و سابقہ حالت پر رکھے چھوڑا، کیونکہ ابتدائی اسلامیوں (صحابہؓ) میں اسے سمجھنے کی استعداد نہ تھی، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلے کو نہ چھیڑ کر عمل کی طاقت کی بناء پر انقلاب کی راہیں ہموار کیں۔

۱۷:- تھانوی لائن کے علماء ہمیشہ حکومتی خواہشات کے لئے استعمال ہوتے رہے، نتیجتاً انہیں سرکار کی جانب سے نوازا جاتا رہا، اور مدنی لائن کے علماء کو اپنے حریت پسند جذبات کی بناء پر ہمیشہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

۱۸:- ''اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا'' (الآیة) اور ''من الذنوب ذنوب لا یکفرها الا الهم فی المعیشة'' (الحدیث) جیسے استدلالات سے عموماً یہ باور کرایا جاتا ہے کہ جب تک معاشی مساوات نہ ہو معاشرے کی اصلاح نہیں ہوسکتی، قبض و بسط کی تشریح بھی مختلف انداز سے کرتا ہے۔

۱۹:- ذاتی ملکیت کا ایک حد تک جواز ہے، لیکن انقلاب کی راہیں ہموار کرتے وقت ذاتی ملکیت ثابت نہیں ہوسکتی، کیونکہ ابتداءً حضرت عثمانؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا مال و اسباب اپنی ذات سے زیادہ راہِ انقلاب میں خرچ ہوتا رہا۔

۲۰:- خمینی انقلاب اُمتِ مسلمہ کے لئے خوش آئند ہے۔

۲۱:- طالبانِ افغانستان سادہ لوح لوگ ہیں، یہ حکومتی مزاج سے ناواقف ہیں، حکومت چلانا ان کے بس کی بات نہیں۔ مسائلِ حاضرہ اور موجودہ تعلیم سے یہ ناواقف ہیں۔ فرمایئے ان عقائد کی حامل ''تحریکِ فکرِ ولی اللّٰہی'' کا کیا حکم ہے؟

جواب:- فکرِ ولی اللّٰہی محض ایک دھوکا ہے، عام طور سے یہ لوگ حضرت شاہ صاحبؒ کے

نام کی آڑ میں اشتراکی نظریات کا پرچار کررہے ہیں۔

واللہ اعلم
۱۸/۳/۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱۹/۲۵)

''گروپ آف لبرل مسلمز تحریک'' کے قیام پر
حضرتِ والا دامت برکاتہم کی رائے

سوال:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دُعائے صحت، درازیٔ عمر اور بلندیٔ ایمان کے ساتھ جنابِ والا کی خدمتِ عالیہ میں مؤدبانہ عرض ہے کہ قیامِ وطنِ عزیز کے مقاصد کی تکمیل باون سالوں میں بھی نہ ہونے کا اصل سبب ہماری تعلیماتِ قرآنِ کریم سے عدم توجہی، غفلت اور کوتاہی ہے۔ اگرچہ ہر سابق حکومت نے اسلام کے نام پر قوم کو فریب دیا، لیکن قرآنی تعلیمات سے ناآشنائی اور عدم توجہی ہمارے مذہبی راہنماؤں کی کوتاہی اور غفلت بھی ہے، جو بنیادی حقیقت ہے، یہی ہماری باہمی نفرتوں اور اختلافات کا اصل سبب بھی ہے۔ الحمدللہ نوجوان نسل میں پیار اور اُنسیت اُجاگر کرنے، نفرتوں کو مٹانے، نیز وحدتِ اسلامی کے نیک مقاصد کی تکمیل کے لئے ''گروپ آف لبرل مسلمز'' کا قیام وجود میں آیا ہے۔

ہمارا مقصد سوائے اصلاح کے کچھ نہیں، ایک معتدل معاشرہ اور اُخوتِ اسلامی کو اُجاگر کرنے اور فہمِ قرآنِ کریم نوجوان نسل خاص کر حفاظ مسلمان بنات اور شبان کو معانیٔ قرآنِ کریم سیکھنے کی دعوت اور اس پر عمل کی ترغیب ہمارا مقصد ہے، کیونکہ ذہنی انقلاب اور اسلامی تعلیمات سے آگاہی کے بغیر نفاذِ اسلام کی عملی صورت نظر نہیں آتی۔ مشن کی کامیابی کے لئے دُعا کی درخواست ہے۔ عقیدت و احترام کے ساتھ! جواب کا انتظار رہے گا۔

جواب:- جس مقصد کے لئے آپ نے یہ تنظیم قائم کی ہے، وہ بڑا مبارک ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی رضا کے مطابق ملک وملت کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

البتہ ایک گزارش یہ ہے کہ آپ نے اپنے نام میں ''لبرل'' (Liberal) کا جو اضافہ کیا ہے، اس کے بارے میں یہ طے کرلینا چاہئے کہ اس کا کیا مقصد ہے؟ اور کن لوگوں کو اس لفظ کے ذریعہ Exclude (خارج) کرنا مقصود ہے، اس سوال کا صحیح جواب متعین کرنے سے پہلے یورپ کے لبرلزم کی تاریخ کا مطالعہ بھی مفید ہوگا کہ اس لبرلزم کی تحریک وجود میں آنے کے کیا اسباب تھے؟ کیا وہ اسباب ہمارے یہاں موجود ہیں؟ دُوسرے اس لبرلزم کے کیا نتائج نکلے؟ اور کیا وہ نتائج ہمیں بھی مطلوب ہیں؟

اُمید ہے کہ ان سوالات پر معروضی مطالعے کے ذریعہ غور وفکر فرمائیں گے۔ والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
از طیارہ براہ لاہور
۱۴۲۰/۱۱/۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۴۰۰)

(یہ جواب طیارے سے لکھ رہا ہوں، اس لئے الگ کاغذ پر نہیں لکھ سکا، معذرت خواہ ہوں)

روافض کو علی الاطلاق کافر نہ قرار دینے کی وجہ

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ ''بینات'' والوں نے دو نمبر روافض کے بارے میں شائع کئے ہیں، ٹائٹل پر لکھا ہے کہ ''علماء کا متفقہ فیصلہ یعنی شیعہ کافر ہے''۔ اس میں ہند و پاک کے بڑے بڑے علماء کے دستخط موجود ہیں۔ آپ کے دستخط نظر سے نہیں گزرے، اور ہمارے ایک دوست کا کہنا یہ ہے کہ مولانا محمد رفیع صاحب کو شیعہ روافض کی تکفیر کے بارے میں تردّد ہے۔ برائے مہربانی آپ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں کہ کیا واقع ایسا ہے کہ آپ شیعوں کو کافر نہیں سمجھتے؟

فقط والسلام
آپ کا مخلص
احقر حافظ مشتاق احمد

جواب:- جو شیعہ کفریہ عقائد رکھتے ہوں، مثلاً قرآنِ کریم میں تحریف کے قائل ہوں یا یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ حضرت جبریل علیہ السلام سے وحی لانے میں غلطی ہوئی، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگاتے ہوں، ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن یہ بات کہ تمام شیعہ یہ یا اس قسم کے کافرانہ عقائد رکھتے ہیں، تحقیق سے ثابت نہیں ہوئی۔ اور کئی شیعہ یہ کہتے ہیں کہ الکافی یا اُصول الکافی وغیرہ میں جتنی باتیں لکھی ہیں، ہم ان سب کو دُرست نہیں سمجھتے۔ دُوسری طرف کسی کو کافر قرار دینا چونکہ نہایت سنگین معاملہ ہے، اس لئے اس میں بے حد احتیاط ضروری ہے۔ اگر بالفرض کوئی تقیہ بھی کرے تو وہ اپنے باطنی عقائد کی وجہ سے عنداللہ کافر ہوگا، لیکن فتویٰ اس کے ظاہری اقوال پر ہی دیا جائے گا۔ اسی لئے چودہ سو سال میں علمائے اہلِ سنت کی اکثریت شیعوں کو علی الاطلاق کافر کہنے کے بجائے یہ کہتی آئی ہے کہ جو شیعہ ایسے کافرانہ عقائد رکھے، کافر ہے۔ اور یہی طریقہ بیشتر اکابر علمائے دیوبند کا رہا ہے، اور چونکہ جمہور علماء کے اس طریقے میں کوئی تبدیلی لانے کے لئے کافی دلائل محقق نہیں ہوئے، اس لئے دارالعلوم کراچی، حضرت مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے وقت سے اکابر کے اسی طریقے کے مطابق فتویٰ دیتا آیا ہے کہ جو شیعہ ان کافرانہ عقائد کا قائل ہو، وہ کافر ہے، مگر علی الاطلاق ہر شیعہ کو خواہ اس کے عقائد کیسے بھی ہوں، کافر قرار دینے سے جمہور علمائے اُمت کے مسلک کے مطابق

احتیاط کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شیعوں کی گمراہی میں کوئی شبہ ہے، جن شیعوں کو کافر قرار دینے سے احتیاط کی گئی ہے، بلاشبہ وہ بھی سخت ضلالت اور گمراہی میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان گمراہیوں سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائیں، آمین۔

والسلام

۱۴۱۲/۱/۱۴ھ

سرسیّد احمد خان کے نظریات اور تبلیغی جماعت کے بارے میں حکم

سوال:- زید اکثر دوستوں یا عام مجالس میں سرسیّد کی تعریف کرتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ سرسیّد نے قوم کو بیدار کیا، مسلمانوں کو آزادی ان کی تعلیمات ہی کی بناء پر ہوئی۔ بکر کہتا ہے کہ شعور اور بیداری مسلمانوں کو قرآن و سنتِ نبوی ہی سے ہوسکتی ہے، اور آزادی کی خالص وجہ علمائے حق کی قربانیاں ہیں۔ نیز بکر یہ بھی کہتا ہے کہ سرسیّد نے فرشتوں اور جنات کے وجود کا انکار کیا ہے، اور یہ فعل صریح کفر ہے، سرسیّد کے بجائے علمائے حق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

مسلمانوں کا زوال اور پستی انگریزی تعلیم سے محروم رہنا ہے، وہ یہ بھی کہتا ہے۔ مگر بکر اس کا قائل نہیں، زوال کی وجہ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل نہ کرنا ہے۔

نیز زید تبلیغی جماعت کو نہایت سست کہتا ہے، اور کہتا ہے کہ ان کا طریقہ سنت کے خلاف ہے، جبکہ بکر کہتا ہے کہ تبلیغی جماعت صحیح راستے پر گامزن ہے، ان کا ہر قول وفعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کے مطابق ہے، یہی وجہ ہے کہ کثرت سے غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ نیز زید ظاہری شکل وصورت کا بھی بالکل قائل نہیں، مسلم داڑھی اور لباس وغیرہ فراڈ ہے، لازمی نہیں۔ آپ ہم کثیر پاکستانیوں کی رہنمائی فرمائیں۔

طالب الحق، ریاض، سعودی عرب

جواب:- بکر کی باتیں دُرست ہیں، سرسیّد احمد خان صاحب کے دینی نظریات جو انہوں نے اپنی تفسیر میں بیان کئے ہیں، انتہائی گمراہانہ ہیں[1]، اور تبلیغی جماعت ماشاء اللہ اچھی دینی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس کے افراد کے کسی عمل یا کام پر تنقید کی جاسکتی ہے، لیکن بحیثیت مجموعی جماعت کو بُرا بھلا کہنا بہت بُرا کام ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۳۷ ج)

---

(۱) سرسیّد اور ان کے نظریات سے متعلق تفصیلی حکم کے لئے امداد الفتاویٰ ج:۶ ص:۱۶۶ تا ۱۸۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) تبلیغی جماعت سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ اسی جلد کی "فصل فی الدعوۃ والتبلیغ" میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

کتاب السُّنَّة والبدعة

(سنت اور بدعت سے متعلق مسائل کا بیان)

فرض نماز کے بعد "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ" پڑھنا

سوال:- اگر فرض نماز کے بعد "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ .... الخ" والی آیت پڑھے تو شریعت میں کیا حکم ہے؟ اور کیا بدعت، حسنہ بھی ہوسکتی ہے؟

جواب:- آج کل جس طرح اس آیت کو پڑھنے کا التزام کیا جاتا ہے کہ اس کے تارک پر ایسی نکیر کی جاتی ہے جیسے فرائض کے تارک پر کی جاتی ہے، تو یہ بدعتِ سیئہ ہے، اور "بدعت" اصطلاحی معنوں میں صرف سیئہ ہی ہوتی ہے، حسنہ نہیں ہوتی، لقولہ علیہ السلام: "کل بدعة ضلالة"۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۵۴ ب)

نیاز فاتحہ کا حکم

سوال:- اگر کسی نے کچھ پکا کر نیاز فاتحہ دیا تو کیا جب تک نیاز فاتحہ نہ دیا جائے، تقسیم کرنا ممکن نہیں؟

جواب:- نیاز فاتحہ کا مروّجہ طریقہ ہی شریعت کی رُو سے دُرست نہیں ہے۔ ہاں! اگر کسی بزرگ کی رُوح کو ایصالِ ثواب کرنا ہے تو کھانا پکا کر کسی کو صدقہ کردیا جائے، اور یہ دُعا کرلی جائے کہ اللہ تعالیٰ اس صدقے کا ثواب فلاں کو پہنچادے، یہ جائز ہے، اور اس نیت سے کرنے کے لئے نیاز فاتحہ کی ضرورت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۵/۲ھ

---

(۱) رواه أحمد وأبوداؤد والترمذی وابن ماجة، راجع الیٰ مشکوٰة المصابیح باب الاعتصام بالکتاب والسُّنة ج:۱ ص:۳۰ (طبع قدیمی کتب خانه) وفی مرعاة المفاتیح لابی الحسن المبارکفوری الهندی ج:۱ ص:۲۶۴ (طبع بنارس هند) والمراد بالبدعة ما أحدث فی الدین ما لا أصل له فی الشریعة یدل علیه واما ما کان له أصل من الشرع یدل علیه فلیس ببدعة شرعًا وان کان بدعة لغة واما ما وقع فی کلام السلف من استحسان بعض البدع فانما ذٰلک فی البدع اللغویة لا الشرعیة .... فالبدع الشرعیة کلها مذمومة لأنها موجبة للضلال والغواية. وفی التعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰة المصابیح للشیخ محمد ادریس الکاندهلوی ج:۱ ص:۸۸ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) فالبدعة فی عرف الشرع مذمومة بخلاف اللغة فان کل شئ أحدث علیٰ غیر مثال یسمّی بدعة سواء کان محمودًا أو مذمومًا .... الخ. نیز دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۳۷ (طبع ادارہ اسلامیات)۔ (محمد زبیر حق نواز)

کسی بزرگ کے مزار پر اجتماعی قرآن خوانی کرنا

سوال:- کسی بزرگ کے مزار شریف پر اجتماعی حیثیت سے بہ نیتِ ایصالِ ثواب قرآن خوانی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- ایصالِ ثواب جائز ہے اور وہ ہر جگہ، ہر وقت ہوسکتا ہے، مگر کسی کی قبر پر اجتماعی طور سے قرآن خوانی کرکے ایصالِ ثواب کرنے کا صحابہ کرامؓ سے کوئی ثبوت نہیں ہے، لہٰذا اس طریقے سے اجتناب بہتر ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ختمِ قرآن کے موقع پر مسجد میں چراغاں کرنا اور مٹھائی تقسیم کرنا

سوال:- ماہِ رمضان میں ختمِ قرآن پر مسجد کو سجانا، روشنی کرنا اور قراءت کا مقابلہ وغیرہ کرنے کے بعد مٹھائی تقسیم کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب:- مسجد میں چراغاں کرنا اِسراف ہے، اور کسی حال جائز نہیں[1]، قراءت کا مقابلہ اگر بچوں میں قرآنِ کریم کی ترغیب کی غرض سے ہو تو اس کی گنجائش ہے، لیکن آج کل اس طرح نام ونمود اور تفاخر کی غرض سے جو مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں، ان سے احتراز لازم ہے۔ جہاں تک مٹھائی تقسیم کرنے کا تعلق ہے، اس کا مسئلہ یہ ہے کہ مسجد کی رقم سے مٹھائی تقسیم کرنا جائز نہیں، ہاں! اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے مٹھائی تقسیم کرے اور اسے مسنون اور لازم بھی نہ سمجھے تو اس کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۱/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۰۰/۳۲ ج)

سفر کرکے بزرگ کے مزار کی زیارت کرنا

سوال:- زید کبھی کبھار اسّی نوّے میل سفر کرکے کسی بزرگ کی قبر پر چلا جاتا ہے، خیال یہ ہوتا ہے کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ دُعا قبول فرماتے ہیں، اس مقبرے پر بعض مشرکانہ افعال بھی کئے جاتے

---

(۱) وقال العلامة الشاطبیؒ فی الاعتصام ج:۲ ص:۲۷۳ (طبع دار المعرفة بیروت) ان النار لیس ایقادها فی المساجد من شأن السلف الصالح ولا کانت مما تزین بها المساجد ألبتة، ثم أحدث التزین بها حتّی صارت من جملة ما یعظم به رمضان واعتقد العامة هٰذا، .... وبعد اسطر .... ومثله ایقاد الشمع بعرفة لیلة الثامن ذکر النوویؒ انها من البدع القبیحة وانها ضلالة فاحشة جمع فیها أنواع من القبائح، منها اضاعة المال فی غیر وجهه، ومنها اظهار شعائر المجوس .... وقد ذکر الطرطوسیؒ فی ایقاد المساجد فی رمضان بعض هٰذه الأمور، وذکر أیضًا فی قبائح سواها. (مرتب عفی عنہ)

ہیں، کیا اس طرح جانا جائز ہے؟

جواب: – اگر زید شرک و بدعات کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہو، اور اسے اعتماد ہو کہ وہاں شرک و بدعات میں مبتلا نہیں ہوگا، تو اس کے لئے جانا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

قال ابن حجر فی فتاویه: ولا تترک (أی الزیارة) لما یحصل عندها من منکرات ومفاسد .... لأن القربات لا تترک لمثل ذٰلک بل علی الانسان فعلها وانکار البدع بل وازالتها ان أمکن. اهـ. (شامی ج: ۱ ص: ۸۴۳)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۰/۱۰/۱۳۸۷ھ[2]

فرض نماز اور عیدین کے بعد مصافحہ و معانقہ کا حکم

سوال: – عموماً عیدین (عید الفطر وعید الاضحیٰ) کی نماز کے بعد نمازی مسجد کے اندر ہی خطبے اور دُعا کے بعد ایک دُوسرے کو عید مبارکباد کہتے ہوئے مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کو ضروری سمجھتے ہیں، کچھ رسم پوری کرنے کی غرض سے، اور کچھ سنت کی غرض سے مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں۔ نمازیوں میں کچھ حضرات بزرگ ہوتے ہیں، ان کے متعلق اللہ والا ہونے کا حسنِ ظن لوگ رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ایسا کرنے سے فیض حاصل ہوگا اور نیکیوں پر مدد ملے گی، وہ نہ اس کو رسم سمجھ کر کرتے ہیں اور نہ ضروری سمجھ کر بلکہ نیک لوگوں کی عقیدت سے معانقہ کرتے ہیں، آیا یہ فعل سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، آثارِ صحابہؓ یا فتاویٰ ائمۂ اربعہ سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب: – دو مسلمانوں کی ملاقات کے وقت مصافحہ مسنون ہے، نیز کوئی شخص سفر سے آئے تو اس سے معانقہ کرنا بھی سنت سے ثابت ہے، ان دونوں مواقع کے علاوہ سنت نہیں، لیکن اگر سنت سمجھے بغیر اتفاقاً کبھی کرلے تو گناہ بھی نہیں، اور سنت سمجھ کر کرے تو بدعت ہے۔ ہمارے زمانے میں چونکہ فرض نمازوں کے بعد مصافحہ اور عیدین کے بعد معانقہ کو سنت سمجھا جانے لگا ہے حالانکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، اس لئے علماء نے اس کو بدعت قرار دیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، لیکن کہیں اعتقادِ سنت کی یہ علت نہ ہو تو مباح ہے۔

فی ردّ المحتار قد یقال: ان المواظبة علیها بعد الصلوات خاصة قد یؤدی الجهلة الی اعتقاد سنیتها فی خصوص هٰذه المواضع، وان لها خصوصیة زائدة علٰی غیرها مع أن ظاهر کلامهم أنه لم یفعلها أحد من السلف فی هٰذه المواضع .... ونقل فی تبیین المحارم عن

---

(۱) شامی ج: ۲ ص: ۲۴۲ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

الملتقط أنه تكره المصافحة بعد اداء الصلوٰة .... ولأنها من سنن الروافض اهـ. ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية أنها بدعة مكروهة، لا أصل لها فی الشرع، وأنه ينبه فاعلها أوّلًا ويعزر ثانيًا .... الخ. (رد المحتار، باب الاستبراء وغيره من كتاب الحظر والاباحة،(۱) ومثله فی عزيز الفتاوىٰ)(۲)۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۷۰ الف)

نماز کے بعد یا مہمان سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا

سوال ۱:- فرض نماز کے بعد خصوصاً اور عصر کی نماز کے بعد دُعا سے فارغ ہوکر مصافحہ کرنا، آپس میں ہاتھ ملانا اور امام صاحب کا مصلےٰ پر کھڑے ہوکر ہاتھ ملانا لازمی ہے یا نہیں؟

۲:- اگر کوئی مہمان مسجد میں نماز کے بعد مصافحہ کرنا چاہے تو اس سے مصافحہ کرنا دُرست ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- ہرگز لازم نہیں، بلکہ لازم یا ثواب وسنت سمجھ کر مصافحہ کرنا بدعت ہے، اور اس کا ترک واجب ہے۔(۳)

۲:- مہمان سے پہلی ملاقات میں مصافحہ مسنون ہے،(۴) اس نیت سے مصافحہ دُرست ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۸۸۴ ج)

میّت کے سرہانے بیٹھ کر یا قبرستان لے جاتے وقت کلمہ پڑھنا

سوال:- میّت کی چارپائی کے پاس بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر کلمۂ طیبہ بلند آواز سے پڑھنا یا میّت کو قبرستان کی طرف لے جاتے وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:- دونوں حالتوں میں کلمۂ طیبہ پڑھنا دُرست ہے، مگر اس کو لازم اور ضروری نہ سمجھا

---

(۱) فتاوىٰ شامية ج:۶ ص: ۳۸۱. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۶۰، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵۔

(۲) عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸۔

(۳) وفی الشامية ج:۶ ص: ۳۸۱ (طبع سعيد) ونقل فی تبيين المحارم عن الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلوٰة بكل حال لأن الصحابة رضی الله عنهم ما صافحوا بعد أداء الصلوٰة ولأنها من سنن الروافض (الی أن قال) فيزجر فاعله لما أتی به من خلاف السّنة. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۶۰، عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵۔

(۴) وفی الشامية أيضًا وموضع المصافحة فی الشرع انما هو عند لقاء المسلم لأخيه لا فی ادبار الصلوٰة.

جائے، اور بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۲۴۸ الف)

کفن پر کلمۂ طیبہ لکھنا

سوال:- کفن پر کلمۂ طیبہ لکھنا آپ کے خیال میں کیسا ہے؟

جواب:- جائز تو ہے، لیکن چونکہ صحابہ کرامؓ، سلف صالحینؒ سے منقول نہیں اس لئے نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔[2]

فقط واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۲۴۸ الف)

جشنِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ایک جمعہ، مسجد میں یہ اعلان کردیا جائے کہ فلاں تاریخ کو جلسہ جشنِ عید میلاد ہوگا، اور بعد میں ایک آدمی کے کہنے پر فلاں مولوی اس مسجد میں تقریر کرنے نہ آئے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ناراض ہے، پھر چند آدمی اس کا ساتھ دے کر جلسہ ملتوی کردینے کا اعلان کردیں، باقی عوام کا خیال نہ رکھیں۔ شریعت کی رُو سے مسئلہ حل کرکے ارسال کریں، والسلام۔

جواب:- جشنِ عید میلا کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے،[3] البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) فی الدرّ المختار ج:۲ ص:۲۳۳ کرہ فیھا رفع صوت بذکر أو قراءۃ فتح وفی الشامیۃ (قولہ کما کرہ) قیل تحریما وقیل تنزیھا کما فی البحر عن الغایۃ، وفیہ عنھا وینبغی لمن تبع الجنازۃ أن یطیل الصمت، وفیہ عن الظھیریۃ فان أراد أن یذکر اللہ تعالیٰ یذکرہ فی نفسہ لقولہ تعالیٰ: "اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ" أی الجاھرین بالدعاء، وعن ابراھیم أنہ کان یکرہ أن یقول الرجل وھو یمشی معھا: استغفروا لہ غفر اللہ لکم. قلت: واذا کان ھذا فی الدعاء والذکر فما ظنک بالغناء الحادث فی ھذا الزمان. وفی الفتاویٰ الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج:۱ ص:۱۹۰ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) ویکرہ رفع الصوت بالذکر فان أراد أن یذکر اللہ یذکرہ فی نفسہ وعن ابراھیم کانوا یکرھون أن یقول الرجل وھو یمشی معھا: استغفروا لہ غفر اللہ لکم .... الخ.

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے عزیز الفتاویٰ ص:۹۹۔

(۳) وفی الابداع فی مضار الابتداع ص:۱۲۶ (طبع مکتبۃ علمیۃ مدینۃ المنورۃ) قیل أوّل من أحدثھا بالقاھرۃ الخلفاء الفاطمیون فی القرن الرابع فابتدعوا ستۃ موالد .... ثم اعیدت فی خلافۃ الحاکم بأمر اللہ فی سنۃ أربع وعشرین وخمسمائۃ بعد ما کاد الناس ینسونھا وأول من أحدث المولد النبی بمدینۃ اربل الملک المظفر أبو سعید فی القرن السابع وقد استمر العمل بالموالد الی یومنا ھذا وتوسع الناس فیھا وابتدعوا بکل ما تھواہ أنفسھم ویوحیہ الیھم الشیطان.

جشنِ میلاد النبیؐ کی تاریخی وشرعی حیثیت سے متعلق مکمل تفصیلات کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:..... (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے ذکرِ مبارک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کو سننے اور سنانے کے لئے کوئی مجلس کسی خاص دن یا تاریخ کی قید کے بغیر منعقد کی جائے تو دُرست ہے، بشرطیکہ اس کا مقصد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ مبارک سے برکت حاصل کرنا اور سیرتِ طیبہ پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا ہو، نام ونمود مقصود نہ ہو۔ صورتِ مسئولہ میں اگر محفل اسی غرض کے لئے منعقد کی گئی تھی تو ٹھیک تھی، لیکن اگر کسی مصلحت سے اسے ملتوی کردیا گیا تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں، مثلاً: یہ کہ کوئی عالم سیرت بیان کرنے کے لئے موجود نہ ہو یا کسی فتنے فساد کا اندیشہ ہو۔ ہاں! اگر کسی عذر کے بغیر جلسہ ملتوی کردیا گیا تو اس میں حاضرین کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچانے کا گناہ ہوگا۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۶/۷۳۱ ج)

شادی کے موقع پر لوگوں کو سفید پگڑیاں دینا
ختنہ کے موقع پر لوگوں کو جمع کرنا

سوال ۱:- ہمارے ہاں شادی کے گھر سے جب لوگوں کو رُخصت کیا جاتا ہے تو سفید پگڑیاں عطا کی جاتی ہیں، یہ لوگ یہ پگڑیاں باندھ کر یا ہاتھ میں لے کر اپنے گھروں کو جاتے ہیں اور یہ ایک بڑی عزّت کی بات سمجھی جاتی ہے، آیا یہ طریقہ جائز ہے یا رسم ہے؟

۲:- اور ختنے کے موقع پر لوگوں کو جمع کرنا سنت ہے یا بدعت؟

جواب ۱:- یہ رسم اگر سنت سمجھ کر کی جاتی ہے تو بدعت اور واجب الترک ہے، اور اگر سنت نہیں سمجھا جاتا لیکن اس کی ایسی پابندی کی جاتی ہے جیسے فرائض و واجبات کی، کی جاتی ہے، اور اگر نہ کرے تو اسے بُرا سمجھا جاتا ہے تب بھی یہ ناجائز ہے، اور اگر ان باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے محض خوش دِلی سے کسی دباؤ کے بغیر دیا جاتا ہے اور بدلے کی توقع بھی نہیں ہوتی تو جائز ہے۔

۲:- سنت سمجھ کر جمع کرنا یا اس کی سنتوں کی طرح پابندی کرنا اور نہ کرنے والے کو بُرا سمجھنا

(گزشتہ سے پیوستہ).....

۱:- فتاویٰ میلاد شریف — مجموعہ افاضات حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری، حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی رحمہم اللہ

۲:- فیصلہ ہفت مسئلہ — حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرِ مکی رحمہ اللہ

۳:- التحذیر من البدع — عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ

۴:- الانصاف فیما قیل فی المولد — ابوبکر جابر الجزائری

۵:- جواہر الفقہ (ج:۱ ص:۲۰۵) — مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ

۶:- راہِ سنت (ص:۱۲۵) — حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر دامت برکاتہم

۷:- تاریخِ میلاد — حکیم مولانا عبدالشکور صاحب مرزاپوری

(محمد زبیر حق نواز)

بدعت اور واجب الترک ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۸/۱/۱۴۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۵۸/۷۲)

نماز کے بعد مصافحہ کرنے کا حکم

سوال:- نماز کے بعد لوگ جو مصافحہ کرتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے بعد مصافحہ کو جس طرح لازم اور نماز کا جزء سمجھ لیا گیا ہے، وہ بدعت اور واجب الترک ہے۔[2] ہاں! کسی آدمی سے اسی وقت ملاقات ہوئی تو ملاقات کے مصافحہ کی نیت سے مصافحہ کرلیں،[3] نماز کے بعد کی نیت سے نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱/۱۰/۱۳۹۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۶۸۰)

بزرگ یا پیر کی نیاز اور میّت کی مختلف رُسومات کا حکم

سوال ۱:- اکثر لوگ کہتے ہیں کہ آج فلاں پیر یا بزرگ کی نیاز ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ جائز ہے یا نہیں؟

۲:- میّت اور اس سے متعلق مختلف رُسومات ہمارے یہاں رائج ہیں، اس سلسلے میں شرعی اَحکام کیا ہیں؟

جواب ۱:- آج کل نیاز کے نام سے جو رسمیں رائج ہیں، قرآن وسنت اور شریعتِ مطہرہ میں ان کا کوئی ثبوت نہیں، ان بدعات کو ترک کرنا واجب ہے،[4] البتہ کسی بزرگ کے ایصالِ ثواب کا طریقہ یہ ہے کہ جتنی توفیق ہو نقد روپیہ یا کھانا، کپڑا صدقہ کرکے اس کا ثواب خاموشی سے ان بزرگ کو پہنچادیا جائے، اس غرض کے لئے یہ دعوتیں اور اجتماعات کرنا شرعاً ناجائز اور بدعت ہے۔

---

(۱) وفی مسند أحمد ج:۴ ص:۲۱۷ (طبع مؤسسة قرطبة مصر) عن الحسن قال: دعی عثمان بن أبی العاص الی ختان فأبی أن یجیب، فقیل له فقال: انا کنا لا نأتی الختان علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا ندعی له. وکذا فی المعجم الکبیر للطبرانی رحمه الله، رقم الحدیث: ۸۳۸۲ ج:۹ ص:۵۷ (طبع مکتبة العلوم، موصل). نیز دیکھئے: امداد المفتین ص:۲۰۱

(۲) وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۸۱ (طبع سعید): ونقل فی تبیین المحارم عن الملتقط أنه تکره المصافحة بعد أداء الصلوٰة بکل حال، لأن الصحابة رضی الله عنهم ما صافحوا بعد أداء الصلوٰة ولأنها من سنن الروافض (الی أن قال) ویزجر فاعله لما أتی به من خلاف السّنة. تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ص:۲۶۰، عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵ دیکھئے۔

(۳) وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۸۱ (طبع سعید) وموضع المصافحة فی الشرع انما هو عند لقاء المسلم لأخیه لا فی ادبار الصلوات.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۳۹ (طبع سعید) واعلم أن النذر یقع للأموات ومن أکثر العوام وما یؤخذ من الدراهم والشمع والزیت ونحوها الی ضرائح الأولیاء الکرام تقربًا الیهم فهو بالاجماع باطل و حرام ما لم یقصدوا صرفها للفقراء الأنام وقد ابتلی الناس بذٰلک وکذا فی البحر الرائق ج:۳ ص:۲۹۸ (طبع سعید) (محمد زبیر حق نواز)

۲:- بہشتی زیور اور بہشتی گوہر میں جنازے اور میّت کے اَحکام تفصیل سے موجود ہیں، اس کا مطالعہ فرمالیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۷/۱۲/۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۵۶/۳۸ ہ)

عرس اور برسی کی شرعی حیثیت

سوال:- عرس و برسی کی شریعت میں کیا حیثیت ہے؟

جواب:- عرس اور برسی کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، یہ سب انسانوں کی ایجادکردہ بدعات ہیں جن سے پرہیز لازم ہے۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۵/۱۱/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۱۲/۳۲ ج)

نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا

سوال:- حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی صحابی کی نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی یا نہیں؟ نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا کیسا ہے؟

جواب:- نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، نہ دُوسرے صحابہ کرامؓ سے۔ لہٰذا آج کل جو رواج چل پڑا ہے اور اس طرح ضروری سمجھتے اور اس کے ترک پر نکیر کرتے ہیں، وہ بدعت اور واجب الترک ہے۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۶/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۵۷/۲۸ ج)

---

(۱) فی التفسیر المظهری سورة ال عمران ج:۲ ص:۶۵ (طبع بلوچستان بک ڈپو) لا یجوز ما یفعله الجهال بقبور الأولیاء والشهداء من السجود والطواف حولها، واتخاذ السرج والمساجد علیها، ومن الاجتماع بعد الحول کالأعیاد، ویسمونه "عرسا". نیز دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۲۵، ۱۲۸۔

(۲) وفی مرقاة المفاتیح شرح مشکوة ج:۴ ص:۶۴ (طبع مکتبه امدادیه ملتان) ولا یدعو للمیّت بعد صلوة الجنازة، لأنه یشبه الزیادة فی صلوة الجنازة. وفی البزازیة (علی الهندیة ج:۴ ص:۸۰) لا یقوم بالدعاء بعد صلوة الجنائز، لأنه دعا مرة لأن أکثرها دعاء. وفی خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۲۵ (طبع امجد اکیڈمی لاهور) ولا یقوم بالدعاء ففی قراءة القرآن لأجل المیّت بعد صلوة الجنازة وقبلها، وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۱۸۳ (طبع سعید): لا یدعو بعد التسلیم. وفی فتاویٰ السراجیة علی قاضی خان ج:۱ ص:۱۴۵: اذا فرغ من الصلوة لا یقوم داعیا له. وفی جامع الرموز فصل فی الجنائز ج:۱ ص:۲۸۳ (طبع ایچ ایم سعید): لا یقوم داعیا له. وفی نفع المفتی والسائل ص:۱۴۳ (طبع کتب خانه رحیمیه دیوبند یوپی): الدعاء بعد الجنازة مکروه. نیز مزید دیکھئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۴ و امداد المفتین ص:۱۷۶۔ (محمد زبیر)

نکاح کے وقت دُولہا کا سہرا باندھنا

سوال:- نکاح سے پہلے دُولہا کے سر پر سہرا باندھنا کسی روایت سے ثابت ہے؟

جواب:- سہرا باندھنا ہندوانہ رسم ہے، مسلمانوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۵۷ ج)

کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھنا

سوال:- کھانا سامنے رکھ کر ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ پڑھنا کسی حدیث یا روایت سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور فاتحہ کو لازمی سمجھنا کیسا ہے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، مرحوم کی رُوح کو ایصالِ ثواب کس طرح کیا کرتے تھے؟

جواب:- کسی روایت یا حدیث سے ثابت نہیں، اور اس کو لازمی سمجھنا بدعتِ شنیعہ ہے۔ ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کوئی بھی نیک عمل صدق و اِخلاص کے ساتھ نام ونمود سے بچتے ہوئے یہ دُعا کرلی جائے کہ یا اللہ! اس کا ثواب فلاں کو عطا فرما۔ اور اس غرض کے لئے لوگوں کو جمع کرنا یا خاص خاص دنوں میں جمع ہوکر اجتماعی طور پر تلاوت کرنا، کھانا پکانا وغیرہ یہ سب اُمور بدعت ہیں اور ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۵۷ ج)

عہدنامہ قبر میں رکھنے کا حکم

سوال:- عہدنامہ کا قبر میں رکھنا کیسا ہے؟

جواب:- میّت کے ساتھ قبر میں کسی قسم کا عہدنامہ رکھنے کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۶/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۳۶ الف)

---

(۱) دیکھئے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (عزیز الفتاویٰ) ص:۹۹۔

قبر پر تلقین کا حکم

سوال:- قبر پر تلقین کی کیا کیفیت ہے؟

جواب:- قبر پر تلقین کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱/۱/۱۳۹۷ھ

مسجد میں بلند آواز سے دُرود وسلام، نعت اور میلاد منعقد کرنا

سوال:- مسجد میں بلند آواز سے دُرود وسلام اور نعت پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ مسجد میں میلاد شریف ہونی چاہئے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے اوقات میں جب لوگ فرض یا سنن ونوافل پڑھ رہے ہوں، مسجد میں بلند آواز سے ذکر یا وعظ وخطبہ دینا دُرست نہیں[2]، البتہ جب نماز میں مشغول نہ ہوں تو ذکرِ جہر یا وعظ کہنا جائز ہے، البتہ دُرود شریف کو آج کل جس طرح کھڑے ہوکر اجتماعی شکل میں بلند آواز سے پڑھنا لازم سمجھ لیا گیا ہے وہ بدعت ہے، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا بیان انتہائی سعادت اور موجبِ خیر و برکت ہے، لیکن اس کو کسی خاص دن کے ساتھ مخصوص کرنا دُرست نہیں، نیز اس میں حاضری کا مقصد اتباعِ سنت کا جذبہ ہونا چاہئے، نمود ونمائش نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۶۱۹ ب)

قبر پر اذان دینے کا حکم

سوال:- ایک شخص مرگیا، اس کی میّت کو دفنانے کے لئے قبرستان لے جاتے ہیں اور دفنانے کے بعد اس کی قبر پر ایک شخص اذان دیتا ہے، قبر پر اذان دینا دُرست ہے؟

جواب:- قبر پر مذکورہ طریقے سے اذان دینا بالکل بے اصل ہے۔ قرآن وحدیث میں اس

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۲۱۱، و فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۳۳۔

(۲) وفی الفتاوی البزازیة علی الهندیة ج:۶ ص:۳۷۸ وقد صح عن ابن مسعود رضی الله عنه أنه سمع قوما اجتمعوا فی مسجد یهللون ویصلون علیه، علیه الصلوٰة والسلام جهرًا، فراح الیهم فقال: ما عهدنا ذٰلک علی عهده علیه السلام وما أراکم الا مبتدعین، فما زال یذکر ذٰلک حتّی أخرجهم عن المسجد. کذا فی ردّ المحتار ج:۶ ص:۳۹۸
وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۴۹ (طبع سعید) وفی الملتقی وعن النبی صلی الله علیه وسلم أنه کره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة والزحف والتذکیر، فما ظنک به عنا. الغناء الذی یسمّونه وجدا ومحبة فانه مکروه لا أصل له فی الدین. وفیها ص:۳۹۸ .... فالاسرار أفضل حیث خیف الریاء أو تأذی المصلین .... الخ.

کا کوئی ثبوت نہیں، اس عمل سے اجتناب لازم ہے۔[۱]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۷۶/۲۷ و)

اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جن مسجدوں میں عرصہ تیس سال سے اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام نہیں پڑھا جاتا تھا وہاں اب پڑھنے، نہ پڑھنے پر نمازیوں میں شدید اختلاف پیدا ہورہا ہے۔ حدیث وفقہ کی روشنی میں دلائل کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

جواب:- دُرود شریف پڑھنا بے حد فضیلت کا عمل ہے، جس مسلمان کو اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے، دُرود شریف پڑھ کر اپنے نامۂ اعمال کو نیکیوں سے بھرنا چاہئے، اس کا کوئی خاص وقت شریعت کی طرف سے مقرّر نہیں، انسان جس وقت چاہے اِخلاص کے ساتھ، نمود ونمائش کے بغیر دُرود شریف پڑھ سکتا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں بعض مقامات پر اذان سے پہلے جس طرح اجتماعی ہیئت میں بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا رواج ہوگیا ہے اور جس طرح اس کو فرض وواجب یا اذان کا لازمی جزء سمجھا جانے لگا ہے، یہ دُرود شریف نہیں، بلکہ اس کی نمائش ہے، جس کا کوئی ثبوت قرآن وسنت یا صحابہؓ و تابعینؒ کے عہدِ مبارک میں نہیں ملتا، اس بناء پر یہ بدعت ہے۔[۲] مسلمانوں کو چاہئے کہ اس طریقے کے

---

(۱) وفی رد المحتار ج:۲ ص:۲۳۵ تنبیه فی الاقتصار علی ما ذکر من الوارد اشارة الی أنه لا یسن الأذان عند ادخال المیّت فی قبره کما هو المعتاد الآن. وقد صرح ابن حجرؒ فی فتاویه بأنه بدعة، وقال: ومن ظن أنه سنة قیاسا علی ندبهما للمولود الحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم یصب. وفی حاشیة البحر الرائق باب الأذان ج:۱ ص:۲۵۶ (طبع مکتبه ماجدیه کوئٹه) قیل: وعند انزال المیّت القبر قیاسا علی أول خروجه للدنیا لٰکن رده ابن حجر فی شرح العباب .... الخ. وفی در البحار: من البدع التی شاعت فی بلاد الهند الأذان علی القبر بعد الدفن. بحوالہ فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۳۶، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۰۱، وعزیز الفتاویٰ ص:۱۰۰ و ۱۰۶۔

(۲) وفی الفتاویٰ الکبریٰ لابن حجر الهیتمیؒ ج:۱ ص:۱۲۹، ۱۳۰ (طبع مکتبه اسلامیه) (وسئل) هل الصلوٰة علی النبی صلی الله علیه وسلم مسنونة قبل الأذان کما هی بعده؟ .... وهل ینهی عنه، وعن الصلوٰة علی النبی صلی الله علیه وسلم قبل الأذان أو لا؟ (فأجاب) .... بعد اسطر .... أما الصلوٰة والسلام علی النبی صلی الله علیه وسلم بعد الأذان والاقامة، فانهما مندوبان کما صرح به أصحابنا وما جاء به ذٰلک خبر مسلم والأربعة الا ابن ماجة. وفیه أیضًا ج:۱ ص:۱۳۱ فمن أتی .... معتقدا سنیته فی ذٰلک المحل المخصوص نهی عنه ومنع منه لأنه تشریع بغیر دلیل ومن شرع بلا دلیل یزجر عن ذٰلک وینهی عنه. فائدة:- قد أحدث المؤذنون الصلوٰة والسلام علی رسول الله صلی الله علیه وسلم عقب الأذان، .... وکان ابتداء حدوث ذٰلک فی أیام السلطان الناصر صلاح الدین ابن أیوب، وبأمره فی مصر وأعمالها .... ولقد استفتی مشائخنا وغیرهم فی الصلوٰة والسلام علیه صلی الله علیه وسلم .... بعد الأذان علی الکیفیة التی یفعلها المؤذنون، فأفتوا بأن الأصل سنة والکیفیة بدعة. .....(بقیہ اگلے صفحے پر)

بجائے مسنون طریقے پر اِخلاص اور ادب کے ساتھ دُرود شریف پڑھنے کا طریقہ اختیار کریں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۸۵۸ ب)

نماز کے بعد بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- نمازوں کے بعد الصلوٰۃ والسلام بلند آواز سے بہ ہیئتِ اجتماعی پڑھنا فرض، واجب یا سنت یا مستحب یا بدعت ہے؟

جواب:- دُرود پڑھنا بہت ثواب ہے، لیکن اس کا جو طریقہ آج کل چل پڑا ہے کہ کھڑے ہوکر اجتماعی طور سے پڑھنے کو ضروری سمجھا جاتا ہے، اور جو ایسا نہ کرے اسے بُرا سمجھا جاتا ہے، یہ بدعت ہے۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۸ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۲۳ الف)

نماز اور درس کے بعد مصافحہ کرنا

سوال:- ہماری مسجد میں روزانہ بعد نمازِ فجر درسِ قرآن ہوتا ہے، درسِ قرآن کے بعد جب مولوی صاحب کھڑے ہوجاتے ہیں تو مصافحہ کے لئے لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں، اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا، کیا اس طرح پابندی بدعت نہیں ہے؟

جواب:- نماز خواہ فجر کی ہو یا ظہر کی، اس کے بعد یا درسِ قرآن کے بعد ثواب سمجھ کر مصافحہ کرنا بدعت ہے، اور اگر اس پر اس طرح پابندی کی جائے کہ جو مصافحہ نہ کرے اسے بُرا سمجھا

(گزشتہ سے پیوستہ).....وفی الابداع فی مضار الابتداع ص:۷۷، ۷۸ (طبع مکتبة علمیة مدینة المنورة) لا کلام فی أن الصلوٰة والسلام علی النبی صلی الله علیه وسلم عقب الأذان مطلوبان شرعا لورود الأحادیث الصحیحة .... انما الخلاف فی الجهر بهما علی الکیفیة المعروفة، والصواب أنها بدعة مذمومة بهذه الکیفیة التی جرت بها عادة المؤذنین من رفع الصوت بهما کالأذان والتمطیط والتغنی، فان ذلک احداث شعار دینی علی خلاف ما عهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وأصحابه والسلف الصالح من أئمة المسلمین، ولیس لأحد بعدهم ذلک .....

ومن ثم قال العلامة ابن حجر فی فتاویه الکبریٰ: من صلی علی النبی صلی الله علیه وسلم قبل الأذان أو قال: محمد رسول الله بعده معتقدا سنیته فی ذلک المحل ینهی ویمنع منه، لأنه تشریع بغیر دلیل ومن شرع بغیر دلیل یزجر ویمنع انتهٰی. وهٰذا العلامة ابن حجر حکم علی من صلّی علی النبی صلی الله علیه وسلم قبل الأذان أو قال: محمد رسول الله بعده بأنه شرع فی دین الله تعالیٰ وانه یمنع من ذلک ویزجر، وما ذاک الا لقبح ما فعل .... الخ.

(۱) دیکھئے ص:۱۱۴ کا حاشیہ نمبر ۱۔

جائے تو بھی بدعت ہے،[1] لیکن اگر اسے ثواب سمجھے بغیر، اور جو مصافحہ نہ کرے اسے بُرا سمجھے بغیر مصافحہ کرلیا جائے تو مضائقہ نہیں۔

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۹۰ الف)

امام صاحب کا نمازِ جنازہ کے بعد دُعا نہ مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ میں چار تکبیروں کے بعد سلام پھیر کر امام بطریقِ مروّجہ دُعا نہ مانگتے ہوئے چلا گیا، کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ بدون دُعا مانگے نماز مکمل نہیں ہوئی، کچھ لوگوں نے کہا کہ نمازِ جنازہ خود میّت کے حق میں دُعا ہے، نماز مکمل ہوگئی۔ کون سا عمل دُرست ہے؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد الگ سے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا سنت سے ثابت نہیں،[2] لہٰذا امام صاحب کا عمل دُرست ہے۔ جو لوگ ان کے اس عمل پر اعتراض کر رہے ہیں ان کا اعتراض صحیح نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۲۲ ہ)

دفن کے بعد قبر پر اذان دینے کا حکم

سوال:- دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہوکر جو اذان دی جاتی ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟

جواب:- دفن کے بعد اذان دینے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں، اس سے احتراز کرنا لازم ہے، کیونکہ یہ بدعت ہے۔[3]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۹/۲ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۳۰ الف)

---

(۱) وفی الشامیة ج:٦ ص: ۳۸۱ (طبع سعید) ونقل فی تبیین المحارم عن الملتقط أنه تکره المصافحة بعد أداء الصلٰوة بکل حال لأن الصحابة ما صافحوا بعد أداء الصلٰوة ولأنها من سنن الروافض .... قال ابن الحاج من المالکیة فی المدخل: انها من البدع، وموضع المصافحة فی الشرع انما هو عند لقاء المسلم لأخیه لا فی ادبار الصلوات، فحیث وضعها الشارع یضعها، فینهی عن ذٰلک ویزجر فاعله لما أتی به من خلاف السنة، وکذا فی فتاویٰ رشیدیة ص: ۴۶۴. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۶۰، عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۸، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۹۵۔

(۲) دیکھئے ص:۱۰۸ کا حاشیہ نمبر۲۔

(۳) دیکھئے ص:۱۱۱ کا حاشیہ نمبر۱۔

دُعا کے آخر میں "صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" پڑھ کر بلند آواز سے دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- آج کل بعض مساجد میں دُعا کے آخر میں "صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" پڑھ کر امام اور مقتدی زور سے دُرود شریف پڑھتے ہیں، اگر امام منع کرے تو فساد ہوتا ہے، کیا حکم ہے؟

جواب:- مذکورہ عمل جس التزام و اہتمام کے ساتھ کیا جارہا ہے، اور جس طرح اس کے تارک پر نکیر کی جاتی ہے، وہ بدعت ہے،(۱) اس سے پرہیز لازم ہے۔ جو لوگ اس پر عمل پیرا ہوں ان کو اہلِ علم کے فتاویٰ دِکھا کر نرمی سے سمجھانا چاہئے، لیکن اس کی وجہ سے فتنہ و فساد برپا کرنا واقعۃً دُرست نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۱/۱۰/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۶۱/ ۲۸ ج)

ما حكم قراءة الصلوٰة والسلام جهرًا بعد صلوٰة الجمعة؟

(جمعہ کے بعد بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنے پر عربی میں مفصل فتویٰ)

الاستفتاء:-

هل يجوز بكلام الله وسنة الرسول صلى الله عليه وسلم أن تؤدى الصلوٰة والسلام جهرا بعد صلوٰة الجمعة أمام المنصة والمحراب للجامع اهتماما والتزاما؟ شرّفونا بالجواب الصائب، مأجورين عند الله، مشكورين عند الناس.

الجواب:-

ليعلم أولا أن الصحابة رضوان الله عليهم فمن بعدهم من التابعين وأتباعهم كانوا سباقين الى الخير حريصين فى كل ما هو خير فى نظر الشريعة الغراء اذ عملوا بكلما رأوه سنة نبيهم الكريم صلى الله عليه وسلم، وبكلما كان حسنا شرعيا، فدل على أنه لم يبق بعدهم شئ

---

(۱) وفى الفتاوى البزازية على الهندية ج:٦ ص:٣٧٨ (طبع رشيديه كوئٹه) وقد صح عن ابن مسعود رضى الله عنه أنه سمع قوما اجتمعوا فى مسجد يهللون ويصلون عليه، عليه الصلوٰة والسلام جهرا فراح اليهم فقال: ما عهدنا ذلك على عهده عليه الصلوٰة والسلام وما أراكم الا مبتدعين، فما زال يذكر ذلك حتى أخرجهم عن المسجد. (كذا فى رد المحتار ج:٦ ص:٣٩٨) وفى الشامية ج:٦ ص:٣٤٩ وفى الملتقى وعن النبى صلى الله عليه وسلم أنه كره رفع الصوت عند قراءة القران والجنازة والزحف والتذكير، فما ظنك به عند الغناء الذى يسمونه وجدا ومحبة فانه مكروه لا أصل له فى الدين. وفيها ج:٦ ص:٣٩٨ فالاسرار أفضل حيث خيف الرياء أو تأذى المصلين .... الخ. وفى المرقاة شرح مشكوة ج:٢ ص:٣٥٧ قوله تعالى: "وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ .... الخ." ويسن الاسرار فى سائر الأذكار أيضا الا فى التلبية، وراجع أيضا الدر المختار ج:١ ص:٥١٠، ٥٢٣.

واجب ولا مندوب الا ما أوجبه القرآن الكريم وأحاديث رسول الله صلى الله عليه أحسن الصلوٰة والتسليم، وان اخترع بعدهم فكر أحد شيئا، يمكن أن يكون مباحا ولٰكنه لا يجوز أن يهتم به اهتماما بليغا ويدعى اليه الناس، ويلام علىٰ من يتركه.

فاذا بحثنا عن فعل الصحابة وأتباعهم فى مسئلتنا هٰذه، رأينا أنهم كانوا يباشرون الصلوٰة على النبى صلى الله عليه وسلم ويعتبرونه عملا مهمّا مثابا عليه، غير أن طريق مباشرتها عندهم غير الطريق المذكور فى السؤال، اذ كانوا يصلون منفردين خاشعين ولم يكونوا يؤدونها زرافات مجتمعين عند المناص والمحاريب، ولم يثبت فى شئ من الروايات اجتماعهم لهٰذا المقصد واعلامهم به كما يُعلمون الأذان.

فظهر أن الصلوٰة على النبى صلى الله عليه وسلم حسن مثاب عليه، والطريق المذكور غير مستحسن، اذ لو كان ذٰلک حسنا لفعله الصحابة بوجه أحسن واهتمام بليغ.

ثم فى هٰذا الفعل مفاسد أخرىٰ عديدة:

۱:- ان الصلوٰة دعاء فى حضرة الحق جل وعلا مجده، وقد تقرر فى موضوعه أن الدعاء بالسر أولىٰ، قال الله تبارک و تعالىٰ: "اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً".(۱)

۲:- انه يشبه الرياء، ولا ينبغى دخول مواضع التهم.(۲)

۳:- غاية ما فى الباب أنه مباح، وسفهاء زماننا يلتزمون التزاما ولا كالتزامهم الجماعة، ويهتمون به ويلومون علىٰ تاركيه، حتّى أن بعضهم يزعمه فرضا، وقد تقرر فى الفقه أن التزام ما لا يلزم لا يجوز، فانه خلاف للاٰية الشريفة: "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ" الاٰية.(۳)

٤:- بعضهم يباشره قائما ويعتقد أن الرسول صلى الله عليه وسلم "حاضر فى كل مكان، ناظر الى كل شئ"، وهٰذه العقيدة نخشى عليها الكفر كما لا يخفى علىٰ مسلم، فان احاطة الأشياء كلها بالعلم ووجوده فى كل مكان من أخص صفات الله سبحانه واشراک أحد فيه شرک بالله تعالىٰ، نعوذ بالله منه.

---

(۱) سورة الاعراف:۵۵.

(۲) وفى كشف الخفاء للعجلونى ج:۱ ص:۴۵ رقم:۸۸ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت) قول عمر من سلک مسالک الظن اتهم، ورواه الخرائطى فى مكارم الاخلاق مرفوعًا بلفظ من أقام نفسه مقام التهم فلا يلومن من اساء الظن به. وراجع أيضًا سنن الكبرىٰ للبيهقى ج:۴ ص:۳۲۴ (طبع مكتبة دار الباز مكة المكرمة) وفتح البارى اجتناب مواضع التهم وكراهة .... الخ. ج:۲ ص:۳۳۶ (طبع دار المعرفة بيروت).

(۳) سورة المائدة: ۳.

وبالجملة فهٰذا الطريق لم يثبت فى القرون المشهود لها بالخير، لا سيما اذا ضمت معها مفاسد ذكرناها كان فعلا قبيحا، وحق علىٰ كل مسلم أن لا يفعله ويمنع فاعله مهما استطاع.(۱)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم

الأحقر محمد تقی العثمانی

الجواب صحیح

العبد محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۷۹/۶/۱۳ھ(۲)

نماز کے بعد دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- نماز کے بعد دُرود شریف اُونچی آواز سے پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ یا آہستہ پڑھنا چاہئے؟

جواب:- آہستہ ہی پڑھنا چاہئے۔ ہمارے زمانے میں بلند آواز سے دُرود شریف پڑھنے کا جو رواج ہوگیا ہے، اور اس کی جس طرح فرائض کی سی پابندی کی جاتی ہے اور جس طرح اس کے خلاف پر ملامت ونکیر کی جاتی ہے، وہ بدعت ہے۔(۳)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۴۶/۲۷ ہ)

نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد دُعا کے لئے اجتماعی اہتمام جیسا کہ آج کل بعض حلقوں میں مروّج ہے، اس کا قرآن وسنت اور بزرگانِ سلف کے تعامل سے کوئی ثبوت نہیں ہے، اور اس طرح کا اہتمام واصرار بدعت ہے، لہٰذا واجب الترک ہے۔(۴)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۵/۲۸ الف)

حیلۂ اِسقاط کا حکم

سوال:- حیلۂ اسقاط کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب:- حیلۂ اسقاط کا مروّجہ طریقہ شرعاً بے اصل ہے، اس بارے میں اصل حکمِ شرعی یہ

---

(۱) مزید حوالہ جات سابقہ ص:۱۱۴ کے حاشیہ نمبر۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

(۳) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۱۴ حاشیہ نمبر۱۔

(۴) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۰۸ حاشیہ نمبر۲۔

ہے کہ نماز، روزے جو میّت کے ذمے رہ گئے ہوں، ان کا فدیہ ادا کیا جائے اگر میّت نے وصیت کی ہو، اور اس کے لئے مال بھی چھوڑا ہو تو ورثاء کے لئے ایسا کرنا واجب ہے، ورنہ واجب نہیں بہتر ہے، کذا فی عزیز الفتاویٰ (ج:۱ ص:۳۷۰)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۰/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۵/ ۲۸ الف)

میّت کے ساتھ قبرستان تک قرآن مجید لے جانا

سوال:- میّت کے ساتھ قبرستان تک قرآن مجید لے جانا کیسا ہے؟

جواب:- اس کی کوئی اصل نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۰/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۵/ ۲۸ الف)

نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگنا

سوال:- نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- نمازِ جنازہ خود دُعا ہے، اور اس کے بعد دُعا کا اہتمام کسی حدیث یا صحابہؓ و تابعینؒ کے عمل سے ثابت نہیں، لہٰذا آج کل بعض حلقوں میں جس اہتمام اور اصرار کے ساتھ یہ عمل کیا جاتا ہے وہ بدعت ہے۔ (کذا فی عزیز الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۸۹)۔[2]

واللہ اعلم

۲۸/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۶/ ۲۸ الف)

میّت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا

سوال:- اذان القبر، میّت کو دفن کرنے کے بعد اس کے سر کی جانب کھڑے ہوکر اذان دینا جائز ہے یا نہیں؟

---

(۱) عزیز الفتاویٰ ص:۱۲۲، وفی الشامیة ج:۲ ص:۷۳ وبه ظهر حال وصایا أهل زماننا، فان الواحد منهم یکون فی ذمته صلوات کثیرة وغیرها من زکاة وأضاح وأیمان ویوصی لذلک بدراهم یسیرة ویجعل معظم وصیته لقراءة الختمات والتهالیل التی نص علماؤنا علی عدم صحة الوصیة بها. وراجع أیضًا الی الرسالة الثامنة منة الجلیل ص:۲۲۵ من رسائل ابن عابدین رحمه الله، وامداد الأحکام ج:۱ ص:۱۸۳.

(۲) فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۱ ص:۲۸۹، مرقاة المفاتیح ج:۴ ص:۶۴ (مکتبه امدادیه ملتان)، بزازیة مع الهندیة ج:۴ ص:۸۰ (رشیدیه کوئٹه)، خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۲۵ (امجد اکیڈمی لاهور)، البحر الرائق ج:۲ ص:۱۸۳، جامع الرموز ج:۱ ص:۲۸۳ (طبع سعید)، نفع المفتی والسائل ص:۱۴۳ (طبع کتب خانه رحیمیه دیوبند یوپی)، امداد الأحکام ج:۱ ص:۱۹۴، امداد المفتین ص:۱۷۶. عبارات سابقہ ص:۱۰۸ حاشیہ نمبر۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

جواب:- اس کا صحابہؓ وتابعینؒ سے کوئی ثبوت نہیں ہے، لہٰذا یہ بدعت ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۴/۱۹ الف)

مروّجہ حیلۂ اِسقاط کا حکم

سوال:- حیلۂ اسقاط جو آج کل مشہور ہے اور لوگ کیا کرتے ہیں، شریعت میں کیا اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

جواب:- اسقاطِ مروّجہ کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے،[2] میّت کے گناہ معاف کرانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے مغفرت کی دُعا کی جائے اور جو نماز، روزے رہ گئے ہیں اس کا فدیہ ادا کیا جائے اور میّت کو ایصالِ ثواب کیا جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

الجواب صحیح

بندہ محمد عاشق الٰہی بلندشہری

۱۳۸۸/۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸۴/۱۹ الف)

رمضان کی ۲۳ تاریخ کو بعد از تراویح سورۂ عنکبوت اور سورۂ رُوم پڑھنا

سوال:- رمضان کی ۲۳ تاریخ کو امامِ مسجد بعد از تراویح سورۂ عنکبوت وسورۂ رُوم پڑھتے ہیں، لوگ سنتے ہیں اور نذرانے پیش کرتے ہیں، یہ طریقہ کیسا ہے؟ فضائلِ قرآن کی روایت کا حوالہ دیتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

سائل: (مولانا) محمد افضل خان

شاہ پور کانا، سوات، صوبہ سرحد

جواب:- قرآنِ کریم کی تلاوت باعثِ اجر وثواب ہے، لیکن اس التزام کے ساتھ پڑھنا ہمارے علم میں بے اصل ہے، جس روایت کا وہ صاحب ذکر کرتے ہیں، اس کا مفصل حوالہ لکھ کر بھیجیں تو

---

(۱) تنبیہ فی الاقتصار علی ما ذکر من الوارد اشارۃ الی أنہ لا یسن الأذان عند ادخال المیّت فی قبرہ کما ھو المعتاد الآن، وقد صرح ابن حجر فی فتاویہ بأنہ بدعۃ، وقال من ظن أنہ سنۃ قیاسا علی ندبھما للمولود الحاقا لخاتمۃ الأمر بابتدائہ فلم یصب، (ردّ المحتار ج:۲ ص:۲۳۵، کتاب الجنائز). وفی در البحار: من البدع التی شاعت فی بلاد الھند الأذان علی القبر بعد الدفن. بحوالہ: فتاویٰ رشیدیہ ص:۱۳۶، وامداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۳۰۱، عزیز الفتاویٰ ص:۱۰۰، ۱۰۶۔

(۲) وفی الشامیۃ ج:۲ ص:۷۳ وبہ ظھر حال وصایا أھل زماننا، فان الواحد منھم یکون فی ذمتہ صلوات کثیرۃ وغیرھا من زکاۃ واضاح وأیمان، ویوصی لذلک بدراھم یسیرۃ ویجعل معظم وصیتہ لقراءۃ الختمات والتھالیل التی نص علماؤنا علی عدم صحۃ الوصیۃ بھا.

اس کے بارے میں کچھ کہا جاسکتا ہے۔　　واللہ اعلم

۶/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۷/ ۲۸ الف)

حیلۂ اسقاط اور میّت کے لئے تین دن خیرات کرنے کا حکم

سوال ۱:- مردے کے فدیہ میں پیسے اور قرآن کا دورِ اسقاط پھراتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

۲:- مردے کے لئے اوّل تین رات خیرات کرتے ہیں اور تین صبح تلاوتِ قرآن قبر پر جاکر کرتے ہیں، اس کو پیسے اور روٹی دیتے ہیں، یہ کیسا ہے؟　　سائل: مولانا افضل خان

شاہ پور کانا، ضلع سوات، صوبہ سرحد

جواب ۱:- حیلۂ اسقاط کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، اس کے بجائے مشروع طریقہ یہ ہے کہ جتنی نمازیں یا روزے مردے کے قضا ہیں، اتنی نمازوں اور روزوں کا فدیہ غرباء کو دے دیا جائے، اور جتنا ہوسکے مشروع طریقے سے اس کو ایصالِ ثواب کیا جائے۔[1]

۲:- اس قسم کی پابندیاں بدعت ہیں اور ان سے اجتناب لازم ہے۔ ہاں! ان پابندیوں سے بچ کر مردے کو جتنا ایصالِ ثواب اِخلاص کے ساتھ کیا جائے باعثِ خیر و برکت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۶/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۷/ ۲۸ الف)

قبرستان میں قرآن مجید لے جاکر پڑھنا

سوال:- قبرستان میں قرآن مجید لے جاکر پڑھنا جائز ہے؟ اور کیا جواز پر اس حدیث سے استدلال کرنا "نوروا قبور موتاکم بالقراٰن" دُرست ہے یا نہیں؟　　عبدالسلام چاٹگامی

جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن

جواب:- قبرستان میں قرآن مجید لے کر پڑھنا جائز ہے، لیکن "نوروا قبور موتاکم بالقراٰن" کے الفاظ کی کوئی روایت ہمیں نہیں ملی، موضوعات کے مجموعے میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملا۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح　　احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ　　۱۴/۱/۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶/ ۱۹ الف)

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص: ۱۱۷ کا حاشیہ نمبر ۱۔

اہلِ قبور سے توسل پکڑنا

سوال:- کیا اہلِ قبور سے توسل پکڑنا جائز ہے؟ اور اس کے جواز کے لئے یہ حدیث: "اذا تحیرتم فی الأمور فاستعینوا بأهل القبور" استدلال میں پیش کرنا کیسا ہے؟ والسلام

(مفتی) عبدالسلام چاٹگامی
سابق مفتی جامعۃ العلوم
الاسلامیہ بنوری ٹاؤن

جواب:- توسل کیا جاسکتا ہے، لیکن خود ان سے حاجت طلب کرنا حرام ہے، "استعینوا بأهل القبور" کے الفاظ کی کوئی حدیث نہیں ملی۔ (۱)

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۵۶ الف)

جماعت کے بعد امام سے مصافحہ کرنا

سوال:- جماعت کے بعد دُعا مانگ کر امام سے مصافحہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- نماز کے بعد امام سے مصافحہ کرنے کو جو بعض لوگ مسنون سمجھتے ہیں، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، خاص طور سے نماز کے بعد مصافحے کو سنت سمجھنا دُرست نہیں، ہاں! واقعۃً امام صاحب سے ملاقات مقصود ہو تو مصافحے میں مضائقہ نہیں۔ (۲)

واللہ اعلم
۱۳۹۶/۱۰/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۴۸ ہ)

---

(۱) سوال میں سائل موصوف مفتی عبدالسلام چاٹگامی صاحب زید مجدہٗ نے "فاستعینوا باهل القبور" کے الفاظ لکھے ہیں جبکہ مجموعۃ الفتاویٰ علامہ لکھنویؒ کے ایک سوال میں "فاستفتوا بأهل القبور" کے الفاظ لکھے ہیں، جس کے جواب میں علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے فرمایا: یہ حدیث نہیں کسی کا مقولہ ہے۔ آگے علامہ لکھنویؒ نے "فاستفتوا" کے الفاظ کے ساتھ اس کا مفہوم یہ لکھا ہے کہ: "جب تمہیں کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے میں شبہ ہو تو اپنے اجتہاد پر عمل کرنے کے بجائے ان قدماء کی تقلید کرو جو اس وقت قبروں میں سو رہے ہیں۔" یا یہ معنی ہے کہ: "جب تم دُنیاوی اُمور میں پریشان ہو تو اصحابِ قبور پر نظر کرو جنھوں نے دُنیا کو چھوڑ کر آخرت کا سفر اختیار کرلیا اور تمہیں بھی یہ سفر کرنا ہے۔" اور "استعینوا" کے الفاظ ہوں تو پھر مفہوم یہ ہے کہ: "اصحابِ قبور کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگو، نہ یہ کہ ان کو مستقل طور سے حلِ مشکلات اور تدابیرِ عالم میں اللہ کا شریک جانو، یہ کھلا ہوا شرک ہے۔" دیکھئے علامہ عبدالحی لکھنویؒ کی کتاب مجموعۃ الفتاویٰ اُردو، کتاب العلم والعلماء ج:۱ ص:۱۵۹ (طبع میر محمد کتب خانہ)۔ (محمد زبیر حق نواز)

(۲) دیکھئے سابقہ ص:۱۰۷ کا حاشیہ نمبر ۲،۳۔

درسِ قرآن کے شروع میں دُرود شریف پڑھوانا

سوال:- درسِ قرآن یا حدیث شروع کرنے سے قبل دُرود شریف پڑھوانا کیا بدعت ہے؟

جواب:- اگر اس کو لازم وضروری نہ سمجھا جائے اور واجبات کی طرح التزام نہ کیا جائے تو بدعت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۹۶/۱۸ الف)

مسجد میں چراغاں کا حکم

سوال:- ہماری مسجد عزّت الاسلام میں رمضان کے شروع ہونے سے دو روز پہلے محلے کے دو تین آدمی آئے اور کہا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ رمضان میں ہم اپنے خرچ سے ایک مہینے تک اپنی جیب سے مسجد کو بجلی کے قمقموں سے سجائیں گے، تقریباً پورے مہینے میں دو ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ زید کہتا ہے کہ یہ فضول خرچی ہے جو اللہ کو ناپسند ہے، اس کا شرعی حکم بتائیں کہ کیا ہے؟

جواب:- مسجد کے چندے سے زائد از ضرورت روشنی کرنا بالکل ناجائز ہے ہی، لیکن اگر کوئی ایک شخص اپنے پاس سے خرچ کر کے روشنی کرے تب بھی اس میں ایک تو اِسراف کا گناہ ہے، دُوسرے تشبہ بالکفار ہے، تیسرے اس کو زیادہ ثواب کا کام سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔ اس لئے جو لوگ چراغاں کر رہے ہیں انہیں اس سے اجتناب لازم ہے۔[1]

واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۹۵ ج)

شہدائے کربلا کے مزارات کی شبیہ بنانا

سوال:- ذکرِ شہادت کے دوران ایک مولانا نے فرمایا کہ: رائج الوقت تمام تعزیئے ناجائز ہیں، البتہ اگر سیّد الشہداء کے روضۂ مبارک کی شکل اور نقل بنائی جائے تو جائز ہے، کیا یہ کہنا دُرست ہے یا نہیں؟

---

(۱) دیکھئے ص:۱۰۲ کا حاشیہ نمبر۱۔

جواب: – تعزیہ داری کی ہر صورت جو رائج ہے، بدعت ہے، اور اس کا بنانا جائز نہیں،[1] شہدائے کربلا کے مزارات کی شبیہ اگر ثواب سمجھ کر بنائی جائے گی تو بدعت ہوگی۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۶ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۰۰ الف)

تعزیہ سازی، سبیل لگانا، تعزیہ کو جلانا وغیرہ کا حکم

سوال: – کیا تعزیہ بنانا جائز ہے؟ اس کی کیا وعیدیں ہیں؟

جواب: – تعزیہ بنانا بدعت ہے، اور اس میں کئی قسم کے گناہ ہیں۔[2]

سوال: – سبیل کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب: – لوگوں کے لئے پانی کا انتظام کرنے کے واسطے راستوں پر سبیل لگانا بڑے ثواب کا کام ہے، لیکن اس ثواب کے کام کو صرف محرّم کے مہینے کے ساتھ خاص کرنا اور اس مہینے کے اندر سبیل لگانے کو زیادہ اَجر وثواب کا موجب سمجھنا بدعت اور ناجائز ہے۔

سوال: – لوگ عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ امام حسینؓ کو سات محرّم کے بعد پانی نہیں ملا تھا، کیا یہ صحیح ہے، یا انہیں آخر تک پانی میسر تھا؟

جواب: – سات تاریخ کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دریائے فرات سے پانی لانے سے روک دیا گیا تھا، یہ بات تاریخی روایات سے ثابت ہے۔[3]

سوال: – ایک صاحب نے زیرِ تعمیر تعزیہ کو موقع پاکر جلادیا، اس فعل پر آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: – کسی شخص کو بُرائی سے روکنے کا یہ طریقہ دُرست نہیں، نرمی سے سمجھانا چاہئے، اگر وہ نہ مانیں تو ان کے حق میں دُعا کریں۔ واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۷ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۷۹ الف)

(۱،۲) تعزیہ سازی وغیرہ بدعاتِ محرّم سے متعلق مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ ص:۵۷، امداد الفتاویٰ ج:۵ ص:۲۸۶، ۲۸۷، امداد الاحکام ج:۱ ص:۱۸۱، ۱۸۶، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند امداد المفتین ص:۱۵۴۔

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا رسالہ ''شہیدِ کربلا'' ص:۶۸۔ (محمد زبیر)

بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اور مسجد میں چراغاں کرنے کا حکم

سوال ۱:- کچھ لوگ مسجد میں بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھتے ہیں، اور جمعرات کو شیرینی بھی تقسیم کرتے ہیں، مجوّزین کا اصرار ہے کہ حلقہ بنا کر دُرود شریف بآوازِ بلند پڑھنے کی اجازت ہونی چاہئے، اور وہ لوگ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تہواروں کے ایام میں مسجد میں چراغاں بھی کرنا چاہئے۔ کیا یہ مذکورہ بالا مسائل ایسے ہیں جیسے مجوّزین کا خیال ہے؟

جواب ۱:- سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر دُرود و سلام بھیجنا بہت اجر و فضیلت کی چیز ہے، لیکن دُرود و سلام کو کسی ہیئت کے ساتھ مخصوص کر دینا یا کسی ایسی ہیئت کو زیادہ ثواب کا موجب سمجھنا جو صحابہ کرامؓ سے منقول نہیں اور جو شخص اس ہیئت کو اختیار نہ کرے اسے بُرا سمجھنا بدعت ہے، جس سے احتراز کرنا چاہئے، کبھی کبھی اجتماعی طور سے حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اصلاً مباح ہے، لیکن چونکہ صحابہ کرامؓ سے یہ طریقہ منقول نہیں اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں ثواب زیادہ ہے، اور جو شخص اس طریقے سے دُرود شریف نہ پڑھے وہ قابلِ نکیر نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اس اجتماعی صورت کو زیادہ ثواب سمجھ کر اختیار کیا جائے اور جو شخص اس ہیئت کو اختیار نہ کرے اسے بُرا سمجھا جائے تو یہ بدعت ہوگا، اور چونکہ آج کل اس اجتماعی ہیئت کو اسی نیت سے اختیار کیا جاتا ہے، اور سوال میں بھی اسی کی تصریح ہے، اس لئے اس طریقے کو ترک کرنا چاہئے۔[1]

شیرینی تقسیم کرنے کا بھی یہی حال ہے کہ اصلاً مباح ہے، لیکن اس کو کسی دن کے ساتھ مخصوص کر کے ثواب سمجھنا اور تارک پر نکیر کرنا بدعت ہے۔

سوال ۲:- بعد نمازِ عشاء حلقہ بنا کر دُرود شریف پڑھنا اور مسجد میں چراغاں کرنا کیسا ہے؟

جواب ۲:- مسجد میں چراغاں کرنا بلاشبہ اِسراف ہے، فقہاء نے صراحۃً اس سے منع فرمایا ہے۔[2]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۵۱ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) دیکھئے سابقہ ص:۱۱۴ کا حاشیہ نمبر ۱۔ (۲) دیکھئے ص:۱۰۲ کا حاشیہ نمبر ۱۔

۱:-تعزیہ کے بوسے کو حجرِ اسود کے بوسے پر قیاس کرنا

۲:-مختلف مقامات میں قمری تقویم مختلف ہونے کی بناء پر لیلۃ القدر ہر مقام پر اپنے مطلع کے لحاظ سے ہوتی ہے

سوال:- ابھی ابھی لکھنؤ سے آئے ہوئے ایک شیعہ عالم جناب ڈاکٹر کلبِ صادق صاحب کا خطاب سننے کا اتفاق ہوا، دورانِ خطاب انہوں نے تعزیہ، علَم، مزار اور اسی طرح دیگر مراسم کے جواز کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ:-

نماز اگر چہار دیواری والے کعبہ کی سمت منہ کر کے پڑھی جائے تو یہ بھی غیر خدا کی تعظیم ہوگئی؟ حجرِ اسود کو اگر بوسہ دیا جائے، قرآن مجید کی تعظیم وتوقیر ہو تو یہ بھی عینِ خدا نہیں ہیں، مگر ان کا ادب واحترام، بوسہ وتعظیم عین عبادت اور دین کا حصہ ہے، صرف اس لئے کہ ان کی نسبت خدا کے ساتھ ہے۔ اسی طرح اگر تعزیہ، علَم، ضریح اور اسی قبیل کی دُوسری چیزوں کا ادب واحترام کیا جاتا ہے تو یہ بھی اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اور ان کے تعلق سے کیا جاتا ہے، تو پھر یہ شرک اور گناہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ یہ بھی عینِ دین ہے اور عبادت ہے۔

ان کی اس توجیہ نے دین میں ایک اِشکال پیدا کردیا ہے، اس سلسلے میں آپ رہنمائی فرمائیں۔

دُوسری گزارش لیلۃ القدر کے حوالے سے ہے۔ پاکستان میں قمری تقویم کی رُو سے لیلۃ القدر کی رات دُوسری ہوگی، سعودی عرب میں دُوسری ہوگی اور یورپ وامریکہ میں یہ رات مختلف ہوگی، تو کیا سال میں مختلف لیلۃ القدر ہوسکتی ہیں؟ اس حوالے سے بھی اپنا نقطۂ نظر بیان فرمائیں۔

جواب:-

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، لفافے پر میرا پتہ اور نام تھا، لیکن اندر خط جاوید الغامدی صاحب کے نام تھا، شاید آپ نے سوال دونوں کو بھیجا اور خطوط بدل گئے۔

بہرصورت! جواب درج ذیل ہے:-

تعزیہ، علَم اور ضریح کو بیت اللہ اور حجرِ اسود پر قیاس کرنا اس لئے بداہۃً غلط ہے کہ بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے اور حجرِ اسود کی تقبیل کا حکم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً عطا فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ کعبہ کے کسی اور پتھر کو چومنا جائز نہیں۔ تعزیہ، علَم اور ضریح کے بارے میں

کون سی نص ہے؟

بالفاظِ دیگر نماز میں رُخ کرنا یا بوسہ دینا اور کوئی تعظیمی عمل جو عبادت کے مشابہ ہو، انجام دینا اصلاً غیر اللہ کے لئے حرام ہے، البتہ جہاں نصوص سے کسی غیر اللہ کے لئے ثابت ہو، صرف اسی حد تک اجازت ہوگی۔ جہاں نص نہیں وہاں اصل حرمت کا حکم لوٹ آئے گا۔

لیلۃ القدر کی فضیلت ہر مقام پر اس کے اپنے مطلع کے لحاظ سے حاصل ہوتی ہے، لہٰذا الگ الگ راتوں میں اس فضیلت کا حصول ممکن ہے۔ (۱)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۴۶/۳۱)

غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز کا حکم

سوال:- قرآن میں اس بات کی صراحت ہے کہ اگر کسی چیز پر اللہ کے علاوہ کسی کا نام لے لیا جائے تو وہ حرام ہوجائے گی، لیکن مسلمان نذر و نیاز کی مٹھائیاں اور کھانے متبرک سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، کیا یہ خلافِ قرآن نہیں؟

جواب:- وہ نذر و نیاز جو غیر اللہ کے نام پر ہو، واقعتاً قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔ (۲)

واللہ اعلم

۱۴۲۲/۸/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۵۰۵/۱۰)

پندرہ شعبان یا معراج کے موقع پر مسجد میں چراغاں کا حکم

سوال ۱:- پندرہ شعبان کے دوران یا معراج کے موقع پر مساجد پر چراغاں کرنے کا کیا حکم ہے؟

۲:- بعض مساجد میں پندرہ شعبان یا معراج کے موقع پر کمیٹی چراغاں نہیں کرتی ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص اگر انفرادی طور پر چراغاں کردے تو ہمیں اعتراض نہیں ہے، کیا ایسا چراغاں کرنا جائز ہے؟

جواب ۱:- جتنی روشنی کی مسجد میں فی الواقعہ ضرورت ہے، اس سے زائد چراغاں کرنا دُرست نہیں۔

۲:- کوئی شخص اگر اپنے مال سے چراغاں کرادے تو اس سے مسجد کا مال غیر مصرف میں خرچ

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۶ ص:۱۲۹ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)، تفسیر معارف القرآن ج:۸ ص:۷۹۴ (سورۃ القدر)۔

(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۰۷ حاشیہ نمبر ۴۔

کرنے کا گناہ تو نہ ہوگا، لیکن اِسراف اور تشبہ بالکفار کا گناہ پھر بھی ہوگا، لہٰذا یہ ناجائز ہے۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۸/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۸۸۶ ج)

ختمِ گیارھویں اور کونڈے کا حکم

سوال: - ختمِ گیارھویں اور کونڈے کا کیا حکم ہے؟ اور مُردوں کو ایصالِ ثواب کے لئے کیا کیا جائے؟

جواب: - گیارھویں اور کونڈے وغیرہ کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں، یہ بدعتیں ہیں جن کا اصل شرع میں وجود نہیں، ان میں شرکت نہیں کرنی چاہئے۔ مُردوں کو ایصالِ ثواب کی نیت سے صدقہ، خیرات ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۲/۲۵ھ

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۹۳ الف)

***

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۱۰۲ حاشیہ نمبر ۱۔

کتاب العلم والتاریخ والطب

(علم، تاریخ اور طب کے متفرق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المتفرقات﴾
(علم، تاریخ اور طب کے متعلق متفرق مسائل کا بیان)

کیا کنعان حضرت نوح علیہ السلام کا حقیقی بیٹا تھا؟

سوال:- کنعان نام فرزند حقیقی حضرت نوح بود یا غیر حقیقی؟

جواب:- پسر حضرت نوح کہ در طوفان غرق شدہ بود اسم او بعض مؤرخین کنعان گفتہ اند۔ حافظ ابنِ کثیرؒ در تاریخ خود می نویسد: وھٰذا الابن ھو یام أخو سام وحام ویافث، وقیل: اسمہ کنعان، وکان کافرا عمل عملا غیر صالح. (البدایۃ والنھایۃ جلد اوّل ص:۱۱۳)۔[1] وایں پسر بود چنانکہ ظاہر آیت دلالت می کند "وَنَادٰی نُوْحٌ ابْنَہٗ"[2] البتہ کنعانے دیگر پسر حام پسر نوح علیہ السلام بود، ومسکنِ او در شام باسم کنعان مشہور گشت۔ (کما فی الکامل لابن اثیرؒ، ج:۱ ص:۲۸)۔[3]

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲۶/۱۹ الف)

"اجماع اور بابِ اجتہاد" نامی کتاب کا حکم، نیز اجماع کی حقیقت کیا ہے؟

سوال:- اسلام میں اجتہاد کا "دستوری ضابطہ" اور ائمۂ اربعہ کے اجتہاد کی "دستوری پوزیشن"، محترم مفتی محمد شفیع صاحبؒ قرآنی آیت النساء (۴:۱۱۵) اور حدیث: "لا تجتمع ...." کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اجماع کا حق بحیثیت مجموعی ساری اُمتِ مسلمہ کو حاصل ہے نہ کہ اُمت کے کسی خاص طبقے یا گروہ کو۔

---

(۱) البدایۃ والنھایۃ قصۃ نوح علیہ السلام ج:۱ ص:۱۷۰ (طبع دار الفکر بیروت).

(۲) سورۃ ھود:۴۲

(۳) وفی التاریخ الکامل لابن اثیرؒ ج:۱ ص:۲۸ (طبع قدیم) واما الحام فولد لہ کوش ومصرایم وقوط وکنعان .... وامام الکنعانیون فلحق بعضھم بالشام .... الخ.

استدلال کے طور پر اس اَمر کو تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ خواہ مسئلہ زیرِ بحث کوئی بھی ہو، اگر اُمت کا سوادِ اعظم فقہاء کے اجماع کا مخالف ہو تو کوئی اجماع اصطلاحی معنوں میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا، لیکن یہ امکان ساری اسلامی تاریخ میں کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا، بلکہ عملاً اس کا وقوع ناممکن بھی ہے، کیونکہ اجماع ایک اسلامی فن اور فقہی عمل ہے جس کے لئے اُمتِ مسلمہ کو ہمیشہ ان اہلِ علم پر اعتماد کرنا ہوگا جو اس شعبے میں ضروری قابلیت اور اختصاصی مہارت رکھتے ہیں۔

''اجماع اور بابِ اجتہاد'' (مصنف کمال فاروقی، ترجمہ مظہرالدین صدیقی صفحہ:۱۵) اس تفسیر کے تجزیے سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

۱:- اُصولی طور پر اجماع کا حق تمام اُمتِ مسلمہ کو حاصل ہے، نہ کسی خاص طبقہ یا گروہ کو۔

۲:- لیکن چونکہ اجماع ایک فنی (Technical) اور فقہی عمل ہے۔ لہٰذا اس عمل کو مسلم معاشرے کا صرف فقہی اور عالم طبقہ ہی انجام دے سکتا ہے جو قرآن وسنت اور دیگر مآخذ سے فقہی اور قانونی تعبیرات اخذ کرنے کا ماہر ہے۔

۳:- چونکہ مسلم معاشرہ بحیثیت مجموعی نہ اس فن کا ماہر ہے، نہ یہ عمل انجام دے سکتا ہے، لہٰذا اُمتِ مسلمہ نے قانون سازی کا یہ حق وفرض طبقۂ علماء وفقہاء کو ''تفویض'' کردیا ہے۔

اس ''طبقۂ ماہرین'' کے انتخاب یا نامزدگی کا کوئی خصوصی طریقہ مسلم معاشرے میں متعین اور مروّج نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ خلافتِ راشدہ کے دور کے نظائر ایک مثال ضرور بن سکتے ہیں، لیکن حجت نہیں۔

۴:- لہٰذا طبقۂ علماء وفقہاء کی تعبیرات اور اجماع پر مسلم معاشرے کا اجماع ناگزیر (منطقی طور پر) اور واجب ہے۔

۵:- لیکن اس کے باوجود بھی اگر بالفرض اُمت کا سوادِ اعظم، فقہاء کے اجماع کا مخالف ہو تو کوئی اجماع اصطلاحی معنوں میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

۶:- اسی طرح بالفرض اُمت کا سوادِ اعظم طبقۂ علماء وفقہاء کے برخلاف (یعنی علماء کے اجماع کے برخلاف) کسی تعبیر یا فیصلے پر متفق ہوجاتا ہے جسے علماء فقہاء کی تائید حاصل نہ ہو تو یہ اجماع بھی منعقد اور مکمل نہیں ہوگا، اور دونوں صورتوں میں نمبر ۵ اور ۶ میں چونکہ اجماع منعقد یا مکمل نہیں ہوگا، لہٰذا حجت نہیں ہوگا۔

۷:- لہٰذا نمبر ۵ اور ۶ کے تجزیے سے یہ ظاہر ہوا کہ طبقۂ علماء وفقہاء اور اُمتِ مسلمہ دونوں کو ''قوّتِ تنفیذ'' حاصل ہے، یعنی انہیں اپنے فیصلے کے نفاذ کا حق بھی حاصل ہونا ضروری ہے۔

(اگر چہ یہ حق صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جبکہ دونوں طبقے علماء اور سوادِ اعظم متفق ہوں)۔

اور دونوں طبقوں کی حیثیت مشاورتی کونسل کی ہرگز نہیں ہے جس کے فیصلے کو قبول یا مسترد کرنے کا اختیار ایک تیسرے اور حکمران طبقے کو حاصل ہو، جسے نہ اُمت نے منتخب کیا ہو، اور نہ نامزد کیا ہو، بلکہ صرف اس کے سیاسی غلبے کی وجہ سے مجبوراً قبول کیا ہو۔

۸:- لہٰذا قرآن وسنت کی دستوری تعبیر اور دستوری اجماع وہ ہوا جو اس وقت منعقد ہو جبکہ:-

۱:- اُمتِ مسلمہ کا منتخب یا نامزد طبقۂ علماء وفقہاء موجود ہو جس کی تعبیر اور رائے کو اُمت کی تائید سے قوتِ نافذہ بھی حاصل ہو (جیسی کہ موجودہ لیجسلیٹو کو حاصل ہوتی ہے)۔

۲:- اُمتِ مسلمہ کو طبقۂ علماء وفقہاء کے اجماع کو قبول یا مسترد کرنے اور قبول کرنے کی صورت میں اس قبول شدہ اجماع کو نافذ کرنے کی قوت بھی حاصل ہو۔

۳:- یعنی کسی حکمران کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی یا کسی فردِ واحد کی (خواہ وہ امام ہی کیوں نہ ہو) یا کسی گروہِ فقہ کی رائے اور تعبیر کو اُمت کی مرضی کے خلاف اس پر نافذ کردے۔

۴:- لہٰذا دستوری اجماع وہی ہوگا جس میں مندرجہ بالا دونوں شرائط (نمبر۱،۲) پائی جائیں، جس کی بہترین مثال خلافتِ راشدہ کے دور کے فیصلوں اور تعبیرات کی ہیں جن میں مندرجہ بالا دونوں شرائط پائی جاتی ہیں، اب ایک ایسے دور میں (مثلاً بنی اُمیہ اور بنی عباس کا دور اور پاکستان کا موجودہ دور بھی اس سے مختلف نہیں) جبکہ:-

الف ۱:- اُمت کی مرضی کے خلاف اور اسلام کے سیاسی نظام کے قطعی طور پر خلاف، محض غلبہ اور طاقت کی بناء پر ایک فرد، خاندان یا جماعت، ملک کے سیاسی نظام پر مکمل طور پر مسلط ہوچکی ہو۔ (یہاں مستفتی نے ایک حاشیہ بھی تحریر کیا ہے جو نیچے ملاحظہ فرمائیں۔ محمد زبیر عفی عنہ)۔[1]

---

(۱) جیسا کہ امام مالکؒ نے خلیفہ منصور کی اس رائے کو مسترد کردیا تھا کہ تمام عالمِ اسلام کو امام کی کتاب پر جمع کردیا جائے، کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ جمع کرنا خلیفہ کی سیاسی قوت کی بناء پر ہوتا جو اُمت کے حق میں قبول ومسترد کو سلب کرتا ہوتا جسے امامؒ نے پسند نہیں کیا۔ امام صاحبؒ نے علماء وفقہاء کی ایک جماعت کے تعاون سے اور دیگر ائمہ نے انفرادی اجتہاد سے قرآن وسنت کی جو فقہی تعبیرات اور فیصلے کئے ہیں ان کی پوزیشن یہی ہے کہ یہ ایک جماعت کا یا فردِ واحد کا ذاتی اجتہاد ہے، اُمت کے منتخب شدہ یا نامزد شدہ طبقۂ علماء کا اجتہاد نہیں اس پر پوری اُمتِ مسلمہ نے بلکہ اُمت کے ایک بڑے گروپ اہل سنت والجماعت نے بلکہ اہلِ سنت کے مختصر گروہوں نے اجماع کیا ہے، اس سلسلے میں اہلِ سنت میں حنفی اکثریت میں ہیں اور مالکی، شافعی، حنبلی اقلیت میں۔

(۲) واضح رہے کہ یہاں سوال غلط یا صحیح اجتہاد کا قطعی نہیں ہے، دستوری وغیر دستوری کا ہے۔ یہ اجتہادات وتعبیرات قرآن وسنت اور دیگر اُصولِ فقہیہ کے عین مطابق اور بالکل صحیح ہیں، اور اگر اسلام کا سیاسی نظام قائم ہوتا تب بھی اسی اجتہاد اور اسی تعبیر کو اُمت اسی طرح قبول کرتی جس طرح اب ہے، لیکن کسی چیز کا صحیح یا غلط ہونا اور چیز ہے، اور دستوری وغیر دستوری ہونا دُوسری چیز۔ یہاں بھی سوال دستوری وغیر دستوری کا ہے۔

۲:- طبقۂ فقہاء وعلماء موجود ہی نہ ہو یا اگر موجود ہو بھی تو:-

ا:- امامت کا منتخب شدہ یا نامزد شدہ نہ ہو۔

۲:- اگر اپنی علمی حیثیت اور سیرت وکردار کی بناء پر اُمت میں ایک مقام بھی رکھتا ہو تب بھی اس کے فیصلوں اور تعبیرات کو نفاذ کی قوّت حاصل نہ ہو۔

۳:- یا حکمران جماعت و خاندان کی حیثیت زیادہ ہو اور اس کی حیثیت صرف مشاورتی کونسل کی ہو، جس کے فیصلوں اور تعبیرات کو قبول اور مسترد کرنے کا اختیار حکمران، فرد یا خاندان کو حاصل ہو۔

۳:- اور اُمتِ مسلمہ کو کسی فیصلے یا اجماع کے قبول ومسترد کرنے اور نافذ کرنے کی قوّت حاصل نہ ہو۔

ب:- مندرجہ بالا صورت میں علماء وفقہاء کی ایک جماعت (جس کی علمی حیثیت اور سیرت و کردار کی بلندی مُسلّم ہونے کے باوجود اُمت کے، غیر منتخب شدہ یا غیر نامزد شدہ ہے) یا فردِ واحد، ذاتی طور پر اجتہاد کرتا ہے اور اس کے اجتہاد پر سوادِ اعظم یا سوادِ اعظم کا مختصر گروہ جمع ہو جاتا ہے۔

ج:- تو کیا یہ اجماع، اسلام کے سیاسی نظام کے دستوری ضابطے کے لحاظ سے (جس کی مثال خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یعنی خلافتِ راشدہ ہے) دستوری ہے؟ (یعنی اس میں نکتہ نمبر ۸ کی دونوں شرائط نمبر ا و ۲ پائی جاتی ہیں؟)

د:- اگر یہ دستوری نہیں تو اس کی حیثیت عبوری ہے، اور جب اسلام کا سیاسی نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بنیاد پر قائم ہوگا (جس میں وہ دونوں شرائط پائی جاتی ہیں جو نکتہ نمبر ۸ میں بیان ہوئے ہیں) تو اس تعبیر اور اجتہاد کو اُمتِ مسلمہ اور طبقۂ علماء وفقہاء باضابطہ طور پر اختیار کرے گا تو ان کی حیثیت دستوری لحاظ سے مُسلّم ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ

ر:- لیکن اگر نکات الف، ب، ج، د، اور نکتہ نمبر ۸ کے تمام نکات غلط ہیں یا اسلام کے سیاسی نظام کے لئے ضروری نہیں ہیں تو:-

ا:- گویا اسلام میں اجماع اور اجتہاد کا کوئی دستوری ضابطہ متعین نہیں ہے، اور

۲:- ہر وہ اجتہاد، اجماع حاصل کر لیتا ہے جس پر اُمت کا کوئی گروہ جمع ہو جائے۔

۳:- اجماع اور اجتہاد کے لئے علماء فقہاء اور اُمت کی قوّتِ تنفیذ ضروری نہیں ہے۔

۴:- مسلم معاشرے میں اجماع اور اجتہاد کی تاریخ اور قرآن وسنت کی فقہی تعبیرات کی تاریخ یہ ہے کہ ہر اجتہاد اور تعبیر علماء وفقہاء کا ذاتی اجتہاد ہے، جس پر بعد میں اُمت کا ایک گروہ یا طبقہ جمع

ہوجاتا ہے۔ کیا مندرجہ بالا تجزیہ دُرست ہے؟

جواب:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے تو میں اس مکتوب کے جواب پر تأخیر کے لئے آپ سے تہِ دِل سے معذرت خواہ ہوں، لیکن میں جن مصروفیات میں ہمہ وقت گرفتار رہتا ہوں اگر آپ انہیں بچشمِ خود دیکھتے تو یقیناً معذور قرار دیتے۔

آپ نے جو سوالات اُٹھائے ہیں وہ تشریح کے لئے کافی تفصیل چاہتے ہیں، تاہم چند نکات عرض کرتا ہوں، خدا کرے کہ وہ آپ کے کسی کام آسکیں۔

۱:- ''اجماع اور بابِ اجتہاد'' نامی کتاب جو کمال فاروقی صاحب کی تصنیف ہے، کوئی معتبر کتاب نہیں ہے، اور اس کتاب میں احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر بیان کرنے میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا، لہٰذا حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی بات نقل کرنے کے لئے اس کا حوالہ مستند نہیں ہے۔

۲:- ''اجماع'' کے بارے میں اکثر مستند فقہاء کا موقف یہ ہے کہ وہ صرف ''کسی زمانے کے تمام اہلِ اجتہاد علماء کے کسی شرعی مسئلے پر متفق ہوجانے'' کو کہتے ہیں، یعنی اجماع دراصل صرف اہلِ اجتہاد علماء کے اتفاق کا نام ہے، عوام کا اختلاف و اتفاق اس میں معتبر نہیں، چنانچہ صدرالشریعہؒ اور علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں:-

وفی الاصطلاح اتفاق المجتهدين من أمة محمد عليه الصلوٰة والسلام فی عصر علىٰ حكم شرعی .... وقيد بالمجتهدين، اذ لا عبرة باتفاق العوام ۔ (ملاحظہ ہو: التلويح مع التوضيح ج:۲ ص:۴۱ طبع مصر)۔[1] ''اجماع اصطلاحی طور پر اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کے مجتہدین کے کسی ایک زمانے میں کسی شرعی حکم پر متفق ہوجانے کا نام ہے۔ اور اس تعریف میں مجتہدین کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ عوام کے متفق ہوجانے کا کوئی اعتبار نہیں۔''

البتہ جن حضرات نے اجماع کی تعریف میں ''اہلِ اجتہاد'' کی قید نہیں لگائی جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کی رائے بھی اجماع میں مؤثر ہے، سو درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کا فریضہ بھی یہ ہے کہ وہ مجتہدینِ اُمت کی پیروی کریں، اور عملاً ہوتا بھی یہ ہے کہ جب مجتہدین کا کسی مسئلے پر اتفاق ہوجاتا ہے تو وہ انہی کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ تاریخِ اسلام میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ عام مسلمانوں نے مجتہدینِ اُمت کے کسی فیصلے سے اختلاف کیا ہو، لہٰذا جب مجتہدین کسی مسئلے پر

---

(۱) توضیح تلویح ص:۴۹۴ (طبع نور محمد کتب خانہ کراچی)۔

اتفاق کرتے ہیں تو اُمت کے تمام افراد کا اتفاق خود بخود ہی ہوجاتا ہے۔ لہٰذا عملی اعتبار سے اسے ''تمام مسلمانوں کا اجماع'' بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر اہلِ اجتہاد کو مجتہدین کے اجماع کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔

۳:- ''مجتہدینِ اُمت'' کی تعیین تاریخِ اسلام میں کبھی بھی یہاں تک کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی ''انتخاب'' اور ''نامزدگی'' کے مروّجہ طریقوں سے نہیں ہوئی، بلکہ قبولیتِ عام سے اس کا فیصلہ ہوا ہے، جس طرح قدیم زمانے میں طبیب کے طبیب ہونے کے لئے کسی انتخاب یا نامزدگی کی ضرورت نہ تھی بلکہ قبولِ عام کی بنیاد پر اس کا فیصلہ ہوتا تھا، اسی طرح کسی کے مجتہد ہونے کا فیصلہ بھی اسی بنیاد پر کیا جاتا تھا اور اس میں کوئی عملی دُشواری نہ تھی۔ چنانچہ اگر کسی مسئلے میں کسی بھی عالم کا کوئی اختلاف نہیں تب تو اجماع کا تحقّق ثابت ہوگیا، اور اگر کسی کا اختلاف ہے تو صرف اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ یہ شخص اَہلِ اجتہاد ہے یا نہیں؟ اور دُوسرے مجتہدین کی اکثریت کا فیصلہ اس بارے میں کافی تھا۔

مندرجہ بالا نکات ذہن میں آجائیں تو اس سے آپ کے بیشتر سوالات کا جواب خود بخود نکل آتا ہے، کیونکہ وہ اس تصوّر پر مبنی ہیں کہ اہلِ اجتہاد کے اجماع کے خلاف عام مسلمانوں کی رائے بھی مؤثر اور معتبر ہے، جس کی تردید نکتہ نمبر ۲ میں احقر کرچکا ہے۔ ان تین نکات کی بنیاد پر اگر کوئی خلش باقی ہو تو وہ دوبارہ لکھ کر معلوم فرمالیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۷/۶/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۴۵ ب)

کیا روزے کی حکمت وہی ہے جو نماز کی ہے؟

سوال:- مندرجہ ذیل الفاظ ایک مضمون کے ہیں جو ''سیرت وکردار کے سانچے'' کے عنوان سے روزنامہ حریت مؤرخہ ۲/دسمبر ۱۹۶۷ء کے صفحہ نمبر ۳ پر شائع ہوا ہے:-

''زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا ''رُکن'' نہیں ہے بلکہ دراصل اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رُکن صلوٰۃ کا ہے، اور اسے رُکن صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگایا گیا ہے، اس کا کام انہی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے جو نماز سے انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ نماز، روزہ کا معمول ''نظامِ تربیت'' ہے، نماز کا معمول تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے اور تعلیم وتربیت کی ہلکی خوراکیں دے کر چھوڑ دیتا ہے،

اور روزہ سال بھر میں ایک مہینے کا غیر معمولی نظامِ تربیت ہے جو آدمی کو تقریباً ۲۷ گھنٹے تک اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجے میں کسا ہوا رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات تھے وہ شدید ہوجائیں۔''

اس کے بعد ''روزے کے اثرات'' کے عنوان سے نیا پیراگراف شروع ہوتا ہے۔

اپنی طرف سے کچھ مفہوم کے متعلق تحریر کرنا بددیانتی سمجھتا ہوں، لیکن چونکہ جواب میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ عبارت کا مفہوم مجمل ہے، لہٰذا کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عبارت کا ابتدائی جملہ ''نہیں ہے'' کے ساتھ ختم ہوکر روزہ کے مستقل جداگانہ نوعیت کے رُکن کی نفی مطلق کرتا ہے۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی اس غلط فہمی کا سبب بیان کیا جارہا ہے کہ مستقل رُکن روزہ کو اس لئے سمجھا گیا ہے کہ اس کا مزاج ایک مستقل رُکن کا سا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسے رُکن صلوٰۃ کے مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگادیا گیا ہے۔ لفظ ''ہی'' روزہ کی حیثیت کو محدود و معین کرتا ہے۔ عبارت کا باقی حصہ اس ''محدود حیثیت'' کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ بہرحال ابتداء میں نفی قطعی اور اس کے بعد وضاحت میں ''ہی'' کا لفظ کم از کم یہی ظاہر کرتا ہے۔

جواب:- مذکورہ عبارت میں نماز اور روزے کی حکمت بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ روزے کی حکمت قریب قریب وہی ہے جو نماز کی تھی، اس کے ذریعہ بھی انسان کو تربیت دینا مقصود ہے، یہ بات اگرچہ فی نفسہٖ محلِ نظر ہے کہ روزے کو حکمت کے لحاظ سے نماز کا تتمہ قرار دیا جائے، حقیقت یہی ہے کہ روزہ بالکل مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اس کی حکمتیں بھی مستقل ہیں۔[1] اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ نماز اور روزہ دونوں بندگی کے مظاہر ہیں، سو اس اعتبار سے تمام عبادات ایک جیسی ہیں، اس لئے اس عبارت میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی، لیکن چونکہ اس میں تشریعی طور پر روزے کے مستقل رُکن ہونے کا انکار نہیں کیا گیا اس لئے اس پر وہ اَحکام جاری نہ ہوں گے جو مستقل رُکن کے انکار سے جاری ہوسکتے ہیں۔

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴/۱۲/۱۳۸۷ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۲/۱۱۸ الف)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: حکیم الاُمت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ کی کتاب ''اَحکامِ اسلام عقل کی نظر میں'' ص:۱۴۳ (طبع کتب خانہ جمیلی لاہور)۔

بعض شرعی اَحکام کی مصلحتیں

(غیر مسلموں کی جانب سے چند اعتراضات کا جواب درکار ہے، اُمید ہے کہ آپ جواب ارسال فرما کر عنداللہ مأجور ہوں گے)

سوال ۱:- اسلام میں کثیر الازدواجی (Poly Gamy) کی اجازت کیوں ہے؟ اور Poly Andry کیوں ممنوع ہے؟ اگر اولاد کی شناخت کا مسئلہ ہے تو یہ خون کے ایک سادہ سے ٹیسٹ سے حل ہوجاتا ہے۔ عورتیں چار شادی کا مطالبہ کریں تو کیا دلائل ہیں؟

۲:- اسلام میں خنزیر کیوں حرام ہے؟ اس کی اخلاقی وطبّی وجوہ ارشاد فرمائیں، اور یہ ثابت فرمایئے کہ اس کا گوشت کیوں مضر ہے؟

۳:- اسلام سے پہلے شراب پی جاتی تھی، یہ کیوں ممنوع نہ تھی؟

۴:- اگر کوئی اپنی بیوی کو غصّے، غلط فہمی یا شدید مجبوری کی حالت میں طلاق دے دے اور دوبارہ اس سے شادی کرنا چاہے تو مرد کی اس غلطی کی سزا اس بیچاری بے گناہ مظلومہ عورت کو حلالہ کی صورت میں کیوں دی جاتی ہے؟ کرے کوئی، بھرے کوئی!

۵:- اسلام میں (معاذ اللہ) عورت کو کم تر مخلوق کیوں تصوّر کیا جاتا ہے؟ مثلاً: جائیداد میں آدھا حصہ، آدھی گواہی، عقیقے میں آدھی قربانی، طلاق کا حق نہ ہونا، اگر خلع لینا ہو تو اپنے حق مہر سے دستبردار ہونا پڑے، وغیرہ وغیرہ۔

جواب:- آپ کے سوالات کے جواب سے پہلے دو اُصولی باتیں عرض کرتا ہوں۔

غیر مسلموں سے گفتگو

۱:- غیر مسلموں سے جب کبھی اسلام کے بارے میں گفتگو کی نوبت آئے تو گفتگو ہمیشہ اُصولِ اسلام پر ہونی چاہئے، جزوی اَحکام پر نہیں، کیونکہ تمام جزوی اَحکام دراصل اُصولوں پر مبنی ہیں۔ جب تک انسان ان اُصولوں کا قائل نہ ہو، جزوی اَحکام کی حکمتیں ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آسکتیں، اور ایک کے بعد دُوسرے حکم پر اعتراض کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

ہر حکم کی مصلحت سمجھ میں آنا ضروری نہیں

۲:- اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم حکمتوں سے خالی نہیں ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر حکم کی مصلحت کلی طور انسان کی سمجھ میں آجائے۔ اگر ہر حکم کی مصلحت انسان کی سمجھ میں آجاتی تو اللہ تعالیٰ کو وحی کے

ذریعے اَحکام عطا فرمانے کی ضرورت نہ تھی، صرف اتنا کہہ دیا جاتا کہ مصلحت اور حکمت کے مطابق عقل سے کام لے کر عمل کرو۔ شریعت کے اَحکام تو آتے ہی عموماً اس جگہ پر ہیں جہاں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر اس معاملے کو صرف انسانی عقل کے حوالے کیا گیا تو وہاں ٹھوکر کھائے گا۔ لہٰذا اگر کسی حکم کی پوری مصلحت سمجھ میں نہ آئے تو اس حکم سے انکار نہیں کیا جائے گا۔ دیکھئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کردو، بظاہر اس حکم میں کوئی مصلحت نہ تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مصلحت نہیں پوچھی، فوراً عمل کرنے پر تیار ہوگئے۔ جب اللہ تعالیٰ کو حکیمِ مطلق اور اپنا پروردگار مان لیا تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے ہر حکم کو بجالائے اور حکمت و مصلحت کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

اگر آپ ایک ملازم رکھیں اور جب آپ اسے کسی کام کا حکم دیں تو وہ پہلے آپ سے اس کی مصلحت بتانے کا مطالبہ کرے، تو کیا وہ ملازم وفادار سمجھا جائے گا یا برطرف کرنے کا مستحق ہوگا؟ جب ایک ملازم کا یہ حال ہے تو بندے کا معاملہ اپنے مالک کے ساتھ خود سوچ لیجئے۔

لہٰذا اصل تو یہ ہے کہ شرعی اَحکام کی مصلحتوں کے زیادہ درپے ہونا نہیں چاہئے، تاہم بہت سے شرعی اَحکام کی کچھ مصلحتیں انسان کو سمجھ میں آجاتی ہیں۔ حضرت مولانا تھانویؒ کی کتاب ''اَحکامِ اسلام عقل کی نظر میں'' انہی مصلحتوں کو بیان کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، کبھی اس کا مطالعہ فرمالیں۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا مختصر جواب حاضر ہے۔

۱:- مردوں کو چار شادیوں کی اجازت کیوں؟

یہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے کہ اگر ایک مرد چار عورتوں کے پاس جائے تو چاروں کو حاملہ بنا سکتا ہے، لیکن ایک عورت چار مردوں کے پاس جائے تو وہ ایک ہی سے حاملہ ہوگی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فطرت کے لحاظ سے عورت یک زوجی کے لئے پیدا کی گئی ہے نہ کہ مرد، اس کے علاوہ مرد پر ایسا کوئی زمانہ معمولاً نہیں آتا جب وہ جنسی تعلق کے قابل نہ ہو، لیکن عورت پر حیض و نفاس اور حمل کے ایام میں ایسے دور باقاعدہ آتے ہیں جب وہ جنسی تعلق کے قابل نہیں ہوتی، لہٰذا مرد کو جنسی تسکین کے لئے زیادہ کی ضرورت ہوسکتی ہے، عورت کو اس کی ضرورت نہیں۔

۲:- خنزیر کیوں حرام ہے؟

خنزیر کے طبّی نقصانات سینکڑوں اطباء اور ڈاکٹروں نے بیان کئے ہیں، اور اخلاقی نقصان یہ ہے کہ اس سے قوتِ بہیمیہ میں اضافہ ہوتا ہے، جس کا مشاہدہ آپ دن رات مغرب میں کرتے ہیں۔

۳:- شراب ایک دم سے کیوں حرام نہیں ہوئی؟

اسلام کے اَحکام بتدریج آئے ہیں، ایک دم سارے اَحکام آجاتے تو عمل مشکل ہوتا، اس لئے رفتہ رفتہ کرکے بُری عادتیں چھڑالی گئیں۔

۴:- حلالہ کیوں؟

یہ خیال غلط ہے کہ ''حلالہ'' کوئی تدبیر ہے جس پر عورت کو مجبور کیا جارہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس شخص نے اللہ کی مقرّر کی ہوئی تمام حدود کو پامال کرکے تینوں طلاقیں دے دیں، وہ اب اس لائق نہیں کہ ایک شریف عورت اس کے پاس رہے۔ لہٰذا حکم یہ ہے کہ اب اس سے نکاح نہ کرو، کوئی اور شوہر تلاش کرو۔ ہاں! اگر اس شوہر سے بھی نبھاؤ نہ ہو اور وہ ازخود طلاق دیدے تو اس صورت میں اُمید ہے کہ پہلا شوہر کچھ سبق حاصل کرچکا ہوگا۔ اس لئے اگر اب اس سے نکاح کرنے پر بیوی رضامند ہو تو اس کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اور یہ جو محض حیلے کے طور پر حلالہ کیا جاتا ہے، وہ شریعت کے منشاء کے خلاف ہے۔

۵:- کیا عورت کم تر مخلوق ہے؟

عورت ہرگز کم تر مخلوق نہیں، البتہ مرد کے مقابلے میں کمزور ضرور ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے، اس لئے کسبِ معاش کی ذمہ داری اس پر نہیں ڈالی گئی۔ اس کی کمزوری اور بعض دُوسری نفسیات کے پیشِ نظر مرد کو اس کے کسبِ معاش کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، اور جب وہ کسبِ معاش کی ذمہ دار نہیں تو جائیداد میں بھی اس کا حصہ آدھا اور کسبِ معاش کے ذمہ دار کا حصہ پورا ہے، (اسلام کے سوا کسی مذہب میں تو آدھا حصہ بھی نہیں ہے)۔

یہ تمام موضوعات تفصیل طلب ہیں اور ایک خط میں ساری بات کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے، اس لئے آپ ''مسلمان عورت'' از مولانا ابوالکلام آزادؒ کا مطالعہ فرمالیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴۱۲/۵/۵ھ (۱)

اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ ''شخص'' استعمال کرنے کا حکم اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات طاہر تھے؟

سوال ۱:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ خدا

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ سے لیا گیا ہے۔ (از مرتب)

تعالیٰ کی ذات کو لفظ ''شخص'' سے پکارا جاسکتا ہے؟ کیونکہ پندرہ پارے کی ابتدائی آیات کا ترجمہ چند مترجم حضرات نے اس طرح کیا ہے کہ: ''پاکی ہے اس شخص کو جو لے گیا اپنے بندے کو'' اس جگہ خدا کی پاک ذات کو ''شخص'' کہہ کر مخاطب فرمایا گیا ہے۔ برائے کرم صرفی ونحوی قاعدے کی رُو سے اور شرعی اعتبار سے اُجاگر فرمائیں کہ لفظ ''شخص'' صرف بنی آدم کے لئے ہی ہے یا خدا کی ذات اور ملائکہ وغیرہ کو بھی کہا جاسکتا ہے؟ نیز ''شخص'' کا لغوی اور اصطلاحی معنی بھی تحریر فرما کر ہماری رہنمائی فرمائیں۔ ایسی تحریر کا قرآنِ پاک ہمارے پاس موجود ہے، اگر لفظ ''شخص'' حضرت جبریلؑ کی طرف منسوب کیا جائے تو پھر اس میں قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جبریلؑ کے بندے تو نہیں ہیں؟

۲:- زید، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلاتِ مبارکہ کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ پاک نہیں ہیں، نیز یہ بھی کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیشابِ مبارک آپ کی کسی خادمہ یا خادم نے نہیں پیا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ سچ ہے تو صحاحِ ستہ کی حدیث پیش کی جائے۔ برائے مہربانی تحریر کریں کہ زید کا قول صحیح ہے یا غلط ہے اور زید کے لئے کیا حکم ہے؟ کیا صحاحِ ستہ کے علاوہ باقی احادیثِ مبارکہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں؟

جواب ۱:- لفظ ''شخص'' کے لغوی معنی خواہ کچھ ہوں، لیکن عرفاً اس کا اطلاق انسانوں پر ہی ہوتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لئے اس لفظ کا استعمال دُرست نہیں، اس کے بجائے لفظ ''ذات'' استعمال کرنا چاہئے۔

۲:- اس مسئلے میں فقہاء ومحدثین میں اختلاف رہا ہے۔ ایک بڑی جماعت کے نزدیک راجح یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات طاہر تھے، جس کے دلائل ان کے پاس موجود ہیں،[1] لیکن اس مسئلے کی تحقیق پر نہ ایمان کا کوئی حصہ موقوف ہے اور نہ عملِ صالح کا، اس قسم کی بحثوں میں فضول پڑنا نہیں چاہئے، اس کے بجائے ایسے مسائل معلوم کیجئے جن کا تعلق عمل اور آخرت کی بھلائی سے ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۱۸/۳۰ د)

---

(۱) اس بارے میں تفصیلی بحث کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:

۱:- الشفاء فی حقوق المصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم ج:۱ ص:۱۶۱ (علامہ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ).

۲:- شرح الشفاء مُلّا علی قاری رحمہ اللہ ج:۱ ص:۱۵۹. ۳:- الدر المختار ج:۱ ص:۳۱۸ مطلب فی طهارة بوله صلی اللہ علیہ وسلم.

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟

سوال:- گزارش یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟ اور یہ جو آثارِ قدیمہ والے بحث کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کے طور پر وہ معلوم شدہ ڈھانچے سامنے لاتے ہیں، اس بارے میں آپ کی کیا تحقیق ہے؟ نیز جنات کب سے دُنیا میں قیام پذیر ہیں؟ احادیثِ مبارکہ میں ان کا کوئی ذکر ہے؟

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قرآنِ کریم یا کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے اب تک کتنی مدّت گزر چکی ہے؟ لہٰذا اس کی تحقیق میں پڑنا دینی اعتبار سے نہ ضروری ہے، نہ مفید۔ سائنسی نظریات جو مختلف جمادات ونباتات کی عمر کے بارے میں سامنے آتے رہتے ہیں، ان کی حیثیت محض اندازے کی ہے، یقین کی نہیں، اور جو ڈھانچے پُرانے ملے ہیں ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اتنی بات بہرحال قرآنِ کریم سے ثابت ہے کہ اس زمین پر انسان سے پہلے جنات آباد تھے۔ بہرحال! ان تحقیقات پر کوئی دینی مسئلہ موقوف نہیں ہے، لہٰذا زیادہ فکر عملی مسائل کی کرنی چاہئے۔ (۱)

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۵/۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰/۸۹۳ ج)

اُحد اور حراء سے متعلق دو واقعات کے زمانے کی تعیین

اور کیا علامہ ابنِ تیمیہؒ حافظ مزیؒ کے شاگرد تھے؟

سوال:- اس خط سے پہلے میری آپ سے اگرچہ تحریری یا بالمشافہ ملاقات نہیں، لیکن آپ کی علمی تصانیف اور خصوصاً تکملۂ فتح الملہم اور درسِ ترمذی سے حد درجہ استفادہ کرنے کی بناء پر پہلے ہی سے ذہنی اور فکری طور پر آپ سے بہت قریب رہا ہوں، اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ انہی بلند پایہ کتابوں کا مطالعہ کر کے میرے اندر حدیث شریف کا وہ ذوق پیدا ہوا جو آج میری اُمنگوں کو مہمیز لگا کر

---

(۱) یہاں فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (امداد المفتین) سے ایک سوال اور اس کا جواب بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:-

سوال (۱۳۶):- حضرت آدمؑ کی پیدائش سے اب تک کتنے برس ہوئے؟ ان کی پوری تاریخ؟

جواب:- حافظِ حدیث ابنِ عساکرؒ نے اس بارے میں مختلف اقوال نقل کئے ہیں، بعض مؤرخین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان چھ ہزار ایک سو پچپن سال کا فاصلہ لکھا ہے۔ (امداد المفتین ص:۲۶۱)۔ مزید تحقیق و تفصیل کے لئے دیکھئے: المعارف لابن قتیبۃؒ "مبداء الخلق" ص:۳۳، ۳۴ (طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔ (محمد زبیر حق نواز)

مجھے ابنِ ماجہ پر تحقیقی کام کرنے کا حوصلہ دے چکا ہے۔ اگر مولائے کریم کی توفیق شامل رہی تو ابنِ ماجہ کی یہ شرح وقت کی اہم ضرورت پوری کرے گی۔

۱:- اس وقت جس مقصد کے لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں، وہ ایک حدیث کے سلسلے میں استفسار کرنا ہے جس میں، میں بُری طرح اُلجھ گیا ہوں۔ بخاری و مسلم، ترمذی، ابنِ ماجہ، مسندِ اُحمد اور تقریباً تمام ہی کتبِ حدیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُحد پر چڑھے تو وہ ہلنے لگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اُحد! ٹھہر جا، "لیس علیک الا نبی أو صدیق أو شهید" آگے راوی تصریح کرتے ہیں کہ فلاں فلاں صحابہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ یہاں دو گتھیاں حل طلب ہیں۔ (الف) پہلی تو یہ کہ بخاری و مسلم میں اُحد کے الفاظ ہیں، جبکہ دُوسری کسی حدیث میں غارِ حراء کی تصریح ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے یا الگ الگ دو واقعے ہیں؟ اس سلسلے میں اپنے موقف سے آگاہ فرمائیں۔ (ب) دُوسرے یہ کہ ابنِ ماجہ کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفینہ بن زید اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا بھی تذکرہ ہے، حالانکہ وہ بالاتفاق شہید نہیں، تو اب اس کی کیا تأویل کی جائے؟ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اس ذیل میں تمام محدثین کی تصریحات میری نظر سے گزر چکی ہیں، اور اَب میری رائے یہ ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے جو اُحد سے متعلق ہے، کیونکہ مکہ میں نبوّت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حراء جانے کا تذکرہ غالباً نہیں ملتا، یہ محض رائے ہے جس کی میرے پاس کوئی دلیل نہیں، صرف ذوق و وجدان کی بناء پر ایسا کہہ رہا ہوں، یقینی فیصلہ تو آپ ہی فرمائیں گے۔

۲:- دُوسری بات یہ ہے کہ ابھی ایک ماہ قبل میں نے "جہانِ دیدہ" پڑھا، اس میں آپ نے علامہ مزیؒ مصنف تہذیب الکمال کے تعارف میں لکھا ہے کہ علامہ ابنِ تیمیہؒ ان کے شاگرد ہیں۔

تہذیب الکمال ایک سال پہلے میری نظر سے گزری تھی، اس میں مزی کے ترجمے میں، میں نے پڑھا تھا کہ وہ ابنِ تیمیہؒ سے اگرچہ چھ سال بڑے ہیں اور ان کے بعد بھی چودہ سال تک زندہ رہے ہیں، لیکن وہ شیخ الاسلام کے شاگرد ہیں، اُستاذ نہیں۔

یہ ایک سال قبل کا اجمالی خاکہ ہے، اس وقت نہ میرے پاس تہذیب الکمال ہے اور نہ ہی دُوسری اُمہات الکتب موجود ہیں جن کی طرف مراجعت کرکے میں یقینی طور سے کچھ کہہ سکوں۔ ہوسکتا ہے کہ میرا حافظہ خطا کر رہا ہو، اس لئے آپ تحقیق کرلیجئے۔ مجھے بہرحال ایسا ہی یاد پڑتا ہے کہ شیخ الاسلام، علامہ مزیؒ کے اُستاذ ہیں، شاگرد نہیں۔

آپ کے پاس اگرچہ مشاغل کا ہجوم ہے، لیکن مجھے آپ کی شفقت وعنایت سے اُمید ہے کہ

آپ اس حدیث کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ کن کتابوں کے ذریعہ میں اپنے ذوقِ حدیث کو ترقی دُوں۔ خصوصی دُعاؤں کی درخواست ہے۔

جواب ۱:- (الف):- شراحِ حدیث کی تصریحات وترجیحات کی بناء پر دُرست موقف یہی ہے کہ اُحد اور حراء سے متعلقہ یہ دونوں الگ الگ واقعے ہیں، جو مختلف اوقات میں پیش آئے ہیں، اور وہ تصریحات درج ذیل ہیں:-

فی فتح الباری ج:۷ ص:۳۲[۱] وأخرج مسلم من حديث أبی هريرةؓ ما يؤيد تعدد القصة، فذكر أنه كان علىٰ حراء ومعه المذكورون، وزاد معهم غيرهم .... الخ.

وفی عمدة القاری ج:۱۶ ص:۱۹۰[۲] ولٰكن لا شك فی تعدد القصة، فان أحمد رواه من طريق بريدة بلفظ "حراء" واسناده صحيح، وأبا يعلىٰ رواه من حديث سهل بن سعد بلفظ "أحد" واسناده صحيح، وأخرجه مسلم من حديث أبی هريرةؓ، فذكر أنه كان علىٰ حراء ومعه أبوبكر وعمر وعثمان وغيرهم، فهٰذا كله يدل على تعدد القصة .... الخ.

وفی المرقاة ج:۱۱ ص:۳۳۲ (طبع مكتبة امدادية ملتان) فاختلاف الروايات محمول علىٰ تعدد القضية فی الأوقات اهـ.

ب:- اس بارے میں دو قسم کی تأویل کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی تغلیب پر محمول ہے، چنانچہ ان حضرات میں سے اکثر شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوگئے ہیں، اور دُوسری یہ کہ شہادت عام ہے، یعنی شہادتِ حقیقیہ اور حکمیہ دونوں کو شامل ہے۔ لہٰذا بعض حضرات تو حقیقی شہادت پاگئے اور بعض کو حکمی شہادت ملی، بایں طور کہ انتقال ایسی بیماری سے ہوا جو شہادت کے حکم میں ہے۔

فی حاشية ابن ماجة ص:۱۳[۳] قال القاری رحمه الله: وفی سعد بن أبی وقاص مشكل، لأن سعدا مات فی قصره بالعقيق، فتوجيه هٰذا أن يكون بالتغليب، أو يقال: كان موته بمرض يكون فی حكم الشهادة اهـ. وأقول: ومثله فی سعيد بن زيد فانه مات بالعقيق أيضًا فحمل الى المدينة سنة احدى وخمسين. (اكمال فی أسماء الرجال)

وفی المرقاة فی هٰذه القصة ج:۱۱ ص:۳۳۲[۴] واثبات الشهادة لبعضهم حقيقة وللباقين حكمًا، والله أعلم.

---

(۱) فتح الباری كتاب فضائل الصحابة ج:۷ ص:۳۸ (طبع دار نشر الكتب الاسلاميه لاهور)
(۲) عمدة القاری ج:۱۶ ص:۱۹۱ (طبع دار الفكر بيروت).
(۳) (طبع ايچ ايم سعيد). (۴) (طبع مكتبه امداديه ملتان).

۲:- صحیح بات وہی ہے جو ''جہانِ دیدہ'' میں ہے، یعنی علامہ ابنِ تیمیہؒ، حافظ مزیؒ صاحبِ تہذیب الکمال کے شاگرد ہیں، اُستاذ نہیں۔ چنانچہ خود کتاب ''تہذیب الکمال'' کی فصلِ اوّل میں تصریح ہے:

وقرأ الثلاثة (أی ابن تیمیة وغیرہ) علی المزی، واعترفوا بأستاذیته وافتخروا بها.

(ج:۱ ص:۱۸)۔[1]

واللہ اعلم

عصمت اللہ عصمہ اللہ

۱۴۱۵/۲/۱۳ھ

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا تھا، احقر نے اسفار و اشغال کی وجہ سے اپنے ایک عزیز دوست کو مأمور کیا تھا کہ وہ ان اُمور کی تحقیق کریں۔ انہوں نے اُوپر جو جواب لکھا ہے، احقر کی رائے میں درست ہے۔ اگر اُحد اور حراء کی احادیث ایک ہی صحابی سے مروی ہوتیں تو تعدّدِ قصہ بعید ہوتا، لیکن یہ مختلف اصحاب سے مروی ہیں، کما حققه الحافظ فی الفتح۔ لہٰذا متعدّد واقعات پر محمول کرنے کے سوا چارہ نظر نہیں آتا۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۵/۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۵/۴۲)

خواتین کے لئے میڈیکل اور ہوم اکنامکس کی تعلیم حاصل کرنا کیسا ہے؟

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ لڑکیوں کو قرآن اور معمولی خط و کتابت کی تعلیم دینے کے سوا مزید تعلیم دِلانا حرام ہے یا جائز؟ اور اگر حرام ہے تو میڈیکل، حکمت اور ہوم اکنامکس کی تعلیم مسلمان خواتین کے لئے کس زُمرے میں آئے گی؟

جواب:- خواتین اگر میڈیکل سائنس، حکمت یا ہوم اکنامکس کی تعلیم اس غرض سے حاصل کریں کہ ان علوم کو مشروع طریقے پر عورتوں کی خدمت کے لئے استعمال کریں گی تو ان علوم کی تحصیل میں بذاتہٖ کوئی حرمت و کراہت نہیں، بشرطیکہ ان علوم کی تحصیل میں اور تحصیل کے بعد ان کے استعمال میں پردے اور دیگر اَحکامِ شریعت کی پوری رعایت رکھی جائے۔ اگر کوئی خاتون ان تمام اَحکام کی

---

(۱) (طبع مؤسسة الرسالة بیروت).

رعایت رکھتے ہوئے یہ علوم حاصل کرے تو کوئی کراہت نہیں،[1] لیکن چونکہ آج کل ان میں سے بیشتر علوم کی تحصیل اور استعمال میں اَحکامِ شریعت کی پابندی عنقاء جیسی ہے، اس لئے اس کا عام مشورہ نہیں دیا جاسکتا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ
(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۲۱۳ د)

خطوط میں بسم اللہ، ابجد اور ہندسوں میں لکھنے کی شرعی حیثیت اور اس طریقے کی ایجاد کی تاریخ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل مسئلے میں کہ خطوط میں جو ابجد سے بسم اللہ لکھی ہوتی ہے، یہ کس کی ایجاد ہے؟ اور ایسا کب ہوا؟ اور عدد سے پورے بسم اللہ کا ثواب و برکت حاصل ہوگی یا نہیں؟

جواب:- خطوط کی ابتداء میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھنا مسنون ہے،[2] اور یہ خود قرآنِ کریم سے ثابت ہے کہ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط بسم اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بات کسی مستند کتاب میں نظر نہیں آئی کہ بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ کا عدد کب سے لکھا جانا شروع ہوا، لیکن اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بسم اللہ لکھا ہوا کاغذ کسی بے حرمتی کی جگہ استعمال ہوگا تو اس لئے بے ادبی ہوگی، لہٰذا اگر کوئی شخص اس خیال سے زبان سے بسم اللہ پڑھ کر یہ عدد لکھ دے تو سنت تو ادا ہوجائے گی لیکن افضل یہی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ صراحۃً لکھی جائے، اس لئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط بھی کفار کے پاس گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر بادشاہوں کو جو خطوط روانہ فرمائے، ان میں بھی بسم اللہ درج تھی۔ ظاہر ہے کہ کفار کے پاس بے حرمتی کا احتمال مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ تھا، مگر اس کی وجہ سے بسم اللہ کو ترک نہیں کیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب

محمد تقی عثمانی غفرلہٗ
۱۳۹۱/۵/۱۰ھ
(فتویٰ نمبر ۲۲/۶۰۳ ب)

---

(۱) فی البحر ج:۸ ص:۱۹۲ والطبیب انما یجوز له ذٰلک اذا لم یوجد امرأة طبیبة، فلو وجدت فلا یجوز له أن ینظر، لأن نظر الجنس الی الجنس أخف، وینبغی للطبیب أن یعلم امرأة ان أمکن. وفی الشامیة ج:۶ ص:۳۷۱ (قوله وینبغی) کذا أطلقه فی الهدایة والخانیة، وقال فی الجوهرة: اذا کان المرض فی سائر بدنها غیر الفرج یجوز النظر الیه عند الآ ِاء، لأنه موضع ضرورة، وان کان فی موضع الفرج فینبغی أن یعلم امرأة تداویها، فان لم توجد وخافوا علیها أن تهلک .... والظاهر أن ینبغی هنا للوجوب. وکذا فی الهندیة ج:۵ ص:۳۳۰، وفی البدائع ج:۵ ص:۱۲۴.

(۲) دیکھئے تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۵۷۸، ۵۷۹۔

جواب صحیح ہے، مگر اس کی شرط یہ ہے کہ ظنِ غالب اس کا ہو کہ اس خط کی بے ادبی نہ کی جائے گی، جہاں یہ شرط نہ ہو جیسے عموماً خطوط میں یہی حال ہے، وہاں بسم اللہ لکھنے سے پرہیز کرنا بہتر ہے، صرف زبان سے کہنے پر اکتفا کرے یا ۷۸۶ کو ایک علامت بسم اللہ کی ہونے کی حیثیت سے لکھ دے۔ مکاتیبِ نبوی اور مکتوبِ سلیمانؑ میں یہ شرط موجود تھی، کیونکہ عام دُنیا میں سلاطین اور بڑوں کے خطوط احتیاط سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ جن خطوط کے متعلق آج بھی یہ گمان غالب ہو ان میں بسم اللہ لکھنا چاہئے۔

بندہ محمد شفیع

حدیث ''کنت کنزًا مخفیًا'' کی تحقیق اور تخلیقِ عالَم کے سلسلے میں کئی وساوس اور شبہات کے جوابات

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ بندہ آپ کے تبحرِ علمی، ذکاوتِ فہم اور اعلیٰ استعدادِ فقہ کا قدردان اور دِل سے معترف ہے، اور آپ کے لئے دست بدعا رہتا ہے، اسلام کو آپ جیسے علماء کی سخت ضرورت ہے، آپ کی بہت سی کتابوں سے بندہ نے استفادہ کیا ہے، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، اللہ کرے نورِ فہم اور زیادہ۔

بندہ آج کل چند وسوسوں کی وجہ سے سخت پریشان ہے، ان میں سے تین اِشکال ہر وقت ذہن میں گھومتے ہیں، اور میرے اور خدا کے درمیان ایک قسم کا حجاب بنتے ہیں، کیونکہ نماز و اذکار وغیرہ کے درمیان یہ وسوسے آکر بدمزگی کا سبب بنتے ہیں۔ براہِ کرم فی سبیل اللہ میری مدد فرمائیں، میں سمجھتا ہوں حضرت تھانویؒ کے فہم وفراست سے جناب کو کافی حصہ ملا ہے، ایسے سوالات کے جوابات مولانا تھانویؒ کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ خدمتِ دین کے سلسلے میں آپ کی مصروفیات ملک و بیرونِ ملک، تصنیف و تألیف، دارالعلوم کے انتظامی اُمور اور دیگر شعبہ جات میں آپ کا انہماک اتنا زیادہ ہے کہ شاید اپنی ذات کے لئے بھی آپ کو وقت کم ملتا ہوگا، مگر آپ جیسے عالم سے پوشیدہ نہیں ہوگا کہ تزکیۂ نفس کا کام بھی کتنا عظیم الشان کام ہے کہ پیغمبر اس کے لئے مبعوث کئے گئے، اور وسوسوں کا ازالہ اور شبہات و اِشکال کا مدلل جواب بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

آپ کی مصروفیت کی بناء پر آپ اس میں آزاد ہیں کہ جواب ایک دن میں، یا ایک مہینے میں دیں، یا ہر اِشکال کا ایک ساتھ دیں، یا الگ الگ دیں، جس طرح آپ کو سہولت ہو، مگر براہِ کرم جواب ضرور دیں، حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

سوال ا:- الف:- ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ'' مفسرین حضرات نے ''لِيَعْبُدُوْنِ'' کی تفسیر ''لِيَعْرِفُوْنِ'' سے کی ہے، یعنی مقصدِ تخلیق یہ ہے کہ خدا کو پہچانا جائے، اور ایک حدیث بھی ہے: ''کنت کنزًا مخفیًا'' یعنی میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں ''فخلقت الخلق'' چنانچہ میں نے خلق کو پیدا کردیا۔

وسوسہ یہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کی صفات الرحمٰن الرحیم بھی ہے، نے محض اپنی شناخت اور تعارف کے لئے کروڑوں، اربوں انسانوں کو پیدا کرکے ایک بلائے عظیم میں مبتلا کردیا۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک کروڑوں، اربوں ذی رُوح انسان جن کے جثّے ایسے بنائے گئے کہ اگر ایک سوئی بھی بدن میں لگ جائے تو تکلیف ہوتی ہے۔ سسک سسک کر ظالموں کے جبر و بربریت اور اذیت ناک تشدّد کے سبب مرگئے۔ ہزاروں، لاکھوں جنگلی جانوروں، شیر، سانپ، بچھو کی غذا کے لئے، لاکھوں افراد سمندری طوفان، برف باری اور موسم کی خنکی کی نذر ہوگئے۔ لاکھوں لوگ آفاتِ سماوی ارضی، طاعون، چیچک اور دُوسری اذیت ناک بیماریوں کے لقمہ بن گئے۔ لاکھوں بے کس انسان قحط میں بھوک سے مرگئے، آج بھی لاکھوں انسان قلتِ غذائیت کے شکار ہیں۔ ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے۔

دو وقت کی روٹی نہ ملے تو کیسی اذیت ہوتی ہے، کوئی زخم لگ جائے، کوئی بیماری ہوجائے، کسی کی عزّتِ نفس مجروح ہو، کسی بے گناہ کو قید کردیا جائے، کسی کو بے عزّت کردیا جائے، کسی کا گھر لوٹ لیا جائے، کسی کو اغواء کرلیا جائے، یہ اذیتیں برابر جاری ہیں اور زیادہ تر ان کے شکار غریب اور بے وسیلہ لوگ ہوتے ہیں، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

بنی نوعِ انسان پر ایسی ایسی مصیبتوں اور تکالیف کے پہاڑ ٹوٹے ہیں جن کو سن کر پتھر دِل بھی موم ہوجائیں۔ نوعِ انسانی کا ابتدائی دور دیکھئے، سردی کی شدّت، گرمی کا عذاب، ہواؤں کی تیزی ایسی ہی تھی جیسی آج ہے، مگر انسان کے پاس نہ لحاف، نہ گدّے تھے، بدن پیڑ کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں سے چھپایا جاتا تھا۔ پتھر کا دور، لوہے کا دور، زندہ رہنے کے لئے کیسی جدوجہد کرنی پڑتی ہوگی؟

ب:- پھر جس پہچان اور شناخت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ'' کی حالت میں پیدا کیا۔ اس شناخت کو بھی ستر ہزار پردوں میں ایسا چھپایا کہ پوری زندگی ریاضت اور مجاہدات کرو، تب بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا، اِلّا ماشاء اللہ۔ سلوک کی کتابیں اور صالحین کے حالات اس پر شاہد ہیں۔

ج:- پھر چلو اگر دُنیا کی زندگی جیسے تیسے گزر گئی، فاقوں میں، بیماری میں، موسم کی سختی میں، مظلومی کی حالت میں تو اَب آخرت کی زندگی کا خوف اس سے بڑھ کر، وہاں کا عذاب دُنیا کے عذاب

سے ہزاروں گنا بڑا ہے، تو گویا ایک رُوح کو جسم دے کر ابد الآباد اور ہمیشہ کی تکلیف میں مبتلا کر دیا اور شناخت کو اتنا مشکل بنا دیا کہ کوئی کہتا ہے اللہ کا وجود ہی نہیں، کوئی کہتا ہے سب اللہ ہی اللہ ہے، کوئی کہتا ہے کہ اس کے اولاد ہے، کوئی کہتا ہے وہ فلاں جسم میں حلول کر گیا۔

۳:- تو پھر ایک ایسی چیز یعنی شناخت (عرفانِ الٰہی) جو اتنی مشکل اور نایاب ہو اس کے لئے اربوں گوشت پوست کے انسانوں کو ایسی بلائے عظیم میں مبتلا کرنا بظاہر خدا کی صفت الرحمٰن الرحیم سے متضاد معلوم ہوتی ہے۔

د:- اگر جواب میں کوئی کہے کہ اسلام نے اللہ کی شناخت کا طریقہ بتا دیا ہے تو بے شک یہ صحیح ہے، مگر اس سے شناخت کہاں ہوتی ہے؟ اس سے تو صرف علم حاصل ہوتا ہے، یعنی جاننا اور پہچاننا اور چیز ہے۔

یا کوئی کہے کہ ہم سب اللہ کی مملوک ہیں اور مالک کو اپنی مملوک میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے، اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا، تو بے شک یہ بھی صحیح ہے مگر خدا نے انسانوں کو منع کیا ہے کہ اپنی مملوک میں بے جا تصرف نہ کرو، اولاد کو بھوکا مارنا، اپنے جانوروں کو بھوکا رکھنا، اپنی دولت کا بیجا اِسراف، یہ سب باتیں خدا نے منع کی ہیں۔ تو جس اَمر کو خدا اپنے بندوں سے پسند نہیں کرتا وہ خود کیونکر کر گیا؟

محترم! یہ سوال میں پوری انسانیت کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے کر رہا ہوں جس میں ابتدائے خلق سے آج تک کے سارے انسان، کافر، مؤمن سب شامل ہیں۔ لہٰذا جواب میں اس حیثیت کو مدِنظر رکھئے گا۔ بندے کا علم بہت محدود ہے اور یہ معاملات تکوینی اُمور سے تعلق رکھتے ہیں جن کی حکمت کا احاطہ محال ہے اور آخرت میں بھی پورا پورا ہوگا۔ پس جناب سے استدعا ہے کہ ایسا معقول جواب عنایت فرمائیں کہ کسی طرح یہ کانٹا نکل جائے جو آج کل مجھے بہت پریشان کئے ہوئے ہے۔ عقیدہ تو الحمدللہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی شئ باطل پیدا نہیں کی مگر بعض اُمور میں قلب ساتھ نہیں دیتا، خدا مجھے اس منافقت سے محفوظ رکھے۔

اِشکال نمبر۲:- ساری دُنیا میں کروڑوں لوگ انتہائی افلاس اور غربت کا شکار ہیں، افریقہ میں تو ہزاروں لوگ بھوک سے مرجاتے ہیں۔ ہم اپنے صوبہ سرحد کو دیکھیں، چھوٹے چھوٹے بچے کچرا چنتے ہوئے نکل آتے ہیں جن کو مشکل سے دس بیس روپے روز مزدوری ملتی ہے۔ دُوسری طرف وہ لوگ جن کے یہاں رزق کی اتنی وسعت ہے کہ ان کے کتے بھی وہ غذا کھاتے ہیں جو غریبوں کو میسر نہیں، اگر اس تفاوت کو اَمرِ خدا سمجھا جائے تو یہ قرآن اور خدا کے قول "وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ" کے خلاف جاتا ہے۔ غور وفکر کے بعد یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا" مشروط ہے اپنے زمانے کے اسبابِ معیشت اختیار کرنے پر۔ مشاہدہ ہے کہ ایک بھائی نے اس زمانے

کے اسبابِ معیشت اختیار کئے، پڑھ لکھ گیا، اعلیٰ عہدے کا مالک ہوگیا، خوب رزق میں وسعت ہوئی، دُوسرا بھائی جاہل رہ کر ہر طرح محتاج رہا۔ اس کے خلاف بھی ہے، مگر حکم اکثریت پر لگایا جاتا ہے۔ خدا کو کسی سے دُشمنی نہیں کہ اس کو محتاج رکھے، قرآن کی آیت "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ ...." بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ آپ فرمائیں کہ یہ بات صحیح ہے اور یہ عقیدہ حق ہے یا نہیں؟

اِشکال نمبر۳:- ہمارا عقیدہ ہے کسب بندے کی طرف سے ہے اور خلق اللہ کی طرف سے۔ بندے نے کسی نیک کام کا ارادہ کیا، اللہ نے اس عمل کی تخلیق کردی، یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن بندے نے کسی بُرائی مثلاً ڈاکا یا قتل کا ارادہ کیا تو اللہ کی طرف سے اس عمل کی تخلیق سے دو اِشکال پیدا ہوتے ہیں، پہلا تو یہ کہ اللہ کی تخلیق کا عمل بندے کے ارادے کے تابع ہے، گو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تخلیقِ عمل نہیں ہوتا مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے اور حکم اکثریت پر لگتا ہے۔

دُوسرا اِشکال یہ کہ بدعمل کی تخلیق بظاہر "وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ بندوں کو حکم ہے "لَا تَعَاوَنُوْا ...." کسی نے کسی بے گناہ کو قتل کرکے اس پر ظلم کیا، اللہ تعالیٰ نے اس عمل کی تخلیق کرکے ظالم سے تعاون کیا (نعوذ باللہ)۔ دُنیا کی عدالتیں اعانتِ جرم کو بھی جرم سمجھتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے اس بدعمل کی تخلیق کی کیا توجیہ کریں گے؟ دُوسرے یہ کہ ایمانِ مفصل میں "وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی" سے مراد یہی تخلیقِ فعل ہے یا کچھ اور؟ کیونکہ شرِمحض کا صدور تو حق تعالیٰ سے محال ہے۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مفصل خط ملا، آپ نے احقر کو جو دُعائیں دی ہیں، ان پر تہِ دِل سے شکرگزار ہوں (جزاکم اللہ تعالیٰ)۔ آپ کے اصل سوال کے بارے میں پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ "کنت کنزًا مخفیًا .... الخ" کا جو فقرہ حدیثِ قدسی کے عنوان سے مشہور ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بھی سند سے ثابت نہیں ہے، علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

"کنت کنزًا لا أعرف فأحببت أن أعرف .... قال ابن تیمیۃؒ: انه لیس من کلام النبی صلی اللہ علیه وسلم، ولا یعرف له سند صحیح ولا ضعیف، وتبعه الزرکشی وشیخنا."

(المقاصد الحسنة للسخاویؒ ص:۳۲۷)

نیز علامہ عجلونی نے بتایا ہے کہ صرف علامہ ابنِ تیمیہؒ ہی نہیں، حافظ ابنِ حجرؒ، علامہ زرکشیؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بھی یہی کہا ہے کہ اس روایت کی کوئی بھی سند نہیں ہے، نہ صحیح، نہ ضعیف۔

(کشف الخفاء للعجلونیؒ ج:۲ ص:۱۷۳)

اور اسنی المطالب میں لکھا ہے کہ: اس حدیث کو بعض صوفیاء تساہلاً حدیثِ قدسی کے طور پر ذکر کرتے ہیں (ص:۲۴۳) اور بس۔

البتہ آیتِ کریمہ میں ضرور وارد ہوا ہے کہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ"(۱) یعنی جن و اِنس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اس سے آگے آپ نے تخلیقِ عالم کے سلسلے میں جن وساوس وشبہات کا ذکر فرمایا ہے، ان کا اجمالی جواب یہ ہے کہ یہ وساوس وشبہات درحقیقت اس دائرے میں قدم رکھنے سے پیدا ہوئے ہیں جو عقلِ انسانی سے ماورا ہے۔ تخلیقِ کائنات کی کیا حکمتیں ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا کیسا نظام بنایا ہے؟ اور یہاں ہر چیز اور ہر واقعے کے پیچھے کیا کیا مقاصد کارفرما ہیں؟ اگر یہ سب باتیں انسان کی عقل اور علم میں آجائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان انسان نہ رہا، عالم الغیب ہوگیا۔ یہ بات طے شدہ ہے جس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ انسان کی عقل محدود ہے، اور وہ کائنات کی تخلیق تو کجا، خود اپنے وجود کے ہر حصے کی حکمتِ تخلیق معلوم کرنے پر بھی قادر نہیں، یہاں تک کہ وہ دماغ جس سے انسان سوچتا ہے، اس کا بھی بڑا حصہ ابھی تک انسان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا عمل کیا ہے؟ جو واقعات انسان کسی کی تکلیف یا صدمے کے دیکھتا ہے، وہ صرف ان کا ظاہری رُخ ہے، ان واقعات کے پیچھے کے حقائق اس کے علم میں نہیں ہوتے۔ ہماری زندگی ہی میں بہت سے حالات و واقعات ایسے پیش آتے ہیں کہ ایک عرصے تک ہم ان پر افسوس کرتے رہتے ہیں، لیکن کسی وقت ان کی حقیقت کھلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ افسوسناک واقعات عین حکمت کے مطابق تھے۔ اگر یہ حقیقت نہ کھلتی تو ہم اسے ظلم ہی سمجھتے۔ اب کسی کسی موقع پر یہ حکمت ظاہر ہوجاتی ہے، لیکن اکثر مواقع پر ظاہر نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان معاملات کی کھوج میں پڑنا جو انسان کے دائرۂ ادراک سے باہر ہیں، خواہ مخواہ اپنے آپ کو پریشانی میں ڈالنا ہے۔

دُوسری طرف اگر اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان ہے تو اس کے رحمٰن و رحیم ہونے پر بھی ایمان ہونا لازمی ہے۔ اگر کسی مخلوق کی کوئی تکلیف دیکھ کر آپ کو ترس آرہا ہے تو کیا رحمٰن و رحیم کو نہیں آئے گا؟ اگر اس نے آپ سے کہیں زیادہ رحیم ہونے کے باوجود اسے اس حالت میں چھوڑا ہے تو یقیناً اس کی کوئی وجہ ہے جو آپ کے دائرۂ علم وادراک سے باہر ہے۔ آپ ایک شخص کو پھانسی پر لٹکا تو دیکھ رہے ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اس نے کتنے انسانوں کی جان لی ہے؟ آپ ایک ڈاکٹر کو کوئی عضو کاٹتے ہوئے دیکھ کر ترس کھا رہے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ آپریشن نہ ہوتا تو سب اعضاء کا کیا بنتا؟ یہ تو معمولی مثالیں ہیں، پوری کائنات کے نظام میں کسی شخص کے حق میں کیا بہتر

---

(۱) سورۃ الذّٰریٰت:۵۶.

ہے؟ اس کا علم سوائے خالقِ کائنات کے کسی کو نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس کھوج میں پڑنا ہی خلافِ عقل ہے۔ اگر یہ اجمالی حقیقت ذہن نشین ہوجائے تو ان شاء اللہ اس قسم کے وساوس وشبہات زیادہ پریشان نہیں کریں گے، اور اگر کبھی غیر اختیاری طور پر آئیں تو اپنے آپ کو کسی کام میں لگالیں، اور ان کی طرف التفات نہ کریں۔

والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۰/۱۲/۲۷ھ

(فتویٰ کے حوالوں کی تخریج از مولانا محمد عبداللہ میمن زید مجدہٗ)

۱:- كنت كنزا لا أعرف فأحببت أن أعرف، فخلقت خلقا فعرفتهم بى، فعرفونى. قال ابن تيميةؒ: انه ليس من كلام النبى صلى الله عليه وسلم ولا يعرف له سند صحيح ولا ضعيف، وتبعه الزركشى وشيخنا. (المقاصد الحسنة للسخاوى ص:۳۲۷)

۲:-وفى كشف الخفاء بعد هذه العبارة:-

وتبعه الزركشى والحافظ ابن حجرؒ فى اللآلى والسيوطىؒ وغيرهم، وقال القارى: ولٰكن معناه صحيح مستفاد من قوله تعالىٰ: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" أى ليعرفونى كما فسره ابن عباسؓ، والمشهور على الألسنة كنت كنزًا مخفيًا، فأحببتُ أن أعرف، فخلقت خلقا فبى عرفونى. وهو واقع كثير فى كلام الصوفية، واعتمدوه، وبنوا عليه أصولا لهم. كشف الخفاء للعجلونى ج:۲ ص:۱۷۳.

۳:- وفى الموضوعات الكبير مثل ذٰلک الىٰ: كما فسره ابن عباس رضى الله عنهما. (ص:۹۳)

۴:- وفى "أسنى المطالب": .... وتبعه الزركشى، وابن حجر، وهٰذا يذكره المتصوفة فى الأحاديث القدسية تساهلًا منهم. (ص:۲۴۳)

قومِ لوطؑ کی جس بستی کو اُلٹا گیا تھا اس کی تعیین میں رائے کا اختلاف

سوال:- معارف القرآن جلد سوم سورۂ انعام ص:۳۲۰ پر مرقوم ہے:

قومِ لوط کی پوری بستی کو اُلٹ دیا گیا جو آج تک اُردن کے علاقے میں ایک عجیب قسم کے پانی کی صورت میں موجود ہے، جس میں کوئی جانور، مینڈک، مچھلی وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتی، اسی لئے اس کو بحرِ میّت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور بحرِ لوط کے نام سے بھی۔

پوری بستی کو اُلٹ جانے کا واقعہ جس جگہ پیش آیا ہے وہ بالکل صاف میدان ہے، عذاب والی جگہ کو پانی سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ کوئی جانور زندہ نہیں رہ سکتا، تاریخ کے خلاف ہے۔ آج کل لوگ اس جگہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، عذابِ الٰہی کی جگہ کو بحرِ میّت کہنا جھوٹ ہے۔

جواب: – حضرت لوط علیہ السلام کی جن بستیوں کو اُلٹا کیا گیا تھا، ان کی تعیین میں رائیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اُردن تشریف لے گئے تو وہاں کے اہلِ علم نے بحرِ میّت کی جگہ کے بارے میں یہی بتایا کہ یہ لوط علیہ السلام کی بستیوں کی جگہ ہے، اور والد صاحبؒ کو وہاں لے بھی گئے، اس کی بنیاد پر انہوں نے یہ بات لکھی ہے۔ اگر کسی صاحبِ علم کی تحقیق اس کے خلاف ہو، تو ہوسکتی ہے، یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر شریعت کا دار و مدار ہو، ایک تاریخی یا جغرافیائی مسئلہ ہے، اور بہت سے تاریخی جغرافی مسائل میں اہلِ علم کی رائے یا مشاہدات مختلف ہوتے ہیں، ان میں سے کسی کو راجح، کسی مرجوح تو کہہ سکتے ہیں، مگر کسی کو جھوٹ کہنا بڑی زیادتی کی بات ہے، والسلام۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۰۴۴ ج)

نبوّت اور وحی کی کیا حقیقت ہے؟

سوال: – برائے کرم عقلی اعتبار سے یہ سمجھا دیجئے کہ نبوّت اور وحی کیا چیز ہیں؟ اور نبی اور خدا کے مابین جو رشتہ ہوتا ہے اس کا ہم کس طرح ادراک کرسکتے ہیں؟

جواب: – یہ ایک مفصل اور طویل بحث ہے جو مختصر طور سے سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ اس موضوع پر احقر کی کتاب ''علوم القرآن'' میں مفصل بحث موجود ہے۔ یہ کتاب مکتبۂ دار العلوم کراچی ۱۴ نے شائع کی ہے، اس کا مطالعہ فرمالیں، پھر بھی کوئی شبہ رہ جائے تو پوچھ لیں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۵۰۹ ہ)

کیا موجودہ سائنسی تحقیقات قرآن وحدیث سے متعارض ہیں؟

سوال: – چاند، سورج اور سیاروں کے بارے میں موجودہ سائنس کی جو تحقیق ہے، کیا وہ قرآنِ کریم کی رُو سے دُرست ہے؟ یہاں بعض حضرات کہتے ہیں کہ سائنس اور قرآن وحدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، لہٰذا اس کی ہر بات دُرست ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ سائنس کے نظریات قرآن سے ٹکراتے ہیں، براہ کرم اس معاملے میں اپنی جامع و مانع رائے سے مطلع فرمایئے۔

جواب: - آپ کا سوال اپنے جواب کے لئے درحقیقت ایک مبسوط مقالے کی وسعت چاہتا ہے، تاہم اُصولی طور پر چند ضروری باتیں پیشِ خدمت ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ آپ کی اُلجھن دُور کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

۱:- سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجئے کہ سائنس کا بنیادی مقصد ان قوّتوں کا دریافت کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ودیعت فرمائی ہیں۔ اگر ان قوّتوں کو انسانیت کی فلاح و بہبود میں استعمال کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اسلام کی نظر میں نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ اسلام ان کوششوں کے راستے میں کوئی رُکاوٹ کھڑی کرنے کے بجائے ان کی ہمت افزائی کرتا ہے، اس سلسلے میں اسلام کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ ان قوّتوں کو ان مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے جو اسلام کی نظر میں جائز اور مفید ہیں۔ دُوسرے الفاظ میں سائنس کا کام یہ ہے کہ وہ کائنات کی پوشیدہ قوّتوں کو دریافت کرے، لیکن ان قوّتوں کا صحیح مصرف مذہب بتاتا ہے، وہی ان اکتشافی کوششوں کے لئے صحیح رُخ اور بہتر فضا مہیا کرتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اسی وقت انسانیت کے لئے مفید ہوسکتی ہے جب اسے اسلام کے بتائے ہوئے اُصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے، ورنہ شاید اس سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ سائنس جس طرح انسانیت کے لئے مادّی فلاح و بہبود کا باعث بن سکتی ہے، اسی طرح اگر اس کا غلط استعمال کیا جائے تو وہ ہمارے لئے تباہ کن بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ مثال ہمارے سامنے ہے کہ ماضی میں سائنس نے جہاں انسانیت کو راحت و آسائش کے اسباب مہیا کئے ہیں، وہاں اس کے غلط استعمال نے پوری دُنیا کو بدامنی اور بے چینی کا جہنم بھی بنادیا ہے۔ سائنس ہی نے سفر کے تیز رفتار ذرائع بھی ایجاد کئے اور اسی نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بھی بنائے، لہٰذا سائنس کا صحیح فائدہ اسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اُصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے۔

۲:- دُوسری بات یہ سمجھنے کی ہے کہ سائنس کی تحقیقات دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو صریح مشاہدے پر مبنی ہیں، ایسی تحقیقات نہ کبھی قرآن وسنت سے متصادم ہوئی ہیں اور نہ ہوسکتی ہیں، بلکہ مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایسی تحقیقات نے ہمیشہ قرآن وسنت کی تصدیق ہی کی ہے، اور قرآن وسنت کی بہت سی وہ باتیں جو کچھ عرصہ پہلے لوگوں کی سمجھ میں ذرا مشکل سے آتی تھیں، سائنس کی ان تحقیقات نے ان کا سمجھنا آسان بنادیا ہے، مثلاً معراج کے موقع پر بُراق کی جس تیز رفتاری کا ذکر صحیح احادیث میں آیا ہے، قدیم زمانے کے نام نہاد عقل پرست اسے بعید از قیاس سمجھتے تھے، لیکن کیا آج سائنس نے یہ ثابت نہیں کردیا کہ تیز رفتاری ایک ایسی صفت ہے جس کو کسی حد میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

دُوسری قسم کے سائنٹفک نظریات وہ ہیں جو مشاہدہ اور یقین کے بجائے ظن وتخمین پر یا کم علمی

پر مبنی ہیں، اور اس سلسلے میں سائنس داں کسی یقینی نتیجے پر ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں، ایسی تحقیقات بعض اوقات قرآن وسنت کی تصریحات سے ٹکراتی ہیں، ایسے مواقع پر سیدھا اور صاف راستہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تصریحات میں کوئی تأویل کئے بغیر ان پر ایمان رکھا جائے، اور سائنس کی جو تحقیقات ان سے ٹکراتی ہیں ان کے بارے میں یہ یقین رکھا جائے کہ سائنس ابھی اپنی کم علمی کی بناء پر اصل حقیقت تک نہیں پہنچی، جوں جوں انسان کی سائنسی معلومات میں اضافہ ہوگا قرآن وسنت کے بیان کئے ہوئے حقائق واضح ہوتے جائیں گے۔

مثلاً بعض سائنسدانوں کا یہ خیال ہے کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ خیال اس بناء پر قائم نہیں ہوا کہ انہیں آسمان کے موجود نہ ہونے پر کوئی دلیلِ قطعی مل گئی ہے، بلکہ ان کے استدلال کا حاصل صرف یہ ہے کہ ہمیں آسمان کے وجود کا علم نہیں ہوسکا، اس لئے ہم اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ دُوسرے الفاظ میں یہ خیال ''علم عدم'' کے بجائے ''عدمِ علم'' پر مبنی ہے ..... لہٰذا ہم جو قرآن وسنت کی قطعیت پر ایمان رکھتے ہیں، پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ان سائنسدانوں کی یہ رائے قطعی غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تصریح کے مطابق آسمان موجود ہے، مگر سائنس اپنی کم علمی کی بناء پر اسے دریافت نہیں کرسکی، اور اگر انسان کی سائنسی معلومات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا تو عین ممکن ہے کہ سائنس دانوں کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوجائے اور وہ اسی طرح آسمان کے وجود کو تسلیم کرلیں جس طرح بہت سی ان چیزوں کو تسلیم کیا ہے جن کا پہلے انکار کیا جاتا تھا۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنے کی ذہنیت ختم ہوتی جارہی ہے، جب کسی چیز کی اہمیت ذہن پر سوار ہوتی ہے تو بسا اوقات اس میں حدود سے تجاوز ہونے لگتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نہایت مفید اور ضروری فنون ہیں، اور دورِ حاضر میں تو مسلمانوں کے لئے از حد ضروری ہے کہ ان فنون کی طرف بطورِ خاص توجہ دے کر ان میں ترقی کی انتھک کوشش کریں، اس کے بغیر موجودہ دُنیا میں ان کے لئے اپنا جائز مقام حاصل کرنا ممکن نہیں رہا، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ کوئی سائنسدان اپنے ظن وتخمین سے جس کسی نظریئے کا اعلان کردے اسے وحی کی طرح دُرست تسلیم کرلیا جائے، اور اس کی بناء پر قرآن وسنت میں تأویل وترمیم کا دروازہ کھول دیا جائے، یا اس کی بناء پر قرآن وسنت میں شکوک وشبہات پیدا ہونے لگیں، خاص طور پر جب یہ شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ سائنس کے اس قسم کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔

۳:- یاد رکھئے کہ اسلام کا معاملہ عیسائیت سے بہت مختلف ہے۔ عیسائی مذہب میں اتنی جان نہیں تھی کہ وہ زمانے کی نت نئی ضروریات اور انسان کی بڑھتی ہوئی سائنٹفک معلومات کا مقابلہ کرسکتی،

لہٰذا سائنس اس کے لئے ایک عظیم خطرہ بن کر سامنے آئی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ کلیسا کے وقار کو سلامت رکھنے کے لئے یا تو سائنس کی مخالفت کرے یا اپنے مذہب میں رَدّ و بدل کرے۔ شروع میں رومن کیتھولک چرچ نے پہلے راستے کو اختیار کیا، اور چونکہ عوام پر اس کا اقتدار قائم تھا، اس لئے گلیلیو جیسے سائنسدانوں کو بے شمار رُکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جب کلیسا کا اقتدار ڈھیلا پڑا تو اَب اس کے لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اپنے مذہب میں ترمیم کرکے اس کی نئی تشریح وتعبیر کریں۔ چنانچہ اہلِ تجدّد (Modernism) کے مکتبِ فکر نے یہ راستہ اختیار کرلیا۔

لیکن یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ عیسائی مذہب کو انتہائی غیر فطری اور غیر معقول بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اسلام کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، وہ دینِ فطرت ہے، اور عقل وخرد کی کوئی دلیل اسے چیلنج نہیں کرسکتی۔ اس میں زمانے کی ہر ضرورت کو پورا کرنے اور ہر دور کی تحقیقات کے ساتھ آنکھیں ملانے کی پوری صلاحیت ہے۔ لہٰذا ہمیں اسلام کے وقار کو سلامت رکھنے کے لئے سائنس کی مخالفت کی ضرورت ہے، نہ اسلام کو بدلنے کی، اس لئے کہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ سائنس جس قدر ترقی کرے گی اور انسان کی سائنسی معلومات میں جتنا اضافہ ہوگا اسلام کی حقانیت اور واضح ہوتی چلی جائے گی، بشرطیکہ انسان کا نقطۂ نظر صحیح معنوں میں سائنٹفک رہے، اور وہ محض قیاس وتخمین کو یقین اور مشاہدے کا درجہ نہ دے بیٹھے۔

بس یہ ہے وہ بات جو علمائے دین کہتے ہیں، اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا چاہئے، جذباتی نعروں کی رو میں آکر حدود سے تجاوز کرجانا دانشمندی کا تقاضا نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ اس معتدل اور سو فیصد معقول بات کی وجہ سے بعض حضرات مسلسل یہ تشہیر کر رہے ہیں کہ علماء، سائنس اور ٹیکنالوجی کے مخالف ہیں، اور اس میدان میں ترقی کرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس الزام کے جواب میں ہم یہ دُعا کرنے کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو فکرِ سلیم عطا کرے۔ واللہ سبحانہ اعلم

آخر جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ (۱)

احرام کے فوائد اور اثرات کی شرعی حیثیت

سوال:- احرام کے اندر کھانے پینے کی اشیاء رکھنے سے وہ سڑتی نہیں بلکہ ٹھوس اور سکڑ جاتی ہیں، مثلاً:-

---

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ جمادی الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

دُودھ رکھا جائے تو وہ دہی یا پنیر میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

گوشت رکھا جائے تو وہ سڑتا نہیں بلکہ خشک ہوجاتا ہے۔

چائے یا تمباکو رکھنے سے ان کی تلخی یا کڑواہٹ ختم ہوجاتی ہے۔

اہرام کے اندر اگر پانی رکھا جائے تو بعد میں وہ اہرامی پانی اگر:-

پودوں میں ڈالا جائے تو ان کی نشو ونما اور جسامت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

سر کے بالوں میں لگایا جائے تو بال گرنے بند ہوجاتے ہیں اور پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے۔

سردیوں میں جلد پر لگایا جائے تو پھٹی ہوئی جلد ٹھیک ہوجاتی ہے، اور چہرے پر لگایا جائے تو جھرّیاں ختم ہوجاتی ہیں۔

عادی شرابی کو پلایا جائے تو شراب کی طلب ختم ہوجاتی ہے۔

مچھلی گھر میں ڈالا جائے تو مچھلیوں کی افزائش میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

جانوروں کے آگے اگر اہرامی پانی اور عام پانی رکھا جائے تو وہ اہرامی پانی پیتے ہیں۔

اہرام کے اندر اگر دوا رکھی جائے تو اس کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔

اہرام کے اندر اگر پھلوں اور ترکاریوں کے بیج رکھے جائیں تو ان بیجوں سے طاقت ور پھل زیادہ پھل پھول والے درخت اور سبزیاں پیدا ہوں گی۔

اگر گلاب اور دُوسرے درختوں کی قلمیں پانی میں ڈبوکر اہرام کے اندر رکھی جائیں تو ان قلموں سے جڑیں بہت جلد نکلتی ہیں۔

اگر استعمال شدہ بلیڈ اہرام کے اندر رکھا جائے تو اس کی دھار دوبارہ تیز ہوجاتی ہے۔

زخموں اور چوٹوں کے اُوپر جب اہرام رکھا گیا تو وہ بہت جلد اچھے ہوگئے۔

سائنس دانوں نے بیماریوں کے جراثیم اہرام میں رکھے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جراثیم یا تو مکمل طور پر ختم ہوگئے یا ان کی پیدائش وافزائش میں حیرت انگیز کمی ہوئی۔

مختلف بیماروں کو اہرام کے اندر بٹھانے سے پہلے اور بٹھانے کے بعد ان کے خون کا تجزیہ کیا گیا، ڈاکٹر حیران رہ گئے کہ اہرامی قوّت نے آدھے گھنٹے کے اندر خون کے اجزاء میں کافی تبدیلیاں کردیں۔ اب آپ فرمایئے کہ:-

۱:- اہرام جسے انگریزی میں پائی رامڈ (Pyramid) کہتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲:- دُنیا کے مختلف علاقوں میں بسے ہوئے اہرام خصوصاً مصر جن میں سے ایک کے اندر فرعون کی لاش موجود ہے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بھی پہلے کے ہیں، اس لئے کیا

اہرام کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ملتی ہیں یا نہیں؟ نیز یہ کہ قرآن کے اندر بھی اہرام کے متعلق کچھ مضمون بیان کیا گیا ہے یا نہیں؟

۳:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں کیا اہرام استعمال کرنے یا اہرامی شکل کے مکانات بنانے کا رواج موجود تھا یا نہیں؟

۴:- ''اہرام کے فوائد'' جو پچھلے صفحے پر بیان کئے گئے ہیں، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے تو پھر اہرام کی پُراسرار قوّت کا راز کیا ہے؟ کیا ان فوائد کا حاصل ہونا کسی جادُو وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے یا یہ کسی دُنیاوی علوم کا نتیجہ ہیں؟

۵:- کیا یہ فوائد حاصل کرنے کے لئے اہرام سے استفادہ کرنا شرعاً جائز ہے؟

۶:- چونکہ اہرام سے دو چیزوں کا خاص تعلق ہے، جن میں سے شمال اور جنوب کا تعین کرنا، کیا ان کی بھی کوئی شرعی حیثیت ہے یا ان کا تعلق کسی دُنیاوی علوم سے ہے؟

۷:- کہا جاتا ہے کہ اکثر اہرام خیالات وخواہشات کو مادّی شکل دیتا ہے، کچھ لوگوں نے قابلِ عمل خواہشات کو لکھ کر اہرام کے اندر رکھا، کچھ عرصے کے بعد ان کی خواہشات خود بخود پوری ہوگئیں، کیا ایسا ہونا شرعاً ممکن ہے؟

۸:- تجربات اور مشاہدات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ مکمل چاند اور بعض اوقات سیاروں اور زمین کی گردش کی وجہ سے اہرام کے بعض اثرات میں زیادتی اور بعض میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ موجودہ مغربی طب نے بڑی حد تک سیاروں کے اثرات کے بارے میں واضح ثبوت فراہم کئے ہیں، مثلاً پورے چاند پر، جنون، پاگل پن، مراقی کیفیت، خودکشی، قتل اور جرائم کی واردات میں اضافہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ عورتوں کے ایامِ حیض بھی چاند کی گردش سے متاثر ہوتے ہیں، اور اس بات کا بھی لوگوں کو عملی تجربہ ہے کہ پورے چاند پر سمندر چڑھا ہوا ہوتا ہے۔

کیا چاند اور سیاروں کے اثرات کی کوئی شرعی حیثیت ہے یا نہیں؟ اگر ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے تو پھر ان تمام باتوں کے ظہور ہونے کی کیا وجوہات ہیں؟ اور ان پر یقین رکھنا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب:- ''اہرام'' کی حقیقت اور خواص وآثار کے بارے میں قرآن وسنت نے کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی، اس کا تعلق خالصۃً تجربے اور مشاہدے سے ہے۔ تجربے اور مشاہدے سے اگر ''اہرام'' کی شکل کے کچھ خواص یا فوائد ثابت ہوجائیں تو ان کو شریعت کے خلاف نہیں کہا جاسکتا، نہ ان خواص کو ظاہری اسباب کے درجے میں تسلیم کرنے سے کسی اسلامی عقیدے میں نقص واقع ہوتا ہے،

بشرطیکہ ان کو ظاہری سبب ہی کے درجے میں رکھا جائے، مؤثرِ حقیقی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کو سمجھا جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۸/۱/۱۴۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۹۱/۵۷)

اجتہاد کی شرائط اور موجودہ دور میں کسی کو مجتہد قرار دینا

سوال:- پندرہ روزہ ''قافلہ'' میں ایک مضمون ''دیوبندی بریلوی اختلاف کا پسِ منظر، اصلاحی تحریک (از صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی)'' نظر سے گزرا۔ کچھ اُمور جو حضرت سیّد احمد بریلویؒ اور ان کے رفقاء کی طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ صحیح اور غلط کا ملغوبہ محسوس ہوتے ہیں، اور ذہنی پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ چونکہ یہ ناچیز دیوبند مسلک، تھانوی مشرب کا حامل ہے، اس لئے ان میں سے چند تحریروں کی نشاندہی کر کے حقیقتِ حال سے نقاب کشائی کا طالب ہے۔ اس مضمون کی یہ پہلی قسط رسالے میں شائع ہوئی ہے، لہٰذا مضمون ابھی جاری ہے، اس لئے مجھے اجازت دی جائے اس سوال اور آپ کے جواب کو بھی پندرہ روزہ ''قافلہ'' میں برائے اشاعت پیش کردوں تاکہ عامۃ المسلمین غلط فہمی سے غلط عقائد کو علمائے حق کی طرف منسوب سمجھ کر اہلِ حق سے مستفید ہونے سے محروم نہ رہیں بفضلہٖ تعالیٰ ان میں سے ایک بات یہ لکھی ہے کہ:-

''اجتہاد'' یہ ایک ایسا حق ہے جو ہر صاحبِ علم و بصیرت مسلمان کو حاصل ہے۔ یہ اجتہاد کسی خاص شخصیت اور خاص زمانے تک محدود نہیں بلکہ تا قیامت جاری رہے گا۔ وہابی تحریک کے ہم نوا اندھی تقلید کے حامیوں پر نکتہ چینی کرتے تھے، اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ وہ ائمہ اربعہ امامِ اعظمؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ کا احترام نہیں کرتے تھے، اور ان کے اجتہاد پر انہیں اعتماد نہیں تھا، کیونکہ اصل وہابی تحریک کے مؤسسِ اوّل شیخ محمد بن عبدالوہاب خود حنبلی مسلک رکھتے تھے اور مقلد تھے۔

جواب:- ''اجتہاد'' کی حقیقت یہ ہے کہ وہ بے شک اس لحاظ سے کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ اس کے بعد کسی زمانے میں پایا جانا عقلاً ناممکن ہو بلکہ وہ ایک ملکہ ہے جس کے پائے جانے کے لئے علم کی کچھ خاص شرائط ہیں، جو اُصولِ فقہ کی کتابوں میں مفصل مذکور ہیں۔ یہ شرائط پہلے زمانوں میں بکثرت پائی جاتی تھیں، اب عام طور سے ان شرائط کا آدمی نہیں ملتا، اس لئے اس دور میں کسی کو مجتہدِ مطلق قرار نہیں دیا گیا، البتہ اجتہاد کی کچھ خاص اقسام مثلاً اجتہاد فی المسائل کے لئے شرائط نسبۃً نرم ہیں اور آخری زمانوں میں اس کے حامل علماء ہوتے ہیں۔ مسئلہ تفصیل طلب ہے، ضرورت ہو تو حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا رسالہ ''الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد'' اور احقر کا

رسالہ ''تقلید کی شرعی حیثیت'' ملاحظہ فرمائیں۔

واللہ اعلم

۱/۱۰/۱۳۹۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۸۱/۳۰ د)

جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے واقعہ کا انکار کرنا

سوال:- مسئلہ مشاجرات میں جو حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان ہوا، جنگِ صفین وجمل میں آپس میں صحابہ کرامؓ مقتول ہوئے۔ زید اس واقعے کی سخت تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' صحابہؓ کی صفت ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ آپس میں قتل وقتال کریں؟ (نعوذ باللہ) یہ صحابہ کرامؓ پر بہتانِ عظیم ہے۔ زید کا یہ انکار دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر جنگِ جمل اور جنگِ صفین کا وقوع صرف کسی ایک تاریخی روایت سے ثابت ہوتا تو زید کا استدلال صحیح ہوتا، لیکن ان جنگوں کا وقوع تواتر سے ثابت ہے۔[1] اس لئے اس کا انکار دُرست نہیں۔ ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ''[2] کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کبھی ایک دُوسرے سے کوئی اختلاف یا رنجش پیدا نہیں ہوتی تھی، لہٰذا اگر اجتہادی اختلافِ رائے کی بناء پر کوئی مشاجرہ پیدا ہو تو اس کے منافی نہیں ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۱/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲۳/۲۸ ج)

بقدرِ ضرورت علمِ دین سیکھنے کے لئے ایک مطالعاتی نصاب کا خاکہ

سوال:- گزارش ہے کہ حضراتِ علمائے کرام سے سنتے رہتے ہیں کہ دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے: ''طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة'' لیکن دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کی تعیین ہم جیسے عامی مسلمانوں کو معلوم نہیں۔

دُوسری بات یہ ہے کہ جس طرح آپ نے دینی مدارس میں پڑھنے والے علمائے کرام کے لئے ایک نصاب مقرّر کر رکھا ہے، اس طرح عام مسلمانوں کے لئے بقدرِ ضرورت دین کا علم سیکھنے کے لئے کوئی نصاب مقرّر نہیں۔ اگرچہ حضراتِ علمائے کرام نے دینِ اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے اُردو زبان میں بہت سی کتابیں اور رسالے تحریر فرمائے ہیں۔

---

(۱) دیکھئے: تاریخ الطبری ج:۳ ص:۵۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت)، الاستیعاب ج:۳ ص:۱۳۷۵ (طبع دار الجیل بیروت)، الإصابة ج:۲ ص:۲۸.

(۲) سورة الفتح:۲۹.

آپ سے درخواست یہ ہے کہ آپ اُردو زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کا ایسا مجموعہ تجویز فرمادیں جو عام مسلمانوں کے لئے علمِ دین سیکھنے کے لئے نصاب کا درجہ رکھتا ہو، اس نصاب کو پڑھ لینے کے بعد آدمی کو دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کا علم حاصل ہوجائے، اور حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محولہ بالا حدیثِ پاک کا منشا بھی پورا ہوجائے، بینوا توجروا۔

جواب:- گرامی نامہ ملا، آپ نے بہت اہم سوال پوچھا ہے۔ بقدرِ ضرورت دین کا علم حاصل کرنا واقعۃً ہر مسلمان پر فرض ہے۔ احقر کی رائے میں اس مطالعے کے دو حصے کرنے چاہئیں۔ پہلا حصہ ابتدائی ضروری معلومات پر مشتمل ہو جن کے بغیر ایک سچے مسلمان کی طرح زندگی گزارنا ممکن نہیں، اور دُوسرا حصہ پہلے حصے کی تکمیل کے بعد ایسے مطالعے پر مشتمل ہو جس سے دینی معلومات میں اتنی وسعت اور استحکام پیدا ہوجائے کہ انسان گمراہ کرنے والوں سے گمراہ نہ ہو، پہلے حصے میں احقر کی نظر میں مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ ضروری ہے:-

۱:- حیاۃ المسلمین از حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۲:- فروع الایمان از حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۳:- تعلیم الدین از حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۴:- مردوں کے لئے ''بہشتی گوہر'' اور عورتوں کے لئے ''بہشتی زیور'' از حکیم الاُمتؒ
۵:- جزاء الاعمال از حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ
۶:- سیرتِ خاتم الانبیاء از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۷:- حکایاتِ صحابہؓ از شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری مدظلہم
۸:- تاریخِ اسلام کامل از حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۹:- اُسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم از حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ

دُوسرے حصے میں مندرجہ ذیل کتب شامل ہونی چاہئیں:-

۱:- معارف القرآن از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
یا تفسیرِ عثمانی از شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
۲:- معارف الحدیث کامل از حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم
۳:- بہشتی زیور کے مسائل از حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
یا علم الفقہ از حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ
۴:- عقائدِ اسلام از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ
۵:- شریعت وطریقت از حکیم الاُمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ان شاء اللہ ان کتابوں کے مطالعے سے دین کی اتنی ضروری معلومات حاصل ہوجائیں گی کہ ان کے بعد اپنی زندگی بھی سنور جائے اور انسان کسی باطل نظریئے سے گمراہ بھی نہ ہو۔ والسلام

آخر جمادی الثانیہ ۱۴۰۲ھ(۱)

کلمۂ طیبہ میں لفظ ''محمد'' پر رفع، اور اذان میں اس پر نصب کی وجہ

سوال:- کلمۂ طیبہ میں لفظ ''محمد'' میں لفظ ''در'' ضمہ کے ساتھ اور اذان میں فتحہ کے ساتھ کیوں ہے؟ دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب:- یہ عربی زبان کے قواعد کی وجہ سے ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۸ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲۳/۱۹ الف)

میڈیکل کالج میں ڈاکٹری کی مخلوط تعلیم اور پوشیدہ انسانی اعضاء کے معائنے سے متعلق متعدّد مسائل

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ دینِ متین مندرجہ ذیل مسائل کی بابت:-

(برائے مہربانی جواب لکھنے سے پہلے ایک بار تمام مسائل پڑھ لئے جائیں تاکہ تمام نکات سامنے آجائیں، اس کے بعد فرداً فرداً جواب تحریر فرمائیں، خصوصاً مندرجہ ذیل پیرا پڑھ لیں)

ہم میڈیکل کالج میں پڑھتے ہیں، ہماری تعلیم مکمل ہونے میں تقریباً ایک سال باقی ہے، مندرجہ ذیل تمام مسائل پڑھ لیں اور بعد از مکمل تحقیق، مفصل و مدلل جواب تحریر فرمائیں، ہر ایک کے لئے لکھیں کہ ۱:- جواز کی آخری حد کیا ہے؟ ۲:- جواز کی آخری حد کن شرائط پر ہے؟ ۳:- افضل کیا ہے؟ جزاک اللہ۔ پہلے یہ پڑھ لیں: یہاں میڈیکل کالج میں جتنے بھی داڑھی والے طلباء ہیں ان کو مولوی کہا جاتا ہے، تمام ''مولویوں'' کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ انتہائی درجے کے نالائق ہوتے ہیں، اور ہمیں طعنے سننے پڑتے ہیں، اگر کبھی کوئی ''مولوی'' کسی سوال کا جواب دیدے تو اُستاد صاحب فرماتے ہیں: ''آج تو کمال ہی ہوگیا، کوئی معجزہ ہوگیا کہ مولوی صاحب نے جواب دے دیا۔'' اساتذہ اور دوست وغیرہ اکثر ہمیں ان الفاظ سے سمجھاتے ہیں: ''مولویوں کو زیادہ پڑھنا چاہئے کیونکہ اسی میں دین

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ رجب المرجب ۱۴۰۲ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

کی عزّت ہے، نہ پڑھ کر مولوی دین کو بدنام کرتے ہیں، اور تمام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو دین پر چلتا ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا، لہٰذا تمہاری وجہ سے دین بدنام ہو رہا ہے۔'' ہم مولوی قطعاً نالائق نہیں ہیں بلکہ شرعی مجبوریوں کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ کی طرف کم سے کم توجہ دیتے ہیں، لوگ اور اساتذہ ہمیں طعنے دیتے ہیں کہ: ''نہ تم کسی پارٹی وغیرہ میں آتے ہو، نہ تم پڑھتے ہو، آخر تم لوگ کرتے کیا ہو؟'' ایک طرف دین کا حکم بھی ہے کہ اپنے آپ سے لوگوں کو غلط فہمی نہ ہونے دو، نیز دین کی اور اپنی عزّت کا خیال رکھو، بعض اوقات تو اساتذہ ایسی بات بھی کہہ دیتے ہیں جو صریح کفر ہوتی ہے۔

اب تک چار سال گزر چکے ہیں اور ہمیں کچھ بھی نہیں آتا، جس طرح ہم یہاں آنے سے پہلے کورے تھے، ویسے ہی اب بھی کورے ہیں، یقیناً کچھ نہیں آتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ شرعی مجبوریوں وغیرہ کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ پر توجہ نہیں دیتے۔

یہ بات بھی ہمارے سامنے کی ہے کہ ہم سے بڑے مولوی یعنی وہ مولوی صاحبان جو ہم سے پہلے یہاں سے تعلیم مکمل کر کے فارغ ہوئے ہیں، کوئی ان کے پاس جانا پسند نہیں کرتا، نہ ان کا کلینک چلتا ہے، وجہ وہی کہ انہوں نے معائنہ وغیرہ میں تجربہ حاصل نہیں کیا، لہٰذا ان کی تشخیص صحیح نہیں ہوتی، مریض کا حق ادا نہ کرنے کا گناہ علیحدہ ہے، اور یہ حدیث علیحدہ ہے کہ نااہل قاضی اور نااہل طبیب کا ٹھکانا جہنم کے سوا کچھ نہیں۔

وجہ یہی ہے کہ انہوں نے مریضوں پر پڑھا نہیں، اپنے ہاتھ سے کر کے نہیں دیکھا، معائنہ کر کے نہیں دیکھا، ان تمام باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

میڈیکل کالج میں مخلوط نظامِ تعلیم ہے، لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں، پڑھانے والے اکثر مرد ہیں، بعض اوقات خواتین اساتذہ بھی پڑھانے آجاتی ہیں اور بے پردہ ہوتی ہیں، ہماری معلومات کے مطابق پورے پاکستان میں مردوں کے لئے علیحدہ کوئی میڈیکل کالج نہیں ہے، لاہور میں لڑکیوں کے لئے فاطمہ جناح کالج ہے، جہاں مخلوط نظامِ تعلیم نہیں ہے، مگر وہاں اساتذہ میں خواتین کے ساتھ مرد بھی شامل ہوتے ہیں، بہرحال ہمارے میڈیکل کالج میں مکمل بے پردگی ہے، بعض لڑکیاں ایسے کپڑے پہنتی ہیں کہ حدیث کے مطابق کپڑے پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں، اور کپڑوں کے اندر جلد کا رنگ صاف نظر آتا ہے، اگر کپڑا باریک نہ ہو تو بھی بعض لڑکیاں تنگ لباس پہنتی ہیں جس سے جسم کے اُبھار واضح ہو جاتے ہیں، تمام لڑکیاں ایسی نہیں ہیں، بعض لڑکیاں چادر سے چہرہ ڈھانپے رکھتی ہیں مگر آنکھیں اور آس پاس کی جلد نظر آتی ہے، لڑکے اکثر تنگ پتلون پہنتے ہیں، جس سے ان کے سرین واضح رہتے ہیں، جو لڑکے شلوار قمیص استعمال کرتے ہیں ان میں سے بھی بعض کالر اور کف استعمال کرتے ہیں، ۹۹ فیصد لڑکوں کے ٹخنے

ڈھکے ہوتے ہیں، جبکہ لڑکیوں میں سے اکثر کے ٹخنے ننگے ہوتے ہیں، لڑکیوں کی آواز بھی سنائی دیتی ہے، بعض لڑکے لڑکیاں آپس میں کھلم کھلا باتیں کرتے ہیں، ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ اساتذہ، خواتین ہوں یا مرد، وہ بھی ہنسی مذاق کرتے ہیں، یہاں مردوں کی کوئی تمیز نہیں، خصوصاً بعض اساتذہ تو یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لئے کوئی لڑکا یا لڑکی نہیں ہے، ہمارے لئے سب طالبِ علم ہیں اور بس۔

خواتین اساتذہ کی آواز بھی سننی پڑتی ہے، مکمل طور پر احتیاط کے باوجود بھی غیر محرَم کے چہرے پر نظر پڑ جاتی ہے، ورنہ کم از کم ان کی آواز تو مکمل طور پر سنائی دیتی ہے۔ یہ تمام تفصیل بتانے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں مکمل بے دینی اور بُرائی کا ماحول ہے، آپ جانتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی جگہ جانے سے پہلے معلوم ہو کہ وہاں گناہ کا کام ہوگا تو وہاں جانا حرام ہے، اور اگر وہاں جا کر پتہ چلے تو اُٹھ آنا واجب ہے، نیز گناہ کی طرف چل کر جانا بھی گناہ ہے، جو کام حرام میں ابتلاء کا سبب بنے وہ بھی حرام ہے اور اُوپر کی تفصیل میں تقریباً سب کے سب کبیرہ گناہ ہیں، اس تمام تفصیل کو ملحوظ رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

مسئلہ نمبر ۱

۱/۱:- اس نظامِ تعلیم میں علم حاصل کرنا عورتوں کے لئے کیسا ہے؟

۱/۲:- اس نظامِ تعلیم میں علم حاصل کرنا مردوں کے لئے کیسا ہے؟

۱/۳:- لاہور کے فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں عورتوں کا علم حاصل کرنا کیسا ہے؟ (وہاں اساتذہ مرد و خواتین دونوں ہوتے ہیں، مگر پڑھنے والی صرف لڑکیاں ہوتی ہیں)۔

۱/۴:- اگر یہ نظامِ تعلیم صحیح نہیں تو کیا مرد و عورت کسی کے لئے علم حاصل کرنا جائز نہیں ہے؟

۱/۵:- حکومت کا کام ہے کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ کالج بنائے اور وہ اس کے تمام اختیارات اور سہولیات رکھتی ہے، مگر جب تک حکومت یہ کام نہ کرے تو کیا اس وقت تک کوئی جواز نہیں کہ ہم لوگ علم حاصل کرسکیں؟ آپ جانتے ہیں کہ باقی علومِ دُنیا کے مقابلے میں علمِ طب افضل ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں، اگر ہم علم حاصل نہیں کرتے تو مردوں اور عورتوں کا علاج کون کرے گا؟ آخر اس صورت میں کوئی نہ کوئی متبادل صورت تو ہوگی؟

۱/۶:- خواتین اساتذہ پڑھانے کے لئے آئیں تو مردوں کے لئے کیا حکم ہے؟

۱/۷:- مرد اساتذہ پڑھانے کے لئے آئیں تو عورتوں کے لئے کیا حکم ہے؟

مسئلہ نمبر ۲

ہمارے ہاں جتنی کتب پڑھنے کا کہا جاتا ہے تمام کی تمام دُوسرے ممالک کی ہوتی ہیں، ان

کتب میں انسانی تصاویر کثرت سے ہوتی ہیں اور اکثر تصاویر عریاں ہوتی ہیں، عریاں صرف وہ حصہ نہیں ہوتا جو دِکھانا مقصود ہے بلکہ پورے پورے انسان کی ننگی تصاویر ہوتی ہیں اور اس میں مردوں کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا، ان کے بارے میں قاعدہ تو یہ ہوا کہ ''بوقت بقدرِ ضرورت'' دیکھنا جائز ہے، یعنی جب تصویر کے بغیر سمجھنے کی کوئی صورت نہ ہو تو صرف وہی تصویر دیکھ لے اور صرف اتنی ہی دیکھے جتنا ضروری ہے، مگر اس بات کا فیصلہ کون کرے کہ بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت دیکھ رہا ہے یا نہیں؟ ہم یہاں پر جوان ہیں بلکہ جوانی کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں، اس صورت میں بوقتِ ضرورت کا تعین اور بھی زیادہ مشکل ہے، اگر تصویر دیکھنے کی بجائے صرف پڑھنے کی غرض سے کتاب کھولی تو بھی تصاویر پر نظر پڑتی ہی ہے، ننگی تصاویر دیکھ کر شہوت آمیز خیالات بھی آتے ہیں، بعض مضامین کتاب میں ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو پڑھنے سے شہوت آتی ہے، اگرچہ یہ علم حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے لیکن پوچھنا یہ ہے کہ ایسے مضامین یا ایسی کتاب کا پڑھنا، پڑھانا، سیکھنا، دیکھنا اور دُوسرے دوستوں کی غرض سے دِکھانا وغیرہ جائز ہے یا نہیں؟ اس میں بھی لکھ دیں کہ افضل کیا ہے؟ جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور جواز کی آخری حد کن شرائط پر ہے؟

میڈیکل کالج میں پڑھائی کے پانچ سال ہوتے ہیں، سالِ اوّل و دوم میں مردہ انسانی جسم کی چیر پھاڑ کروائی جاتی ہے، اس کا متبادل تو موجود ہے کہ پلاسٹک کے بنے اعضاء سے سیکھا جائے، سالِ سوم سے سالِ پنجم تک ہمیں ہسپتال اور وارڈوں میں بھیجا جاتا ہے، خصوصاً سالِ پنجم میں تو رات کو بھی جانا پڑتا ہے، وہاں پر ہمیں مریضوں پر پڑھایا جاتا ہے، پڑھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اُستاد ایک مریض کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ اس سے پوچھو کہ اسے کیا تکلیف ہے؟ اور اس کے بعد اس کا معائنہ کرو، نظامِ تعلیم مخلوط ہے، لہٰذا لڑکے، لڑکیاں اکٹھے ہوتے ہیں، جب طالبِ علم اپنا کام پورا کر لیتے ہیں تو اُستاد صاحب تشریف لاتے ہیں طلباء و طالبات میں سے کوئی ایک تفصیل کے ساتھ مریض کی تکلیف اور معائنے کے بارے میں بتادیتا ہے، اُستاد صاحب اس میں سے غلطیاں نکالتے ہیں، سمجھاتے ہیں، وغیرہ۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ ہر بیماری مرد و عورت دونوں میں نہیں ہوتی، بعض بیماریاں صرف مردوں، اور بعض بیماریاں صرف عورتوں میں پائی جاتی ہیں، نیز کوئی جانور ایسا نہیں جو مکمل طور پر انسان کے مشابہ ہو، نیز معائنے کے دوران مختلف پٹھوں کی حرکت، دِل کی دھڑکن کی مختلف آوازیں، مختلف بیماریوں میں سانس کی مختلف آوازیں وغیرہ صرف انسان کے جسم میں دیکھی جاسکتی ہیں نہ کہ پلاسٹک کے اعضاء میں، اگرچہ بعض چیزیں کمپیوٹر پر ایسی آگئی ہیں کہ ان پر آواز سنی جاسکتی ہے، مگر ہر چیز پاکستان میں نہیں ملتی اور ہر طالبِ علم کمپیوٹر بھی نہیں خرید سکتا، نیز میڈیکل کالج میں بھی یہ سہولت نہیں

ہے۔ سب سے پہلے مریض سے اجازت لی جاتی ہے، اگر مریض (مرد وعورت) اجازت نہ دے تو اس کا معائنہ وغیرہ طالبِ علم کو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

معائنہ کرنے کے چار حصے ہوتے ہیں، ۱:- دیکھنا، ۲:- ہاتھوں سے دبا کر ٹٹول کر چیک کرنا، ۳:- اُنگلی سے ٹھونک کر دیکھنا، ۴:- کانوں کے آلے (Stethoscope) سے اس حصے کی آواز سننا۔

۱:- دیکھنا

اس کے لئے ضروری ہے کہ جو حصہ دیکھنا ہو وہ حصہ اور اس کے آس پاس کا کافی حصہ ننگا کیا جائے، مثلاً قاعدہ یہ ہے کہ اگر سینہ دیکھنا ہو تو کم از کم ناف تک قمیص اُتروالی جائے، اور اگر پیٹ دیکھنا ہے تو سینے سے لے کر گھٹنوں تک بشمول شرم گاہ ننگا کیا جائے، اگرچہ کتب کے مطابق صحیح طریقہ یہی ہے، مگر پاکستان میں شرم گاہ سب کے سامنے نہیں کھولی جاتی بلکہ علیحدہ کمرے میں پردے کے ساتھ کھولی جاتی ہے، اس میں مرد کی شرم گاہ کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا، البتہ عورت کی شرم گاہ کو عورت ہی کھولتی اور دیکھتی ہے، مردوں کو اجازت نہیں، بہرحال مریض مرد ہو یا عورت یہ کرنا پڑتا ہے، مرد میں تو خاص شرم گاہ کے حصے کے علاوہ باقی جسم کو ننگا کرنا بشمول ران گھٹنوں وغیرہ کے کچھ بُرا نہیں سمجھا جاتا، عورت مریض کی صورت میں دوپٹہ اُتروالیا جاتا ہے اور پیٹ کمر وغیرہ سے قمیص بھی ہٹالی جاتی ہے، عام طور پر اس سے زیادہ نہیں کیا جاتا۔

۲:- دبا کر، ہاتھ لگا کر دیکھنا

اس میں مریض کو جس حصے کی تکلیف ہو اس کو ہاتھ لگا کر اور دبا کر دیکھا جاتا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ اس کی جلد اور جلد کے نیچے دُوسرے اعضاء اور پٹھے عام صحت مند آدمی کی طرح ہیں یا سخت ہیں یا نرم ہیں یا یہ کہ ہاتھ لگانے سے مریض کو درد ہوتا ہے یا نہیں، وغیرہ۔ یہاں بھی مرد وعورت (مریض ہو یا طالبِ علم) کی کوئی تخصیص نہیں۔

۳:- ٹھونک کر دیکھنا

اس میں ہاتھ اور اُنگلی کی مدد سے مریض کے جسم کے مختلف حصوں خصوصاً سینہ اور پیٹ کو ٹھونک کر دیکھتے ہیں، اور آواز کا موازنہ عام صحت مند انسان سے کیا جاتا ہے۔

۴:- کانوں والے آلے سے سننا

اس میں اگرچہ عموماً مریض کو ہاتھ نہیں لگتا، مگر جس جگہ آلہ لگایا جاتا ہے وہاں سے اکثر کپڑا ہٹالیا جاتا ہے۔

آپریشن تھیٹر

شعبۂ جراحت کی پڑھائی کے دوران طلباء و طالبات کو عملِ جراحی (آپریشن) دِکھایا جاتا ہے، اس میں طالبِ علم کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی، مگر اسے دِکھایا جاتا ہے، یہاں پر بھی اُستاد، شاگرد اور مریض میں مرد وعورت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔

آؤٹ ڈور O.P.D

اس میں مریضوں کا معائنہ اُستاد کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس میں فلاں بیماری کی فلاں فلاں علامتیں ظاہر ہیں، چنانچہ طلباء و طالبات بیماری کی وہ علامتیں اس میں فرداً فرداً دیکھتے ہیں اور معائنہ کرتے ہیں۔

تمام میڈیکل کالجوں میں یہی طریقۂ تعلیم ہے اور اسی کا امتحان لیا جاتا ہے، اس تمام تفصیل کے بعد جواب طلب اُمور مندرجہ ذیل ہیں، اس میں لکھ دیں کہ افضل کیا ہے؟ جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور جواز کی حد کن شرائط کے ساتھ ہے؟ یاد رہے کہ سب سے پہلے مریض سے اجازت لی جاتی ہے، اگر مریض (مرد وعورت) اجازت نہ دے تو اس کا معائنہ وغیرہ طالبِ علم کو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر ۳

۳/۱:- مرد طالبِ علم کو مریض (مرد وعورت) سے بات کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۲:- عورت طالبِ علم کو مریض (مرد وعورت) سے بات کرنے کا حکم کیا ہے؟

۳/۳:- مرد طالبِ علم کو مریض (مرد وعورت) کا معائنہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۴:- عورت طالبِ علم کو مریض (مرد وعورت) کا معائنہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

۳/۵:- اگر جواز نہیں تو اُستاد کے کہنے یا حکم کرنے کے بعد جواز کا کیا حکم ہے؟ جبکہ یہ فتنے کا دور ہے، اور طالبِ علم کے انکار پر اسے سالانہ امتحان میں فیل بھی کیا جاسکتا ہے۔

۳/۶:- آپ جانتے ہیں کہ عملِ جراحی مہارت کا کام ہے، اور مہارت ہاتھ سے کام کرنے سے آتی ہے، کالج میں عموماً ہاتھ سے کام تو نہیں کرنے دیا جاتا مگر عملِ جراحی دِکھایا جاتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

۳/۷:- اگر ہر طرف سے بچ جائے تو دورانِ امتحان تو ہر طالبِ علم کا علیحدہ علیحدہ امتحان لیا جاتا ہے، پس دورانِ امتحان کیا حکم ہے؟ (افضل اور جواز مع شرائط)۔

۸/۳:- دورانِ تعلیم مرد وعورت طلباء و طالبات کو کہا جاتا ہے کہ مریض یا مریضہ کے مقعد یا اندامِ نہانی وغیرہ میں ہاتھ اور اُنگلیاں وغیرہ ڈال کر دیکھیں، اس کا حجم وغیرہ دیکھیں، اندر سے دبا کر دیکھیں، وغیرہ، ایسا کرنا کیسا ہے؟ (مریض اور طالبِ علم مرد یا عورت میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے) اگر جواز نہیں تو اُستاد کے کہنے یا حکم کرنے کے بعد جواز کا کیا حکم ہے؟ جبکہ یہ فتنے کا دور ہے، اور طالبِ علم کے انکار پر اسے سالانہ امتحان میں فیل بھی کیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ نمبر ۴

شعبۂ حادثات یعنی ایمرجنسی وارڈ میں عموماً مریض آتے ہیں جن کی حالت نازک ہوتی ہے، لہٰذا وہاں بعض اوقات ایک ایک مریض پر دو دو، تین تین ڈاکٹر لگے ہوتے ہیں، بعض اوقات ڈاکٹر کم ہوں یا مریض زیادہ ہوں تو طالبِ علم کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ مریضوں کی جان بچانے کی کوشش کی جاسکے، اس حالت میں بوتل بھی لگائی جاتی ہے، بوتل لگانے کے لئے عام طور پر مریض کے بازو کی خون کی وریدپر سوئی لگائی جاتی ہے، اگر وہاں نہ ملے تو جسم کے دُوسرے حصوں پر وریدتلاش کی جاتی ہے، بعض اوقات سارے جسم میں کہیں نہیں ملتی اور جاکر شرم گاہ کے ساتھ ران پر ملتی ہے، مریض، ڈاکٹر اور طالبِ علم، مرد وعورت میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے، یہاں پر اگر مریض کی حالت زیادہ نازک ہوتو پردہ کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ اس کی جان بچانے کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے، ایسی حالت میں ڈاکٹر اور طالبِ علم (مرد وعورت) کے لئے کیا حکم ہے؟ بعد جواز مع شرائط اور افضل کیا ہے؟ لکھ دیں۔

مسئلہ نمبر ۵

کالج میں تعلیم کے دوران تمام طلباء و طالبات کے لئے ضروری ہے کہ کالج وہسپتال میں کل حاضری میں سے ۷۵ فیصد حاضری کا ہونا اور ۷۵ فیصد اسباق اُستاد سے پڑھنا ضروری ہے، ورنہ اسے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی، بعض اوقات سال ضائع ہونے کا احتمال بھی ہوتا ہے، لہٰذا ۷۵ فیصد حاضری کے لئے کالج اور ہسپتال میں جانا مجبوراً ضروری ہے، اس سے زیادہ جانا یا نہ جانا اپنے اختیار میں ہے، اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بتائیں کہ:-

۱/۵:- ایسی حالت میں کیا یہ ضروری ہے کہ ۷۵ فیصد کے بعد طالبِ علم کالج نہ جائیں، اس سلسلے میں لکھا نہیں کہ افضل کیا ہے؟ اگر جواز ہے تو کیا ہے؟ اور کن شرائط پر ہے؟

۲/۵:- کالج میں زیادہ تر لوگ صرف اس لئے جاتے ہیں کہ ۷۵ فیصد حاضری ضروری ہے،

اگر یہ ضروری نہ ہوتو اکثر لوگ نہ جائیں، بعض اوقات اگر پڑھنے کا دِل نہ کرے یا سبق سمجھ میں نہ آئے یا خاتون اُستاد آجائے تو بعض طالبِ علم دینی کتب، مواعظ اور بعض ناول وغیرہ دورانِ سبق پڑھتے رہتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ صحیح ہے؟

۳/۵:- یہاں کالج میں ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت بھی ہے، جن کے نزدیک داڑھی اتنی رکھنا کافی ہے کہ دُور سے نظر آئے، کچھ لڑکے ان کے اثر سے، اور کچھ فیشن کے طور پر چھوٹی سی داڑھی رکھ لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں واجب پورا ہوگیا، جب ہم انہیں کہتے ہیں کہ داڑھی پوری رکھوتو وہ کہتے ہیں کہ کیا وہ داڑھی نہیں ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح نہیں تو کیا ہم نے داڑھی جتنی رکھی ہے کٹوادیں؟ ہم انہیں کیا جواب دیں؟ ایک مولانا صاحب نے فرمایا تھا کہ: انہیں بے شک کہہ دو کہ اس داڑھی کا کوئی فائدہ نہیں لہٰذا بے شک کٹوادیں۔ بتائیں کہ ہم انہیں کیا جواب دیں؟ (ان کا پوری داڑھی رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں اور وہ اسی کو سنت، واجب سمجھتے ہیں)۔

۴/۵:- طلباء کا کالج جانے کو دِل نہیں کرتا، نیز اس کے لئے صبح صبح اُٹھنا پڑتا ہے، لہٰذا بعض طلباء دُوسروں کو کہہ دیتے ہیں کہ ہم نہیں جاتے مگر ہماری حاضری لگوادینا، کیا یہ جائز ہے کہ طالبِ علم نہ جائے اور کوئی دُوسرا اس کی حاضری لگادے؟ بعض اساتذہ اجازت دیتے ہیں، مگر اکثر ناراض ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر ۶

یہاں میڈیکل کالج میں جتنے بھی داڑھی والے طلباء ہیں ان کو ''مولوی'' کہا جاتا ہے، تمام ''مولویوں'' کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ انتہائی درجے کے نالائق ہوتے ہیں، اور ہمیں طعنے سننے پڑتے ہیں، اگر کبھی کوئی ''مولوی'' کسی سوال کا جواب دیدے تو اُستاد صاحب فرماتے ہیں: ''آج تو کمال ہی ہوگیا، کوئی معجزہ ہوگیا کہ مولوی صاحب نے جواب دے دیا۔'' اساتذہ اور دوست وغیرہ اکثر ہمیں ان الفاظ سے سمجھاتے ہیں: ''مولویوں کو زیادہ پڑھنا چاہئے کیونکہ اسی میں دین کی عزّت ہے، نہ پڑھ کر مولوی دین کو بدنام کرواتے ہیں، اور تمام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو دین پر چلتا ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا، لہٰذا تمہاری وجہ سے دین بدنام ہورہا ہے۔'' ہم مولوی قطعاً نالائق نہیں ہیں بلکہ شرعی مجبوریوں کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ کی طرف کم سے کم توجہ دیتے ہیں، لوگ اور اساتذہ ہمیں طعنے دیتے ہیں ''نہ تم کسی پارٹی وغیرہ میں آتے ہو، نہ تم پڑھتے ہو، آخر تم لوگ کرتے کیا ہو؟'' ایک طرف دین کا حکم بھی ہے کہ اپنے آپ سے لوگوں کو غلط فہمی نہ ہونے دو، نیز دین کی اور اپنی عزّت کا خیال رکھو، بعض اوقات تو اساتذہ ایسی بات بھی کہہ دیتے ہیں جو صریح کفر ہوتی ہے۔

اب تک چار سال گزر چکے ہیں اور ہمیں کچھ بھی نہیں آتا، جس طرح ہم یہاں آنے سے پہلے کورے تھے، ویسے ہی اب بھی کورے ہیں، یقیناً کچھ نہیں آتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ شرعی مجبوریوں وغیرہ کی وجہ سے پڑھائی اور معائنہ وغیرہ پر توجہ نہیں دیتے۔

یہ بات بھی ہمارے سامنے ہے کہ ہم سے بڑے مولوی یعنی وہ مولوی صاحبان جو ہم سے پہلے یہاں سے تعلیم مکمل کر کے فارغ ہوئے ہیں، کوئی ان کے پاس جانا پسند نہیں کرتا، نہ ان کا کلینک چلتا ہے، وجہ وہی کہ انہوں نے معائنہ وغیرہ میں تجربہ حاصل نہیں کیا، لہٰذا ان کی تشخیص صحیح نہیں ہوتی، مریض کا حق ادا نہ کرنے کا گناہ علیحدہ ہے، اور یہ حدیث علیحدہ ہے کہ نااہل قاضی اور نااہل طبیب کا ٹھکانا جہنم کے سوا کچھ نہیں۔ وجہ یہی ہے کہ انہوں نے مریضوں پر پڑھا نہیں، اپنے ہاتھ سے کر کے نہیں دیکھا، معائنہ کر کے نہیں دیکھا، ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مسائل کا جواب عنایت فرمائیں۔

۶/۱:- اس پیرے کی روشنی میں دین دار طلباء و طالبات کے لئے جواز کی آخری حد کیا ہے؟ اور کن شرائط سے ہے؟ نیز یہ بھی بتادیں کہ افضل کیا ہے؟ کیا ہمارے لئے کوئی جواز نہیں کہ ہم علم حاصل کرسکیں؟ کیا ہم پڑھائی چھوڑ دیں؟ اگر ہم پڑھائیں چھوڑ دیں گے تو ہمارے ماں باپ، دوست، رشتہ دار سخت باتیں کہیں گے، آپ جانتے ہیں کہ آج کل لوگوں کے ایمان کتنے کمزور ہیں، ہمیں یقین ہے کہ ہمارے کالج چھوڑنے پر بہت سے اپنے پرائے ایسی باتیں کریں گے کہ کافر ہوجائیں گے۔

۶/۲:- کیا ہم طلباء جو یہاں پڑھ رہے ہیں، ہم سب گناہِ کبیرہ کے مرتکب اور فاسق ہیں یا نہیں؟

مسئلہ نمبر ۷

ہمارے کالج، ہسپتال اور دارالاقامہ کے قریب کم وبیش چھ مساجد ہیں، ہمارے کالج میں ایک ڈاکٹر صاحب پڑھاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب شکل وصورت، لباس کے لحاظ سے ماشاء اللہ دین دار ہیں، ماشاء اللہ تعالیٰ حافظِ قرآن بھی ہیں، آواز بھی اچھی ہے، مگر مخلوط تعلیم میں پڑھاتے ہیں، حالانکہ ڈاکٹر ہیں، اپنا کلینک بھی کھول سکتے ہیں، یہ صاحب ہسپتال کی لیبارٹری میں کام بھی کرتے ہیں، غالباً اپنی ذاتی لیبارٹری بھی ہے، ان اُمور کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل فرمائیں کہ:-

۷/۱:- کیا مخلوط تعلیم میں پڑھانے کی وجہ سے یہ صاحب فاسق ہیں یا نہیں؟

۷/۲:- ان کی امامت میں فرض نماز کا کیا حکم ہے؟

۷/۳:- ان کی امامت میں تراویح کی نماز کا کیا حکم ہے جبکہ قریب میں اور مساجد بھی ہیں؟

۷/۴:- اگر قریب اور مسجد نہ ہو تو ان کی امامت میں فرض وتراویح کا کیا حکم ہے؟ افضل اور

حدِ جواز اگر ہو تو مع شرائط بیان فرمادیں۔

برائے مہربانی مکمل تحقیق کے بعد جواب عنایت فرمائیں۔ جزاک اللہ

واللہ تعالیٰ ھو الموفق وھو المستعان ولا حول ولا قوۃ الا بہ

سیّد فاتح عظمت اللہ، فرحان شہزاد،
محمد عمران، محمد ہارون محمود،
کمرہ نمبر ۲۹ جوہر ہال
(طلبہ قائداعظم میڈیکل کالج بہاولپور
۲۳ رصفر ۱۴۲۳ ہجری)

جواب:-

مسئلہ نمبر ۱

شریعت کا اصل حکم تو یہ ہے کہ نامحرم مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے پرہیز کیا جائے، خاص طور پر ایسا مستقل مشغلہ اختیار کرنا، جس میں نامحرم خواتین کے ساتھ مستقل میل جول ہو، بغیر ضرورت کے جائز نہیں، لہٰذا حکومت اور مسلم معاشرے کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ مخلوط تعلیم کی بجائے لڑکوں کے لئے الگ اور لڑکیوں کے لئے الگ تعلیمی ادارے قائم کریں، لیکن جب تک ایسا انتظام نہ ہو تو چونکہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنا ایک ضرورت ہے اور اس میدان میں متدین افراد کی کمی ہے جسے دُور کرنے کا یہی راستہ ہے کہ متدین افراد میڈیکل کی تعلیم حاصل کریں،(۱) اس لئے اگر اس تعلیم کے حصول کا وہ راستہ نہ ہو جو اُوپر بیان کیا گیا تو اس شرط کے ساتھ تعلیم کے حصول کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ حتی الامکان اپنے آپ کو بے پردہ نامحرم خواتین سے دُور رکھیں اور جہاں کہیں ایسی خواتین کا سامنا ہو وہاں نگاہ نیچی رکھیں، اور اپنی نگاہ اور دِل کی حفاظت کریں۔

خواتین کے لئے بھی میڈیکل تعلیم کا حصول اس شرط کے ساتھ جائز ہے(۲) کہ وہ پردہ کا مکمل اہتمام کریں اور مردوں کے قریب نہ بیٹھیں، عورتوں کے لئے تعلیم کی غرض سے مردوں کو دیکھنے کی گنجائش ہے، مگر یہ گنجائش ضرورت کی حد تک ہی محدود رہنی چاہئے۔(۳)

مسئلہ نمبر ۲

جب کتاب کا اصل مقصود تعلیم ہے اور اس میں تصویریں ضمنی طور پر آئی ہیں تو ایسی کتاب کو اس شرط کے ساتھ رکھنا اور پڑھنا جائز ہے کہ تصویروں کے جن حصوں کی، تعلیم کے لئے ضرورت نہ ہو ان کو

(۱ تا ۳) وفی مقدمة ردّ المحتار ج: ۱ ص: ۴۲ (طبع سعید) قال فی تبیین المحارم واما فرض الکفایة من العلم فھو کل علم لا یستغنی عنه فی قوام أمور الدنیا کالطبّ والحساب .... الخ. نیز دیکھئے ص: ۱۴۳ کا فتویٰ اور ص: ۱۴۴ پر اس کا حاشیہ نمبر ۱۔

یا تو مٹادیا جائے یا کسی کاغذ وغیرہ سے چھپادیا جائے، خاص طور پر ایسی تصویر جو شہوت کو برانگیختہ کرے اس کو اس طرح تبدیل کردیا جائے کہ صرف وہ حصہ باقی رہے جو تعلیم کی غرض سے ضروری ہے، ضرورت کا تعین اس موضوع سے کیا جاسکتا ہے جس موضوع کی اس تصویر کے ذریعے تعلیم دی جارہی ہے۔

مسئلہ نمبر۳

۱،۲، ۵، ۶، ۷:- ان تمام کاموں میں جو کام طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں، ان کو بقدرِ ضرورت انجام دینے کی گنجائش ہے، لیکن ہر کام میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ مریض کے ستر کا اتنا ہی حصہ کھلے جتنا معائنے کے لئے ضروری ہے، اگر عملے کا کوئی فرد اس میں بے احتیاطی کرے تو اسے تاکید کی جائے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ کھولے۔[۱]

مسئلہ نمبر۴

جب جان بچانے کے لئے بوتل یا انجکشن لگانا ضروری ہو اور جسم کے ظاہری حصوں پر رَگ نہ ملے تو ستر والے حصے میں رَگ تلاش کرنے کی گنجائش ہے، اس میں ڈاکٹر اور طالبِ علم کے درمیان کوئی فرق نہیں، تاہم اس میں یہ بھی ضروری ہے کہ حتی الامکان مرد مریضوں کے ساتھ یہ عمل مرد ڈاکٹر یا طلباء کریں، اور خواتین کے ساتھ یہ عمل لیڈی ڈاکٹر یا طالبات کریں۔[۲]

مسئلہ نمبر۵

۱،۲:- ۷۵ فیصد، حاضری کی کم سے کم مقدار ہے، ورنہ تعلیم کی تکمیل کے لئے سو فیصد حاضری ضروری ہے، لہٰذا ۷۵ فیصد کے بعد بھی حاضری کا اہتمام کرنا چاہئے اور حاضر ہوکر تعلیم ہی پر متوجہ رہنا چاہئے، تاہم حتی الامکان ان احتیاطوں کو ملحوظ رکھا جائے جو اُوپر بیان کی گئیں۔

۳:- داڑھی کی شرعی مقدار ایک قبضہ ہے، داڑھی کا ایک قبضہ سے نیچے کٹوانا جائز نہیں،[۳] جن لوگوں نے داڑھی ایک قبضہ سے کم رکھی ہوئی ہے، وہ اگر یہ کہیں کہ جتنی رکھی ہوئی ہے کیا وہ ہم کٹوادیں؟

(۱،۲) وفی الدر المختار ج:۶ ص:۳۷۰ (طبع سعید) ینظر الطبیب الی موضع مرضها بقدر الضرورة اذ الضرورات تتقدر بقدرها وکذا نظر قابلة وختان وینبغی أن یعلّم امرأة تداویها لأن نظر الجنس الی الجنس أخف. وفی الشامیة تحته فی الجوهرة اذا کان المرض فی سائر بدنها غیر الفرج یجوز النظر الیه عند الدواء لأنه موضع ضرورة وان کان فی موضع الفرج فینبغی أن یعلم امرأة تداویها فان لم توجد وخافوا علیها أن تهلک أو یصیبها وجع لا تحتمله یستروا منها کل شئ الا موضع العلة ثم یدوایها الرجل ویغض بصره ما استطاع الا عن موضع الجرح.

(۳) وفی الدر المختار کتاب الحظر والاباحة فصل فی البیع ج:۶ ص:۴۰۷ (طبع سعید) والسنة فیها القبضة .... ولذا یحرم علی الرجل قطع لحیته .... الخ. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۲۸۰ (طبع رشیدیه کوئٹه) واما الأخذ منها وهی دون ذلک کما یفعل بعض المغاربة والمخنثة من الرجال فلم یبحه أحد .... الخ.

تو جواب یہ نہیں ہے کہ ''ہاں کٹوادیں!'' بلکہ جواب یہ ہے کہ داڑھی پوری رکھیں، اور یہ بات دُرست ہے کہ داڑھی کم رکھنا بالکل منڈوانے سے بہتر ہے۔

۴:- دُوسرے طالبِ علم کی حاضری لگوانا دھوکا ہے اور بالکل ناجائز ہے۔

مسئلہ نمبر ۶

اس سوال میں آپ نے جو باتیں لکھی ہیں، اکثر و بیشتر مبالغہ پر مبنی ہیں، اگر واقعۃً آپ تعلیم میں کورے ہیں تو اس کی وجہ دین دار ہونا نہیں، بلکہ تعلیم کی طرف توجہ نہ دینا ہے، اور یہ بھی غلط ہے کہ جو دین دار لوگ میڈیکل تعلیم حاصل کر کے فارغ ہو چکے ہیں ان کا کلینک نہیں چلتا، ملک کے ہر خطے میں ایسے متدین ڈاکٹروں کی کمی نہیں ہے جو اپنی فنی مہارت میں مشہور ہیں، لہٰذا اس احساسِ کمتری سے نکلئے، اور اپنی بے عملی کو اپنے تدین کے ساتھ وابستہ نہ کیجئے، اگر واقعی آپ ایسا کریں گے تو یقیناً متدین لوگ بدنام ہوں گے۔

جواز کی حدود پیچھے بیان کی جا چکی ہیں، ان حدود میں رہ کر اگر محنت سے تعلیم حاصل کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مہارت حاصل نہ ہو۔

مسئلہ نمبر ۷

محض مخلوط تعلیم میں پڑھانے کی وجہ سے ان صاحب کو فاسق نہیں کہا جاسکتا، عین ممکن ہے کہ وہ نگاہ و دِل کی حفاظت کرتے ہوئے پڑھاتے ہوں، لہٰذا ان کی امامت میں نماز بھی جائز ہے، اگر قریب کوئی دُوسری مسجد موجود ہو تو شبہ سے بچنے کے لئے اس مسجد میں چلے جائیں، ورنہ ان کے پیچھے نماز پڑھیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۳/۴/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶/۵۹۵)

(بنو ہاشم، بنو اُمیہ، جنگِ جمل، جنگِ صفین، حضرت حسینؓ، حضرت معاویہؓ اور یزید سے متعلق متعدّد سوالات اور جوابات)

کیا بنو ہاشم اپنے کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے؟

سوال ۱:- کیا بنو ہاشم اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے؟ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''شہادتِ حسین'' میں تحریر کیا ہے؟

قبولِ اسلام کے بعد بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی خاندانی رنجشوں کی کیفیت

سوال۲:- کیا اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی بنو ہاشم اور بنو اُمیہ نے قبلِ اسلام کی خاندانی رنجشوں کو ختم نہیں کیا تھا؟ جیسا کہ واقعہ کربلا کے پسِ منظر میں بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ قرآنِ پاک نے مسلمان ہونے کے بعد خصوصاً صحابہؓ میں مودّتِ قلبی کا ذکر کیا ہے، اثبات کی صورت میں اس تأثر کے حامل کا کامل الایمان ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

کیا حضرت علیؓ نے خلافت کے لئے خلفائے سابقہ کے اتباع کی شرط سے انکار کر دیا تھا؟

سوال۳:- کچھ تواریخ میں ذکر آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد انتخابی شوریٰ نے حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کے سامنے اطاعتِ خدا و رسولؐ کے ساتھ اتباعِ خلفائے اوّل و ثانی کی شرط بھی رکھی تھی، جسے حضرت عثمانؓ نے قبول کرلیا، لیکن حضرت علیؓ نے خلفائے سابقہ کے اتباع کی شرط کو قبول نہیں کیا، چنانچہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں لایا گیا، کیا یہ صحیح ہے؟ اور کیا اطاعتِ خدا و رسولؐ کے بعد خلفائے سابقین کا اتباع منتخب خلیفہ کے لئے ایک لازمی اَمر تھا؟

قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ کرنے والوں کا حقیقی مقصد قصاصِ عثمانؓ تھا یا حضرت علیؓ کو خلافت سے روکنا؟

سوال۴:- عام تاریخوں سے یہ تأثر ملتا ہے کہ قصاصِ عثمانؓ ایک بہانہ تھا، ورنہ اصل مقصد خلافتِ علیؓ کو مرتب نہ ہونے دینا تھا، اگر یہ تأثر قبول کرلیا جائے تو اس میں حضرت عائشہؓ سے لے کر حضرت معاویہؓ تک اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ سے لے کر عمرو بن العاصؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ تک سب ملوّث ہیں، اور ان کے علاوہ بہت سارے ایسے صحابہؓ بھی ملوّث ہیں جن کو اکابر میں شمار کیا جاتا ہے اور جن کے ذریعہ دین کا ایک بڑا حصہ ہم تک پہنچا ہے، مذہبِ اہل السنۃ کس چیز سے انکار کرے گا؟ فسادِ ایمان سے بچنے کے لئے سکوت اختیار کرنے کا حکم ضرور دیا گیا ہے، لیکن اس سکوت کو فرار سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کے کردار کا تاریخی وشرعی جائزہ

سوال۵:- تاریخوں سے حضرت معاویہؓ کے کردار کا مطالعہ کرنے کے بعد دو باتیں لازمی طور پر پیدا ہوتی ہیں، یا تاریخیں غلط یا حضرت معاویہؓ کا ایمان مصلحتِ وقت کا تقاضا تھا، تیسری صورت میں جیسا کہ اہل السنۃ انہیں اکابر صحابہؓ میں شمار کرتے ہیں، نبی کی تربیت اور ذات محلِ نظر رہ جاتی ہے۔

کیا حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی میں بزور ولی عہدی کی بیعت لی تھی؟

سوال ۶:- حضرت معاویہؓ کا اپنی زندگی میں بزور ولی عہدی کی بیعت لینا ایک سیاسی مسئلہ ہے یا مذہبی؟ اگر سیاسی مسئلہ ہے اور حضرت معاویہؓ کو خلفائے راشدین میں شمار نہیں کیا جاتا تو اعتراض کس چیز کا رہ جاتا ہے؟ اس سلسلے میں دو ضمنی سوال بھی پیش ہیں:

الف:- کیا نفسِ ولی عہدی کی بیعت لینا صحیح نہیں ہے؟

ب:- لوگوں کو اپنے بعد کسی کو ولی عہد بنانے کی وصیت کرنے بلکہ جواب حاصل کرنے اور بیعت لینے میں کیا فرق ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے آخری وقت میں نہ صرف حضرت عمرؓ کو ولی عہد نامزد کیا تھا، بلکہ لوگوں سے ان کی اطاعت کا اقرار بھی کرایا تھا، اور حضرت علیؓ نے بھی اپنے آخری وقت میں حضرت حسنؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔

یزید کے لئے ولایتِ عہد کی بیعت لینے کا شرعی حکم

سوال ۷:- یزید فاسق و فاجر تھا، اور ایسے بیٹے کے لئے ولایتِ عہد کی بیعت لینا جائز تھا یا ناجائز؟ ناجائز کام کرنا معصیتِ خداوندی ہے یا نہیں؟

حضرت معاویہؓ کے عہد میں یزید پر شرعی حد کیوں جاری نہیں کی گئی؟

سوال ۸:- تاریخوں میں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کے زمانے میں شرعی عدالتیں موجود تھیں، جو خدا کی نافرمانیوں اور قابلِ تعزیر جرائم کا ارتکاب کرنے والوں پر حدود جاری کیا کرتی تھیں، کیوں یزید پر حد جاری نہیں کی گئی؟ جبکہ اس کا شرابی، زانی ہونا اس قدر مشہور تھا کہ بیعتِ ولی عہدی کے دوران اس کا بزور اظہار کیا گیا، اس مسئلے کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے لئے یہ ریمارکس قائم نہیں کیا جاسکتا: ''أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ''؟

یزید کا حکم؟ اور کیا حضرت معاویہؓ کے عہد میں مجالسِ غناء عام تھیں؟

سوال ۹:- تاریخوں میں اجمالی حیثیت سے یزید کے فسق و فجور کا ذکر تو آیا ہے، لیکن کسی خاص واقعے کا ذکر کم از کم اُردو ترجموں میں سامنے نہیں آیا، کیا کسی عربی تاریخ نے حضرت معاویہؓ کے عہد میں اس قسم کے واقعات کا ذکر کیا ہے؟ شاید ابنِ خلدون نے مجالسِ غناء کا ذکر کیا ہے، کیا اس قسم کی مجالسِ غناء جو خلافِ شرع ہوں حضرت معاویہؓ کے دور میں عام ہوا کرتی تھیں؟

حضرت حسینؓ کے نام کوفیوں کے خطوط میں کیا بات درج تھی؟

سوال۱۰:- تاریخوں میں حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ کے ساتھ کوفیوں کی خط وکتابت کا جو تذکرہ اُردو میں منتقل ہو چکا ہے، اس کے مطابق حضرت معاویہؓ کی وفات پر حضرت حسینؓ کو مبارک باد اور اپنا حق لینے کی ترغیب ہے، اس خط وکتابت میں ایک فاسق وفاجر خلیفہ کو ہٹانے کی جدوجہد کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا، براہِ کرم اگر عربی تاریخوں میں ایسا کوئی واقعہ ہو تو مطلع کریں، مختلف روایتوں کے مطابق تین سو خطوط یا بروایت دیگر ۳ بوریوں کی مقدار میں خطوط آنے کے بعد اور وفود آنے کے بعد حضرت حسینؓ نے مکہ مکرّمہ چھوڑا۔

فاسق حکمران کے خلاف حضرت حسینؓ کے خروج وجہاد کی شرعی حیثیت

سوال۱۱:- واقعہ کربلا کا پسِ منظر بتاتے ہوئے ہر تحریر وتقریر میں یہ بات وضاحت کے ساتھ آتی ہے کہ ایک فاسق وفاجر حکمران سے جہاد کی خاطر حضرت حسینؓ مکہ مکرّمہ سے نکلے تھے، یہ مقصد واجب تھا یا مستحب؟ اگر واجب تھا تو دُوسروں کو ترغیب دِلانا ضروری تھا، کیا حضرت حسینؓ نے اس سلسلے میں دُوسروں کو ترغیب دِلائی؟ اور اگر مستحب تھا تو نتائج کا اندازہ کر کے حضرت حسینؓ کو ترک کر دینا چاہئے تھا، ہر صورت میں بہتر تھا کہ حضرت حسینؓ اپنے ہم نوا پیدا کرتے، پھر نظریاتی یا عملی دباؤ ڈال کر حالات کو بہتر بناتے، اور اگر یہ خیال تھا کہ تیس ہزار کوفی تیار ہیں جیسا کہ تاریخیں لکھتی ہیں اور مسلم نے اطلاع دی تھی اور بغیر کسی مشورے کے حضرت حسینؓ ان تک پہنچنا چاہتے تھے تو بھی پورے خاندان واسباب کو لے کر روانہ ہونا مناسب نہ تھا، اکیلے یا ایک دو ساتھی کو لے کر کسی غیر معروف راستے سے جا کر کوفہ والوں سے ملتے، بلکہ تاریخوں میں جیسے آتا ہے کہ کوفہ والوں نے کھلم کھلا یزید کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا اور مسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اور حکومت کو ان کے رُجحانات کا علم تھا، لہٰذا حکومت کی طرف سے مزاحمت متوقع تھی، چنانچہ حضرت حسینؓ کا ایسے حالات میں خاندان والوں کو لے کر نکلنا اپنے آپ کو اور مشن کو نقصان پہنچانے کے مترادف تھا، اس لحاظ سے حضرت حسینؓ کو اپنے اس مشن میں مخلص ماننے میں تأمل پیدا ہوتا ہے یا پھر یہ مقصد ہی نہ تھا؟

کیا یزید نے اپنی مملکت میں غیر اسلامی دستور جاری کیا تھا؟

سوال۱۲:- بتایا جاتا ہے کہ یزید قانونِ شریعت کو بدلنا چاہتا تھا، حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنا چاہتا تھا، کیا تاریخ وسوانح کے ذریعہ کہیں یہ نظر آتا ہے کہ اپنے خلاف ہونے والی جدوجہد کو کچلنے

کے بعد اس نے اپنی مملکت میں غیر اسلامی دستور رائج کیا تھا؟ حالانکہ اس کے بعد اسے کسی قسم کی مزاحمت کی توقع نہ تھی۔

یزید کے خلاف جدوجہد میں دیگر صحابہ کرامؓ کیوں شریک نہیں ہوئے؟

سوال ۱۳:- یزید کے خلاف جدوجہد میں اس دور کے بقیہ صحابہؓ کی عدمِ شرکت کو کس بات پر محمول کیا جائے؟ حالانکہ حضرت حسینؓ کے مقابلے میں کوئی آدمی، درجہ کا صحابی بھی نہیں بلکہ ایک فاسق و فاجر حکمران تھا، کیا آلِ علیؓ کے سوا کسی پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا تھا؟ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ عباسؓ اور دیگر صحابہؓ نے انہیں روکنے کی کوشش بھی کی تھی۔

حضرت حسینؓ کی طرف سے جہاد اور مقابلے کے فیصلے کی وجہ

سوال ۱۴:- مرثیہ خواں ذاکروں کی طرح سنی واعظ بھی لہک لہک کر اشعار پڑھتے ہیں کہ سر داد و نداد دست در دستِ یزید۔ اور بتاتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کسی صورت میں یزید جیسے فاسق و فاجر کی خلافت کو اپنی زندگی میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھے، جان دے دی لیکن یزید کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا، حالانکہ واقعات کے اعتبار سے نہ تو حضرت حسینؓ مکہ مکرمہ سے یزید کی بیعت کے خوف سے نکلے تھے، نہ ان پر مکہ مکرمہ میں کسی نے جبر کیا تھا، بلکہ کوفیوں کی خط و کتابت پر نکلے اور راستے میں جب معلوم ہوا کہ کوفی بدعہد ہوگئے ہیں تو لوٹنے کا ارادہ فرمایا، لیکن مسلم کی شہادت پر مشتمل اعزّہ و اقارب کی ضد کی وجہ سے ارادے کا ساتھ دیا اور آخر میں تین شرطیں تک پیش کردیں، پھر مقصد کیا تھا؟ سمجھ میں نہیں آتا۔

تاریخِ اسلام کو روایات کی تحقیق کے ساتھ ازسرِنو مرتب کرنے کی ضرورت

سوال ۱۵:- آخر میں ایک اہم سوال پیشِ خدمت ہے، اسلامی تاریخِ قدیم کا ذخیرہ ایک عجوبہ سے کم نہیں، کہیں ایک فرشتہ ہے اور دُوسری جگہ شیطان بن جاتا ہے، بدقسمتی سے تراجم کے سلسلے میں بھی کوئی احتیاط نہیں کی گئی، علمائے کرام نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ قرآن وسنت اور آثارِ سلف کے ماہر علماء کا ایک بورڈ مقرّر کرکے اختلافِ روایات پر تحقیق کرتے اور کم از کم اہلِ سنت کو ابتدائی تاریخ ایسی ملتی جس میں اکابر صحابہؓ اور قرونِ خیر کی ایک اچھی اور متفق علیہ تصویر ہوتی، اب بھی وقت گیا نہیں، کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کرسکتے ہیں؟ ورنہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ آنے والی نسلیں، دُوسرے مذاہب ہی نہیں بلکہ سیاسی وملکی رہنماؤں کی تاریخوں کو بے عیب اور متفق علیہ پاکر، اور اسلامی تاریخ کے پورے ذخیرے کو اختلافات اور کشت وخون سے بھرا ہوا پاکر، خلافِ اسلام مشنریز کے پروپیگنڈے میں آکر محمدِ

عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور ان کے خلاف کھلم کھلا زبان درازی پر اُتر آئیں، اعوذ باللہ من شر ذٰلک۔

جواب: -محترمی ومکرمی!　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شرمندہ ہوں کہ اب تک آپ کے سوالات کا جواب لکھنے کا موقع نہیں مل سکا، دراصل میں اس انتظار میں تھا کہ کوئی اطمینان کا وقت ملے تو مفصل جواب تحریر کروں، لیکن اندازہ یہ ہوا کہ اطمینان کا وقت ملنا بہت مشکل ہے، اب جو تھوڑی بہت فرصت ملی ہے اس میں اختصار کے ساتھ آپ کے سوالات کا جواب عرض کردینا زیادہ مناسب ہے، اگر کسی جواب میں پھر کوئی اِشکال رہ جائے تو براہِ کرم آپ دوبارہ رُجوع فرمالیں، اپنے ناقص علم کی حد تک میں ان شاء اللہ جواب عرض کردوں گا۔

سب سے پہلے ایک اُصولی بات عرض کردوں، اور وہ یہ کہ ہمارے پاس علمِ تاریخ پر کتابوں کا جو ذخیرہ موجود ہے اس میں ایک ہی واقعے سے متعلق کئی کئی روایتیں ملتی ہیں، اور تاریخ میں روایت کی چھان پھٹک اور جرح وتنقید کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو حدیث میں حضراتِ محدثینؒ نے اختیار کیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتبِ تاریخ میں ہر طرح کی روایتیں درج ہوگئی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔ کسی معاملے کی حقیقت پسندانہ تحقیق کرنی ہو تو یہ ضروری ہے کہ رطب ویابس کے اس مجموعے میں سے صرف ان روایات پر اعتماد کیا جائے جو روایت اور درایت کے اُصولوں پر پوری اُترتی ہوں، اگر کوئی ایسا عالم جسے جرح وتعدیل کے اُصولوں سے واقفیت ہو، ان روایتوں کو ان ہی اُصولوں کے مطابق چھانٹتا ہے تو شکوک وشبہات کا ایک بہت بڑا حصہ وہیں ختم ہوجاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے میں عبداللہ بن سبا کی سازش نے جو تحریک شروع کی تھی اس کے دو بڑے مقاصد تھے، ایک صحابہؓ کی عظمت کو مجروح کرنا، اور دُوسرے جھوٹی روایتیں پھیلانا، چنانچہ انہوں نے بے شمار غلط سلط حکایتیں معاشرے میں پھیلانے کی کوشش کی۔ حضراتِ محدثینؒ نے پوری تندہی اور جانفشانی کے بعد احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اس سبائی تحریک کے اثرات سے جدوجہد کرکے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ کردیا، لیکن علمِ تاریخ میں اہتمام نہ ہوسکا اور وہ روایتیں کتابوں میں درج ہوتی رہیں جو خالص سبائی پروپیگنڈے کی پیداوار تھیں۔

ہاں! محتاط مؤرخین نے اتنا ضرور کیا ہے کہ ہر روایت کی سند لکھ دی ہے، اور اب تحقیقِ حق کرنے والوں کے لئے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ علمِ اسماء الرجال کی مدد سے وہ روایتوں کی تحقیق کریں اور جن روایتوں کے بارے میں یہ ثابت ہوجائے کہ وہ کسی سبائی تحریک کے فرد کی بیان کی ہوئی ہیں ان پر صحابہ کرامؓ کے بارے میں اعتماد نہ کریں، کیونکہ صحابہؓ کے فضائل ومناقب اور ان کا اللہ کے نزدیک انبیاء

کے بعد محبوب ترین اُمت ہونا، قرآنِ کریم اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت ہے، لہٰذا اس سبائی پروپیگنڈے پر کان دھر کر قرآن وسنت کے واضح ارشادات کو دریا بُرد نہیں کیا جاسکتا، اہلِ سنت کا جو عقیدہ ہے کہ مشاجراتِ صحابہؓ کی تحقیق میں پڑنا دُرست نہیں بلکہ اس معاملے میں سکوت اختیار کیا جائے، یہ کوئی تلخ حقائق سے فرار نہیں بلکہ اس کی وجہ یہی ہے کہ تاریخی روایات میں سے صحیح اور غلط، اور سچی اور جھوٹی کا امتیاز ہر انسان کا کام نہیں ہے، اس لئے جو شخص جرح وتعدیل کے اُصولوں سے ناواقف رہ کر ان روایات کو پڑھے گا وہ ہرگز کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا، صحیح روایات میں مشاجراتِ صحابہؓ سے متعلق جو مواد آیا ہے اسے سامنے رکھ کر اہلِ سنت کے تمام مرکزی علماء نے متفقہ طور پر یہ عقیدہ اختیار کیا ہے کہ اگرچہ صفین وجمل کی جنگوں میں حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، لیکن ان کے مقابل حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت معاویہؓ وغیرہم کا موقف بھی سراسر بے بنیاد نہیں تھا، یہ حضرات بھی اپنے ساتھ شرعی دلائل رکھتے تھے اور ان سے جو غلط فہمی صادر ہوئی وہ خالص اجتہادی نوعیت کی تھی۔ اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا جواب درج ذیل ہے۔

۱:- مولانا ابوالکلام مرحوم کی کتاب میں نے نہیں پڑھی، اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ خیال غلط ہے کہ بنو ہاشم اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت تک بنو ہاشم کے کسی فرد نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا، صرف حضرت علیؓ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے ابتداءً حضرت صدیقِ اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی، لیکن خود انہوں نے بعد میں یہ وجہ بیان فرمائی کہ میری رنجیدگی کا اصل سبب یہ تھا کہ ہمیں مشورۂ خلافت میں شریک نہیں کیا گیا، چنانچہ بعد میں انہوں نے برسرِ عام حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ صرف حضراتِ شیخینؓ بلکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ساتھ بھرپور تعاون فرمایا۔

۲:- اسلام کے بعد بلاشبہ بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی خاندانی رنجشیں ختم ہوگئی تھیں، اس کے بعد جو تھوڑی بہت رنجشیں ظاہر ہوئی ہیں، ان کا سبب خاندانی رقابت نہ تھی بلکہ کچھ دُوسرے اُمور تھے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ ان رنجشوں کے باوجود دونوں خاندانوں میں برابر رشتے ناطے ہوتے رہے۔

۳:- یہ غلط ہے کہ حضرت علیؓ نے انتخابی شوریٰ کی اس شرط کو ٹھکرادیا تھا کہ وہ خلفائے سابقین کی اتباع کریں گے۔ علامہ طبریؒ نے حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد شوریٰ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ نقل فرمایا اور اس میں صحیح وغلط ہر طرح کی روایت جمع کی ہیں، لیکن اس میں یہ بھی موجود ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے، جو شوریٰ کے متفقہ نمائندہ تھے، حضرت علیؓ سے پوچھا: "علیک عهد الله وميثاقه لتعلمن بكتاب الله وسنة رسوله وسيرة الخليفتين من بعده"، تم پر اللہ کی طرف سے عہد ہوگا کہ تم

کتاب وسنت اور آپؐ کے بعد آنے والے دو خلفاء کی سیرت پر عمل کروگے، اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا: "أرجو أن أفعل وأعمل بمبلغ علمی وطاقتی"، مجھے اُمید ہے کہ میں اپنے علم اور اپنی طاقت کی حد تک اس پر عمل کروں گا۔ (ملاحظہ ہو تاریخِ طبری ج:۳ ص:۲۹۷، مطبعۃ الاستقامہ قاہرہ ۱۳۵۷ھ) اسی طرح کے الفاظ ایک اور روایت میں بھی ہیں جو مذکورہ تاریخ کے صفحہ:۳۰۱ پر منقول ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی طاقت کی حد تک اتباع کا وعدہ کیا تھا۔

۴:- عام تاریخوں میں یہ تأثر پیدا کرنے والے وہی عبداللہ بن سبا کے افراد ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قصاصِ عثمانؓ کا مطالبہ کرنے والے صحابہؓ پوری دیانت داری کے ساتھ یہی سمجھتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کا قصاص اگر اس مرحلے پر نہ لیا گیا تو ایک طرف دین کا ایک اہم حکم جس پر قرآنِ کریم کی کئی آیات اُتری ہیں مجروح ہوگا۔ دُوسری طرف فتنہ پرور لوگوں کی جرأتیں بڑھ جائیں گی اور وہ جس خلیفہ کے ساتھ چاہیں گے یہی معاملہ کریں گے، جنگِ جمل میں تو یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ فریقین کے درمیان لڑائی صرف سبائی فتنہ پردازوں نے کرائی، حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ صلح پر متفق ہو چکے تھے، رات کے وقت سبائی فتنہ پردازوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہنے لگے: "رأی الناس فینا واللہ واحد وان یصطلحوا وعلیٌّ فعلی دمائنا"[1] (ہمارے بارے میں ان سب لوگوں کی رائے ایک ہے، اب اگر ہم میں اور ان میں صلح ہوگئی تو وہ ہمارے خون پر ہوگی)، عبداللہ بن سبا نے یہ تجویز پیش کی کہ "اذا التقی الناس غدًا فانشبوا القتال ولا تفرغوھم للنظر"[2] (جب کل یہ لوگ ملیں تو لڑائی شروع کردینا اور انہیں سوچنے کی مہلت نہ دینا)، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انہوں نے لڑائی چھیڑ دی اس کے نتیجے میں جنگِ جمل پیش آئی۔ (ملاحظہ ہو تاریخِ طبری ج:۳ ص:۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۴، ۵۰۵، ۵۰۷،[3] اور کامل ابنِ اثیر ج:۳ ص:۲۳۳، ۲۳۶، ۲۴۱، ۲۴۲،[4] اور البدایۃ والنہایۃ ج:۷ ص:۲۳۴ تا ۲۳۷)[5]

رہا حضرت معاویہؓ کا معاملہ جس وقت حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت ابوامامہؓ، حضرت معاویہؓ سے گفتگو کرنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں اسی وقت حضرت معاویہؓ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ حضرت علیؓ مجھ سے بہتر اور افضل ہیں، میرا ان سے اختلاف صرف قصاصِ عثمانؓ کے معاملے میں ہے، وہ اگر حضرت عثمانؓ کا قصاص لے لیں تو اہلِ شام میں سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا

---

(۱) تاریخ طبری ج:۳ ص:۵۰۷ (مطبعة الاستقامة، قاهرة).
(۲) تاریخ طبری ج:۳ ص:۵۰۸ (مطبعة الاستقامة، قاهرة).
(۳) تاریخ طبری ج:۳ ص:۵۰۷ (مطبعة الاستقامة، قاهرة).
(۴) التاریخ الکامل لابن اثیرؒ تحت ذکر مسیر علیؓ الی البصرة والوقعة ج:۳ ص:۹۲، ۹۳.
(۵) ذکر مسیر أمیر المؤمنین علی بن أبی طالبؓ من المدینة الی البصرة (طبع مطبعة السعادة بجوار محافظة، مصر). نیز دیکھئے: البدایة والنهایة (طبع دار الفکر بیروت) ج:۵ ص:۲۳۴. (محمد زبیر)

میں ہوں گا، (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۲۵۸، ۲۵۹، و ج:۸ ص:۱۲۹) اس کے بعد اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ محض بہانہ بنایا تھا تو اس کے اطمینان کے لئے شاید کوئی اور بات کافی نہ ہوگی۔

۵:- آپ کا خیال بڑی حد تک صحیح ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ تاریخ میں حضرت معاویہؓ پر جو الزامات عائد کئے گئے ہیں، وہ غلط سلط اور موضوع روایات پر مبنی ہیں، اگر صرف صحیح روایات پر بھروسہ کر کے حضرت معاویہؓ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو صورتِ حال بالکل مختلف ہوجاتی ہے، میں نے اپنے مضمون ''حضرت معاویہؓ'' میں اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے، یہ مضمون ''سیرتِ معاویہؓ'' کے اضافے کے ساتھ عنقریب کتابی صورت میں آجائے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۶:- یزید کی ولی عہدی کے مسئلے پر میں اپنے مقالے میں مفصل گفتگو کر چکا ہوں، اگر آپ نے اس کا مطالعہ فرمالیا ہوگا تو اُمید ہے کہ اس میں آپ کو تمام سوالات کا جواب مل گیا ہوگا۔

۷:- اس مسئلے پر بھی میں اپنے مضمون میں روشنی ڈال چکا ہوں۔

۸:- یزید کا شراب پینا یا زنا کرنا کسی بھی قابلِ اعتماد روایت سے ثابت نہیں ہے، زنا کی روایت تو میں نے کسی بھی تاریخ میں نہیں دیکھی، کمی نے جو شیعہ راوی ہے یزید کا شراب پینا وغیرہ بیان کیا ہے، لیکن کسی مستند روایت میں اس کا ذکر نہیں، اگر یزید کھلم کھلا شرابی ہوتا تو حضراتِ صحابہؓ کی اتنی بڑی جماعت اس کے ساتھ قسطنطنیہ کے جہاد میں نہ جاتی، اس دور کے حالات کو دیکھ کر ظنِ غالب یہی ہے کہ یزید کم از کم حضرت معاویہؓ کے عہد میں شراب نہیں پیتا تھا اور حدِ شرعی اس وقت قائم ہوسکتی ہے جبکہ دو گواہوں نے پیتے وقت دیکھا ہو، ایسا کوئی واقعہ کسی شیعہ روایت میں بھی موجود نہیں ہے۔

۹:- ابنِ خلدون نے صرف اتنا لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید کا فسق ظاہر ہوگیا تھا، اس میں غالباً مجلسِ غناء کا تذکرہ بھی ہے۔

۱۰:- اس زمانے میں مکتوب نگاری کا اُسلوب نہایت مختصر ہوتا تھا، آپ اس دور کے کسی بھی ایسے مکتوب کی مثال نہیں پائیں گے جس میں تفصیل و اطناب سے کام لیا گیا ہو، مختصر خطوط میں سب باتوں کی رعایت ممکن نہیں، پھر کوفہ کے باشندے حضرت حسینؓ کو خواہ کس لئے بلا رہے ہوں، حضرت حسینؓ کا اپنا موقف یہ تھا کہ ایک سلطان متغلب جو، ان کی نظر میں نااہل تھا، ابھی پورے عالمِ اسلام پر غلبہ نہیں پاسکا، اس کے غلبے کو روکنا ان کے پیشِ نظر تھا، اور اسی مقصد کے لئے وہ روانہ ہوئے تھے۔ اس پہلو کو بھی میں اپنے مضمون میں واضح کر چکا ہوں۔

۱۱:- حضرت حسینؓ کے خروج کی شرعی حیثیت میرے مضمون میں موجود ہے، اُمید ہے کہ آپ نے دیکھ لی ہوگی، یہ کہنا مشکل ہے کہ آپؓ نے پورے خاندان کو لے کر جانا کس وجہ سے مناسب سمجھا

تھا؟ لیکن اگر بالفرض حضرت حسینؓ کو معاذ اللہ غیر مخلص قرار دیا جاتا تب بھی تو یہ سوال باقی رہتا ہے، درحقیقت حضرت حسینؓ کا خلوص شک وشبہ سے بالاتر ہے، انہوں نے جو کچھ کیا وہ اللہ کے لئے کیا، اب چودہ سو سال کے بعد ان کے ایک ایک جزوی اقدام کی ٹھیک ٹھیک حکمت ومصلحت معلوم کرنا ہمارے لئے نہ ممکن ہے، نہ ضروری۔

۱۲:- یزید کے بارے میں صحیح بات وہی ہے جو میں لکھ چکا ہوں، قانونِ الٰہی کو بدلنے کا کوئی ثبوت کم از کم مجھے نہیں ملا۔

۱۳:- جیسا کہ میں اپنے مضمون میں عرض کر چکا ہوں، یزید ایک سلطان متغلب تھا، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ پورا کنٹرول حاصل کر چکا ہو تو اس کے خلاف خروج نہ کیا جائے گا، اور اگر اس کا غلبہ روکنا ممکن ہو تو روکنے کی کوشش کی جائے، حضرت حسینؓ سمجھتے تھے کہ اس کا غلبہ روکنا ممکن ہے اس لئے وہ روانہ ہوگئے اور دُوسرے حضرات صحابہؓ کا خیال تھا کہ اب اس کے غلبہ کو روکنا استطاعت میں نہیں اور اس کو روکنے کی کوشش میں زیادہ خون ریزی کا اندیشہ ہے، اس لئے وہ خود بھی خاموش رہے اور حضرت حسینؓ کو بھی اپنے ارادے سے باز آنے کا مشورہ دیا۔

۱۴:- ''سر داد و نداد دست در دستِ یزید'' کوئی نقطۂ نظر نہیں ہے، حضرت حسینؓ شروع میں یہ سمجھتے تھے کہ سلطان متغلب کا غلبہ روکنا ممکن ہے اس لئے روانہ ہوئے اور اہلِ کوفہ پر اعتماد کیا، لیکن جب عبداللہ بن زیاد کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو کوفیوں کی بدعہدی کا اندازہ ہوا، اس وقت آپ کو یقین ہوگیا کہ اہلِ کوفہ نے بالکل غلط تصویر پیش کی تھی، حقیقت میں یزید کا غلبہ روکنا اب استطاعت میں نہیں ہے، اس لئے انہوں نے یزید کے پاس جاکر بیعت تک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر عبداللہ بن زیاد نے انہیں غیر مشروط طور پر گرفتار کرنا چاہا، اس میں انہیں مسلم بن عقیلؓ کی طرح اپنے بے بس ہوکر شہید ہونے کا اندیشہ تھا، اس لئے ان کے پاس مقابلہ کے سوا چارہ نہ رہا۔

۱۵:- کوئی شک نہیں کہ تاریخ کو اس طرح چھان پھٹک کر مرتب کرنا بہت ضروری ہے، لیکن آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں کام بے شمار ہیں، آدمی کم۔ کوئی شخص کیا کیا کام انجام دے؟ آج کل ایک مفصل کتاب میرے زیرِ قلم ہے، کسی اور کام میں لگنا مشکل ہے، تاہم کوشش کروں گا کہ احباب کو اس طرف متوجہ کروں۔ میں دوبارہ معذرت خواہ ہوں کہ آپ کے جواب میں بہت تأخیر ہوئی لیکن ہجومِ مشاغل کا یہ عالم ہے کہ یہ خط بھی کئی روز میں مختلف نشستوں کے اندر پورا کیا ہے، خدا کرے کہ یہ باعثِ اطمینان ہوسکے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے اصل عربی تواریخ میں مشاجراتِ صحابہؓ کے زمانے کے واقعات پڑھنے کا موقع ملا ہے، اور شاید تاریخ کی کوئی کتاب جو آج کل

ملتی ہے چھوٹی نہیں، لیکن بحمداللہ میرا دِل و دِماغ صحابہؓ کی طرف سے بالکل مطمئن ہے، پہلے میں اہلِ سنت کے عقائد کا تقلیداً اگر اتباع کرتا تھا، اب بحمداللہ تحقیقاً ان کا متبع ہوں، اور تمام صحیح وسقیم روایات دیکھنے کے بعد بفضلہٖ تعالیٰ اس عقیدے پر اور زیادہ شرحِ صدر ہوا ہے، اس موضوع پر والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے ایک مقالہ ''مقامِ صحابہؓ'' کے نام سے لکھا ہے جو اِن شاء اللہ ایک دو ماہ میں منظرِ عام پر آجائے گا، موقع ہوتو اس کا بھی مطالعہ فرمائیں۔

والسلام

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۹ ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۴۰۴ الف)

کس قسم کی غلطی کو ''اجتہادی غلطی'' قرار دیا جائے گا؟

سوال:- مکرمی ومحترمی مولانا محمد تقی عثمانی ایڈیٹر ''البلاغ'' کراچی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے بعد عرض یہ ہے کہ ذوالحجہ کا خصوصی ایڈیشن ماہنامہ ''البلاغ'' نظر سے گزرا، پڑھ کر دِل مطمئن ہوا لیکن ایک عبارت پر چند شکوک ذہن میں پیدا ہوئے۔ ان شکوک کو رفع کرنے کے لئے آپ کو خط لکھ رہا ہوں تاکہ آپ کا منشاء اس عبارت سے معلوم کرسکوں، عبارت درج ذیل ہے:-

''لیکن چونکہ حضرت عائشہؓ ہوں یا حضرت معاویہؓ دونوں سے یہ عمل حضرت علیؓ کی عداوت یا بغض کی وجہ سے نہیں بلکہ شبہ اور تاویل کی بنا پر صادر ہوا تھا، اور بہرحال وہ بھی اپنے پاس دلائل رکھتے ہیں جو غلط فہمی پر مبنی سہی لیکن دیانت دارانہ تھے، اس لئے اُخروی اَحکام کے اعتبار سے ان کا یہ عمل اجتہادی غلطی کے ذیل میں آتا ہے، اس لئے ان پر طعن کرنا جائز نہیں، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ذبیحہ پر جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ کر اسے ذبح کردینا اور پھر اسے کھانا دلائلِ قطعیہ کی بناء پر گناہِ کبیرہ ہے، لیکن امام شافعیؒ نے اپنے اجتہاد سے اسے جائز سمجھا، اس لئے اگر کوئی شافعی المسلک انسان اسے کھالے تو اس کا یہ عمل دلائلِ شرعیہ کی رُو سے گناہِ کبیرہ اور فسق ہے لیکن چونکہ وہ دیانت دارانہ اجتہاد کی بناء پر صادر ہوا اس لئے اس شخص کو فاسق نہیں کہا جائے گا۔'' (''البلاغ'' ۱۳۹۰ ص:۷۲)

میرا اس عبارت پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن کی آیتوں کا انکار کرتا چلا جائے تو آپ اس کو دیانت دارانہ اجتہاد کہیں گے؟ اور اس کی نیت کو دیکھیں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی دِلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے تو آپ کیسے دعوے کررہے ہیں؟ اگر مرزائی قرآن مجید کی آیتوں کی تلاوت کرتے جائیں اور یہ کہیں کہ ہماری نیت ٹھیک ہے اور ہم دیانت داری سے کرتے ہیں، تو کیا وہ آپ کے نزدیک ٹھیک ہوگا؟ اگر کوئی یہ کہے کہ مولانا مودودی نے یہ اجتہادی غلطی کی تو آپ اس کا کیا

جواب دیں گے؟

یہ شکوک میرے ذہن میں پیدا ہوئے اس لئے ان شکوک کو دُور کرنے کے لئے آپ کی طرف متوجہ ہورہا ہوں، مہربانی فرما کر آپ میرے شبہات دُور کر کے خدا کے ہاں اَجرِ عظیم کے مستحق ٹھہریں۔

جواب: -محترمی ومکرمی!　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ موصول ہوا، کسی شخص کی غلطی کو اجتہادی غلطی قرار دینے کے لئے میں نے جو دو شرطیں عرض کیں، وہ غالباً آپ کی نگاہ سے اوجھل رہ گئیں، اس کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوا، میں نے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی شخص اجتہاد کا اہل ہے، یعنی اس میں وہ علمی وعملی صلاحیت پائی جاتی ہے جو تمام اُمت نے مجتہد کے لئے ضروری قرار دی ہے، اور اپنے مسلک کی بنیاد کسی شرعی دلیل پر رکھتا ہے خواہ وہ دلیل ہمیں کمزور معلوم ہوتی ہے تو اس کا یہ عمل ''اجتہاد'' کہلائے گا، اور اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو وہ ''اجتہادی غلطی'' ہوگی۔ امام شافعیؒ نے حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث کی بناء پر یہ مسلک اختیار کیا کہ بغیر بسم اللہ پڑھے بھی ذبیحہ دُرست ہے۔[1] اور قرآنِ کریم کی آیات کو "مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ" پر محمول کیا، ساری اُمت نے اسے اجتہادی غلطی اس لئے قرار دیا کہ ان میں اجتہاد کی شرائط پوری طرح پائی جاتی تھیں، اور یہ مسلک بہرحال ایک شرعی دلیل پر مبنی ہے جو کمزور سہی لیکن اجتہاد کی حدود میں داخل ہے۔

آپ نے یہ سوال بڑا اچھا کیا ہے کہ پھر آج کل دُوسرے لوگ اگر اسی اجتہاد کو بہانہ بنا کر قرآن وسنت میں غلطیاں کرنے لگیں تو ان کو کیا کہا جائے گا؟ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شرائطِ اجتہاد کا حامل ہو تو اس کی غلطی کو اجتہادی غلطی کہیں گے، لیکن جن لوگوں کی آپ نے مثال دی ہے ان میں شرائطِ اجتہاد مفقود ہیں، اس لئے ان کی غلطی کو اجتہادی غلطی نہیں کہہ سکتے۔ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ ایک غلطی کوئی مجتہد کرے تو باعثِ ثواب اور اگر غیر مجتہد کرے تو باعثِ ملامت، یہ بے انصافی کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ اگر ایک سند یافتہ ڈاکٹر کسی مریض کو کسی غلط فہمی کی بناء پر غلط دوا دیدے اور اس سے مریض کا کام تمام ہوجائے تو اگر یہ ثابت ہو کہ اس نے اپنے پیشے کی بجا آوری میں دیانت داری سے وہ دوا دی تھی، تو دُنیا کا کوئی قانون اسے مجرم قرار نہیں دیتا، اس کے برخلاف اگر وہی دوا کوئی غیر سند یافتہ عطائی کسی مریض کو دے اور اس سے اس کی موت واقع ہوجائے تو دُنیا کا ہر قانون اس پر گرفت کرتا ہے۔

---

(۱) وفی المجموع شرح المهذب، باب الأضحية ج:۹ ص:۴۵۲ (طبع جديد، دار الكتب العلمية بيروت) فرع فی مذاهب العلماء فی التسمية علی ذبح الأضحية وغيرها من الذبائح .... مذهبنا أنها سنة فی جميع ذٰلک، فان تركها سهوًا أو عمدًا حلّت الذبيحة ولا اثم عليه. نیز دیکھئے: روضة الطالبين ج:۳ ص:۲۰۵۰ (طبع المكتب الاسلامی).

یہ فرق اس لئے ہے کہ غلطی سے دُنیا کا کوئی انسان محفوظ نہیں ہے، البتہ اس کے ذمہ یہ ضروری تھا کہ غلطی سے بچنے کے جتنے اسباب و وسائل ہوسکتے ہیں ان کو پوری طرح اختیار کرے، جو شخص ڈاکٹر بننا چاہتا ہے اس کے لئے اسباب یہ ہیں کہ وہ فنِ طب کو ماہر اساتذہ سے حاصل کرکے ان سے سند لے، اس کے بعد اس سے کوئی غلطی ہوجاتی ہے تو یہ ایسی غلطی ہے جس سے کوئی انسان محفوظ رہنے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اسی طرح ایک عالم کے لئے ظاہری وسائل یہ ہیں کہ وہ قرآن وسنت کا پورا علم باضابطہ حاصل کرے، ماہر اساتذہ سے اس کی تربیت لے، اس کے بعد وہ غلطی کرے گا تو یہ ایک ماہر ڈاکٹر کی غلطی کی طرح قابلِ ملامت نہ ہوگی، اس کے برخلاف جس شخص میں اجتہاد کی اہلیت نہیں ہے اس کی مثال عطائی کی سی ہے کہ اس کی غلطی قابلِ ملامت اور موجبِ گرفت ہے۔

یادآوری کے لئے شکرگزار ہوں اور دُعا کی درخواست ہے۔ والسلام

۱۳۹۱/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۴۶ الف)

﴿فصل فی تعلیم القراٰن وتعظیمه وتلاوته﴾

(قرآنِ کریم کی تعلیم، تعظیم، تلاوت اور آداب سے متعلق مسائل کے بیان میں)

قصص القرآن کی فلم بندی کا شرعی حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں کہ ایک فلم قصص القرآن کے نام سے جاری کی گئی ہے، جس کے اندر مختلف قرآنی واقعات کو فلم کے طور پر پیش کیا گیا ہے، مثلاً بنی اسرائیل کے ذبح کا واقعہ، فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ اور بنی اسرائیل کے خروج کا واقعہ، فلم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شبیہ نہیں دِکھائی گئی، بلکہ کسی اور شخص کی زبانی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اَحکام بنی اسرائیل تک پہنچائے گئے ہیں۔

ایسی فلم کو دیکھنے اور دِکھلانے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ براہِ کرم مدلل بیان فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- قرآنِ کریم کے واقعات کی مصوّر فلم بنانا، دیکھنا اور دِکھانا ہرگز جائز نہیں، بلکہ قرآنِ کریم کی بے حرمتی کی بناء پر اس عمل میں شدید وبال کا اندیشہ ہے، اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:-

۱:- قرآنِ کریم کے مضامین جس عظمت و جلال کے حامل ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان مضامین کو قرآنِ کریم ہی کے الفاظ میں پورے ادب و احترام کے ساتھ پڑھا، یا سنا جائے، اس کے برعکس پیشہ ور اداکار وں اور بہروپیوں کو مقدس قرآنی شخصیتوں کی مصنوعی شکل میں پیش کر کے ان سے قرآنِ کریم کے بیان کردہ واقعات کی مصنوعی نقالی کرانا، آیاتِ قرآنی کو کھیل تماشہ بنانے کے مرادف ہے، جو بنصِ قرآنی حرام ہے، آیت ہے:-

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ ۢ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ .... الخ.

(سورۂ انعام:۷۰)

۲:- کوئی فلم جانداروں کی تصاویر سے خالی نہیں ہوتی، اور جانداروں کی تصاویر بنانا، دیکھنا اور

دِکھلانا شرعاً جائز نہیں، لہٰذا قرآنی مضامین کو ایسے ذرائع سے پیش کرنا جو درجنوں احادیث کی رُو سے ناجائز ہے، نہ صرف حرام بلکہ قرآنِ کریم کی توہین کے مترادف ہے۔

۳:- واقعات کی فلم اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس میں عورتوں کے کردار نہ ہوں، چنانچہ مذکورہ فلم میں بھی کردار موجود ہیں، اور خواتین کے بے حجاب مردوں کے سامنے آنا یا ان کی تصاویر کا بلاضرورت نامحرَموں کو دِکھلانا قرآن و حدیث کی رُو سے بالکل ناجائز ہے، اور ناجائز کام کو قرآنِ کریم کے مضامین کو بیان کرنے کے لئے ذریعہ بنانا بھی نہ صرف حرام بلکہ معاذ اللہ قرآنِ کریم کی توہین کے مترادف ہے۔

۴:- کسی سچے سے سچے واقعے کو بھی جب فلم کی شکل دی جاتی ہے تو اس میں فلم ساز کے فرضی تخیلات کی آمیزش ناگزیر ہے، اس کے بغیر عموماً کوئی فلم تیار نہیں ہوسکتی، فلم ساز کو ایک مربوط فلم بنانے کے لئے لامحالہ واقعات کے خلاء کو اپنے فرضی قیاسات سے پُر کرنا پڑتا ہے، اور کچھ نہیں تو متعلقہ اشخاص کی شکل و شباہت، ان کی تعداد، ان کے اندازِ نشست و برخاست، ان کے اِردگرد پائے جانے والے ماحول، پسِ منظر اور ان کے عادات و خصائل کو لازماً قیاسی مفروضات کی بنیاد پر پیش کرنا پڑے گا، اور فلم میں ان سب باتوں کو قرآنِ کریم سے ممتاز نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا یہ سارے قیاسات قرآنِ کریم ہی کی طرف منسوب کئے جائیں گے جو قرآنِ کریم کی معنوی تحریف کے مشابہ ہے۔

زیرِ بحث فلم کے بارے میں بھی ذمہ دار فلم دیکھنے والوں نے بتلایا ہے کہ اس میں قرآنِ کریم کے بیان کردہ واقعات کے ساتھ بہت سی اسرائیلی روایات اور فرضی تخیلات کو قرآنی واقعات کے ساتھ شامل کردیا گیا ہے، اور جن ناواقف لوگوں کو قصص القرآن سے واقف کرانے کے موہوم شوق میں یہ فلم دِکھلائی جارہی ہے، ان کے لئے قرآن اور غیرِ قرآن میں امتیاز کرنے کا کوئی راستہ نہیں، وہ اس سارے مجموعے ہی کو قرآنی مضامین سمجھیں گے اور ان کو قرآنِ کریم کے بارے میں اس سنگین غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہوگی جو اس فلم کو بنانے یا دِکھانے کے ذمہ دار ہیں۔

۵:- قرآنِ کریم کے بیان کردہ واقعات میں بہت سے مقامات پر ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کی ایک سے زیادہ تشریحات ممکن ہیں، اور ان میں سے کسی ایک تشریح کو یقینی اور قطعی طور پر کسی دُوسرے احتمال کے بغیر قرآنِ کریم کی حقیقی مراد قرار دینا جائز نہیں، مفسرین جب ایسی آیات کی تشریح کرتے ہیں تو عام طور سے ممکنہ احتمالات ذکر کردیتے ہیں، ورنہ کم از کم کسی نہ کسی صورت سے یہ واضح کردیتے ہیں کہ اتنی بات قرآنِ کریم کی ہے اور اتنی تفسیر کی، تاکہ قرآن کا غیرِ قرآن سے ملتبس ہونا

لازم نہ آئے، یہ صورت فلم میں کسی طرح ممکن نہیں، بلکہ فلم ساز کے ذہن میں مذکورہ آیت یا واقعے کی جو تفسیر ہے صرف اسی کو لازماً قرآنی مضمون کی شکل میں اس طرح پیش کیا جائے گا کہ اس میں کوئی دُوسرا احتمال نہیں ہوگا اور فلم کے زور سے اسی تفسیر کا نقش ذہن پر اس طرح قائم کردیا جائے گا کہ گویا اس فلم میں بیان کردہ تصویر عینِ قرآن ہے، یہ صورت بھی قرآن اور غیرِ قرآن کے درمیان التباس پیدا کرنے کا موجب ہے، اس لئے بھی یہ فلم بالکل ناجائز ہے۔

۶:- فلم کا اصل منشاء تعلیم وتبلیغ نہیں ہوتا، بلکہ تفریحِ طبع اور کھیل تماشوں سے لذّت حاصل کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اس فلم کو دیکھنے والے دراصل تفریحِ طبع کی غرض سے فلم دیکھیں گے نہ کہ علم، عبرت یا نصیحت حاصل کرنے کی غرض سے، جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اگر یہی مضامین اپنی اصلی صورت میں وعظ وتذکیر کے لئے بیان کئے جاتے تو یہ لوگ اس میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ ہوتے، اور قرآنی مضامین کو سننے سنانے کا مقصدِ اصلی کھیل تفریح کو بنالینا کسی طرح جائز نہیں، بلکہ اس کا مقصدِ اصلی عبرت اندوزی ہے، اس کے ضمن میں تنشیط وتفریح بھی حاصل ہوجائے تو اور بات ہے، لیکن کھیل تفریح کو اصل قرار دے کر اسی کو مقصدِ اصلی بنالینا ہرگز جائز نہیں۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر، نیز دُوسرے متعدّد مفاسد کے پیشِ نظر ایسی فلم بنانا، دیکھنا، دِکھانا سب ناجائز ہے، مسلمانوں کو اس سے سختی کے ساتھ پرہیز کرنا چاہئے اور حکومت کا بھی فرض ہے کہ نہ صرف یہ کہ ایسی فلمیں دِکھانے سے باز رہے بلکہ آئندہ اس قسم کی فلموں کی نمائش کا مکمل طور پر سدِ باب کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۰۴/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۵/۱۵۹۹ د)

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	اصغر علی ربانی
دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴	۱۴۰۴/۹/۱۸ھ	۱۴۰۴/۹/۱۸ھ

ماہواری کی حالت میں تلاوت، کلمہ، دُرود پڑھنے کا حکم

سوال:- کیا ایامِ حیض میں عورت، سورت یا کلمہ اور دُرود وغیرہ پڑھ سکتی ہے؟

جواب:- قرآنِ کریم کی تلاوت تو بالکل نہیں کرسکتی، کلمہ، دُرود وغیرہ پڑھنے میں

مضائقہ نہیں۔[1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۲/۷/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۶۲/۷/۱۹ الف)

قرآنی آیات والے اخبارات کی بے حرمتی کرنا

سوال:- مولانا احتشام الحق صاحب جو جمعہ کو اخبار میں آیتیں چھپواتے ہیں، وہ دُکاندار، ردّی میں پھینک دیتے ہیں، کیا یہ دُرست ہے؟

جواب:- جن کاغذات پر اللہ، رسول کا نام یا قرآنی آیات واحادیث لکھی یا چھپی ہوں ان کو بے حرمتی کی جگہ ڈالنا دُرست نہیں ہے۔[2]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۵/۷/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد عاشق الٰہی

جن کتابوں میں قرآنی آیات بھی ہوں انہیں حالتِ حیض میں پڑھنا اور چھونا، اور حالتِ حیض میں تلاوت واذکار جائز ہیں یا نہیں؟

سوال ۱:- عورت کے لئے حالتِ حیض میں ایسی کتابوں کو چھونا اور پڑھنا جن میں چند آیات کلامِ پاک کی لکھی ہوتی ہیں جائز ہے یا نہیں؟ ان آیات کو چھوڑ کر صرف ترجمہ، تفسیر اور مطلب پڑھ لیا جائے؟

۲:- ایسے زمانے میں زبانی کلامِ پاک، کلمہ جات، دُرود شریف پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- اس معاملے میں اُصول یہ ہے کہ اگر کتاب کا اکثر یا آدھا حصہ قرآنی آیات پر مشتمل ہے تو حالتِ حیض ونفاس اور جنابت میں اس کا چھونا جائز نہیں، اور اگر کتاب کا اکثر حصہ غیرِ قرآن ہے تو اس کو اس مقام سے چھونا جائز ہے جہاں قرآنی آیات لکھی ہوئی نہیں ہیں۔

قال الشامی: ان کان التفسیر أکثر لا یکرہ، وان کان القرآن أکثر یکرہ، والأولیٰ الحاق المساواۃ بالثانی، وھٰذا التفصیل ربما یشیر الیہ ما ذکرناہ عن النھر، وبہ یحصل

---

(۱) وفی الدر المختار باب الحیض، ج:۱ ص:۲۹۳ (طبع ایچ ایم سعید) ویمنع قراءۃ قرآن .... ولا بأس لحائض وجنب بقراءۃ أدعیۃ ومسھا وحملھا وذکر اللہ تعالیٰ وتسبیح. مزید حوالہ جات اگلے صفحے کے حاشیہ نمبر۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) تفصیل اور دلائل کے لئے آگے صفحہ نمبر ۱۹۴ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

التوفیق بین القولیین. (شامی ج:۱ ص:۱۶۴ طبع استنبول)۔(۱)

۲:-قرآنِ کریم کی تلاوت تو بالکل ناجائز ہے، البتہ دُعائیں، اذکار واوراد اور احادیث وغیرہ پڑھے جاسکتے ہیں۔(۲)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۵/۱۲/۳ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۸/۱۸ الف)

شبینہ کی محفلوں میں لاؤڈ اسپیکر پر تلاوت، اس پر اُجرت اور سجدۂ تلاوت وغیرہ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

چند سال سے سہلٹ کے اطراف میں شبینہ کے نام سے ایک نئی قسم کی مجلسیں قائم ہوتی ہیں جو عموماً مغرب سے طلوعِ آفتاب کے دو ایک گھنٹہ بعد تک باقی رہتی ہیں ..... حاضرین کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ وہاں مائیکروفون کی ضرورت ہرگز نہیں ہوتی، لیکن شاید ہی کوئی ایسی مجلس مائیکروفون سے خالی رہتی ہے، حاضرینِ مجلس اکثر سوتے رہتے ہیں، کوئی خراٹے لیتا ہے، کوئی اُونگھتا ہے، کوئی باہر بیڑی سگریٹ پی رہا ہے، اس کی بدبو مجلس تک آتی رہتی ہے ..... گھر کے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمہ تن متوجہ ہوکر تلاوتِ کلامِ پاک سنتے ہیں، اکثر لوگ اپنے خانگی اُمور میں مشغول رہتے ہیں، گھر کے سونے والوں کے لئے یہ آواز حرجِ عظیم ہوا کرتی ہے، واعظین حضرات تلاوتِ قرآن ہوتے وقت بھی چائے نوش کرتے ہیں، پان کھاتے ہیں، کبھی کبھار آپس میں گفتگو بھی کرتے ہیں، کوئی سوئے ہوئے، تو کوئی بیٹھے ہوئے ہیں، بانیٔ مجلس کی طرف سے ان کو روپے ملتے ہیں، کم ہونے پر برہمی ظاہر کرتے ہیں اور کبھی پہلے سے روپے کا تصفیہ کرلیتے ہیں۔ اکثر واعظین مدارس کے مدرّس ہوتے ہیں اور ان مجلسوں کا سلسلہ عموماً ماہ کا تک سے ماہ بیساکھ تک جاری رہتا ہے، سو واعظ صاحب اس تقریب کی وجہ سے مدرسہ سے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ بھی لیتے ہیں، علاوہ ازیں طویل

---

(۱) شامی ج:۱ ص:۱۷۷ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) فی اعلاء السنن ج:۱ ص:۲۶۶ (طبع ادارة القرآن) عن ابن عمر عن النبی صلی الله علیه وسلم لا تقرأ الحائض ولا الجنب شیئًا من القران. أخرجه الترمذی ج:۱ ص:۱۹ (طبع فاروقی کتب خانه). وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۹۳ یمنع حل (دخول المسجد) الی قوله (وقراءة قرآن) بقصده ومسه الا بغلافه. وفی الهندیة ج:۱ ص:۳۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) ومنها حرمة قراءة القرآن لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شیئًا من القرآن، والآیة وما دونها سواء فی التحریم علی الأصح، الا أن لا یقصد بمادون الآیة القراءة مثل أن یقول: "الحمد لله" یرید الشکر، أو "بسم الله" عند الأکل أو غیره فانه لا بأس به. وفی الدر المختار مع رد المحتار باب الحیض ج:۱ ص:۲۹۳ (طبع سعید) ولا بأس لحائض وجنب بقراءة أدعیة ومسها وحملها وذکر الله تعالٰی وتسبیح.

سات مہینے میں وقتاً فوقتاً شب بیداری کی وجہ سے درسی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرسکتے، بعض ایک ہی مدرسہ کے تین چار ایسے واعظ اساتذہ باہر رہا کرتے ہیں، اس سے مدرسہ کا جو تعلیمی نقصان ہوتا ہے وہ خارج عن البیان ہے۔

سوال ۱:- ایسی مجلس میں مائیکروفون لاکر اس کا کرایہ دینا بیجا خرچہ کہا جائے گا یا نہیں؟

جواب:- جب مجلس کے حاضرین تک بغیر لاؤڈ اسپیکر کے آواز پہنچ جاتی ہے تو لاؤڈ اسپیکر لگانا ''غیر ضروری'' بلکہ مضر ہے، لہٰذا یہ اِسراف میں داخل ہے۔

سوال ۲:- ایسی مجلس کے مائیکروفون میں کلامِ پاک کی تلاوت جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب:- اگر اس کی آواز ان لوگوں تک پہنچتی ہے جو مجلس میں حاضر نہیں اور ان کی نیند وغیرہ میں خلل اندازی ہوتی ہے یا اس سے تلاوتِ کلامِ پاک کی بے حرمتی کا امکان ہے تو مائیکروفون میں تلاوت کرنا دُرست نہیں۔

قال فی رد المحتار وعلٰی هذا لو قرأ علی السطح والناس نیام یأثم. (شامی ج: ۱ ص: ۵۰۹)۔(۱)

سوال ۳:- ایسی مجلس کے مائیکروفون میں سجدے کی آیات تلاوت کرنے سے مجلس سے باہر یا گھر کے لوگوں کے سننے سے ان پر سجدہ کرنا واجب ہوگا یا نہیں؟ برتقدیرِ اوّل وہ لوگ اگر سجدہ نہ کریں تو تلاوت کرنے والے یا بانیٔ مجلس پر گناہ عائد ہوگا یا نہیں؟

جواب:- واجب ہوگا، اور اگر انہوں نے سجدہ نہ کیا تو اس کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر لگانے والے بھی گناہ سے خالی نہ ہوں گے۔

سوال ۴:- کہتے ہیں کہ آدابِ تلاوت مجلسِ تلاوت کے لئے محدود ہیں، جب مائیکروفون میں تلاوت ہوگی تو مجلس کی تعریف میں اور توسیع ہوگی یا نہیں؟

جواب:- جی نہیں، مجلسِ تلاوت اسی جگہ کو کہا جائے گا جہاں حقیقتاً تلاوت ہو رہی ہے، لہٰذا بلاضرورت مائیکروفون پر تلاوت کی جائے تو باہر سننے والے عدمِ استماع وغیرہ میں معذور ہوں گے اور اس کا گناہ تلاوت کرنے والوں پر ہوگا۔

یجب علی القاری احترامه بأن لا یقرأه فی الأسواق ومواضع الاشتغال، فاذا قرأه فیها کان هو المضیع لحرمته فیکون الاثم علیه دون أهل الاشتغال. (رد المحتار ج: ۱ ص: ۵۱۰)۔(۲)

سوال ۵:- تلاوتِ قرآنِ پاک کے وقت سامع کو چائے نوش کرنا، پان کھانا یا گفتگو کرنا،

---

(۱) شامی فروع فی القراءة خارج الصلوٰة ج: ۱ ص: ۵۴۶ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) شامی مطلب الاستماع للقرآن فرض کفایة ج: ۱ ص: ۵۴۶ (طبع سعید).

مجلس میں لیٹنا کیسا ہے؟

جواب:- اگر تلاوتِ قرآن، شرائط کی رعایت کے ساتھ کی جارہی ہو تو سامعین کا چائے پینا، پان کھانا، لیٹنا یا اور کوئی ایسا کام کرنا جس سے تلاوت کی طرف سے بے توجہی کا اظہار ہو کراہت سے خالی نہیں۔

سوال ۶:- واعظ مدرّس کو صاحبِ مجلس کی طرف سے عطیہ یا وعظ کی اُجرت لے لینے کے بعد مدرسہ سے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ لینا کیسا ہوگا؟

جواب:- اگر مدرسہ سے باضابطہ رُخصت لی ہے اور وعظ پر اُجرت لینے کا کوئی معاہدہ منتظمینِ مدرسہ سے نہیں ہوا، تو جائز ہے۔

سوال ۷:- کسی مدرّس صاحب کا ایسی مجلسوں میں ہمیشہ ہمیشہ جاکر مدرسہ سے غیر حاضر رہ کر اور اکثر اوقات بغیر مطالعہ درس دے کر مدرسہ یا طلبہ کو نقصان پہنچانا کیسا ہوگا؟

جواب:- مجلس اگر ان منکرات پر مشتمل نہ ہو جن کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے تو کبھی کبھی اس میں چلے جانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو اس طرح روزانہ کا معمول بنالینا اور ایسا مشغلہ بنالینا کہ مطالعے کی فرصت نہ ملے جس سے مدرسہ کا نقصان ہو دُرست نہیں، اس صورت میں ان کی تنخواہ حلال طیب نہ رہے گی۔

سوال ۸:- واعظ صاحب کو عطیہ یا وعظ کی اُجرت لے لینے کے بعد اُخروی ثواب کی اُمید باقی رہتی ہے یا نہیں؟

جواب:- وعظ اگر اُجرت لینے کے مقصد سے نہیں کیا گیا، تو اللہ سے اُمید رکھنی چاہئے، خواہ منتظمینِ وعظ کچھ ہدیہ، عطیہ دے دیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۷۰ الف)

قرآنی آیات والے اخباری تراشوں کی بے حرمتی کرنا

سوال:- جو لوگ قرآنی آیات اخباروں میں درج کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے اور اس سے قرآن کی بے حرمتی نہیں ہوگی؟

''اِلَّا اللہ'' کا ذکر دوازدہ تسبیح کا ایک جزو ہوکر اس لئے دُرست ہے کہ اس سے پہلے پورے کلمے ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ'' کی تسبیحات پڑھی جاچکی ہوتی ہیں، اس لئے ہر ''اِلَّا اللہ'' کے ساتھ ''لا اِلٰہ'' محذوف و ملحوظ ہوتا ہے، نیز مشائخ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ''لامعبود اِلَّا اللہ''، ''لامحبوب اِلَّا اللہ'' وغیرہ کا تصوّر کریں۔

البتہ دوازدہ تسبیح کے جزء کے بغیر، یا مذکورہ تصوّر کے بغیر ''اِلَّا اللہ'' کا ذکر واقعی نہ منقول ہے نہ معقول۔ دُعا کی درخواست ہے، والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۴/۲/۱۲ھ

***

کتاب حقوق المعاشرۃ واٰدابھا

(حقوقِ معاشرت اور اس کے آداب)

گھریلو ناچاقی اور والد کی سخت مزاجی کا حل اور طلاق کے معاملے میں والد کی اطاعت واجب ہے یا نہیں؟

سوال:- محترم جناب مفتی صاحب، دار العلوم کورنگی کراچی السلام علیکم

مؤدّبانہ عرض ہے میں مندرجہ ذیل مسئلے کا حل قرآن اور سنت کی روشنی میں چاہتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ اس مسئلے سے اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی مول لئے بغیر نکلوں۔

میں اپنے والدین کا ایک ہی لڑکا ہوں، نیز یہ کہ میری دو بہنیں بھی ہیں۔ ان بہنوں میں سے ایک بہن شادی شدہ ہے۔ میں اپنی دونوں بہنوں سے بڑا ہوں، میں حتی الامکان اپنے ماں باپ کی فرمانبرداری کی کوشش کرتا ہوں اور اللہ پاک کا شکر ہے کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں۔ میرے والد جن کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہے، بہت ہی سخت مزاج آدمی ہیں، نیز یہ کہ وہ حد درجہ اَنا پرست آدمی بھی ہیں، اور وہ اپنی بات کے آگے کسی کی بات سننا یا ماننا پسند نہیں کرتے۔ میری والدہ تقریباً پچاس سال کی ہیں اور وہ مستقل بیمار رہتی ہیں، کچھ عرصہ قبل ان کا رسولی کا آپریشن ہوا تھا، جس کا انہوں نے ذہن پر اتنا اثر لیا کہ ان کے اعصاب بُری طرح متأثر ہوئے، بہت زیادہ علاج اور گھر والوں (بشمول میرے والد اور میری بیوی) کی دیکھ بھال کی وجہ سے ان کی ذہنی حالت تو بحال ہوگئی، لیکن ہاتھ پاؤں میں طاقت نہیں رہی، جس کی وجہ سے ان کی دیکھ بھال کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ میرے والد نے میری شادی میرے (مرحوم) ماموں کی لڑکی سے کردی اور اس سے میری تین عدد لڑکیاں ہیں، میری شادی کے بعد سے اب تک میری زندگی اور میری بیوی کی زندگی کے ہر معاملے میں میرے والد صاحب کی مرضی چلتی ہے اور بعض اوقات اس وجہ سے میں اپنی بیوی اور بچوں کے حقوق صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتا ہوں۔ میں ایک پروائیویٹ ادارے میں ملازم ہوں اور اپنے بہت سارے فرائض اپنی ملازمت میں مصروفیت کی وجہ سے بھی ادا نہیں کر پاتا ہوں۔ میری بیوی کا گو کہ میرے والد بہت خیال بھی رکھتے ہیں مگر بعض مسئلوں میں بُری طرح ناراض بھی ہوتے ہیں اور اکثر بہت نازیبا الفاظ کا استعمال بھی کرتے ہیں، جس کو میں اور میری بیوی والدین کا حق سمجھ کر برداشت بھی کرتے ہیں۔

یوں ہم نے سات سال بڑی مشکل سے اپنے والد کی خوشی کو پورا کرکے گزارے ہیں اور

بہت سے مرحلے ایسے بھی آئے جب میرے والد نے ہم کو گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا، مگر ہم نے اپنی عاقبت خراب ہونے کے ڈر سے معافی تلافی کر کے ان کو منالیا۔

اب صورتِ حال ایسی ہوگئی ہے کہ میرے والد بہت ساری باتیں اور ہماری غلطیاں جن کو وہ نظر انداز کر سکتے ہیں یا اس پر سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کر سکتے ہیں، اس پر بھی سخت رویہ اختیار کرتے ہیں اور معاملات کو انتہائی حد تک بگاڑ دیتے ہیں، اور بات بات پر ہم کو نکل جانے کو کہہ دیتے ہیں، اور کبھی کبھی میری بیوی کو طلاق دِلوانے کی بات بھی کرتے ہیں، جب وہ ہم کو نکالنے کی بات کرتے ہیں تو مجھے یہ بھی کہتے ہیں کہ تمہیں اپنی ماں کا آخری دیدار تک نہیں کرنے دُوں گا اگر تم کو گھر سے نکالا، دُوسری طرف میری بیوی جو کہ خود بھی بہت زیادہ اچھے مزاج کی نہیں ہے، مگر میرے سمجھانے پر ساری چیزیں برداشت کرتی ہے، بعض اوقات میرے ماں باپ کی خدمت میں لاپرواہی بھی کر جاتی ہے جس پر میں اسے ٹوکتا ہوں تو سمجھ جاتی ہے۔ زیادہ تر خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتی ہے، مگر فطرۃً زیادہ خوش مزاج نہیں ہے، میری بہنوں کا حتی الامکان خیال رکھتی ہے، کبھی کبھی معمول کی ناچاقی بھی ہوجاتی ہے، اپنے گھر والوں کی بُرائی سن کر اس کا مزاج خراب ہوجاتا ہے جو کہ میرے والد اکثر ناراضگی کی حالت میں بہت کرتے ہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میری کیفیت ایسی ہے جیسے مجھے کسی نے تلوار سے درمیان سے چیر دیا ہو، یعنی میں اپنے والدین سے بھی بہت محبت کرتا ہوں خاص طور پر اپنی ماں اور بہنوں سے، اور اپنے بیوی بچوں سے بھی بہت محبت کرتا ہوں، اور اپنے روزگار یعنی دفتری مسائل کے ساتھ ساتھ ان گھریلو مسائل سے بہت پریشان رہتا ہوں۔ مجھے اپنی بچیوں کے مستقبل کی بھی بہت فکر رہتی ہے کہ اگر میرا گھر خراب ہوا یعنی مجھے اپنی بیوی کو چھوڑنا پڑا اپنے والد کی مرضی کی وجہ سے، تو میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ یا اگر مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑا اور گھر والوں یعنی اپنے والد کی ناراضگی مول لینا پڑی تو میرے والدین خاص طور پر والدہ کا خیال کون رکھے گا؟ دُوسرے، اللہ بھی ناراض ہوگا۔

یعنی میں دُنیا اور آخرت دونوں کے کھوجانے کے خوف میں رہتا ہوں، ابھی کچھ دن پہلے بھی اس طرح کا مسئلہ ہوگیا تھا، ہوا یوں تھا کہ میری بیوی اپنی والدہ کے یہاں گئی ہوئی تھی، اس دوران میری والدہ بیت الخلاء میں پھسل گئیں اور مجھے ان کو لے جا کر ٹانکے لگوانا پڑے، کیونکہ ان کا سر پھٹ گیا تھا اور زخم آیا تھا۔

میری بیوی کو والد صاحب نے دُوسرے دن فون پر بتانے کے لئے کہہ دیا اور کہلوایا کہ تم جتنی

جلدی ہو سکے آجاؤ، میں نے اپنے دفتر سے فون کیا اور اس سے کہا کہ جلدی تو جانا مگر بدحواس مت ہونا، میری بیوی کو گھر پہنچنے میں تأخیر ہوگئی اور والد صاحب حسبِ مزاج بہت برہم ہوئے، اس موقع پر میری بیوی نے بھی کچھ غلط رَدّعمل کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے معاملات بہت بگڑ گئے، میرے سمجھانے پر میری بیوی نے والد صاحب سے معافی مانگ لی۔

یہاں پر اب میں یہ بتاؤں میری زندگی میں یہ مسئلے مسائل بہت بڑھ گئے ہیں، اور اب معاملات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ میرے ذہن میں ایک دن یہ خیال آیا کہ میں دبئی جاکر نوکری کرلوں اور بیوی بچوں کو بھی وہاں بلالوں اور والدین کو اکثر وہاں بلالیا کروں، یا میں خود ان سے ملنے آجایا کروں، مگر اس میں بھی والد صاحب کی ناراضگی اور والدہ کی خدمت سے محرومی کا ڈر لگا رہتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ کیونکہ کسی بھی فیصلے میں اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی کا ڈر رہتا ہے کہ والدین یا بیوی بچوں کے حقوق کے سلسلے میں قیامت کے روز میری پکڑ نہ ہوجائے۔

مندرجہ بالا تفصیلات کے بعد میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے مسئلے کا قرآن اور سنت کی روشنی میں ممکنہ حل بیان کریں تاکہ میں اپنے دین کی حدود میں رہتے ہوئے اس مسئلے کو حل کرسکوں اور ذہنی سکون پاسکوں۔

میں اس سلسلے میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا اور اللہ پاک سے دُعا کروں گا کہ آپ کو اس کا اجر دے۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جو حالات آپ نے لکھے ہیں ان میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ خوش اُسلوبی کے ساتھ اپنی رہائش علیحدہ کرلیں۔ اور علیحدہ رہ کر والدین کی جتنی خدمت کرسکتے ہوں کریں، آپ کسی وقت اگر ممکن ہو تو اپنے والد صاحب سے نرمی کے ساتھ بات کرلیں کہ مزاجوں کے اختلاف وغیرہ کی وجہ سے ساتھ رہنے میں آپ کے حق تلفیاں ہوجاتی ہیں اور مسائل پیدا ہوتے ہیں، اس لئے کوئی ایسی صورت پیدا کرلینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں یہ مسائل پیدا نہ ہوں، اور آپ کی خدمت احسن طریقے سے کرنے کا موقع ملے۔ اگر اس بات چیت کے نتیجے میں کوئی ایسا راستہ پیدا ہوجائے جس سے گھر میں رہتے ہوئے مسائل حل ہوسکیں تو خیر، ورنہ علیحدگی اختیار کرلیں، اس پر بھی اگر والد صاحب ناراض ہوں تو اِن شاء اللہ اس کا گناہ آپ پر نہیں ہوگا، آپ ہر ممکن طریقے سے ان کی خدمت اور ان کی رضاجوئی کی کوشش ہر حال میں جاری رکھیں، یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اگر باپ بیوی کو طلاق

دینے کا حکم دے تو اس کی تعمیل شرعاً واجب نہیں ہے، جب تک بیوی واقعۃً طلاق دینے کی لائق نہ ہو۔[1]

والسلام

۲۰/۴/۱۴۲۳ھ

(فتویٰ نمبر ۵۵۰/۷۵)

شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر جانا، جائز اَمر میں شوہر کی اطاعت واجب ہے

سوال ۱:- کیا مسلمان عورت خاوند کی بغیر اطلاع یا بغیر اجازت محلے میں قرآن خوانی یا میّت میں یا قریبی رشتہ داروں میں یا مارکیٹ میں کوئی سامان خریدنے جاسکتی ہے، جبکہ وہ دو تین بچوں کی ماں بن چکی ہو؟

۲:- کیا شریعت نے خاوند کو اس کی منکوحہ مسلمان بیوی پر فوقیت یا افضلیت عطا کی ہے؟ کیا عورت، خاوند کے ہر حکم کی پابند ہے؟ اور کیا رُوگردانی کی صورت میں گناہگار ہوگی؟

جواب ۱:- شوہر کی اجازت یا مرضی کے خلاف مذکورہ مقاصد میں سے کسی بھی مقصد کے لئے گھر سے باہر جانا بیوی کے لئے جائز نہیں۔[2]

۲:- شوہر کی اطاعت بیوی پر واجب ہے،[3] اِلّا یہ کہ وہ کسی ایسے کام کا حکم دے جو شرعاً ناجائز ہو تو ایسی صورت میں اس کی مخالفت ضروری ہے،[4] اور اس لحاظ سے شوہر کو بیوی پر فوقیت حاصل ہے، لقولہ تعالیٰ: ''اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ''،[5] ولقولہ تعالیٰ: ''وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ''۔[6]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۹/۸/۱۳۹۷ھ

---

(۱) اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ رسالہ ''تعدیل حقوق الوالدین'' ج:۴ ص:۴۸۵ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۳ ص:۱۴۵ (طبع سعید) فلا تخرج الا لحق لها أو عليها أو لزيارة أبويها كل جمعة مرة أو المحارم كل سنة ولكونها قابلة أو غاسلة لا فيما عدا ذلك. وفی الشامية (قوله فيما عدا ذلك) عبارة الفتح، وما عدا ذلك من زيارة الأجانب وعيادتهم والوليمة لا يأذن لها ولا تخرج .... الخ.

(۳) وفی مشكوة المصابيح باب عشرة النساء ص:۲۸۱ (طبع قديمی كتب خانه) عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لو كنت امرًا أحدًا أن يسجد لأحد لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها. رواه الترمذی. وفيه أيضًا ص:۲۸۳ عن أبی هريرةؓ قال: قيل لرسول الله صلى الله عليه وسلم: أی النساء خير؟ قال: التی تسره اذا نظر وتطيعه اذا أمر ولا تخالفه فی نفسها ولا مالها بما يكره. رواه النسائی والبيهقی فی شعب الايمان. وفی البدائع ومنها وجوب اطاعة الزوج على الزوجة لقوله تعالىٰ: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' .... فيدل على لزوم طاعتهن الأزواج.

(۴) وفی الصحيح للامام مسلمؒ رقم الحديث:۱۸۳۹ ج:۳ ص:۱۴۶۹ (طبع دار احياء التراث العربی) لا طاعة فی معصية الله، انما الطاعة فی المعروف. وفی مصنف ابن أبی شيبة رقم الحديث:۳۳۷۱۷ ج:۶ ص:۵۴۵ (طبع مكتبة الرشد، رياض) لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق.

(۵) سورة النساء:۳۴. (۶) سورة البقرة:۲۲۸ (محمد زبیر حق نواز)

گھر میں ٹیلی ویژن لانے کے لئے باپ کو گھر سے نکالنا، عالم کا والد اور بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرنا

سوال ۱:- کن کن وجوہ سے مسلمان اپنے عزیز و رشتہ دار، بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرسکتا ہے؟ اور کن وجوہ سے منع ہے؟

۲:- ایک لڑکا شادی شدہ ہے، صاحبِ ثروت ہے، کراچی میں دو مکان ہیں، ایک کو کرایہ پر دیا ہوا ہے، باپ موجود ہے جس کی عمر ۷۰ سال ہے، بڑھئی کا کام کرتا تھا، باپ کے پاس اس لڑکے کے مکان کے سوا اور کوئی جگہ رہائش نہیں ہے۔ لڑکا کھیل تماشے کا عادی ہے، بیوی ریڈیو پر گانا سنتی رہتی ہے، بیوی نے لڑکے سے شکایت کی، میاں بیوی کی رائے ٹیلی ویژن لانے کی ہوئی تو میاں بیوی نے مشورے سے والد کو تنگ کرنا شروع کیا، آخر باپ تنگ آکر چھوٹی بیٹی کے یہاں چلا گیا، ٹیلی ویژن بھی آگیا اور محلے والوں کو دیکھنے کی دعوت بھی دی جانے لگی، اس طرح کھیل تماشا دیکھنے کے لئے بہانہ بنا کر باپ کو گھر سے نکال دینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

۳:- ایک شخص نے لڑکے کو علمِ دین کے لئے لگایا، دیوبند خیال کے ہیں، لڑکا دو سال درسِ نظامی حاصل کرتا رہا اور چار سال بعد نیو کراچی میں والد نے مکان بھی خرید دیا اور شادی کردی، یہ مولوی صاحب جب دو سال کے تھے تو والدہ کا انتقال ہوگیا تھا، باپ نے ہی پرورش کی تھی، لیکن شادی کے بعد مولوی صاحب نے اپنے والد، بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرلیا ہے، غیروں سے میل جول ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب ۱:- اس سوال کے جواب میں بہت تفصیل ہے، کوئی خاص صورت معین کرکے لکھیں تو اس کا حکم بتادیا جائے گا۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں لڑکے کا عمل سراسر خلافِ شرع ہے، گھر میں ٹیلی ویژن رکھنا بذاتِ خود ایک فتنہ ہے، چہ جائیکہ اس کی خاطر باپ کو تنگ کرکے گھر سے نکلنے پر مجبور کرنا، اس میں تو بہت سے گناہ جمع ہوگئے۔[1]

۳:- صورتِ مسئولہ میں اس لڑکے کا عمل دُرست نہیں، جو صحیح معنی میں عالمِ دین ہو وہ ایسا نہیں کرسکتا، اس کو چاہئے کہ اپنے اس عمل سے توبہ کرکے اپنے والد اور اعزّہ کے حقوق ادا کرے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۶/۱/۱۳۹۷ھ

(حاشیہ نمبر ۱، ۲ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

غیبت کے چرچوں کی وجہ سے پڑوسیوں کے گھر آمد ورفت سے رُکنا

سوال:- ہر گھر میں آج کل فتنہ اور غیبت کا بہت زور ہے، ہمسایہ وغیرہ کو غیبت کے چرچے سے منع کروں تو عورتیں نہیں رُکتیں، بہرحال فتنہ وغیبت کی وجہ سے بیمار پُرسی اور ماتم پُرسی میں بھی جانا نہیں چاہتی، اگر جاؤں تو غیبت اور دیگر مفاسد میں مبتلا ہونا پڑتا ہے، اگر نہ جاؤں تو پڑوسی ناراض ہوتے ہیں، کیا حکم ہے؟ اور ایسی صورت میں اگر میّت والوں سے یہ کہا جائے کہ میں بہت زیادہ مشغول تھی تو کہیں یہ جھوٹ تو نہیں ہوگا؟

جواب:- حقوقِ شرعیہ مثلاً عیادت وتعزیت میں جانا چاہئے،(۱) البتہ جب یہ اندیشہ ہو کہ غیبت یا کسی اور بُرائی میں مشغول ہوں گی تو اس صورت میں اہلِ میّت سے اپنے آپ کو مشغول کہنے میں جھوٹ بھی اِن شاء اللہ نہ ہوگا، اور نیت اپنی گھریلو مشغولیات یا ذکر اللہ میں مشغول ہونے کی کرلیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۵۹۱ ب)

ناجائز اُمور میں باپ کی اطاعت کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ یہاں ایک شخص اپنے بیٹے کو نماز پڑھنے اور مسجد میں جانے اور قرآنِ پاک پڑھنے سے منع کرتا تھا، لوگ اسے کمیونسٹ کہتے، بعض مرزائی کہتے، اس کے پڑوس میں میّت ہوئی وہ اس کے جنازے میں شریک نہ ہوا، ایک مرزائی کے جنازے میں شریک ہوا اور پوری رسومات میں شریک ہوا، اس کے بعد اس کے بیٹے محمد قاسم نے باپ کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا کہ میرا باپ مرزائی ہے، اب محمد قاسم کہتا ہے کہ میرا باپ مرزائی ہے، مجھ کو اس سے کیا معاملہ کرنا چاہئے؟

جواب:- باپ کی اطاعت صرف جائز کاموں میں واجب ہے، لہٰذا اگر باپ کسی جائز کام کا حکم دے تو بیٹے کو اس کی اطاعت کرنا چاہئے، اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس کی خدمت میں

(حاشیہ متعلقہ صفحہ گزشتہ)..... (۱، ۲) "وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا. اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ" الأية. (الاسراء: ۲۳، ۲۴). "وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ" الأية. (الاسراء: ۲۶). نیز دیکھئے: جامع الترمذی ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی عقوق الوالدین ج: ۲ ص: ۱۲ (طبع فاروقی کتب خانه).

(۱) وفی مشکوة المصابیح باب السلام ص: ۳۹۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن علیؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: للمسلم علی المسلم ست بالمعروف یسلم علیه اذا لقیه ویجیبه اذا دعاه ویشمته اذا عطس ویعوده اذا مرض ویتبع جنازته اذا مات ویحب له ما یحب لنفسه. رواه الترمذی والدارمی.

کوتاہی نہیں کرنی چاہئے، لیکن اگر وہ کسی ناجائز کام کا حکم دے یا فرائضِ شرعیہ کی ادائیگی سے روکے تو اس کی اطاعت واجب نہیں، لقولہ تعالیٰ: وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ" الاٰیۃ۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۳۹ و)

والدہ کے حکم سے بیوی کو طلاق دینے کا حکم

سوال:- میری عمر ۳۶ سال ہے، والد صاحب قبلہ کا انتقال ۱۹۵۹ء میں ہوا، اس کے بعد ساری ذمہ داری مجھ پر آئی، ہم تین بھائی بڑے ہیں، پھر دو بہنیں ہیں، میں منجھلا ہوں، جب سے مجھ پر ذمہ داری آئی میں نے اپنی دونوں بہنوں اور بڑے بھائی کی شادی کردی، ان فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے میں شادی نہ کرسکا، والدہ ڈھائی تین سال تک رشتے کی تلاش میں رہیں، کہیں لڑکی پسند نہ آئی، کہیں لڑکی والوں نے انکار کردیا، سرپرست نہ ہونے کی وجہ سے غلط راستہ اختیار کرلیا، ایک غریب لڑکی ملی، ہم دونوں ایک دُوسرے سے ملنے لگے، پھر ایک مرتبہ ہم سے غلطی ہوئی اور حمل ہوگیا، ہم نے اسقاط کروادیا، دُوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، میں نے توبہ کی، مگر تعلق میں کمی نہ ہونے کے سبب اور لڑکی کے یہ کہنے کے سبب کہ اب وہ کبھی شادی نہیں کرے گی کیونکہ اس کی زندگی خراب ہوئی ہے۔ میں اس کے ساتھ اس خیال سے ملتا رہا کہ کہیں غلط راہ پر نہ چلی جائے، ہوسکے تو کہیں اس کی شادی کرادوں، اسی دوران ہم سے تیسری غلطی ہوئی اور حمل ٹھہر گیا (اس دوران میں اپنی والدہ کو منانے کی کوشش کرتا رہا کہ شادی ہوجائے، مگر وہ نہ مانیں، اگر مان جاتیں تو شاید یہ غلطی نہ ہوتی)، تیسری مرتبہ اسقاط کرانے کے حق میں نہ تھا، اگرچہ وہ راضی تھی۔ چنانچہ ایک قاضی صاحب سے بات کی اور باقاعدہ چند دوستوں کے سامنے نکاح کرالیا، دوستوں کو یہی پتہ تھا کہ میرا نکاح ہورہا ہے، تاریخ میں نے دو ماہ پہلے کی ڈلوائی، اب والدہ، بھائی، بہنوں کو علم ہے کہ کہیں میں نے شادی کرلی ہے، مگر والدہ شدید ناراض ہیں، چونکہ میں ان کے ارمانوں کا مرکز تھا، اب والدہ کہتی ہیں کہ اس لڑکی کو طلاق دے دو، تو میں معاف کردوں گی، دُودھ بھی بخش دوں گی، ورنہ نہیں۔ میں پنج وقتہ نمازی ہوگیا ہوں، اللہ سے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں، مجھے ماں کی بھی ضرورت ہے، اور اس بدنصیب بیوی کی بھی، لیکن یہ آگ پانی کس طرح ملیں گے، آپ کوئی وظیفہ لکھیں تاکہ دُنیا میں شرمندگی نہ ہو۔

---

(۱) سورۃ لقمٰن:۱۵. وفی الصحیح للامام مسلمؒ رقم الحدیث: ۱۸۳۹ ج:۳ ص:۱۴۶۹ (طبع دار احیاء التراث العربی) لا طاعة فی معصیة اللہ، انما الطاعة فی المعروف .... الخ. وفی مصنف ابن أبی شیبة رقم الحدیث:۳۳۷۱۷ ج:۶ ص:۵۴۵ (طبع مکتبة الرشد، ریاض) لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق.

جواب:- آپ سے اور آپ کی بیوی سے جو گناہ سرزد ہوئے ان پر صدقِ دِل سے توبہ اِستغفار کیجئے، اور اپنی زندگی کو اَحکامِ الٰہی کے مطابق بنانے کی فکر میں لگ جائیں، اِن شاء اللہ سچی توبہ ہوگی تو اللہ تعالیٰ یہ گناہ معاف کردے گا۔ اب اگر آپ اپنی بیوی سے مطمئن ہیں اور کوئی وجہ طلاق دینے کی نہیں پاتے تو آپ پر اس معاملے میں والدہ کے حکم کی تعمیل واجب نہیں[۱]، البتہ والدہ کو راضی کرنے کے لئے انہیں اصل حقیقت مناسب طریقے پر بتادیجئے۔ نیز قرآن وحدیث کے وہ اَحکام دِکھایئے جس میں تصریح ہے کہ سچی توبہ سے ہر گناہ معاف ہوجاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر وہ راضی ہوجائیں فبہا، ورنہ آپ پر اس معاملے میں ان کی تعمیل واجب نہیں[۲]، انہیں دُوسرے طریقوں سے خوش کرنے کی کوشش کیجئے اور اپنی بیوی کو بھی ہدایت کیجئے کہ وہ ان کی خدمت سے ان کی رضامندی حاصل کرے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۴۲ ج)

مرزائیوں سے تعلق رکھنے والے رشتہ داروں سے تعلق کا حکم

سوال:- زید کا قریبی رشتہ دار بکر مرزائی ہے، زید کا شرعی قانون کے مطابق بکر کے ساتھ کسی قسم کا میل جول نہیں ہوسکتا، مگر زید کے رشتہ دار ایسے آدمیوں کے گھر خوشی غمی میں جاتے ہیں جہاں بکر کی آمد ورفت ہے، ایسے آدمیوں سے مراد بھی رشتہ دار ہی ہیں کہ جن سے برادری کے تعلقات ہیں، مگر یہ لوگ باوجود مسلمان ہونے کے بکر وغیرہ سے میل جول رکھتے ہیں اب جو اُن تعلق داروں کے گھر، معاملات وغیرہ میں شریک ہو اور بکر کی آمد و رفت وہاں ہو تو کیا شرعاً ایسے گھر جانا جائز ہے؟ جو لوگ ایسے ہوں کہ ان کے ہاں مرزائی کا آنا جانا ہو یا ان کی برادری کے گھر مرزائی کا آنا جانا ہو، ان سے تعلق کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں زید کے لئے اپنے مسلمان رشتہ داروں کے یہاں آنے جانے کی گنجائش ہے، البتہ اسے چاہئے کہ وہ اپنے مسلمان رشتہ داروں کو مرزائیوں سے قریبی تعلقات رکھنے سے حکمت کے ساتھ روکتا رہے۔[۳]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۷۹۲ ب)

(۱،۲) اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے دیکھئے: حکیم الأمت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ کا رسالہ ''تعدیل حقوق الوالدین'' امداد الفتاویٰ ج:۴ ص:۴۸۰ تا ۴۸۵ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۳) وفی تکملة فتح الملهم ج:۵ ص:۳۵۶ قال ابن عبدالبر .... أجمع العلماء علی أن من خاف من مكالمة أحد وصلته ما يفسد عليه دينه أو يدخل مضرة فی دنياه يجوز له مجانبته وبعده ورب صرم جميل خير من مخالطة تؤذيه .... الخ.

اُستاذ کو گالی دینے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے میں کہ کوئی شاگرد اُستاذ کو گالیاں دیدے تو اس کا کیا حکم ہے؟ عاق ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- کسی مسلمان کو گالیاں دینا حرام ہے، سباب المسلم فسوق، الحدیث۔[1] خاص طور پر اُستاذ کو گالی دینا بڑا گناہ ہے، حدیث میں علماء کی تعظیم کا ذکر ہے، اور جو علماء کی توہین کرے گا فرمایا گیا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۳/۱۱/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۳۳/۱۸ الف)

والدین اور اساتذہ کے لئے تعظیماً کھڑے ہونے کی شرعی حیثیت

سوال:- والدین یا اساتذہ کے لئے تعظیماً کھڑا ہونا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- والدین، اُستاذ، اہلِ علم یا دُوسرے قابلِ تعظیم افراد کے لئے کھڑا ہونا بغرضِ تعظیم جائز ہے بلکہ فقہاء نے اسے مستحب لکھا ہے، درمختار میں ہے: وفی الوهبانية يجوز بل يندب القيام تعظيمًا للقادم كما يجوز القيام ولو للقارئ بين يدى العالم وقال الشامیؒ تحته أى ان كان ممن يستحق التعظيم قال فى القنية قيام الجالس فى المسجد لمن دخل عليه تعظيمًا وقيام قارئ القرآن لمن يجئ تعظيمًا لا يكره اذا كان ممن يستحق التعظيم. (شامى ج:۵ ص:۲۴۶ كتاب الحظر والاباحة قبيل فصل البيع)۔[2] واللہ سبحانہ اعلم

۲۸/۱۱/۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۵۵/۲۷ و)

والدین کے کہنے پر بلا عذرِ شرعی، بیوی کو طلاق دینے کا حکم

سوال:- عام طور پر مشہور ہے کہ صرف والدین کے کہنے پر بلا عذرِ شرعی بھی بیوی کو طلاق دے دینی چاہئے، کیا یہ دُرست ہے؟ گھر میں جھگڑے کی وجہ سے اگر والدین اس پر مجبور کریں تو کیا حکم ہے؟

---

(۱) وفى صحيح البخارى باب ما ينهى عن السباب واللعن ج:۲ ص:۸۹۳ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: سباب المسلم فسوق، وقتاله كفر. وفيه أيضًا ان النبى صلى الله عليه وسلم يقول: لا يرمى رجل رجلًا بالفسوق ولا يرميه بالكفر الا ارتدت عليه ان لم يكن صاحبه كذلك.

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۶ ص:۳۸۴ (طبع سعيد) وفى صحيح البخارى ج:۲ ص:۹۲۶ باب قول النبى صلى الله عليه وسلم "قوموا إلى سيّدكم" عن أبى سعيد أن أهل قريظة نزلوا على حكم سعد فأرسل النبى صلى الله عليه وسلم اليه، فجاد، فقال: قوموا إلى سيّدكم .... الخ. وفى حاشية البخارى وفيه استحباب القيام عند دخول الأفضل وهو غير القيام المنهى، لأن ذلك بمعنى الوقوف وهذا بمعنى النهوض .... الخ.

جواب:- اگر شوہر طلاق دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں سمجھتا تو اسے اپنے والدین کو نرمی کے ساتھ سمجھانا چاہئے کہ طلاق بالکل آخری قدم ہے جسے بغیر شدید مجبوری کے اختیار نہ کرنا چاہئے، حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ: "أبغض المباح الی اللہ الطّلاق"،[1] یعنی مباحات میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز طلاق ہے، اُمید ہے کہ نرمی اور حکمت سے فہمائش کی جائے گی تو والدین سمجھ جائیں گے، اور اگر پھر بھی وہ نہ سمجھیں تو طلاق نہ دے،[2] اور راضی کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۲۲ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۴۶۴ الف)

بھائی بہنوں سے بیوی کی ملاقات پر پابندی لگانے کا حکم

سوال:- کیا کسی مسلمان شوہر کو اسلامی شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنی ذاتی وجوہات رنجش، عداوت، غرور وتکبر کی وجہ سے اس کے بھائیوں بہنوں سے ملاقات کرنے پر پابندی لگائے؟

جواب:- بھائیوں کے بیوی سے ملنے پر بلاوجہ پابندی لگانا شوہر کے لئے مناسب نہیں ہے، البتہ کوئی معقول وجہ ہو، مثلاً ان سے ملنے سے فساد کا اندیشہ ہو، تو بات دُوسری ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶/۱۳۹)

***

(۱) سنن أبی داؤد ج: ۱ ص: ۳۰۳ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان).

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج: ۴ ص: ۴۸۰ تا ۴۸۵، وعزیز الفتاویٰ ص: ۱۵۳۔

کتاب السیر والمناقب

(انبیاء اور مختلف شخصیات کے حالات ومناقب)

قسطنطنیہ پر حملے میں شرکت کی بناء پر یزید کے جنتی ہونے کا عقیدہ رکھنا

سوال:- عن خالد بن معدان ان عمير بن الأسود العنسى حدثه أنه أتى عبادة بن الصامت وهو نازل فى ساحل حمص وهو فى بناء ومعه أم حرام قال عمير فحدثتنا أم حرام أنها سمعت النبى صلى الله عليه وسلم يقول: أوّل جيش من أمتى يغزون البحر قد أوجبوا، قالت أم حرام: قلت: يا رسول الله! أنا فيهم؟ قال: أنت فيهم، قالت: ثم قال: أوّل جيش من أمتى يغزون مدينة قيصر مغفور لهم، فقلت: أنا فيهم يا رسول الله؟ قال: لا.

قسطلانی شارحِ بخاری نے لکھا ہے کہ: كان أوّل من غزا مدينة قيصر يزيد بن معاوية ومعه جماعة من سادات الصحابة كابن عمرو وابن عباس وابن الزبير وأبى الأنصارى وتوفى بها أبو أيوب سنة اثنين وخمسين من الهجرة۔ علامہ ابنِ حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: قال المهلب فى هذا الحديث منقبة لمعاويةؓ لأنه أوّل من غزا البحر ومنقبة لولده لأنه أوّل من غزا مدينة قيصر۔ اس پرچہ میں یزید کے متعلق احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جنتی ہے جیسا کہ بخاری کا حوالہ دیا گیا، حقیقت سے آگاہ کریں۔

جواب:- جو حدیث منسلکہ پرچہ میں نقل کی گئی ہے وہ صحیح بخاری میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے، پھر علماء نے اس پر کلام کیا ہے کہ اس لشکر سے کون سا لشکر مراد ہے؟ جہاں تک پہلے سمندری جہاد کا تعلق ہے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حضرت معاویہؓ کے ہاتھوں انجام پایا، البتہ قسطنطنیہ پر پہلی بار حملہ آور ہونے والا لشکر کون سا تھا؟ اس بارے میں اقوال مختلف ہیں، ایک قول یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے سفیان بن عوفؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر قسطنطنیہ روانہ کیا تھا، جس میں حضرت ابنِ عباسؓ، ابنِ زبیرؓ اور ابوایوب انصاریؓ موجود تھے، اور اسی میں حضرت ابوایوبؓ کی وفات ہوئی، علامہ عینیؒ نے اس قول کو زیادہ راجح قرار دیا ہے، قلت الا ظهر ان هؤلاء السادات من الصحابة كانوا مع سفيان هذا ولم يكونوا مع يزيد بن معاوية لأنه لم يكن أهلًا أن يكون هؤلاء السادات فى خدمته۔ یہ زیادہ ظاہر ہے کہ یہ اکابر صحابہ سفیانؓ کے ساتھ ہوں گے، یزید

بن معاویہ کے ساتھ نہیں کیونکہ وہ اس بات کا اہل نہ تھا کہ یہ حضراتِ صحابہؓ اس کی خدمت میں رہیں۔ (عمدة القاری ج:۱۴ ص:۱۹۸، ۱۹۹ ادارة الطباعة المنیرة، وکذا فی طبع دار الفکر)۔

لیکن تاریخی طور پر یہ قول زیادہ مشہور ہے کہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں ہوا ہے، اس سے بعض علماء نے یزید بن معاویہ کی فضیلت اخذ کی ہے، لیکن حافظ ابنِ حجرؒ، علامہ بدرالدین عینیؒ اور دُوسرے علمائے محققین نے اس کی تردید کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ حدیثِ مذکور میں ایک عام حکم دیا گیا ہے کسی فرد کی تخصیص نہیں، لہٰذا یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص دُوسرے اسباب کی بناء پر اس عام حکم سے خارج ہو، (فتح الباری ج:۶ ص:۷۸) گویا یہ ایسا ہی ہے جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: "من قال لا اِلٰہ اِلَّا اللہ دخل الجنة" جو شخص لا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک عام حکم ہے اور لا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہنے کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو، لیکن اگر دُوسرے گناہوں کا ارتکاب کرے یا بعد میں مرتد ہوجائے تو وہ اس عام حکم سے خارج ہوجائے گا، صحیح بات یہ ہے کہ اس حدیث کا اصل مقصد قسطنطنیہ کے جہاد کی ترغیب دینا اور اس جہاد میں شرکت کی فضیلت کا اظہار ہے، جس کو یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے اس کا انکار کرنا بھی غلط ہے۔

لیکن اس فضیلت کی بناء پر اس کے دُوسرے ناجائز افعال کا جواز تلاش نہیں کیا جاسکتا، یزید بن معاویہ نے اگر اس جہاد میں شرکت یا اس کی سربراہی کی تو بلاشبہ اس کا یہ عمل نیک اور باعثِ اَجر ہے، لیکن اس نیک عمل سے ان ناجائز افعال کا جواز ثابت نہیں کیا جاسکتا جو اس نے اپنے عہدِ حکومت میں انجام دیئے ہوں، چنانچہ اہلِ سنت والجماعت کا مسلک اس کے بارے میں یہی ہے کہ وہ مسلمان تھا، اسی لئے محقق علماء نے اس پر لعنت کرنے کو جائز قرار نہیں دیا، اور نہ یہ کہنا دُرست ہے کہ قیامت میں اس کی بخشش نہیں ہوگی۔ اس نے اپنے عہد میں بلاشبہ بعض ناجائز افعال کئے، ان افعال کو ناجائز قرار دیا جائے گا، اس کے بعد معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، وہ چاہے تو مغفرت کردے اور چاہے تو سزا دے، ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس سے دُنیا میں اس کے مغفور لہٗ یا معذّب ہونے کا فیصلہ کرسکیں۔ یزید کے بارے میں اہلِ سنت کے مسلک کی بہترین ترجمانی علامہ ابنِ تیمیہؒ نے ان الفاظ میں کی ہے: الناس فی یزید طرفان ووسط، قوم یعتقدون أنه من الصحابة أو من الخلفاء الراشدین المهدیین أو من الأنبیاء وهٰذا کله باطل، وقوم یعتقدون أنه کافر منافق فی الباطن .... وکلا القولین باطل یعلم بطلانه کل عاقل، فان الرجل ملک من ملوک المسلمین وخلیفة من الخلفاء الملوک لا هٰذا ولا هٰذا. (منهاج السنة علامة ابن تیمیةؒ ج:۲ ص:۳۲۱ طبع مکتبة الریاض الحدیثة، ریاض)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یزید کو خلفائے راشدین مہدیین میں سے

سمجھنا بھی غلط ہے، اور اسے کافر، منافق قرار دینا بھی صحیح نہیں، اہلِ حق کا مسلک اس افراط وتفریط کے درمیان ہے، اس اعتدال پر قائم رہنا چاہئے اور اس قسم کی فضول بحثوں میں نزاع وجدال یا ان میں اپنی عمر کے اوقات صَرف کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۱/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۴۳ الف)

قبیلۂ ''جون'' کی عورت اُمیمہ بنت شراحبیل سے متعلق شیعوں کا من گھڑت قصہ

سوال:- یہ واقعہ بخاری میں موجود ہے یا نہیں؟ شیعوں کی کتاب سے نقل کردہ یہ واقعہ عدالت میں پیش کرنا ہے۔ میرے سامنے جو کتاب ہے اس کے ص:۶۷ پر یہ واقعہ یوں نقل کیا گیا ہے اور میں اس کو حرف بحرف نقل کر رہا ہوں۔ ''ایک جونیہ عورت کو حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) کسی تدبیر سے اس کے گھر سے منگا بھیجا اور شہر کے باہر جا کر درختوں کے پتوں کی آڑ کر کے اس سے اپنا مطلب پورا کرنا چاہا، اس پر وہ چیخنے اور دُعائیں دینے لگی، جب کسی طرح راضی نہیں ہوئی معاملہ طول کھینچ گیا، پکڑ دھکڑ کا خوف ہوا، راز فاش ہوجانے کی گھڑی پہنچ گئی، انتہائی درجے کی رُسوائی کا اندیشہ ہوگیا، اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بالکل مایوس ہوگئے تو اس کو کچھ دے دِلا کر واپس کردیا۔''

یہ نہایت درجہ رُسوا کرنے والا واقعہ بھی اس صحیح بخاری کی جلد نمبر ۶ ص:۱۶۲ میں موجود ہے۔ اس کو بھی پڑھ کر آج کی دُنیا حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عفت وشرافت کی کتنی دھجیاں اُڑاتی ہوں گی؟

جواب:- آپ کا خط ملا، شیعوں کی جس کتاب سے آپ نے عبارت نقل کی ہے، وہ ان لوگوں نے اپنی عادت کے مطابق غلط طور پر گھڑ کر بیان کی ہے، اصل واقعہ جو صحیح بخاری میں مروی ہے اس کا خلاصہ دُوسری روایات کی روشنی میں یہ ہے کہ قبیلۂ جون کا ایک سردار مسلمان ہوکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور اس نے ذکر کیا کہ ہمارے قبیلے میں ایک خاتون اُمیمہ بنت شراحبیل بیوہ ہوگئی ہیں اور انہوں نے آپ کے ساتھ نکاح کی رغبت ظاہر کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حالات معلوم کرنے کے بعد نکاح کی رضامندی فرمادی اور نکاح کر بھی لیا اور ان کے وطن سے مدینہ طیبہ بلوالیا، جو صاحب ان کو لے کر آئے تھے انہوں نے ان کو بنوساعدہ کی ایک حویلی میں ٹھہرایا اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی، آپ وہاں تشریف لے گئے اور منکوحہ ہونے کی حیثیت سے ان کے کمرے میں داخل ہوئے، اور جب ان سے کوئی بات شروع کی تو انہوں نے یہ کلمہ کہا: ''میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ: تم نے ایک ایسی ذات کی پناہ مانگی ہے جو پناہ مانگنے کے لائق ہے، چنانچہ آپ نے اس کے بعد اسے طلاق دے دی اور ان کو جوڑے دے کر واپس ان کے گھر بھجوانے کا حکم دے دیا۔

واقعہ کا یہ خلاصہ صحیح بخاری کتاب الأشربة حدیث نمبر ۵۶۳۴، صحیح مسلم کتاب الأشربة، باب اباحة النبیذ، اور طبقات ابنِ سعد ج:۸ ص:۱۴۳ سے مأخوذ ہے۔[1]

رہا یہ سوال کہ اس خاتون نے پناہ کیوں مانگی؟ اس کے بارے میں بعض ضعیف روایتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ کچھ ازواجِ مطہراتؓ نے ان کو یہ سکھادیا تھا کہ ''اعوذ باللہ منک'' کا کلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے، اور مقصد یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ کلمہ سن کر ان کو طلاق دے دیں۔ لیکن یہ روایات واقدی اور ہشام بن الکلبی کی روایتیں ہیں، جو طبقات ابنِ سعد میں ان کے حوالے سے بیان کی گئی ہیں، اور یہ دونوں ناقابلِ اعتبار راوی ہیں، جو اپنے جھوٹ اور اپنے رفض میں مشہور ہیں، لہٰذا اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ اُمہات المؤمنینؓ سے یہ توقع ہوسکتی ہے۔

احقر نے تمام متعلقہ روایات کو سامنے رکھنے کے بعد تکملة فتح الملهم[2] میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاید یہ خاتون دماغی اعتبار سے نارمل نہیں تھیں، ان کے کچھ اور جملے بھی صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہیں، جن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ ہے واقعہ کی مختصر حقیقت اس کو مذکورہ کتاب کی عبارت سے ملاکر دیکھ لیجئے کہ دونوں میں کتنا تضاد ہے؟ جس کو تحریف اور بددیانتی کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔

والسلام

۱۴۱۰/۱/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۴/۴۱ الف)

بعض تاریخی روایات کی بنیاد پر صحابہ کرامؓ کے حق میں بدگمانی کرنا

سوال:- کیا کوئی ان الفاظ سے صحابہ کرامؓ کی توہین کا کوئی پہلو نقل کرسکتا ہے؟

ا:- عمرو بن العاص نے امیر معاویہ کو کہا: اب میں ایک ایسی چال چلوں گا یا تو جنگ ختم ہوجائے گی یا حضرت علی کی فوج میں نفاق پڑ جائے گا، اس نے اپنی فوج کے متعدّد نیزوں پر قرآن بند چڑھوادیئے۔

---

(۱) صحیح بخاری ج:۲ ص:۸۴۲. صحیح مسلم ج:۲ ص:۱۶۸، ۱۶۹. وطبقات ابن سعد ج:۸ ص:۱۴۳، ۱۴۴.

(۲) کتاب الأشربة ج:۳ ص:۶۵۰.

۲:- حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن العاصؓ نے ایک گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر مشورہ کیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو اپنے منصب سے معزول کریں، عمرو بن العاص نے فریب کیا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کو منبر پر فیصلے کے لئے کھڑا کردیا، حضرت ابوموسیٰ اشعری نے اعلان کیا کہ ہم دونوں کو معزول کرتے ہیں، بعد میں حضرت عمرو بن العاص نے حضرت علی کی معزولی کا اعلان کیا اور حضرت معاویہ کی معزولی کی نفی کی، ابوموسیٰ اشعری اس کے بیان پر ششدر رہ گئے اور فرمایا کہ یہ اعلان صریح غداری اور بے ایمانی ہے۔

۳:- امیر معاویہ نے زبردستی سے یزید کے لئے بیعت لی تھی، لیکن امام حسین متفق نہ ہوئے، خلفائے راشدین کا تو یہ حال تھا کہ خلافت کا معاملہ رائے شماری پر چھوڑتے تھے مگر امیر معاویہ نے قیصر وکسریٰ کی سنت کے مطابق بادشاہت کا سلسلہ جاری کردیا۔

جواب:- عباراتِ مذکورہ میں صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ تاریخ کی بعض کتابوں میں موجود ہیں، لیکن خاص طور سے مشاجراتِ صحابہ کے بیان میں تاریخی روایات اس قدر مختلف، بسااوقات متضاد ہیں کہ ان سے صحیح واقعات کا پتہ معلوم کرنا بڑا مشکل ہے، لہٰذا ان کی بنیاد پر صحابہؓ کے حق میں بدگمانی کرنا، دانش مندی کے خلاف ہے، ان کا معاملہ انہی پر چھوڑا جائے اور ان کی حرمت وعظمت دِل میں رکھنی چاہئے: "تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"۔[1]

فقط واللہ اعلم بالصواب

۳/۱۱/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۳۵/۱۸ الف)

حضرت فاطمہؓ کے نکاح کی تاریخ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کا نکاح کس تاریخ میں ہوا؟ اور مہر کتنا مقرّر ہوا تھا؟

جواب:- حضرت فاطمہؓ کا نکاح رمضان سنہ۲ھ میں ہوا، اور چار سو مثقال چاندی مہر مقرّر کیا گیا، تاریخِ نکاح کے بارے میں رجب سنہ۲ھ کا بھی ایک قول ہے۔ (اصابہ،[2] واستیعاب[3])۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۷/۴/۱۳۸۳ھ

---

(۱) سورة البقرة: ۱۳۴ و ۱۴۱.

(۲) ج:۴ ص:۳۶۶ (مطبع مصطفیٰ محمد، مصر).

(۳) ج:۴ ص:۱۸۹۳، ۱۸۹۴ (طبع دار الجیل بیروت).

جواب صحیح ہے، چار سو مثقال چاندی ہمارے مروّجہ وزن کے اعتبار سے ڈیڑھ سو تولہ تقریباً ہوتے ہیں۔ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

حضرت خدیجہؓ کے مال سے تجارت کرنے پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی کمیشن مقرّر تھا؟

سوال:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر تجارت کے لئے جاتے تو ابتداء میں آپ کے لئے کوئی کمیشن مقرّر ہوتا تھا یا نہیں؟

جواب:- علامہ واقدی نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جن لوگوں کو اپنے مال کی تجارت کے لئے روانہ کرتی تھیں ان سے مضاربت کا معاملہ کرتی تھیں، یعنی منافع میں سے ایک متناسب حصہ ان کو دیا کرتی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انہوں نے عام لوگوں سے دُگنا حصہ مقرّر کیا تھا، وأنا أعطيک ضعف ما أعطى رجلا من قومک .... وكانت تستأجر الرجال وتدفع اليهم المال مضاربة (از زرقانی شرح المواہب ج:۱ ص:۱۹۸)۔[1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۹/ ۱۸ الف)

حضرت معاویہؓ کے بارے میں کتاب ''شہیدِ کربلا'' اور بعض اکابر کی عبارات کا جواب

سوال:- گزارش یہ ہے کہ آپ کی تصنیف کردہ کتاب ''حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق'' کو پڑھ کر بے حد مسرّت ہوئی۔ کافی لوگ جنھوں نے خلافت وملوکیت کا مطالعہ کیا تھا حضرت معاویہؓ کو طعن وتشنیع کی نگاہ سے دیکھتے تھے، آپ کی کتاب پڑھ کر کافی حد تک ان کے شبہات کا ازالہ ہوگیا ہے۔ مگر آپ کے والد ماجد مفتیٔ اعظمؒ کی کتاب ''کربلا'' کے صفحہ گیارہ سے لے کر بیس تک کے مطالعے سے مخالفین کے شبہات کو تقویت پہنچتی ہے جو حضرت معاویہؓ کو بغض وعناد سے دیکھتے ہیں۔ ''کربلا'' میں مفتی صاحبؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ خلافت کا سلسلہ جب امیر معاویہؓ پر پہنچتا ہے تو حکومت میں خلافتِ راشدہ کا وہ رنگ نہیں رہتا جو خلفائے راشدینؓ کی حکومتوں کو حاصل تھا۔ (ص:۱۱)

جناب من! اگر یہ بات مان ہی لی جائے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کو خلافتِ راشدہ میں

---

(۱) (طبع دار المعرفة بيروت).

شمار نہ کیا جائے تاہم معاویہؓ کے بعد جو اُمراء اور سلاطین ہوئے ہیں، خود عمر بن عبدالعزیزؒ بھی۔ ان سب سے معاویہؓ کا دور بہتر اور افضل ہے، یہ اقرار اور اعتراف خود ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی کر رہے ہیں، جس کو آپ کا بھی مؤید کہتے ہیں۔

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت پر کسی قلم کار نے یہ نہیں لکھا کہ ان کی حکومت خلافتِ راشدہ کے رنگ کی نہ تھی، بلکہ کچھ نے تو انہیں خلیفۂ راشد ہی مانا ہے، اس کے علاوہ اہلِ سنت کی کتابوں کو دیکھ کر شبہات کچھ پکے ہونے لگتے ہیں۔

۱:- ہدایہ جلد ثالث میں ہے کہ سلطان جائر کی تقلید جائز ہے، جیسا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ۔

۲:- ''مؤمن کے ماہ و سال'' مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص:۳۵ میں ہے: ''اسی سال سنہ۴۳ھ میں امیر معاویہؓ نے زیاد بن اُمیہ کو اپنا نائب بنایا اور یہی وہ پہلا عمل ہے جس کے ذریعے اَحکامِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی کی گئی، (ثعالبی وغیرہ)۔'' خلافت و ملوکیت کے صفحہ:۱۷۴ میں نظر ڈالیں تو اس نے بھی یہی لکھا ہے کہ معاویہؓ نے کتاب اللہ و سنتِ رسول کی خلاف ورزی کی، برائے کرم آپ صحیح مسئلہ سے آگاہ کریں۔

جواب:- آپ کا خط ملا، احقر نے اپنی کتاب ''حضرت معاویہؓ'' میں ایک مستقل باب اسی موضوع پر لکھا ہے کہ علمائے اہلِ سنت کے نزدیک حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت کی صحیح حیثیت کیا تھی؟ اسے ملاحظہ فرمالیں، خلاصہ اس کا بھی یہی ہے کہ آپؓ کے عہد کو خلافتِ راشدہ کے برابر تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن آپؓ ایک امامِ عادل تھے۔ لہٰذا اگر حضرت والد صاحبؒ نے یہ لکھا ہے کہ آپؓ کے عہد میں خلافتِ راشدہ کا مثالی رنگ باقی نہیں رہا تھا، تو اس میں علمائے اہلِ سنت کے موقف کے خلاف کوئی بات نہیں ہے، اور اس کا مقابلہ ''خلافت و ملوکیت'' کی ان عبارتوں سے نہیں کیا جاسکتا جن پر احقر نے تنقید کی ہے۔

جہاں تک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کا تعلق ہے، اس کو خلافتِ راشدہ قرار دینے پر اتفاق نہیں ہے، اور حضرت معاویہؓ بلاشبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے صحابیت کی بناء پر بدرجہا فوقیت رکھتے ہیں، لیکن اگر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ حکومت کو بحیثیت مجموعی کوئی شخص بہتر کہے تو اس سے مُسلَّم اُصول بظاہر متأثر نہیں ہوتا۔

جہاں تک صاحبِ ہدایہ کی عبارت کا تعلق ہے! اس میں سلطانِ جائر ایک فقہی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے، فقہ میں جو شخص امامِ برحق کے مقابلے میں برسرِ جنگ ہو خواہ وہ کتنا متقی ہو اور اپنے اجتہاد سے ایسا کر رہا ہو اس کو اصطلاحاً ''سلطانِ جائر'' ہی کہتے ہیں، لیکن صاحبِ ہدایہ نے احتیاط

فرمائی ہے کہ حضرت معاویہؓ کو آپ نے سلطانِ جائر نہیں کہا،[1] بلکہ یہ کہا ہے کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، اس کے باوجود صحابہ کرامؓ نے ان سے قضاء کو قبول کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امامِ برحق کے مدِ مقابل (جسے اصطلاحاً سلطانِ جائر کہتے ہیں) کی تقلید جائز ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی جو عبارت[2] آپ نے نقل فرمائی ہے، وہ درحقیقت بعض ضعیف تاریخی روایات پر مبنی ہے، اور احقر یہ واضح کر چکا ہے کہ وہ روایات قابلِ اعتماد نہیں ہیں، حضرت شیخ عبدالحق صاحبؒ نے ضمنی طور پر انہیں ذکر کر دیا ہے، شاید تحقیق کا موقع نہ ملا ہو، اور حضرت معاویہؓ کا عذر اگر ان کے سامنے آتا تو شاید ان کی رائے بھی مختلف ہوتی، اس کے ساتھ ہی ان کی عبارت اور خلافت وملوکیت کی عبارت کا موازنہ کر کے دیکھ لیجئے کہ کون سی عبارت توہین آمیز ہے؟ اور اُصولی طور پر یہ بات بھی احقر لکھ چکا ہے کہ ایک صحابیؓ پر کسی ضعیف روایت کی بنیاد پر الزام عائد کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ بعد کے کسی عالم کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ان سے تسامح ہوا ہے۔

والسلام

۱۴۰۸/۱۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۲۸۳ ز)

حضرت عباسؓ کی اولاد سادات میں شامل ہے

سوال:- ایک آدمی کہتا ہے کہ سیّد زادیاں اُمتوں پر جائز ہیں، اس نے ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ عباسی بھی سیّد ہو سکتے ہیں، ہم اس سے ناواقف ہیں؟ آپ بیان فرمادیں۔

جواب:- سوال کا خط کشیدہ جملہ سمجھ میں نہیں آیا، واضح کر کے لکھیں، اور سادات تمام بنو ہاشم ہیں، لہٰذا حضرت عباسؓ کی اولاد بھی سادات میں شامل ہے۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۳/۱۸ الف)

---

(۱) هداية ثالث، كتاب أدب القاضي ص:۱۳۳ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان).

(۲) دیکھئے: ''مؤمن کے ماہ وسال'' ص:۳۰ (طبع دارالاشاعت)۔

(۳) وفي رد المحتار ج:۲ ص:۳۵۰ (قوله ولا الى بنو هاشم) اعلم أن عبدمناف وهو الأب الرابع للنبي صلى الله عليه وسلم أعقب أربعة وهم: هاشم، والمطلب، ونوفل، وعبدشمس، ثم هاشم أعقب أربعة انقطع نسل الكل الا عبدالمطلب فانه أعقب اثني عشر، تصرف الزكاة الى أولاد كل اذا كانوا مسلمين فقراء الا أولاد عباس وحارث وأولاد أبي طالب من علي وجعفر وعقيل .... الخ.

یزید کے بارے میں جنتی ہونے کا عقیدہ

سوال:- قوم کو اس وقت ایسے مسائل درپیش ہیں جن کے حل کی طرف فکر کی ضرورت ہے، لیکن کچھ لوگوں نے بخاری شریف کی حدیث سے غلط استدلال کر کے یزید جیسے فاسق و فاجر کو جنتی ہونا ثابت کیا ہے، براہِ کرم آپ اس حدیث کی وضاحت فرمائیں۔

جواب:- ہر شخص کو اپنے ایمان اور عملِ صالح کی فکر کرنی چاہئے، یزید کے صالح یا فاسق ہونے کی تحقیق شرعاً کچھ ضروری نہیں، اور نہ آخرت میں اس کے بارے میں سوال ہوگا، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ: ''تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ''۔[1] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه''۔[2] لہٰذا ان فضول بحثوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۱۴۶ الف)

یزید کے نام کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' لکھنا

سوال:- ایک کتاب بنام رشید بن رشید مصنفہ ابو یزید محمد دین بٹ نظر سے گزری، جس میں یزید کو ''صلی اللہ علیہ وسلم'' لکھا ہے، کتابِ مذکور میں بہت سے علمائے دیوبند کی رائے بھی درج ہے، گزارش ہے کہ اس مسئلہ کی حقیقت سے مطلع فرمائیں۔

جواب:- یزید کو کافر کہنا دُرست نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' یا ''رضی اللہ عنہ'' لگانا ان کلمات کی بے ادبی ہے، اس سے پرہیز کرنا چاہئے، یہ اُمتِ مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے، اس پر عمل کرنا چاہئے، اور اس سے زائد فضول و لایعنی بحثوں میں پڑنا کسی طرح دُرست نہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۳ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۸۹ الف)

کیا حضرت یوسف علیہ السلام کا زلیخا سے نکاح ہوگیا تھا؟

سوال:- کیا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اس عورت کا عقد نکاح ہوگیا تھا جس نے

---

(۱) سورة البقرة: ۱۳۴ و ۱۴۱.

(۲) جامع الترمذی أبواب الزهد ج: ۲ ص: ۵۵ (طبع فاروقی کتب خانه ملتان).

بُرے ارادے سے مکان کے دروازے بند کردیئے تھے؟

جواب: – بعض تاریخی روایات میں ایسا آیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح زلیخا سے ہوگیا تھا،[1] لیکن قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۲۳ الف)

کیا یزید بن معاویہؓ پر لعنت بھیجنا ثواب ہے؟

سوال: – یزید بن معاویہؓ پر ہر روز ایک سو بار لعنت بھیجنا کیا کارِ ثواب عمل ہے؟

جواب: – ہرگز نہیں،[2] یزید کے بارے میں یہ عقیدہ کافی ہے کہ اس نے حضرت حسینؓ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ غلط تھا، لیکن اس پر لعنت بھیجنا اہلِ سنت کا عقیدہ نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۲۳ الف)

پاک رحموں اور پاک صلبوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا مطلب

سوال: – نبی علیہ السلام کی حدیث ہے کہ میری پیدائش پاک رحموں اور پاک صلبوں سے ہے، حضرت عبداللہ والد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منی رحم مائی آمنہ میں آنا کیسا ہے؟ اگر بذریعہ منی ہے تو کیا حضرت عبداللہ کی منی پاک تھی؟ اگر پاک تھی تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منی کے متعلق اَحکامِ غسل دھونا آیا ہے، اگر پلید تھی تو حدیث پر حرف آتا ہے؟

جواب: – پاک رحموں اور پاک صلبوں سے مراد صحیح النسب ہونا ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباء واجداد صحیح النسب تھے، اس کا مطلب منی کی طہارت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

علامہ ابنِ تیمیہؒ کے بارے میں جمہور علماء کی رائے

سوال: – بندۂ ناچیز نے مولوی محمد عمر صاحب کی ایک کتاب پڑھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ

---

(۱) دیکھئے: تفسیر معارف القرآن ج:۵ ص:۷۹۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ''تحقیق لعنِ یزید'' ج:۵ ص:۴۲۵۔

حضرت شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہؒ کو بڑے بڑے محدثین معاذ اللہ کافر کہتے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر بندۂ ناچیز کو اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ جمہور علماء کی کیا رائے ہے؟ یا کوئی کتاب بتائیں جس میں مولوی عمر کو مکمل جواب دیا ہو، بندہ آپ کے جواب کا منتظر رہے گا۔

جواب:- شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ بڑے عالم گزرے ہیں، البتہ انہوں نے بعض مسائل میں جمہور فقہاء ومحدثین اور علمائے اُمت سے اختلاف کیا ہے۔ جمہور اُمت نے ان کے تفردات کو قابلِ عمل نہیں سمجھا، اور اس بناء پر بعض حضرات نے ان کی تردید میں کتابیں بھی لکھی ہیں، ان کے مفصل حالات علامہ ابوزہرہ کی کتاب ''ابن تیمیہ'' میں مل سکتے ہیں، جس کا اُردو ترجمہ شائع ہوگیا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۶۶۲ د)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا حکم

سوال ۱:- ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا کیا حکم ہے؟

۲:- سنا ہے ''تقریر دِل پذیر'' شائع فرمارہے ہیں، مجھے ضرورت ہے۔

جواب ۱:- اس کے بارے میں علماء کا اختلاف رہا ہے، اکثر حنفی علماء اس کے قائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فضلات پاک تھے، مُلّا علی قاریؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ کا رُجحان بھی اسی طرف ہے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: صحح بعض أئمة الشافعية طهارة بوله صلى الله عليه وسلم وسائر فضلاته وبه قال أبو حنيفة كما نقله فى المواهب اللدنية عن شرح البخارى للعينى وصرح به البيرى فى شرح الأشباه وقال الحافظ ابن حجر تظافرت الأدلة علىٰ ذٰلك، وعد الأئمة ذٰلك من خصائصه صلى الله عليه وسلم ونقل بعضهم عن شرح المشكوٰة لمُلّا على قارى أنه قال: اختاره كثير من أصحابنا، وأطال فى تحقيقه فى شرحه على الشمائل فى باب ما جاء فى تعطره عليه الصلوٰة والسلام۔ (شامى باب الانجاس ج: ۱ ص: ۲۱۲)۔[1]

۲:- غالباً دار الاشاعت مقابل مولوی مسافرخانہ بندر روڈ کراچی یہ کتاب شائع کر رہا ہے، آپ ان سے خط لکھ کر معلوم کرلیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۱/۳/۲۶ھ

---

(۱) رد المحتار مطلب فى طهارة بوله صلى الله عليه وسلم ج: ۱ ص: ۳۱۸ (طبع سعيد).

نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج: ۱ ص: ۸۰ تا ۸۲۔

كتاب الطهارة

(طہارت کا بیان)

﴿فصل فی الوضوء والغسل والتیمّم﴾
(وضو، غسل اور تیمّم کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب ومکروہات کا بیان)

جنازے کے لئے کئے گئے وضو سے فرائضِ پنج گانہ پڑھ سکتے ہیں

سوال:- کیا جنازے کی نماز کے لئے کیا گیا وضو فرائضِ پنج گانہ کے لئے بھی کافی ہے؟ یعنی اس سے فرائضِ پنج گانہ پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- ظاہر ہے کہ وضو ایک طہارتِ مطلقہ ہے، جب وہ مکمل ہوجائے تو ہر عبادت جو طہارت کے ساتھ مشروط ہو اس سے ادا ہوسکتی ہے،[1] ہر عمل کے لئے جداگانہ نیت وضو کے ساتھ کرنا کسی کے نزدیک شرط نہیں، اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
(۲) ۱۳۷۹/۱۱/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

غسل خانے میں بات کرنے کا حکم

سوال:- غسل خانہ اور پائے خانہ میں بات کرنے کو عوام ناجائز سمجھتے ہیں، سو شرعاً اس کی کوئی اصل ہے؟

جواب:- قال ابن عابدینؒ عبارة الغزنوية ولا يتكلم فيه أى فى الخلاء، وفى الضياء عن بستان أبى الليث يكره الكلام فى الخلاء، وظاهره أنه لا يختص بحال قضاء الحاجة وذكر بعض الشافعية أنه المعتمد عندهم، وزاد فى الامداد: ولا يتنحنح أى الا بعذر كما اذا خاف دخول أحد عليه. (رد المحتار ج: ۱ ص: ۳۱۸)[3]۔

---

(۱) وفى الهندية ج: ۱ ص: ۲۶ (طبع مكتبه ماجديه كوئٹه) تيمم لصلوٰة الجنازة أو لسجدة التلاوة أجزأه أن يصلى المكتوبة بلا خلاف. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج: ۱ ص: ۷، وکفایت المفتی ج: ۲ ص: ۳۱۷ (جدید ایڈیشن دار الاشاعت)۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

(۳) فتاویٰ شامية "تنبيه" ج: ۱ ص: ۳۴۴ (طبع ايچ ايم سعيد)

عبارتِ مرقومہ سے معلوم ہوا کہ بیت الخلاء میں نہ صرف یہ کہ بوقتِ قضاءِ حاجت بات کرنا مکروہ ہے، بلکہ دُوسرے حالات میں بھی بولنا دُرست نہیں، مثلاً کوئی شخص اگر بیت الخلاء میں وضو کر رہا ہو تو تسمیہ اور دُوسری دُعائیں پڑھنا بھی دُرست نہیں، کما قال الشامیؒ، اسی طرح بے ضرورت کھانسنا بھی مکروہ ہے۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
(۱) ۱۳۷۹/۱۱/۲۴ھ

دانت میں چاندی بھری ہوئی ہو تو وضو اور غسل کا حکم

سوال:- دانتوں میں کیڑا لگ جانے کی وجہ سے اور کوئی علاج مستقل مفید نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر نے علاجاً چاندی بھر دی ہے، اس صورت میں وضو میں کوئی نقص تو نہیں رہے گا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں وضو میں تو کوئی اِشکال ہی نہیں، غسل میں اِشکال ہوسکتا تھا لیکن فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ مواضعِ ضرورت میں نیچے تک پانی پہنچانا ضروری نہیں۔

چنانچہ درمختار میں ہے:-

ولا یمنع ما علی ظفر صباغ ولا طعام بین أسنانه أو فی سنه المجوف به یفتی. وقیل: ان صلبًا منع وهو الأصح، وقال الشامی: قوله وهو الأصح صرح به فی شرح المنیة وقال: لامتناع نفوذ الماء مع عدم الضرورة والحرج. (شامی ج:۱ ص:۱۵۴ مبحث الغسل، طبع ایچ ایم سعید).

وقد تقرر فی موضعه أنه مفاهیم الکتب حجة، فدل علی أنه لا یمنع عدم نفوذ الماء فی مواقع الضرورة، وقد صرح به امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۸.

اور عالمگیریہ میں ہے: قال محمدؒ فی الجامع الصغیر: ولا یشد الأسنان بالذهب ویشدها بالفضة یرید به اذا تحرکت الأسنان وخیف سقوطها فأراد صاحبها أن یشدها یشدها بالفضة ولا یشدها بالذهب، وهذا قول أبی حنیفةؒ، وقال محمدؒ: یشدها بالذهب أیضًا. (عالمگیریة ج:۵ ص:۳۳۶)۔(۲)

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۳۹/۲۸ ج)

---

(۱) یہ فتویٰ حضرت والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

(۲) کتاب الکراهیة باب ۱۰ وکذا فی امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۹.

برہنہ ہوکر غسل کرنا

سوال:- غسل (فرض، سنت، مستحب) اگر مکان میں پردے کا پورا انتظام ہے تو برہنہ ہوکر کرسکتا ہے؟ اور جو وضو غسل کے لئے کیا ہے، بعد میں نماز کے لئے یہی وضو برقرار ہوگا یا نیا وضو کرنا ہوگا؟

جواب:- بہتر تو یہی ہے کہ کوئی کپڑا وغیرہ باندھ کر غسل کیا جائے، لیکن برہنہ ہوکر غسل کرنا جبکہ پردے کا پورا انتظام ہے، بھی بلاکراہت جائز ہے۔[1] غسل میں جو وضو کیا جاتا ہے وہ بعد میں نماز پڑھنے کے لئے کافی ہے، نیا وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔[2]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۹ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۱۴ الف)

گردن کے مسح کی شرعی حیثیت

سوال:- گردن کا مسح سنت ہے یا بدعت؟ مع الدلیل بیان کیجئے۔

جواب:- قال فی الدر المختار (فی مستحبات الوضوء) ومسح الرقبة بظهر يديه (لا الحلقوم) لأنه بدعة، وقال الشامیؒ تحت قوله لأنه بدعة اذ لم يرد فی السنة،[3] وقال فی البحر قوله ومسح رقبته يعنی بظهر اليدين۔[4] اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مسحِ رقبہ تو مستحب ہے، لیکن حلقوم کا مسح بدعت ہے، چونکہ سنت سے ثابت نہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۷۹/۱۱/۲۵ھ[5]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مرض کی وجہ سے پانی نقصان دہ ہو تو تیمّم کیا جاسکتا ہے

سوال:- زید کی بیوی ایک طویل بیماری میں مبتلا ہے حتیٰ کہ نل کے پانی سے وضو کرنے سے

---

(۱) روی البخاریؒ عن أم هانیؓ بنت أبی طالب أنها ذهبت الی رسول الله صلی الله علیه وسلم عام الفتح فوجدته يغتسل وفاطمة تستره، وعن ميمونةؓ قالت: سترت النبی صلی الله علیه وسلم وهو يغتسل من الجنابة فغسل يديه .... الخ. صحیح البخاری، کتاب الغسل ج:۱ ص:۴۲ (طبع قدیمی کتب خانه کراچی).

(۲) وفی مشکوٰة المصابیح ج:۱ ص:۴۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن عائشةؓ قالت: كان النبی صلی الله علیه وسلم لا يتوضأ بعد الغسل. رواه الترمذی وأبو داؤد والنسائی وابن ماجة. وفی المرقاة ج:۱ ص:۳۳۸ لا يتوضأ بعد الغسل أی اكتفا بوضوئه الأول فی الغسل وهو سنة، وكذا فی عزيز الفتاویٰ ص:۱۷۵، وامداد المفتين ص:۱۷۵.

(۳) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۱۲۴.

(۴) البحر الرائق ج:۱ ص:۲۸. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۳۔

(۵) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

بھی اس کے پیٹ میں درد ہوجاتا ہے، کیا اس بیماری کی وجہ سے زید کی بیوی کے لئے تیمّم کرنا جائز ہوگا یانہیں؟

جواب:- کسی طبیب سے مشورہ کیا جائے، اگر وہ وضو کو مضر قرار دے تو تیمّم کیا جاسکتا ہے۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۶۱۸ الف)

غسل کے بعد دوبارہ وضو کا حکم

سوال:- اگر وضو کرتے وقت ستر کھلا ہوا ہو مثلاً غسل کے دوران جو وضو کیا جاتا ہے تو یہ وضو نماز کے لئے کافی ہوگا یانہیں؟ یا کپڑے پہننے کے بعد دوبارہ وضو کرنا ہوگا؟

جواب:- غسل کے وقت کیا ہوا وضو نماز کے لئے کافی ہے،[2] بشرطیکہ اس وضو کے بعد کوئی ایسا اَمر نہ پیش آیا ہو جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اور اس میں ستر کھلے ہونے سے کچھ فرق واقع نہیں ہوتا۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۱۳۳ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار باب التیمم ج:۱ ص:۲۳۲. من عجز عن استعمال الماء .... لمرض یشتد أو یمتد بغلبة ظن أو قول حاذق مسلم .... تیمم. وکذا فی الهندیة الباب الرابع فی التیمم ج:۱ ص:۲۸.

(۲) وفی مشکوة المصابیح ج:۱ ص:۴۸ (طبع قدیمی کتب خانه) عن عائشة رضی الله عنها قالت: کان النبی صلی الله علیه وسلم لا یتوضأ بعد الغسل. رواه الترمذی وأبو داؤد والنسائی وابن ماجة. وفی المرقاة ج:۱ ص:۳۳۸ لا یتوضأ بعد الغسل أی اکتفا بوضونه الأول فی الغسل وهو سنة، وکذا فی عزیز الفتاویٰ ص:۱۷۵.

﴿فصل فی النّجاسات وأحکام التطهیر﴾

(نجاسات کے اَحکام اور پاکی کا طریقہ)

ناپاک رُوئی کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال:- رُوئی اگر ناپاک ہوجائے تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب:- علامہ شامیؒ نے تطہیر کے جو طریقے ابنِ وہبانؒ سے نقل کئے ہیں، ان میں سے ایک ندف بھی ہے، جس کے معنی ہیں ''دُھننا''، (ملاحظہ ہو شامی ج:۱ ص:۲۹۰)[1] اور یہ طریقہ رُوئی ہی پر چسپاں ہوسکتا ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۷۹/۱۱/۲۶ھ[2]

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

تیل کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال:- گھی اور تیل اگر نجس ہوجائیں تو تطہیر کا طریقہ کیا ہے؟

جواب:- تیل کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو کسی برتن میں ڈال کر اتنا ہی پانی اس میں ڈال دیا جائے اور ہلا کر چھوڑ دیا جائے جب تک کہ تیل اُوپر آجائے، پھر برتن میں سوراخ کرے یا نتھار کر پانی علیحدہ کردیا جائے، تین مرتبہ یہی عمل کرنے سے تیل پاک ہوجائے گا۔ (کذا فی العالمگیریۃ ج:۱ ص:۴۳)[3]۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۷۹/۱۱/۲۶ھ[4]

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) واٰخر دون الفرک والندف والجفاف .... الخ. فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۳۱۵ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

(۳) عالمگیریة، الباب السابع فی النجاسة وأحکامها ج:۱ ص:۴۲ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه). وفی الدر المختار ج:۱ ص:۳۳۴ (طبع ایچ ایم سعید) ویطهر لبن وعسل ودبس ودهن یغلی ثلاثًا. وفی الشامیة تحته قال فی النهر لو تنجس العسل فتطهیره أن یصب فیه ماء بقدره فیغلی حتی یعود الی مکانه والدهن یصب علیه الماء فیغلی فیعلو الدهن الماء فیرفع بشیٔ هکذا ثلاث مرات وهذا عند أبی یوسف خلافا لمحمد وهو أوسع، وعلیه الفتویٰ.

(۴) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر)

تطہیرِ اشیاء کے طریقوں کی تعداد اور مکمل تفصیل

سوال: -تطہیرِ اشیاء کے کیا کیا طریقے ہیں؟ اور ان میں کیا تفصیل ہے؟

جواب: -تطہیرِ اشیاء کے دس طریقے ہیں:-

۱:-دھونا، جیسے ناپاک کپڑا وغیرہ اسی طریقے سے پاک کیا جاتا ہے۔

۲:-پھیر لینا، یہ طریقہ ان اشیاء کے لئے مخصوص ہے جو شفاف ہوں، جیسے آئینہ، تلوار وغیرہ۔

۳:-(فرک) کھرچنا، یہ طریقہ منی سے تطہیر کے لئے ہے، عالمگیریہ میں اس کو مطلق چھوڑا گیا ہے، لیکن العرف الشذی میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اس طریقے کو قرونِ اُولیٰ کے ساتھ بایں وجہ مخصوص قرار دیا ہے کہ اس زمانے میں منی بہت غلیظ ہوتی تھی، اور آج کل عام طور سے منی کی رقت شائع ہے، اس لئے منیٔ رقیق کے لئے محض فرک کافی نہیں۔

۴:-ملنا اور رَگڑنا، (حت و دلک) اور یہ طریقہ اس صورت کے لئے ہے جبکہ نجس چیز ثخین ہو اور نجاست متجسد (یعنی خشک ہونے کے بعد نظر آنے والی) ہو۔

۵:-سوکھ جانا، یہ حکم زمین اور اس میں گڑی ہوئی چیزوں کے لئے ہے، جیسے دیواریں، درخت، اینٹیں وغیرہ، یہ تمام چیزیں صرف سوکھ جانے سے پاک ہوجاتی ہیں۔

۶:-جلانا، گوبر اور نجس کیچڑ اس طریقے سے پاک ہوجاتے ہیں، اسی طرح اگر بکری وغیرہ کا سر جو خون میں لتھڑا ہوا ہو اس قدر جلایا جائے کہ خون بالکل زائل ہوجائے تو وہ طاہر ہوجاتا ہے۔

۷:-ایک حالت سے دُوسری حالت کی طرف تبدیل کردینا استحالہ، مثلاً شراب کو کسی نئے مٹکے میں سرکہ بنادینا، یہ بھی تطہیر کا سبب بن جاتا ہے۔

۸:-دباغت، خنزیر اور آدمی کے علاوہ تمام جانوروں کی کھالوں کو دُھوپ میں رکھ کر یا نمک لگا کر مدبوغ کرلیا جائے تو وہ پاک ہوجاتی ہیں۔

۹:-ذکاۃ یعنی حیوان کا ذبح کردینا اس کی جلد کو پاک کردیتا ہے اور گوشت کو بھی، خواہ وہ حیوان غیر مأکول ہو۔

۱۰:-نزح، یعنی اگر کنویں میں نجاست گرجائے تو اس کی مناسبت سے کنویں کا پانی کھینچ لینا۔

یہ دس طریقے عالمگیریہ میں ص:۴۲ سے ۴۶ تک نقل کئے گئے ہیں، اور ابنِ وہبانؒ اور علامہ حصکفیؒ نے ان کے ساتھ چند چیزیں اور ملاکر انہیں اشعار میں جمع کردیا ہے، ابنِ وہبانؒ کے اشعار علامہ شامیؒ نے نقل فرمائے ہیں:-

واخر دون الفرک والندف والجفا ف والنحت قلب العين والغسل يطور
ولا دبغ تخليل ذكاء تخلل ولا المسح والنزح الدخول التغوّر

وزاد شارحها بيتا، فقال:-

وأكل وقسم غسل بعض ونحله وندف وغلي بيع بعض تقور

(۱) (شامی ج:۱ ص:۲۹۰)

علامہ حصکفیؒ نے انہی اشعار کو ذرا سا بدل کر فرمایا ہے: ؎

وغسل ومسح والجفاف مطهر ونحت وقلب العين والحفر يذكر
ودبغ وتخليل ذكاة تخلل وفرک ودلک والدخول التغور
تصرفه في البعض ندف ونزحها ونار وغلي غسل بعض تقور (۲)

جس سے مندرجہ ذیل طریقہ ہائے تطہیر مزید معلوم ہوئے:-

۱:- کھودنا، اور یہ طریقہ زمین کو پاک کرنے کے لئے ہے۔

۲:- دخول، جس کی تفسیر علامہ ابنِ عابدینؒ نے یہ کی ہے کہ پاک پانی کا ایسے چھوٹے حوض میں داخل ہونا کہ جو ناپاک ہوگیا ہو، جبکہ ایک طرف سے اس کا پانی نکل رہا ہو، اور نیا پاک پانی داخل ہو رہا ہو، تو اگرچہ حوض کا پانی قلیل ہو، لیکن پھر بھی وہ پاک ہوجاتا ہے۔ (کذا فی رد المحتار ج:۱ ص:۲۹۰)۔ (۳)

۳:- تغور، یعنی کنویں کا اتنا پانی خشک ہوجائے کہ جتنا نجاست گرنے کی وجہ سے نکالنا واجب تھا تو یہ پانی نکالنے کے قائم مقام ہوجائے گا۔

۴:- تصرف، یعنی ایک نجس چیز میں تصرف کرنا، مثلاً گندہ ڈھیر میں سے کچھ ناپاک ہوجائے تو اس کے اندر اکل، بیع، ہبہ اور صدقہ وغیرہ کے ذریعہ تصرف کرلیا جائے تو وہ پاک ہوجاتا ہے۔

۵:- جوش دینا، جیسے کہ اگر تیل یا گوشت نجس ہوجائیں تو ان کو جوش دے کر پاک کیا جاسکتا ہے۔

۶:- تقویر، یعنی جہاں جہاں نجاست ہو، وہاں وہاں سے ان نجس چیز کا علیحدہ کردینا، چنانچہ اگر جما ہوا گھی ناپاک ہوجائے تو اس میں یہی طریقہ استعمال کیا جائے گا۔

یہ چھ طریقے مزید ملا کر کل سولہ طریقہ ہائے تطہیر معلوم ہوئے۔ (۴)

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
(۵)
۱۳۷۹/۱۱/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) فتاویٰ شامية ج:۱ ص:۳۱۵ (طبع ايچ ايم سعيد). (۲) الدر المختار ج:۱ ص:۳۵؛ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۳) شامية ج:۱ ص:۳۱۵ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۴) تطہیرِ اشیاء کے مذکورہ طریقے فتاویٰ عالمگیریہ ج:۱ ص:۴۱ تا ۴۵ (مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ) میں بھی موجود ہیں۔
(۵) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

مٹی کا تیل پاک ہے

سوال:- کرویشین تیل پاک ہے یا ناپاک؟ اگر نجس ہے تو نجاست خفیفہ ہے یا غلیظہ؟ بغیر دھوئے نماز دُرست ہوگی یا نہیں؟

جواب:- کرویشین تیل معلوم نہیں کیا ہوتا ہے؟ اگر مراد مٹی کا تیل ہے تو وہ پاک ہے، اسی طرح اور کوئی تیل جو معدن سے نکلتا ہو وہ بھی پاک ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱۱/۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۴۳ الف)

بیت الخلاء کے لوٹے سے طہارت حاصل کی جاسکتی ہے

سوال:- مساجد میں بھنگی وغیرہ صفائی کرتے ہیں، مگر وہ پیشاب خانے اور بیت الخلاء دھوتے وقت زور زور سے پانی بہاتے ہیں، استنجا کے لوٹے وہیں رکھے ہوتے ہیں، کیا ایسے برتنوں میں پانی لے کر پھر طہارت کی جاسکتی ہے؟

جواب:- ان برتنوں کے ناپاک ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے ان کو تین مرتبہ دھولیں، پھر بے کھٹکے ان سے طہارت حاصل ہوسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۸۸ ب)

دھوبی کے دُھلے ہوئے کپڑوں کا حکم

سوال:- کپڑے جو کہ نجس ہوتے ہیں ان کے بارے میں طہارت کے اُصول کے مطابق پاک پانی سے تین مرتبہ سختی سے نچوڑنے کے اَحکام ہیں، جبکہ آج کل دھوبی گندے نالوں میں یا حوض وغیرہ میں دھوتے دیکھے جاتے ہیں، پھر گندی جگہوں پر وہ کپڑے سکھاتے ہیں، کیا ایسے دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر نماز پڑھی جاسکتی ہے؟

جواب:- اصل میں تو کسی دھوبی کو مقرّر کرتے وقت اس بات کا اطمینان کرنا چاہئے کہ وہ کپڑوں کو پاک کرکے دھوتا ہے یا نہیں؟ لیکن جب تک ناپاک پانی سے دھونے کا صرف اندیشہ ہو اس

---

(۱) کرویشین تیل سے مٹی کا تیل مراد ہے، بنگلہ زبان میں مٹی کے تیل کو کہتے ہیں۔ (محمد زبیر)

وقت تک ابتلائے عام کی بناء پر ان کی طہارت ہی کا حکم کیا جاتا ہے۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۸۸ ب)

کتے کی دباغت شدہ کھال پاک ہے

سوال:- خلاصۂ سوال یہ ہے کہ ماہنامہ ''البلاغ'' بابت ماہِ شوال سنہ ۱۳۸۷ھ میں ''آپ کے سوال'' کے عنوان کے تحت کتے کی کھال کے بارے میں یہ فتویٰ دیا گیا ہے کہ کتے کی کھال کو اگر شرعی طور پر ذبح کیا جائے اور اس کی کھال کو اس طرح صاف کیا جائے کہ وہ سڑنے سے محفوظ ہوجائے ..... سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ناپاک، نجس، حرام، گندی چیز کو کسی بھی طریقے سے ذبح کریں، اوّل تو لفظِ ذبح وہاں جائز ہی نہیں ہے، پھر اس کی شرعی حیثیت؟

جواب:- حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے: ''أیما أهاب دبغ فقد طهر'' أو كما قال عليه السلام، (أخرجه مسلم في صحيحه)۔[2] یعنی جس کھال کو بھی دباغت دے دی جائے تو وہ پاک ہوجاتی ہے۔ دُوسرے دلائل کی روشنی میں اس سے صرف خنزیر اور انسان کی کھال کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس لئے فقہائے کرامؒ لکھتے ہیں: كل أهاب دبغ فقد طهر جازت الصلوٰة فيه والوضوء منه الا جلد الخنزير والآدمي ..... وليس الكلب نجس العين، ألا ترى أنه ينتفع به حراسة واصطيادًا بخلاف الخنزير. (هداية ص: ۴۰، ۴۱)۔[3]

ان عبارتوں سے معلوم ہوگیا کہ کتے کی کھال دباغت سے پاک ہوجاتی ہے، اور کتے کا حکم خنزیر کی طرح نہیں ہے جو کسی حال پاک نہیں ہوتا، اور کتے کو ذبح کرنا کھانے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کی کھال وغیرہ استعمال کرنے کے لئے ہوسکتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۴۲۶ الف)

---

(۱) جیسا کہ حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ: ''یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے، سخت ضرورت ..... میں دُوسرے امام کے قول کو لے لینا جائز ہے، اس لئے جو شخص دُوسرے طریقے سے نہ دُھلوا سکے اس کے لئے پاکی کا حکم کیا جائے گا۔ دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۸۰۔

(۲) وفي الصحيح للامام مسلمؒ ج: ۱ ص: ۱۵۹ (طبع قديمي كتب خانه) عن عبدالله بن عباسؓ قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: اذا دبغ الاهاب فقد طهر.

(۳) (طبع مكتبه شركت علميه). وفي الدر المختار ج: ۱ ص: ۲۰۳، ۲۰۴ (وكل اهاب دبغ وهو يحتملها طهر) .... (وما) أي أهاب (طهر به) بدباغ (طهر بذكاة)، وفي البحر الرائق ج: ۶ ص: ۸۱ (وبعد يباع وينتفع به) وقيد بالميتة، لأن جلد المذكاة يجوز بيعه قبل الدباغ.

ذبح کرنا کوئی فرض واجب نہیں، اگر کوئی شخص کرلے تو اس کا حکم لکھا ہے۔

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

کیا دھوبی سے کپڑے دُھلانے کے بعد دوبارہ دھونا ضروری ہے؟

سوال:- کیا کسی فیکٹری کے دھوبی سے کپڑے دُھلوانے سے کپڑے پاک ہوجاتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- یہ تو فیکٹری کے طریقِ کار پر منحصر ہے۔ اگر وہ کپڑوں کو پاک کرنے کا اہتمام کریں یعنی کپڑوں کا میل کاٹ کر انہیں سکھانے سے پہلے ہر کپڑے کو الگ الگ تین مرتبہ دھولیں تب تو کپڑوں کے پاک ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے، اور اگر کوئی اور طریقہ اختیار کرتے ہیں تو اس کی وضاحت کی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۱۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دھوبی سے کپڑا دُھلوانے کے بعد کیا دوبارہ پاک کرنا ضروری ہے؟ اور کیا کپڑا پاک کرتے وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا ضروری ہے؟

سوال:- کپڑوں کی دُھلائی کے بعد اس کو پاک کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کس صورت میں؟ اور کیا اس وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا ضروری ہے؟

جواب:- اگر کپڑے دھونے والے نے دھوتے وقت پاک کرنے کا اہتمام کیا ہے تب تو دوبارہ پاک کرنے کی ضرورت نہیں، اور اگر یہ معلوم ہو کہ دھوتے وقت پاکی کا اہتمام نہیں ہوا تو بعد میں پاک کرلیں۔ اور پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے اتنا دھویا جائے کہ نجاست کا اثر زائل ہوجائے، تین مرتبہ دھولیں تو بہتر ہے، اور اس وقت کلمۂ طیبہ پڑھنا ضروری نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۱۵/۲۸ ج)

ہاتھی کی سونڈ سے نکلنے والے پانی کا حکم
مچھلی کا پِتّہ پاک ہے یا نہیں؟

سوال ۱:- ہاتھی کی سونڈ سے جو پانی نکلتا ہے وہ عادۃً گرمی کے سبب اپنے بدن پر چھڑکا کرتا ہے، یہ پانی پاک ہے یا نہیں؟

۲:- مچھلی کا پتہ پاک ہے یا نہیں؟

جواب ۱:- ہاتھی کی سونڈ کا پانی دراصل اس کا لعاب ہے، جو فقہاءؒ کی تصریحات کے مطابق ناپاک ہے، درمختار میں ہے: "وسؤر (خنزیر وکلب وسباع بهائم) ومنه الهرة البرية (وشارب خمر فور شربها وهرة فور أكل فارة نجس)" اور سباع بہائم کے تحت علامہ ابنِ عابدین شامیؒ رقم طراز ہیں: هی ما كان يصطاد بنابه كالأسد والذئب والفهد والنمر والثعلب والفيل .... الخ. (شامی استنبولی "مطلب فی السور" ج: ۱ ص: ۲۰۵)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھی کا جھوٹا نجس ہے، جو لعاب ہی کی فرع ہے، جیسا کہ عالمگیریہ میں ہے: عرق كل شئ معتبر بسؤره. (ج: ۱ ص: ۲۴)۔[2] اور فتاویٰ قاضی خان میں خود سوالِ مذکور کا جواب بایں طور مصرح ہے: لعاب الفيل نجس كلعاب الفهد والأسد اذا أصاب الثوب بخر طومه ينجسه. (خانية ج: ۱ ص: ۱۷)۔[3] لہٰذا ہاتھی کی سونڈ سے نکلنے والا پانی ناپاک ہے۔

۲:- کوئی جزئیہ تو نہیں مل سکا، البتہ چونکہ مچھلی کا خون ناپاک نہیں ہے جیسا کہ علامہ علاء الدین حصکفیؒ نے درمختار میں تصریح کی ہے، اور علامہ شامیؒ نے اس کے تحت تحریر فرمایا ہے: لأنه ليس بدم حقيقة، لأنه اذا يبس يبيض والدم يسود. (رد المحتار، باب الأنجاس ج: ۱ ص: ۲۹۴)۔[4]

یعنی مچھلی کا خون درحقیقت خون نہیں، چونکہ وہ خشک ہونے کے بعد سفید ہوجاتا ہے، حالانکہ خون خشکی کے بعد سیاہ رہتا ہے، اس لئے خون پر قیاس کرکے پتہ کو بھی پاک کہنا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ خون پر پتے کو قیاس کرنا اس لئے دُرست نہیں کہ پتہ حرام ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے کتاب الذبائح ج:۵ ص:۲۷۱ میں ذکر فرمایا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی حرمت سے اس کی نجاست لازم نہیں، جیسے کہ زہر کا استعمال ناجائز ہے، اس کے باوجود اس وجہ سے وہ نجس نہیں ہوتا، اسی طرح پتہ بھی ایک سمیاتی اثرات کا مجموعہ ہے، جو سمیت کی وجہ سے اگر ناجائز ہو تو اس سے اس کی پاکی پر اثر نہیں پڑتا۔

اس تحریر کے بعد ایک عبارتِ مصرحہ پر نظر پڑی: ومرارة كل شئ كبوله. (عالمگيرية ج: ۱ ص: ۴۷)۔[5] ہر چیز کا پتہ حکم میں اس کے پیشاب کی طرح ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناپاک ہے،

---

(۱) شامية ج: ۱ ص: ۲۲۳ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۲) فتاوىٰ عالمگيرية ج: ۱ ص: ۲۳ (طبع مكتبه رشديه، كوئٹه).
(۳) خانية علىٰ هامش الهندية ج: ۱ ص: ۲۱ (أيضًا).
(۴) فتاوىٰ شامية ج: ۱ ص: ۱۳۱۹ (طبع ايچ ايم سعيد)
(۵) فتاوىٰ عالمگيرية ج: ۱ ص: ۴۶ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه). وفى الدر المختار ج: ۱ ص: ۳۴۹ (طبع سعيد) مرارة كل حيوان كبوله .... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۶۔ (محمد زبیر حق نواز)۔

لیکن مچھلی کا پیشاب ہونا خود مشکوک ہے، اس لئے دُوسرے اہلِ علم سے بھی رُجوع کرلیا جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۳۷۹/۱۱/۲۳ھ(۱)

ہاتھ پر نجاست لگنے کی صورت میں کتنی مرتبہ دھونا لازم ہے؟

سوال:- ہاتھ پر پیشاب لگ گیا، پانی سے اتنا دھویا جتنی دیر میں تین بار پانی ڈالا جاتا ہے، تو پاک ہوگیا یا الگ الگ دومرتبہ اور دھوئیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں ہاتھ کو اتنا دھونا ضروری ہے کہ پیشاب کے ہاتھ سے چھوٹ جانے کا غالب گمان ہوجائے، الگ الگ تین مرتبہ پانی ڈالنا ضروری نہیں، لما فی الدر المختار: ویطهر محل غیرها أی غیر مرئیة بغلبة ظن غاسل طهارة محلها بلا عدد، به یفتی. (شامی ج: ۱ ص: ۲۲۰)۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۳۶ الف)

جوتے یا چپل وغیرہ کو وضوخانے میں دھونے کا حکم

سوال:- جوتا اور چپل خراب ہوجائے اور گیلی مٹی لگ جائے یا خراب پانی میں گر جائے تو کیا وضوخانے میں دھویا جاسکتا ہے؟

جواب:- بہتر یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو مسجد کے وضوخانے کے بجائے کسی اور جگہ دھویا جائے، لیکن اگر ضرورت کے وقت وہاں جوتے دھولئے جائیں تو مضائقہ نہیں، البتہ پھر اس جگہ کو صاف کردینا چاہئے تاکہ نمازیوں کو تکلیف نہ ہو۔

واللہ اعلم

۱۳۹۶/۹/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۲۸۳)

---

(۱) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

(۲) الدر المختار ج: ۱ ص: ۳۳۱ (طبع ایچ ایم سعید). (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی أحکام الماء﴾
(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق مسائل کا بیان)

تالاب سے پانی لیتے وقت اگر گھڑے میں مینگنی آجائے تو کیا کرے؟

سوال:- ہمارے علاقے میں پانی جمع کرنے کی غرض سے تالاب بنے ہوئے ہیں، بارش کا پانی اس میں جمع ہوتا ہے، کبھی کبھی جب ہم اس سے پانی لیتے ہیں تو اس میں ایک آدھی مینگنی یا گوبر آجاتا ہے، کیا یہ پانی پاک ہے یا نہیں؟

جواب:- تالاب سے پانی لیتے وقت کوئی مینگنی آجائے تو اسے گھڑے سے نکال کر پھینک دے تو پانی پاک ہوگا، اور اگر مینگنی گھڑے میں رہ گئی تو احتیاط اس میں ہے کہ اس سے وضو اور غسل نہ کیا جائے، فی الهداية: فان وقعت فيها بعرة أو بعرتان من بعر الابل أو الغنم لم تفسد الماء الى قوله: ولا يعفى القليل فى الاناء على ما قيل لعدم الضرورة، وعن أبى حنيفة أنه كالبير فى حق البعرة والبعرتين. (هداية ج:۱ ص:۴۲)[1]۔ وفى فتح القدير: فى الشاة تبعر فى المحلب قالوا: ترمى البعرة أى من ساعته فلو أخر .... لا يجوز. (ص:۶۹)[2]۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۱۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۴۵۵ الف)

''دہ در دہ'' حوض میں نجاست گرنے کا حکم

سوال:- ایک مسجد کا حوض پختہ ''دہ در دہ'' پانی سے بھرا ہوا تھا، اس میں چند ٹین کے لوٹے گر گئے جن کے نکالنے کے لئے بندوبست کیا گیا، ان لوٹوں کے ساتھ تین چپل بھی نکل آئے، یہ معلوم نہیں کہ کب سے گری ہوئی تھیں؟ چونکہ ماءِ کثیر تھا تو زید (امام مسجد) نے تمام پانی نکلوادیا اور حوض خالی ہوگیا، آج کل پانی کی جو قلت ہے وہ ظاہر ہے، اور جواب میں مولانا عبدالحی کا یہ سوال و جواب پیش کیا:-

سوال:- اگر حوض دہ در دہ تھا اور پانی کم ہوجانے پر اس میں نجاست پڑی پھر

---

(۱) (طبع مکتبہ شرکت علمیہ). (۲) فتح القدير ج:۱ ص:۸۷ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

حوض میں پانی آ گیا اور وہ بھر گیا اور کوئی چیز ان میں سے باہر نہیں نکلی تو وہ حوض کا پانی دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- بعض کے نزدیک دُرست ہے، اور بعض کے نزدیک دُرست نہیں ہے۔

جواب:- حوض کا پانی اگر کثیر (دہ در دہ) ہو تو اس میں نجاست کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا جب تک کہ پانی کا رنگ، بو یا مزہ نہ بدل جائے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر پانی کے اندر کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا تھا تو حوض خالی کرنے کی ضرورت نہیں تھی[1]۔ فتاویٰ مولانا عبدالحی کا جو سوال و جواب[2] نقل کیا گیا ہے اس سے استدلال دُرست نہیں ہے، اس کی صورت بالکل مختلف ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۵/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۵۹۵ الف)

کنویں میں سانپ گرنے کی صورت میں کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک کنویں میں سانپ کا بچہ سوا گز لمبا اور ایک انچ موٹا مر کر سڑ گیا اور جدا نہیں ہوا، آیا اس کے نکالنے سے پانی صاف ہے یا ناپاک؟ اور اگر سارا پانی نکالنا ہے تو اس میں بہت دُشواری ہے، اگر یہ سانپ نہ نکالا جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر سانپ خون والا تھا تو مطلقاً پانی ناپاک ہے، اور اس کو نکالنے کے بعد کنویں کا تمام پانی نکالنا واجب ہے۔ رہی دُشواری سو اگر وہ اس وجہ سے ہے کہ کنواں تلی توڑ ہے (یعنی اس میں ہر وقت پانی آتا رہتا ہے) تب تو اس قدر پانی نکالنا کافی ہو جائے گا جتنا کہ نکالنا شروع کرتے وقت ہے، اور اس کا اندازہ دو ایسے عادل شخص لگائیں جن کو کنویں کی مساحت وغیرہ میں مہارتِ تامہ حاصل ہو، اس کے بعد جو پانی آئے گا وہ پاک ہوگا۔ اور اگر دُشواری عام کنووں میں بھی معلوم ہوتی ہے تو وہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۱۹۰ الی ۱۹۲ وکذا یجوز براکد کثیر کذلک أی وقع فیه نجس لم یر أثره .... لکن فی النهر وانت خبیر بأن اعتبار العشر اضبط .... الخ. وفی الشامیة قوله: لم یر أثره أی من طعم أو لون أو ریح .... الخ. وفی شرح الوقایة کتاب الطهارات ج:۱ ص:۸۰ (طبع ایچ ایم سعید) ولا بماء راکد وقع فیه نجس الا اذا کان عشرة أذرع فی عشرة أذرع ولا ینحسر أرضه بالغرف فحکمه حکم الماء الجاری. نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۱ ص:۱۴۹ سوال نمبر ۱۷۵، ۱۷۷، و ج:۱ ص:۱۴۹۔

(۲) دیکھئے: مجموعۃ الفتاویٰ فارسی ج:۳ ص:۲۸ ومعلّم الفقہ اُردو ترجمہ مجموعۃ الفتاویٰ علامہ عبدالحی لکھنویؒ (طبع قدیم) باب الحوض ج:۱ ص:۲۰۰ (طبع میر محمد کتاب خانہ)۔

شرعاً معتبر نہیں، پورا پانی نکالنا ضروری ہوگا، جس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:-

۱:-تنویر الابصار میں ہے: اذا وقعت نجاسة فی بئر دون القدر الکثیر أو مات فیها حیوان دموی وانتفخ أو تفسخ ینزح کل مائها بعد اخراجه. (شامی ج:۱ ص:۱۶۵، ۱۶۶)[۱]۔

۲:- درمختار میں ہے: (وان تعذر) نزح کلها لکونها معینا (فبقدر ما فیها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبی (یؤخذ ذٰلک بقول رجلین عدلین لهما بصارة بالماء) به یفتی. (شامی ج:۱ ص:۱۹۸)[۲]۔

اور اگر سانپ خون والا نہیں تھا تو اس کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہے، اس کو نکالنے کے بعد مزید پانی نکالنے کی حاجت نہیں۔ درمختار میں ہے:-

(ویجوز) رفع الحدث (بما ذکر وان مات فیه) أی الماء ولو قلیلا (غیر دموی کزنبور ومائی مولد کسمک وسرطان) وضفدع الا بریاله دم سائل وهو ما لا سترة له بین أصابعه فیفسد فی الأصح کحیة بریة ان لها دم والا لا۔ اور علامہ شامیؒ ''والا لا'' کے تحت تحریر فرماتے ہیں: أی وان لم یکن للضفدع البریة والحیة البریة دم سائل فلا یفسد. (شامی ج:۱ ص:۱۷۱)[۳]۔

یہ تفصیل اس صورت میں تھی جبکہ سانپ خشکی کا ہو، اور اگر پانی کا سانپ ہے تو وہ مطلقاً بہر صورت پانی کو فاسد نہیں کرتا، جیسا کہ علامہ ابنِ عابدینؒ نے لکھا ہے: أما المائیة فلا تفسد مطلقًا کما علم مما مر. (رد المحتار ج:۱ ص:۱۷۱)[۴]۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۷۹/۱۱/۲۷ھ[۵]

کیا ٹینکی سے آنے والا پانی ''ماءِ جاری'' کے حکم میں ہے؟

سوال:- آج کل پائپ سسٹم میں یہ رواج ہے کہ مکان کی چھت پر پانی کی ایک ٹینکی ہوتی ہے، اور ہینڈ پمپ کے ذریعہ نیچے سے اس میں پانی جمع کرلیا جاتا ہے، اس ٹینکی سے تمام مکان میں پانی پہنچایا جاتا ہے، تو اگر اُوپر سے پانی ٹینکی میں ڈالا جارہا ہو اور نیچے سے پائپ کے ذریعہ پانی نکل رہا ہو تو کیا یہ پانی ''ماءِ جاری'' ہوگا یا نہیں؟

---

(۱) ج:۱ ص:۲۱۱، ۲۱۲ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۲۱۴ (أیضًا)
(۳) شامیة ج:۱ ص:۱۸۳ الیٰ ۱۸۵ (طبع ایچ ایم سعید).
(۴) شامیة ج:۱ ص:۱۸۵ (طبع سعید)
(۵) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر)

اور اگر ایسی ٹینکی میں نجاست اس وقت گرے جبکہ پانی ٹھہرا ہوا ہو، کسی ایک جانب سے یا دونوں جانبوں سے پانی نہ نکل رہا ہو تو کیا جس وقت پانی جاری ہوگا اس وقت وہ ٹینکی پاک ہوجائے گی یا نہیں؟

جواب:- قال فی منیة المصلی عن أبی یوسفؒ ماء الحمام بمنزلة الماء الجاری .....، (واختلف المتأخرون فی بیان هٰذا القول، قال بعضهم: مراده حالة مخصوصة وهو .... اذا کان الماء یجری من الأنبوب الی حوض الحمام والناس یغترفون منه غرفا متدارکا) وقال تحته العلامة الحلبی نقلا عن فتاویٰ قاضی خان: وان کان الناس یغترفون من الحوض بقصاعهم ولا یدخل من الأنبوب ماء أو علی العکس اختلفوا فیه، وأکثرهم علٰی أنّه یتنجس ماء الحوض، وان کان الناس یغترفون بقصاعهم ویدخل الماء من الأنبوب اختلفوا فیه وأکثرهم علٰی أنه لا یتنجس (انتهٰی) فهٰذا هو الذی ینبغی أن یعتمد علیه. (کبیری شرح منیة ص:۱۰۰)[1]۔

وقال العلامة طاهر البخاریؒ: وفی الفتاویٰ وحوض الماء اذا اغترف رجل منه وبیده نجاسة وکان الماء یدخل من أنبوبه فی الحوض والناس یغترفون من الحوض غرفا متدارکا لم یتنجس. (خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۵، طبع امجد اکیڈمی لاهور)، ومثله فی الدر المختار علی الشامی ج:۱ ص:۹۰۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ وہ حوضِ صغیر جس کے ایک جانب سے پائپ کے ذریعہ پانی آرہا ہو اور دُوسری جانب سے اس میں سے پانی بھر رہے ہوں تو ''ماءِ جاری'' کے حکم میں ہے۔ آج کل جو ٹینکوں کی صورت مروّج ہے وہ بھی بظاہر اس میں داخل ہے۔ مگر اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ علامہ شامیؒ نے اس حکم کو اس صورت میں خاص کیا ہے کہ جیسے پانی اوپری کی طرف سے نکالا جارہا ہو، اور اگر نیچے سے کسی سوراخ وغیرہ کے ذریعے سے پانی نکل رہا ہو جیسا کہ مروّجہ چھت کی ٹنکیوں سے بذریعہ پائپ نکلتا ہے تو اس صورت میں یہ حکم نہ ہوگا۔

اس کا جواب میرے خیال میں یہ ہے کہ علامہ شامیؒ نے یہ حکم حوض کے بارے میں بیان فرمایا[2] اور اس کی تلی میں اگر سوراخ ہو تو یقیناً وہ اس حکم میں نہ ہوگا، کیونکہ اس وقت حوض سے پانی کا خروج نہایت سست رفتار سے اور بہت کم ہوگا۔ بخلاف اس صورت کے کہ ٹینکی سے پانی پوری قوّت و

---

(۱) غنیة المتملی ص:۱۰۲، ۱۰۳ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

(۲) شامی مطلب لو أدخل الماء من أعلی الحوض وخرج أسفله فلیس بجار ج:۱ ص:۱۹۰.

شدّت کے ساتھ نیچے بہتا ہو، ان دونوں میں فرق ہوگیا۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

[2] ۱۳۸۰/۵/۸ھ

ہندو خاکروب کی دھوئی ہوئی جگہ پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- صدرِ مملکت پاکستان نے جیسا کہ حکم صادر کیا ہے کہ تمام سرکاری دفاتر میں نماز ادا کی جائے، ہمارے یہاں ہندو خاکروب ہیں، اس سے ہم وہ جگہ جو ہم نے نماز کے لئے تجویز کی ہے پانی سے دُھلانا چاہتے ہیں، اگر وہ ہندو خاکروب اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر اس جگہ کی دُھلائی کرے تو اس جگہ پر نماز پڑھنا دُرست ہے؟

جواب:- مذکورہ ہندو خاکروب اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر اگر زمین کو دھوئے اور اگر جھاڑو استعمال کرے تو وہ پاک ہوتو اس جگہ نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۱/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۱۴ الف)

---

(۱) تفصیل کے لئے ''خیر الکلام فی حوض الحمام'' مصنفہ حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کا مطالعہ فرمائیں۔

(۲) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

﴿فصل فی أحکام الجنب والمعذور﴾
(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

غسلِ جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری نہیں

سوال:- کیا غسلِ جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری ہے؟ اور تکیہ، بستر وغیرہ کا دھونا ضروری ہے؟

جواب:- غسلِ جنابت میں سر کا تیل چھڑانا ضروری نہیں، تاہم چھڑادیں تو بہتر ہے۔

فی الدر المختار: ولا یمنع الطهارة ونیم .... وحناء ولو جرمه، به یفتی ودرن ووسخ ....، وکذا دهن ودسومة، وفی رد المحتار أی کزیت وشیرج بخلاف نحو شحم وسمن جامد. (شامی ج:۱ ص:۱۰۴).[1]

سوال:- تیل لگے ہوئے سر پر کوئی پرندہ بیٹ کردے تو صرف پانی سے بال دھونا کافی ہے یا تیل چھڑانا ضروری ہے؟

جواب:- جانور کی بیٹ چھڑالینی چاہئے، تیل چھڑانے کا حکم اُوپر آ گیا، اور جتنی چکناہٹ کا ازالہ ممکن ہو، کرلے اور جس کا ازالہ متعذر ہو وہ معاف ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۸۸ ب)

حالتِ جنابت میں دُرود شریف پڑھنے کا حکم

سوال:- حالتِ جنابت میں دُرود شریف کا معمول پورا کرسکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- حالتِ جنابت میں صرف قرآنِ کریم کی تلاوت ممنوع ہے، لیکن دُعائیں، اذکار و تسبیحات اور دُرود شریف پڑھنا، ناجائز نہیں، البتہ مستحب یہ ہے کہ دُرود شریف اور اذکار و دُعا کے لئے

---

(۱) رد المحتار ج:۱ ص:۱۵۴ (طبع سعید). وفی الهندیة الفصل الأول فی فرائضه ج:۱ ص:۱۴ (طبع ماجدیه کوئٹه) واذا ادهن فامر الماء فلم یصل یجزئ .... الخ.

کم ازکم وضوکرلے۔ لما فی الدر المختار: ولا بأس لحائض وجنب بقراءة أدعية ومسها وحملها وذكر الله تعالىٰ وتسبيح، وقال الشامي: الى أن وضوء الجنب لهٰذه الأشياء مستحب كوضوء المحدث. (شامی ج:۱ ص:۱۹۳)۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲۶/۲۸ ب)

جنابت کی حالت میں قرآن چھونے کا حکم

سوال:- ایک شخص پر غسل واجب ہے، وضوکر کے قرآن مجید پر ہاتھ لگا کر پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب:- جنابت کی حالت میں جب انسان پر غسل واجب ہو اس کے لئے قرآنِ کریم کا چھونا، پڑھنا سب ناجائز ہے،[2] اور صرف وضوکرنے سے جنابت ختم نہیں ہوتی، اس لئے صرف وضو کرنے سے قرآنِ کریم کا چھونا یا پڑھنا بھی جائز نہیں ہوتا، اس کے لئے غسل ضروری ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۲/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۶۷/۱۸ الف)

ایک ہی شب میں دوبارہ ہم بستری کے لئے غسلِ جنابت ضروری نہیں

سوال:- اپنی بیوی سے صحبت کرنے کے بعد اگر دوبارہ خواہش ہو تو کیا دوبارہ صحبت کے لئے غسلِ جنابت کرنا ضروری ہے؟

(۱، ۲) فتاویٰ شامية ج:۱ ص:۲۹۳ (طبع ایچ ایم سعید). وفی مشكوة المصابيح ج:۱ ص:۴۹ (طبع قديمی كتب خانه) عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقرأ الحائض ولا الجنب شيئًا من القرآن. (رواه الترمذی). وفی المرقاة تحته ج:۲ ص:۱۶۰ وفی شرح السنة اتفقوا علىٰ ان الجنب لا يجوز له قراءة القرآن .... والحاصل ان جمهور العلماء على الحرمة، اذ هی اللائقة بتعظيم القرآن وفی الدلالة عليها الأحاديث الكثيرة المصرحة بها وان كانت كلها ضعيفة، لأن تعدد طرقها يورثها قوة أی قوة وترقيها الى درجة الحسن لغيره وهو حجة فی الأحكام. وفی الدر المختار ج:۱ ص:۱۷۲ ويحرم به تلاوة قرآن ولو دون اية على المختار بقصده ومسه. وفی الهندية ج:۱ ص:۳۸ ومنها حرمة قراءة القرآن لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شيئًا من القرآن، والآية وما دونها سواء فی التحريم على الأصح. (محمد زبیر حق نواز)

جواب:- دوبارہ صحبت کرنے کے لئے غسلِ جنابت ضروری نہیں، البتہ بیچ میں وضو کرلینا بہتر ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۶/۵/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۴۵۱ ب)

کئی مرتبہ ہم بستری کے بعد ایک غسلِ جنابت کافی ہے

سوال:- کیا اپنی بیوی سے ایک شب میں جتنی مرتبہ ہم بستری کی جائے اتنی مرتبہ غسل کرنا بھی ضروری ہوگا؟ یعنی ایک شب میں ایک دفعہ ہم بستری ہوگئی، تو دُوسری دفعہ تب ہم بستری کرے کہ پہلے غسل کرے؟ ورنہ یہ فعل حرام ہے؟

جواب:- ایک شب میں ہم بستری خواہ کتنی مرتبہ کی جائے سب کے لئے آخر میں ایک غسل کافی ہے،[2] البتہ اگر کسی ہم بستری کے بعد غسل کرلیا تو آئندہ ہم بستری کے بعد نیا غسل کرنا ہوگا۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۰/۱۲/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۴۵۳ الف)

لیکن ہر بار غسل کرنا افضل ہے، اور یہ مشکل ہو تو صرف وضو کرے، اور وہ بھی نہ ہوسکے تو کوئی گناہ نہیں، آخر میں غسل کرے۔[3]

محمد عاشق الٰہی

ایک ہی شب میں دوبارہ ہم بستری سے پہلے اگر غسل نہ کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- عورت کے ساتھ ہم بستری کرنے کے بعد دوبارہ اگر ہم بستری کی ہو تو دوبارہ غسل کرنا ضروری ہے یا اسی حالت میں ہم بستری کرسکتے ہیں؟

جواب:- دوبارہ ہم بستری کا ارادہ ہو تو پہلے غسل یا وضو کرلینا مستحب ہے، لیکن اگر نہ کرے تو کوئی گناہ بھی نہیں۔[4]

واللہ اعلم

۲۲/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۵۶ الف)

(۱ تا ۴) وفی مشکوٰۃ المصابیح ج: ۱ ص: ۴۹ (طبع قدیمی کتب خانہ) عن أبی سعید الخدریؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا أتی أحدکم أهله ثم أراد أن یعود فلیتوضأ بینهما وضوء. (رواہ مسلم). وفیه أیضًا بعده: عن أنس قال: کان النبی صلی اللہ علیه وسلم یطوف علی نسائه بغسل واحد. (رواہ مسلم).

وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۱۷۶، ۱۷۷ لا (یکرہ) معاودۃ أهله قبل اغتساله الا اذا احتلم لم یأت أهله. قال الحلبیؒ: ظاهر الحدیث انما یفید الندب لا نفی الجواز المفاد من کلامه.

پیشاب کے قطروں کی بناء پر کپڑے کی پاکی اور وضو کا حکم

سوال:- مثانے کی کمزوری کی بناء پر اکثر پیشاب سکھانے کے بعد قطرے نکل جاتے ہیں، اکثر وضو کرنے کے بعد ایسا ہوجاتا ہے، وضو اور کپڑے کی پاکی یا ناپاکی کا کیا حکم ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جب قطرہ آئے تو کپڑا پاک کرکے وضو دوبارہ کیا جائے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۷۰ ج)

''لیکوریا'' کے پانی کا حکم اور اس سے متعلق متعدّد مسائل

سوال:- عورتوں کو لیکوریا کی بیماری ہوتی ہے، جس کی وجہ سے رحم سے سفید پانی رِستا رہتا ہے۔

۱:- کیا یہ سفید پانی نجاستِ خفیفہ ہے یا کہ نجاستِ غلیظہ؟

۲:- اگر کسی عورت کو یہ بیماری ہو اور وہ نماز بھی پڑھتی ہو، چونکہ پانی رِسنے کا کوئی خاص وقت مقرّر نہیں ہوتا تو کیا اس پانی کی وجہ سے کپڑے ناپاک ہوجاتے ہیں؟

۳:- باوضو ہونے کی صورت میں یہ پانی نکلے تو کیا وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

۴:- اگر نماز کی ادائیگی کے دوران پانی نکل آئے تو کیا نماز ہوجاتی ہے؟

۵:- اگر نماز نہیں ہوتی تو اس سلسلے میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ نماز ضائع نہ ہو؟

۶:- شرعاً کیا اس قسم کے مریض کو معذور سمجھا جائے گا؟

جواب ۱:- لیکوریا کی بیماری میں جو پانی خارج ہوتا ہے وہ چونکہ رحم سے خارج ہوتا ہے اس لئے وہ مذی کی طرح نجاستِ غلیظہ ہے، **ولیس ھو فی حکم رطوبة الفرج الداخل کما فی امداد الفتاویٰ** ج:۱ ص:۶۵ و۷۴۔[1]

۲:- اس سے کپڑے ناپاک ہوجاتے ہیں۔[2]

۳:- اس کے نکلنے سے وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔[3]

(۱ تا ۳) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۳۱۳ أی رطوبة الفرج فیکون مفرعا علی قولهما بنجاستها، وقال ابن عابدینؒ تحته: .... ومن وراء باطن الفرج فانه نجس قطعًا ککل خارج من الباطن کالماء الخارج مع الولد أو قُبَیْلِه.

۴:- نماز نہیں ہوگی، اِلاَّ یہ کہ معذوری کی وہ صورت ہوجائے جو نمبر۵ و ۶ کے جواب میں آرہی ہے۔

۵،۶:- اگر یہ پانی ہر وقت بہتا رہتا ہے اور اتنا وقفہ بھی نہیں ملتا کہ اس میں چار رکعت نماز ادا کی جاسکے تو پھر یہ عورت ''معذور'' کے حکم میں ہے، ایسی عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ ہر نماز کا وقت داخل ہونے پر وضو کرلے اور اس سے جتنی چاہے نمازیں نوافل وغیرہ پڑھتی رہے، جب تک اس نماز کا وقت رہے گا، اس کا وضو سیلان کا پانی نکلنے سے نہیں ٹوٹے گا، پھر جب دُوسری نماز کا وقت آئے تو اس کے لئے نیا وضو کرے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴/۲/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۳/۲۷ھ)

---

(۱) وفی الدر المختار ج: ۱ ص:۳۰۵ وصاحب عذر من به سلس بول لا يمكنه امساكه أو استطلاق بطن ريح أو انفلات أو المستحاضة .... ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة بأن لا يجد فی جميع وقتها زمنا يتوضأ ويصلی فيه خاليا عن الحدث .... وحكمه الوضوء .... لكل فرض .... ثم يصلی به فيه فرضا أو نفلا، فاذا خرج الوقت بطل.

﴿فصل فی الاستنجاء﴾
(استنجاء کے مسائل کا بیان)

کیا طہارت کے لئے ڈھیلا اور پانی دونوں استعمال کرنا ضروری ہے؟

سوال:- استنجے کے لئے مجھے دو بار ضرور جانا پڑتا ہے، پہلے مٹی استعمال کرتا ہوں، اور اس کے بعد پانی سے طہارت حاصل کرتا ہوں۔ میری سمجھ میں مجھ کو مکمل طہارت کے لئے ایسا کرنا پڑتا ہے، لیکن اس وقت بڑی تکلیف ہوتی ہے جبکہ جماعت نماز کے لئے کھڑی ہو اور میں سارا وقت استنجے میں صَرف کردوں یا بارش وغیرہ کے وقت طہارت کے لئے مٹی کا ڈھیلا دستیاب نہیں ہوتا، اسی طرح سفر میں بھی مٹی دستیاب نہیں ہوتی۔ نماز اور حج وغیرہ میں اس کا اہتمام کرنے سے ارکان ہی چھوٹ جائیں گے، آخر کیا کروں؟ رہنمائی فرمائیں۔

جواب:- افضل تو بے شک یہی ہے کہ ڈھیلا اور پانی دونوں استعمال کئے جائیں، لیکن ضرورت کے وقت صرف پانی سے استنجا کرلینا بھی کافی ہے، اور اتنا دھویا جائے کہ نجاست باقی نہ رہے، زیادہ وہم میں پڑنا ٹھیک نہیں۔ ثم اعلم أن الجمع بين الماء والحجر أفضل ويليه فى الفضل الاقتصار على الماء. (شامی ج:۱ ص:۲۲۶)[۱]۔ والغسل بالماء الى أن يقع فى قلبه أنه طهر ما لم يكن موسوسا. (درمختار ج:۱ ص:۲۲۵)[۲]۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۸۸ ب)

پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا مسنون ہے اور صرف پانی کا استعمال بھی کافی ہے

سوال:- پیشاب کے بعد استعمال کے لئے ڈھیلا اگر میسر نہ آئے تو کیا صورت اختیار کرنی چاہئے؟ جبکہ دیوار بھی سنگِ مرمر کی ہو، اور ڈھیلا اور پانی کے استعمال کے بعد بھی کسی شخص کو قطرہ نکل

---

(۱) فتاوىٰ شامية ج:۱ ص:۳۳۸ (طبع ايچ ايم سعيد). وفى الهندية ج:۱ ص:۴۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) والأفضل أن يجمع بينهما كذا فى التبيين. (۲) الدر المختار ج:۱ ص:۲۳۷.

آتا ہے تو اس کے لئے پاکی کیا صورت ہوگی؟

جواب: - پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا مسنون ہے، تاہم اگر ڈھیلا میسر نہ ہو تو صرف پانی بھی کافی ہے، لیکن صرف ڈھیلے پر اکتفاء نہیں کرنا چاہئے۔ ڈھیلے اور پانی دونوں کے استعمال کے بعد بھی اگر قطرہ آجائے تو استنجاء اور وضو دوبارہ کرلینا چاہئے اور کپڑا پاک کرلینا چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۱/۲/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۹۳ الف)

﴿فصل فی المسح علی الخفین﴾
(موزوں پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

مروّجہ موزوں پر مسح کا مسئلہ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ کن موزوں پر مسح کرنا دُرست ہے؟

الف:- جہاں تک چمڑے کے موزوں پر مسح کا تعلق ہے، اس کے جواز پر تقریباً تمام ہی علمائے کرام کا اتفاق ہے۔

البتہ اُونی، سوتی اور نائیلون وغیرہ کے موزوں پر مسح کے جائز ہونے کے بارے میں کچھ اختلاف ہے، بیشتر فقہاء اُونی اور سوتی موزوں پر مسح جائز ہونے کے بارے میں کچھ شرائط رکھتے ہیں۔

لیکن دورِ حاضر کے ایک مشہور صاحبِ فکر و بصیرت فرماتے ہیں کہ ہر قسم کے موزوں پر کسی قید کے بغیر مسح کرنا دُرست ہے۔

ب:- فقہائے کرام نے جو شرائط موزوں پر مسح کے جائز ہونے کی رکھی ہیں ان کے بارے میں مشہور مفکر فرماتے ہیں کہ:-

''میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان شرائط کا مأخذ کیا ہے؟ مگر سنت میں کوئی ایسی چیز نہ مل سکی۔''

سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں اور جوتیوں پر مسح فرمایا ہے، نسائی کے سوا کتبِ سنن میں اور مسندِ احمد میں مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور (مسح علی الجوربین والنعلین) اپنی جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا۔ ابوداؤد کا بیان ہے کہ حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، براء بن عازب، انس بن مالک، ابواُمامہ، سہیل بن سعد اور عمر بن حریث رضی اللہ عنہم نے جرابوں پر مسح کیا، نیز حضرت عمرؓ اور حضرت عباسؓ سے بھی یہ فعل مروی ہے، بلکہ بیہقی نے ابنِ عباسؓ اور انس بن مالکؓ سے، طحاوی نے اویس بن اویسؓ سے

روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف جوتوں پر مسح فرمایا، اس میں جرابوں کا ذکر نہیں ہے، اور یہی عمل حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے، ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جراب اور جرابیں پہنے ہوئے جوتے پر بھی مسح کرنا اسی طرح جائز ہے جس طرح چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا دُرست ہے، ان روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقہاء کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو، اور نہ ہی یہ ذکر کسی جگہ ملتا ہے کہ جن جرابوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرامؓ نے مسح فرمایا وہ کس چیز کی تھیں؟

اس لئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فقہاء کی عائد کردہ ان شرائط کا کوئی مأخذ نہیں، اور فقہاءؒ چونکہ شارع نہیں اس لئے ان کی شرطوں پر اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گناہگار نہ ہوگا۔ اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر قسم کے موزوں پر اطمینان کے ساتھ مسح کیا جاسکتا ہے چاہے وہ اُونی ہوں یا سوتی، نائیلون کے ہوں یا کسی اور ریشے کے، چمڑے کے ہوں یا آئل کلاتھ کے اور ریگزین کے، حد یہ کہ اگر پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر بھی مسح کرلیا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

ان مفکر کے علاوہ علامہ ابنِ تیمیہؒ نے بھی اپنے فتویٰ کی کتاب جلد دوم میں یہ فتویٰ دیا ہے، اور حافظ ابنِ قیمؒ اور علامہ ابنِ حزمؒ کا بھی یہی مسلک ہے کہ کسی قید کے بغیر ہر قسم کے موزے پر مسح کیا جاسکتا ہے۔

آخر میں مستدعی ہوں کہ اپنے مصروف اوقات میں سے اس دینی مسئلے کو حل فرما کر مرسل فرمائیں، فتویٰ مدلل اور مفصل درکار ہے۔

آپ کے فتویٰ کا منتظر رہوں گا تا کہ اس اُلجھن سے نکل کر راہِ راست پاسکوں۔

منتظر الجواب

محمد طاہر غوری

چشتیاں، ضلع بہاول نگر

الجواب وباللہ التوفیق

جس قسم کے سوتی، اُونی یا نائیلون کے موزے آج کل رائج ہیں، ان پر مسح کرنا ائمۂ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک جائز نہیں، آپ کا خیال غلط ہے کہ اس مسئلے میں فقہاءؒ کے درمیان کوئی اختلاف ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے باریک موزوں کے بارے میں ائمۂ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ ان پر مسح کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ ملک العلماء کاسانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:-

فان كانا رقيقين يشفان الماء لا يجوز المسح عليهما بالاجماع.

(بدائع الصنائع ج:۱ ص:۱۰)[۱]

پس اگر موزے اتنے باریک ہوں کہ ان میں سے پانی چھن سکتا ہو تو ان پر باجماع مسح جائز نہیں۔

اور علامہ ابنِ نجیم رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

ولا يجوز المسح على الجورب الرقيق من غزل أو شعر بلا خلاف، ولو كان ثخينًا يمشي معه فرسخًا فصاعدا .... فعلى الخلاف.

(البحر الرائق ج:۱ ص:۱۹۲)[۲]

اس سے معلوم ہوا کہ جن موزوں میں ''ثخین'' کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں، یعنی ان میں پانی چھن جاتا ہو، یا وہ کسی چیز سے باندھے بغیر محض اپنی موٹائی کی بناء پر کھڑے نہ رہ سکتے ہوں، یا ان میں ایک کوس تک بغیر جوتے کے چلنا ممکن نہ ہو، ان پر مسح کرنا کسی بھی مجتہد کے مذہب میں جائز نہیں، ہاں! جن موزوں میں یہ تینوں شرائط پائی جاتی ہوں، ان پر مسح کے جواز وعدمِ جواز میں اختلاف ہے۔

جہاں تک جناب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا تعلق ہے، انہوں نے بہت سے مسائل میں جمہور اُمت سے الگ راستہ اختیار کیا ہے، یہ مسئلہ بھی ایسا ہی ہے جس میں انہوں نے جمہور فقہاء کی مخالفت کر کے سخت غلطی کی ہے، آپ نے ان کے جو دلائل ذکر کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے مسئلے کی اصل حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش ہی نہیں فرمائی۔ آپ کے اطمینان کے لئے مسئلے کی حقیقت مختصراً عرض کی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے سورۂ مائدہ میں وضو کا جو طریقہ بیان فرمایا ہے اس میں پوری وضاحت کے ساتھ پاؤں کو دھونے کا حکم دیا ہے، نہ کہ ان پر مسح کرنے کا۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ وضو میں ہمیشہ پاؤں دھوئے جائیں، اور ان پر مسح کسی صورت میں بھی جائز نہ ہو، یہاں تک کہ جب کسی شخص نے چمڑے کے موزے پہنے ہوئے ہوں اس وقت بھی مسح کی اجازت نہ ہو، لیکن چمڑے کے موزوں پر مسح کی بواجازت باجماعِ اُمت دی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے موزوں پر مسح کرنا اور اس کی اجازت دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے تواتر کے ساتھ ثابت ہے جس کا انکار ممکن نہیں، اگر مسح علی الخفین کے جواز پر دو تین ہی حدیثیں ہوتیں تب بھی ان کی بناء پر قرآنِ کریم کے مذکورہ صریح حکم میں کوئی تقیید دُرست نہ ہوتی، کیونکہ اخبارِ آحاد سے قرآنِ کریم پر زیادتی یا اس کا نسخ

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) البحر الرائق باب المسح على الخفين ج:۱ ص:۱۸۳ (طبع ایچ ایم سعید).

یا اس کی تقیید جائز نہیں ہوتی۔ لیکن چونک مسح علی الخفین کی احادیث معنیً متواتر ہیں، اس لئے ان متواتر احادیث کی روشنی میں تمام اُمت کا اس پر اجماع منعقد ہوگیا کہ قرآنِ کریم کی آیت میں پاؤں دھونے کا حکم اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے جب انسان نے ''خفین'' (یعنی چمڑے کے موزے) نہ پہن رکھے ہوں، چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ما قلت بالمسح حتّی جاءنی فیه ضوء النهار. (۱) (البحر الرائق ج:۱ ص:۱۷۳)

میں مسح علی الخفین کا اس وقت تک قائل نہیں ہوا جب تک میرے پاس روزِ روشن کی طرح اس کے دلائل نہیں پہنچ گئے۔

چنانچہ ''مسح علی الخفین'' کا حکم اسّی (۸۰) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے روایت کیا ہے، حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں لکھتے ہیں:-

وقد صرح جمع من الحفاظ بأن المسح علی الخفین متواتر وجمع بعضهم رواته فجاوزوا الثمانین منهم العشرة. (۲) (نیل الاوطار ج:۲ ص:۱۷۶)

حفاظ کی ایک بڑی جماعت نے تصریح کی ہے کہ مسح علی الخفین کا حکم متواتر ہے، اور بعض حضرات نے اس کے روایت کرنے والے صحابہؓ کو جمع کیا تو وہ اسّی (۸۰) سے متجاوز تھے جن میں عشرۂ مبشرہ بھی شامل ہیں۔

اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ادرکت سبعین بدریا من الصحابة کلهم کانوا یرون المسح علی الخفین. (۳) (تلخیص الحبیر ج:۱ ص:۱۵۸ و بدائع ج:۱ ص۷۲)

اگر مسح علی الخفین کا حکم ایسے تواتر یا استفاضے کے ساتھ ثابت نہ ہوتا تو قرآنِ کریم نے پاؤں دھونے کا جو حکم دیا ہے اس میں کسی تخصیص یا تقیید کی گنجائش نہیں تھی، چنانچہ امام ابو یوسفؒ فرماتے تھے:-

انما یجوز نسخ القران بالسنة اذا وردت کورود المسح علی الخفین فی الاستفاضة. (۴) (أحکام القران للجصاص ج:۲ ص:۴۲۵)

---

(۱) البحر الرائق باب المسح علی الخفین ج:۱ ص:۱۶۵ (طبع ایچ ایم سعید). وکذا فی فتح القدیر ج:۱ ص:۱۲۶ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۲) نیل الأوطار للشوکانی أبواب المسح علی الخفین باب فی شرعیته ج:۱ ص:۱۵۵ (طبع مصطفی البابی، مصر).

(۳) وفی تلخیص الحبیر باب المسح علی الخفین ج:۱ ص:۲۴۸ (طبع مکتبة نزار مصطفی الباز، مکة المکرمة) عن الحسن البصری قال حدثنی سبعون من أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم انه کان یمسح علی الخفین. وکذا فی نیل الأوطار للشوکانی أبواب المسح علی الخفین باب فی شرعیته ج:۱ ص:۱۵۵ (طبع قدیم، مصر) والبحر الرائق ج:۱ ص:۱۶۵ (طبع ایچ ایم سعید).

(۴) أحکام القران للجصاص رحمه الله، ذکر الخلاف فی المسح علی الخفین ج:۲ ص:۳۴۸ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

سنتِ نبویہ سے قرآن کریم کے کسی حکم کو منسوخ (بمعنی مقید) کرنا اسی وقت جائز ہوسکتا ہے جب وہ سنت ایسے تواتر سے ثابت ہو جیسے مسح علی الخفین ثابت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وضو میں پاؤں دھونے کا قرآنی حکم ایسی چیز نہیں ہے جسے دو تین روایتوں کی بنیاد پر کسی خاص بات کے ساتھ مخصوص کردیا جائے، بلکہ اس کے لئے ایسا تواتر درکار ہے جیسے مسح علی الخفین کی احادیث کو حاصل ہے۔ اب ''خفین'' (چمڑے کے موزوں) کے بارے میں تو یہ تواتر موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مسح خود بھی فرمایا اور دُوسروں کو بھی اس کی اجازت دی، لیکن ''خفین'' کے سوا کسی چیز پر مسح کرنے کے بارے میں ایسا تواتر موجود نہیں ہے۔ اور ''خفین'' چونکہ عربی زبان میں صرف چمڑے کے موزوں کو کہتے ہیں، کپڑے کو موزوں کو ''خف'' نہیں کہا جاتا، اس لئے یہ اجازت صرف چمڑے ہی کے موزوں کے ساتھ مخصوص رہے گی، دُوسرے موزوں کے بارے میں قرآنِ کریم کے اصلی حکم یعنی پاؤں دھونے پر ہی عمل ہوگا۔ ہاں! اگر کپڑے کے موزے اتنے ثخین (موٹے) ہوں کہ وہ اپنی خصوصیات اور اوصاف میں چمڑے کے ہم پایہ ہوگئے ہوں، یعنی نہ تو ان میں پانی چھنتا ہو، نہ انہیں کھڑا رکھنے کے لئے کسی بیرونی سہارے کی ضرورت ہو اور ان کو پہن کر تین میل چل سکتے ہوں تو ایسے موزوں کے بارے میں فقہاءؒ کے درمیان اختلاف ہوگیا، بعض فقہاء نے فرمایا کہ چونکہ ایسے موزے چمڑے ہی کے معنی میں آگئے ہیں اس لئے ان پر بھی مسح جائز ہونا چاہئے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چونکہ مسح کرنا تواتر کے ساتھ صرف خفین (چمڑے کے موزوں) پر ہی ثابت ہے، اس لئے ان پر مسح کرنا دُرست نہیں، گویا موزے تین قسم کے ہوگئے:-

۱:- چمڑے کے موزے جنھیں خفین کہا جاتا ہے، ان پر مسح بالاجماع جائز ہے۔

۲:- وہ باریک موزے جو نہ چمڑے کے ہوں، اور نہ ان میں چمڑے کے اوصاف پائے جاتے ہوں، جیسے آج کل سوتی، اُونی یا نائیلون کے موزے، ان کے بارے میں اجماع ہے کہ ان پر مسح جائز نہیں کیونکہ ایسے موزوں پر مسح کرنا ایسے دلائل سے ثابت نہیں جن کی بناء پر پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو چھوڑا جاسکے۔

۳:- وہ موزے جو چمڑے کے تو نہیں ہیں، لیکن ان میں موٹے ہونے کی بناء پر اوصاف چمڑے ہی کے پائے جاتے ہیں، ان پر مسح کے جواز میں فقہاءؒ کا اختلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو موزے چمڑے جیسے نہ ہوں، ان پر مسح کے عدمِ جواز میں مجتہدین اُمت کا کوئی اختلاف نہیں، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جاسکتا ہے جب تک کہ مسح کا حکم ایسے تواتر سے ثابت نہ ہوجائے جس تواتر سے مسح علی الخفین کا جواز

ثابت ہے۔ لہٰذا فقہائے کرامؒ نے کپڑے کے موزوں پر مسح کے لئے جو شرطیں لگائی ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں لگائیں، بلکہ ان موزوں میں چمڑے کے اوصاف کے تحقّق کے لئے لگائی ہیں، اور اس میں بھی اختلاف رہا ہے کہ ان شرائط کے تحقّق کے بعد بھی ان پر مسح جائز ہے یا نہیں؟

حقیقتِ مسئلہ کی وضاحت کے بعد اب ان روایات کو دیکھئے جن میں جوربین (جرابوں) پر مسح کا ذکر آیا ہے، سارے ذخیرۂ حدیث میں یہ کل تین حدیثیں ہیں، ایک حضرت بلالؓ سے مروی ہے، ایک حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے، اور ایک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے۔ حضرت بلالؓ کی حدیث معجم صغیر طبرانی میں ہے، اور حضرت ابوموسیٰؓ کی ابنِ ماجہؒ اور بیہقیؒ وغیرہ نے روایت کی ہے، لیکن حافظ زیلعیؒ نے ان دونوں کے بارے میں ثابت کیا ہے یہ دونوں سنداً ضعیف ہیں۔ (نصب الرایۃ ج:۱ ص:۱۸۳،۱۸۴)[1]

اور حضرت ابوموسیٰؓ کی حدیث کے بارے میں تو امام ابوداؤدؒ نے بھی لکھا ہے کہ:-

لیس بالمتصل ولا بالقوی. (بذل المجهود ج:۱ ص:۹۶)[2]

لہٰذا یہ دونوں روایتیں تو خارج از بحث ہیں۔

اب صرف حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث رہ جاتی ہے، اس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اگرچہ امام ترمذیؒ نے اسے ''حسن صحیح'' کہا ہے، لیکن دُوسرے ائمۂ حدیث نے ان کے اس قول پر سخت تنقید کی ہے، امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو روایت کرکے لکھتے ہیں:-

وكان عبدالرحمٰن بن مهدى لا يحدث بهٰذا الحديث لأن المعروف عن المغيرة أن النبى صلى الله عليه وسلم مسح على الخفين. (بذل المجهود ج:۱ ص:۹۶)[3]

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ یہ حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ حضرت مغیرہؓ سے جو معروف روایتیں ہیں وہ مسح علی الخفین کی ہیں (نہ کہ جوربین پر مسح کی)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ سننِ کبریٰ میں لکھتے ہیں:-

لا نعلم أحدا تابع أبا قيس على هٰذه الرواية، والصحيح عن المغيرة أنه عليه السلام مسح على الخفين. (نصب الراية ج:۱ ص:۱۸۳)[4]

یہ روایت ابوقیس کے سوا کسی نے روایت نہیں کی، اور ہمارے علم میں کوئی اور راوی اس کی

---

(۱) (طبع مؤسسة الريان بيروت).

(۲) دیکھئے: بذل المجهود فى حل أبى داؤد ج:۲ ص:۳۳ (طبع ندوة العلماء لكهنؤ). وكذا فى الكفاية على هامش فتح القدير ج:۱ ص:۱۳۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

(۳) حوالہ بالا۔

(۴) نصب الراية لأحاديث الهداية ج:۱ ص:۱۸۴ (طبع مؤسسة الريان بيروت).

تائید نہیں کرتا، البتہ حضرت مغیرہؓ سے صحیح روایت مسح علی الخفین ہی کی ہے۔

اس کے علاوہ امام مسلمؒ، امام بیہقیؒ، سفیان ثوریؒ، امام احمدؒ، یحییٰ بن معینؒ، علی بن المدینیؒ اور دُوسرے محدثین نے اس روایت کو ابوقیس اور ہزیل بن شرجیل دونوں کے ضعف کی بناء پر ضعیف قرار دیا ہے، اور علامہ نوویؒ شارحِ صحیح مسلم لکھتے ہیں:-

کل واحد من هؤلاء لو انفرد قدم علی الترمذی مع ان الجرح مقدم علی التعدیل، واتفق الحفاظ علی تضعیفه، ولا یقبل قول الترمذی أنه حسن صحیح. (نصب الرایة بحوالہ بالا)[1]

جن حضرات نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اگر ان میں سے ہر ایک تنہا ہوتا تب بھی وہ امام ترمذیؒ پر مقدم ہوتا، اس کے علاوہ یہ قاعدہ ہے کہ جرح، تعدیل پر مقدم ہوتی ہے، اور حفاظِ حدیث اس کی تضعیف پر متفق ہیں، لہٰذا ترمذی کا یہ قول کہ یہ ''حسن صحیح ہے'' قابلِ قبول نہیں۔

یہ ہے اس حدیث کی اسنادی حیثیت جسے مولانا مودودی صاحب نے اپنی دلیل میں پیش کیا ہے، آپ نے دیکھا کہ اوّل تو اکثر حفاظِ حدیث کے نزدیک یہ حدیث ضعیف اور نا قابلِ استدلال ہے۔

دُوسرے اگر بالفرض امام ترمذیؒ کے قول کے مطابق اسے صحیح مان لیا جائے تو پورے ذخیرۂ حدیث میں تنہا یہ ایک روایت ہوگی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جوربین پر مسح کرنا مذکور ہے۔

اب آپ غور فرمایئے کہ قرآنِ کریم نے پاؤں دھونے کا جو صریح حکم دیا ہے، اسے صرف اس ایک روایت کی بناء پر کیسے چھوڑ دیا جائے؟ جبکہ ائمۂ حدیث نے اس پر شدید تنقید بھی کی ہے۔ آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ مسح علی الخفین کا حکم اس وقت ثابت ہوا کہ جب اس کی احادیث تواتر کی حد تک پہنچ گئیں، اور امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر مسح علی الخفین کی احادیث اتنی کثرت کے ساتھ نہ ہوتیں تو پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو چھوڑنے کی گنجائش نہ تھی، لیکن مسح علی الجوربین کی احادیث متواتر تو کیا ہوتیں؟ پورے ذخیرۂ حدیث میں اس کی صرف تین روایتیں ہیں، ان میں سے دو تو بالاتفاق ضعیف ہیں، اور ایک کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے، صرف امام ترمذیؒ اسے صحیح کہتے ہیں۔ ایسی روایات کی بناء پر قرآنِ کریم کے کسی حکم میں کوئی تخصیص یا تقیید پیدا نہیں کی جاسکتی، چنانچہ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:-

والأصل فیه أنه قد ثبت أن مراد الآیة الغسل علی ما قدمنا، فلو لم ترد الآثار المتواترة عن النبی صلی الله علیه وسلم فی المسح علی الخفین لما جاز لنا المسح ولما لم ترد الآثار فی جواز المسح علی الجوربین فی وزن ورودها فی المسح علی الخفین أبقینا

---

(۱) نصب الرایة لأحادیث الهدایة ج: ۱ ص: ۱۸۴ (طبع مؤسسة الریان بیروت).

حکم الغسل علی مراد الآیة. (أحکام القرآن للجصاص ج:۲ ص:۴۲۸)[1]

مسئلے کی حقیقت یہ ہے کہ آیت کی اصلی مراد پاؤں دھونا ہے، جیسے کہ پیچھے گزر چکا، لہٰذا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسح علی الخفین کی متواتر احادیث ثابت نہ ہوتیں تو ہم کبھی مسح علی الخفین کو جائز قرار نہ دیتے ..... اور چونکہ جوربین (کپڑے کے موزوں) پر مسح کی احادیث اس وزنی طریقے سے مروی نہیں ہیں جس وزنی طریقے سے مسح علی الخفین کی احادیث مروی ہیں اس لئے ہم نے وہاں آیتِ قرآنی کی اصل مراد یعنی پاؤں دھونے کے حکم کو برقرار رکھا ہے۔

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جن حضراتِ صحابہ کرامؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے جوربین پر مسح کیا یا اس کی اجازت دی، تو ان کے اس عمل کی کیا وجہ تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے ان آثار میں کہیں بھی یہ صراحت نہیں ہے کہ جوربین کپڑے کے باریک موزے تھے، اور جب تک یہ صراحت نہ ہو اس وقت تک ان آثار سے باریک موزوں پر مسح کا جواز کیسے ثابت ہوسکتا ہے؟ چنانچہ مشہور اہلِ حدیث عالم علامہ شمس الحق صاحب عظیم آبادی لکھتے ہیں:-

ان الجورب یتخذ من الادیم وکذا من الصوف وکذا من القطن ویقال لکل من هذا أنه جورب ومن المعلوم ان هذه الرخصة بهذا العموم .... لا تثبت الا بعد ان یثبت ان الجوربین الذین مسح علیهما النبی صلی الله علیه وسلم کانا من صوف .... الخ.

(عون المعبود ج:۱ ص:۶۲)[2]

یعنی جوربین کھال کے بھی ہوتے ہیں، اُون کے بھی اور رُوئی کے بھی، اور ہر ایک کو جورب کہا جاتا ہے، اور ہر قسم کے موزے پر مسح کی اجازت اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکتی ہے جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جوربین پر مسح فرمایا، بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ثابت ہے کہ ان حضرات نے جن جوربین پر مسح فرمایا وہ زیادہ تو چمڑے کے تھے یا اپنی موٹائی کی وجہ سے چمڑے کے موزوں کی طرح تھے، اور ان میں چمڑے کے موزوں کی صفات پائی جاتی تھیں، چنانچہ مصنف ابنِ ابی شیبہ میں روایت ہے:-

حدثنا هشیم قال أخبرنا یونس عن الحسن وشعبة عن قتادة عن سعید بن المسیب والحسن انهما قالا: یمسح علی الجوربین اذا کانا صفیقین. (مصنف ابن ابی شیبة ج:۱ ص:۱۸۸)[3]

---

(۱) أحکام القرآن للجصاص رحمه الله ج:۲ ص:۳۵۰ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

(۲) عون المعبود باب المسح علی الجوربین ج:۱ ص:۱۸۷ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت).

(۳) (طبع ادارة القرآن کراچی).

حضرت سعید بن مسیبؒ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جرابوں پر مسح جائز ہے، بشرطیکہ وہ خوب موٹی ہوں۔ واضح رہے کہ ثوب صفیق اس کپڑے کو کہتے ہیں جو خوب مضبوط اور دبیز ہو، ملاحظہ ہو قاموس اور مختار الصحاح وغیرہ۔

حضرت حسن بصریؒ اور حضرت سعید بن المسیبؒ دونوں جلیل القدر تابعین میں سے ہیں، اور انہوں نے صحابہ کرامؓ کا عمل دیکھ کر ہی یہ فتویٰ دیا ہے۔

لہٰذا ان حضرات کے عمل اور فتویٰ سے جو بات ثابت ہوئی وہ اس سے زائد نہیں کہ جو موزے بہت موٹے ہونے کی بناء پر چمڑے کے اوصاف کے حامل ہوں، ان پر مسح جائز ہے، اور اس موٹائی کی وضاحت کے لئے فقہاءؒ نے وہ تین شرائط ذکر کی ہیں کہ ایک تو ان میں پانی نہ چھنے، دوسرے وہ کسی چیز سے باندھے بغیر اپنی موٹائی کی وجہ سے خود کھڑے رہیں، اور تیسرے یہ کہ ان کو پہن کر تین میل چلنا ممکن ہو، ایسے موزے چونکہ چمڑے کے اوصاف کے حامل ہوتے ہیں، اس لئے ان کو بھی اکثر فقہاءؒ نے ''مسح علی الخفین'' کی احادیث کی دلالۃ النص اور مذکورہ آثارِ صحابہ کی بناء پر ''خفین'' کے حکم میں داخل کرلیا، چنانچہ علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:-

لا شک ان المسح علی الخف علی خلاف القیاس، فلا یصلح الحاق غیرہ بہ، الا اذا کان بطریق الدلالة، وھو أن یکون فی معناہ، ومعناہ الساتر لمحل الفرض الذی ھو بعدد متابعة المشی فیه فی السفر وغیرہ. (۱) (فتح القدیر ج ۱ ص ۱۰۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسح علی الخفین کی مشروعیت خلافِ قیاس ہوئی ہے، لہٰذا کسی دوسری چیز کو ان پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اِلّا یہ کہ وہ دلالۃ النص کے طریقے پر خفین کے معنی میں داخل ہو، اور خفین کے معنی ایک ایسے موزے کے ہیں جنھوں نے پاؤں کو بالکل ڈھانپ رکھا ہو، اور ان میں سفر وغیرہ کے دوران مسلسل چلنا ممکن ہو۔

لہٰذا فقہاءؒ نے جوربین پر مسح کے لئے جو شرائط مقرر کی ہیں، ان کی یہ تعبیر بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ہے کہ حدیث میں مسح علی الجوربین کی اجازت مطلق تھی، اور انہوں نے اپنی طرف سے شرائط عائد کرکے اسے مقید کردیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اصولی اعتبار سے پاؤں دھونے کے فریضے کو چھوڑ کر مسح کرنے کا حکم اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس پر احادیث متواتر موجود نہ ہوں، خفین

---

(۱) فتح القدیر باب المسح علی الخفین ج ۱ ص ۱۳۹ (طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

میں چونکہ ایسی احادیث موجود تھیں، اس لئے وہاں مسح کی اجازت دے دی گئی، لیکن جوربین پر مسح کسی ایسی حدیث سے بھی ثابت نہیں جو متفق علیہ طور پر صحیح ہو، لہٰذا ان پر مسح کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی، اِلّا یہ کہ وہ جوربین، خفین کی صفات کی حامل ہوکر خفین کے حکم میں بدلالۃ النص داخل ہوجائیں، اور چونکہ صحابہؓ وتابعینؒ سے ایسے ہی موزوں پر مسح ثابت تھا، اس لئے بیشتر فقہاء نے اس کی اجازت دی، اور ''خفین'' کی بنیادی صفات کو مذکورہ تین شرائط کے ذریعہ بیان کردیا، اور اس پر تمام ائمۂ مجتہدینؒ کا اجماع منعقد ہوگیا۔

جہاں تک علامہ ابنِ حزمؒ یا علامہ ابنِ تیمیہؒ اور علامہ ابنِ قیمؒ کا تعلق ہے، ان کا مقامِ بلند اپنی جگہ ہے، لیکن انہوں نے بہت سے مسائل میں جمہور اُمت سے الگ راہ اختیار کی ہے، جسے اُمت نے بحیثیت مجموعی قبول نہیں کیا، بالخصوص اس مسئلے میں تو انہوں نے اپنے مسلک پر کوئی دلیل بھی نہیں دی، لہٰذا پوری اُمت کے فقہاء، محدثین اور مجتہدین کے مقابلے میں صرف ان تین حضرات کی رائے پر عمل کرکے پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو ترک کردینا ایک سنگین جسارت ہے۔ اور اس ''اجتہاد'' کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے کہ: ''اگر پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر بھی مسح کرلیا جائے تو اس پر بھی مسح جائز ہے۔'' ساری اُمت کے تمام فقہاء، تمام محدثین اور تمام مجتہدین کے بارے میں تو یہ الزام ہے کہ ان کے اس قول کا کوئی مأخذ نہیں، حالانکہ ان کے ناقابلِ انکار دلائل آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں، اور دُوسری طرف اپنا خود ''اجتہاد'' یہ ہے کہ بلاوجہ پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر اس پر بھی مسح کیا جاسکتا ہے۔ کیا اس لایعنی حرکت کی خاطر پاؤں دھونے کے قرآنی حکم کو ترک کرنے کا بھی کوئی مأخذ ہے؟

آپ نے جناب مولانا مودودی صاحب کی جو عبارت نقل فرمائی ہے، اس میں چونکہ جوتوں پر مسح کرنے کا بھی ذکر ہے، اس لئے اس کی حقیقت بھی آخر میں مختصراً عرض ہے۔

جوربین اگر موٹے ہوں تو ان پر مسح کرنے کے تو بعض فقہاء قائل بھی ہیں، لیکن جوتوں پر مسح کرنا تو کسی بھی امام کے مذہب میں جائز نہیں۔

لم یذهب أحد من الأئمة الی جواز المسح علی النعلین. (معارف السنن ج:۱ ص:۳۴۷)[1]

ائمہ میں سے کوئی بھی جوتوں پر مسح کرنے کا قائل نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جوتوں پر مسح کرنا اس وقت ثابت ہے جبکہ

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید).

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی سے باوضو ہوتے تھے، لیکن نئی نماز کے لئے تازہ وضو فرماتے تھے، ایسی حالت میں چونکہ وضو پہلے سے ہوتا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں دھونے کے بجائے اپنے جوتوں پر ہاتھ پھیر لیتے تھے، چنانچہ صحیح ابن خزیمہ میں روایت ہے:-

عن علیؓ أنه دعا بكوز من ماء ثم توضأ وضوأ خفيفًا مسح على نعليه، ثم قال: هكذا وضوء رسول الله صلى الله عليه وسلم للطاهر ما لم يحدث.

(صحیح ابن خزیمة ج:۱ ص:۱۰۰ باب۵۴ حدیث:۳۰۰)[1]

حضرت علیؓ نے پانی کا ایک گلاس منگوایا، اور بہت مختصر وضو کیا اور اپنے جوتوں پر مسح کیا، پھر فرمایا ''طہارت کی حالت میں جب تک وضو نہ ٹوٹا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح وضو فرمایا کرتے تھے۔''

اس وضاحت کے بعد ''جوتوں پر مسح'' ثابت کرنے والی روایات سے بے وضو آدمی کے لئے جوتوں پر مسح کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لہٰذا

اُمت کے تمام مستند فقہاء و مجتہدین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ باریک موزے جن سے پانی چھن جاتا ہو یا وہ کسی چیز سے باندھے بغیر پنڈلی پر کھڑے نہ رہتے ہوں، یا ان میں تین میل مسلسل چلنا ممکن نہ ہو، ان پر مسح جائز نہیں، اور نہ جوتوں پر مسح دُرست ہے۔ اور چونکہ ہمارے زمانے میں جو سوتی، اُونی، نائیلون کے موزے رائج ہیں وہ باریک ہوتے ہیں اور ان میں مذکورہ اوصاف نہیں پائے جاتے، اس لئے ان پر مسح کسی حال میں جائز نہیں ہے، اور جو شخص ایسا کرے گا تو امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، بلکہ کسی بھی مجتہد کے مسلک میں اس کا وضو صحیح نہیں ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

(از ماہنامہ ''البلاغ''

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ)

---

(۱) (طبع المكتب الاسلامی بیروت)

نائیلون کی مروّجہ جرابوں اور سوتی جرابوں پر مسح کا حکم

سوال: – موزوں پر مسح کرنا جائز ہے، ربڑ کے موزے کے علاوہ واٹر پروف موزے وغیرہ اور نائیلون کی جرابیں، سوتی جرابیں، ان پر مسح جائز ہے یا نہیں؟ واضح طور پر صحیح ثبوت کے ساتھ باحوالہ تحریر فرمائیں۔

جواب: – چمڑے یا ربڑ کے موزے اگر اتنے موٹے ہوں کہ محض اپنی موٹائی اور سختی کی وجہ سے یا لاسٹک باندھے بغیر خود کھڑے رہیں تو ان پر مسح دُرست ہے، نائیلون کی مروّجہ جرابیں پتلی ہوتی ہیں ان پر مسح دُرست نہیں۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۱/۲/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۹۳ الف)

***

(۱) دلائل اور تفصیل کے لئے پچھلا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

کتاب الصلوٰۃ

(مسائلِ نماز)

﴿فصل فی مواقیت الصلوٰۃ﴾
(اوقاتِ نماز سے متعلق مسائل کا بیان)

دارالعلوم کراچی کے نقشۂ اوقاتِ نماز میں صبحِ صادق کے وقت پر اعتراض اور اس کا جواب

سوال:- محترم واجب الاحترام مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ نے تقریباً ایک مہینے سے دارالعلوم کے مفتیوں کے ساتھ صبحِ صادق اور صبحِ کاذب کے بارے میں گفت وشنید کی، جس سے معلوم ہوا کہ ان کو اس فن کا کوئی علم ہی نہیں سوائے اندھی تقلید کے۔

جناب مولانا اشرف صاحب بیت المکرّم والے سے تین بار فون پر گفت وشنید کی، اور ان سے عرض کیا کہ ہمیں وقت دے دیں کہ ہم تین آدمی اس بارے میں دلائل سے گفتگو کریں۔ مشاہدات کے لئے میں محمد اشرف جنوبی وزیرستان، علمِ جدید کے لئے احمد نفیس انجینئر، علمِ ہیئتِ قدیم کے لئے مفتی بلال صاحب، لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوئے، بالآخر تیسری بار یہ فرمایا کہ یہ نقشۂ اوقاتِ نماز عباسی صاحب نے مرتب کیا ہے، غرضیکہ سوائے اندھی تقلید کے اور کوئی دلائل زیرِ اُفق اٹھارہ درجے پر صبحِ صادق ہونے کے، نہیں تھے۔

آخر میں یہ فرمایا کہ آپ مفتی رفیع عثمانی صاحب اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے بات کریں۔

جناب محترم! آپ دونوں بھائیوں نے اور علماء حضرات کے ساتھ اندازاً تین بار مشاہدات کئے ہیں، اور آپ صاحب نے اپنے قلم سے زیرِ اُفق اٹھارہ درجے صبحِ کاذب ثابت کیا ہے، پھر آپ نے اسی صبحِ کاذب کو صبحِ صادق کیسے ثابت کیا؟ غرضیکہ مشاہدات سے بھی اور حسابات سے بھی آپ دونوں بھائی زیرِ اُفق اٹھارہ درجے پر صبحِ کاذب کے قائل ہوگئے تھے، پھر بغیر مشاہدات اور حسابات کے زیرِ اُفق پندرہ درجہ صبحِ صادق کی کیوں مخالفت شروع کی ہے؟

جناب محترم! مؤدّبانہ التماس ہے کہ بندوں کو سیدھی راہ دِکھانے کی خاطر آئندہ کے لئے

ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید چھوڑیں اور مسئلے کو صحیح حل فرمانے کی مہربانی فرمائیں، تاکہ عوام کی نمازِ فجر ضائع ہونے سے بچ جائے، اُمیدِ واثق ہے کہ دارالعلوم سے شائع ہونے والے نقشۂ اوقاتِ نماز کی اپنے لکھے ہوئے اُصول کے مطابق شائع کرنے کی ہدایت جاری فرمائیں گے۔

یعنی انتہاءِ سحر پُرانے نقشوں کے مطابق، اذانِ فجر صبحِ صادق مفتی رشید احمد دامت برکاتہم کے مرتب کردہ حساب کے مطابق، صبحِ صادق زیرِ اُفق پندرہ درجے پر ہونے کو شائع کرنے کی ہدایت جاری فرمائیں۔ وفقکم اللہ تعالیٰ

بندہ محمد اشرف عفا اللہ تعالیٰ
جنوبی وزیرستان
۲۲ رشوال ۱۴۱۷ھ

(مذکورہ تحریر کے بعد سائل کی طرف سے ذیل کا استفتاء بھی آیا)

محترم المقام واجب الاحترام مفتیان حضرات زید مجدکم، ومفتی تقی عثمانی صاحب
دارالعلوم کورنگی کراچی ۱۴
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حق کو نہ چھپاؤ، حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔ یہاں کراچی شہر میں صبح وانتہاءِ سحر و اِفطار کے نقشے چھپتے ہیں، ان نقشوں میں سحر کے وقت اور اَذانِ فجر کے مابین کوئی فرق نہیں لکھا ہے، تعجب کی بات ہے کہ انتہاءِ سحر کے وقت لاؤڈ اسپیکروں پر اذانیں دینا بھی شروع کردیتے ہیں، ساتھ ہی لوگ انفرادی و اجتماعی طور پر فجر کی نماز ادا کرتے ہیں، لیکن بہت سے ایسے مفتیان و علمائے کرام جن کو معلوم ہے کہ مروّجہ جنتریوں میں جو صبحِ صادق کا وقت لکھا ہے وہ صبحِ کاذب کا ہے، لیکن پھر بھی وہ غلط نقشوں کی نشر واشاعت کررہے ہیں۔

اب بندہ اپنے پندرہ سال کے عینی مشاہدات لکھ رہا ہے، وہ یہ کہ زیرِ اُفق اٹھارہ درجے صبحِ کاذب کا وقت ہے، اور زیرِ اُفق پندرہ درجے صبحِ صادق کا وقت ہے، نیز پُرانے نقشے جو برِصغیر پاک و ہند میں چھپتے ہیں ان میں صبح وعشاء کا وقت غلط ہے، جو نقشہ صاحبِ احسن الفتاویٰ مفتی رشید احمد صاحب نے مرتب کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

کراچی شہر میں جتنے اوقات مدارس والے یا کوئی اور چھاپتے ہیں اس میں صبحِ صادق کا وقت غلط ہے، دارالعلوم کراچی کا نقشہ بھی غلط ہے، جو صبح کا وقت لکھا ہے وہ صبحِ کاذب ہے، اب آئندہ کے لئے اگر کراچی شہر کے مفتیوں اور علماء نے اس مروّجہ جنتری کے غلط ہونے کا فتویٰ نہیں دیا اور خود بھی عمل

نہیں کیا تو جن لوگوں کی نمازیں ضائع ہوئی ہیں ان کا وبال ان علماء پر پڑے گا۔

آپ کراچی شہر کے علماء سے دردمندانہ اپیل ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لئے جدوجہد شروع فرمائیں اور اس بارے میں عینی مشاہدات کریں، جس کی صورت یہ ہے کہ کراچی شہر سے باہر جاکر مہینے میں پانچ دن مشاہدات کئے جائیں، اس طرح آپ حضرات پر اپنی غلطی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجائے گی۔

مفتیانِ کرام کی پانچ رُکنی کمیٹی نے نقشہ مرتب کرنے کے جو دو اُصول مقرّر فرمائے ہیں:-

۱:- سال بھر عینی مشاہدات کئے جائیں، اس کے بعد نقشہ مرتب کیا جائے۔

۲:- حسابات کے مطابق نقشہ مرتب کیا جائے، لیکن اس کے لئے بھی سال بھر مشاہدات کئے جائیں۔

دارالعلوم کا مرتب کردہ نقشہ ان دونوں اُصولوں کے خلاف ہے، غرضیکہ پورے پاکستان میں شائع کئے جانے والے نقشوں میں صبحِ صادق کی جگہ صبحِ کاذب کا وقت لکھا ہے، جبکہ صبحِ صادق اور کاذب کے مابین بارہ سے بیس منٹ کا فرق ہے۔ دوبارہ التماس ہے کہ کراچی کے علماء اور مفتیان حضرات اس مسئلے کے حل کے لئے جدوجہد شروع کریں، میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ دُنیا کا کوئی بھی شخص زیرِ اُفق اٹھارہ درجے پر صبحِ صادق ثابت نہیں کرسکتا اور نہ کرسکے گا، اگر کسی کو دعویٰ ہے تو وہ مشاہدے کے لئے آئے۔

بندہ محمد اشرف عفا اللہ عنہ

(سائل کو جواب میں ٹنڈو آدم کے مشاہدات کے نتیجے میں مرتب کردہ درج ذیل تحریر بھی بھیجی گئی اور ساتھ ہی حضرتِ والا دامت برکاتہم نے مستقل جواب بھی تحریر فرمایا، جو اس تحریر کے بعد درج ہے۔ از مرتب عفی عنہ)

صبحِ صادق

حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کے رسالہ صبحِ صادق کے دلائل پر غور وخوض کرنے کے لئے ۱۳/ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ کو مجلس منعقد ہوئی، جس میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم، حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم اور حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے شرکت فرمائی، اس تحریر میں یہ تمام حضرات متفق تھے، اور اس میں سب حضرات کے دستخط بھی ثبت تھے، اور مفتیٔ اعظم مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اگرچہ اس مجلس میں موجود نہ تھے، مگر بعد میں حضرتؒ نے اس تحریر سے اتفاق کیا اور اپنے تصدیقی دستخط ثبت فرمائے، یہاں وہ تحریر بعینہٖ نقل کی جارہی ہے۔

الحمدللہ و کفٰی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد:

آج بتاریخ ۱۳؍ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ صبحِ صادق اور عشاء کے اوقات کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے مجلس منعقد ہوئی، جس میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے:-

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب

حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب

احقر تقی عثمانی

اس مجلس میں مولانا رشید احمد صاحب کے رسالہ صبحِ صادق کے دلائل پر غور کیا گیا، اور متعلقہ کتب کی مراجعت کی گئی، نیز مسئلے کی تحقیق اور مشاہدات کے لئے ٹنڈو آدم کا سفر کیا گیا، اس کے نتائج زیرِ غور آئے، بحث و تمحیص کے بعد مندرجہ ذیل باتیں پایۂ ثبوت کو پہنچیں:-

۱:- مروّجہ جنتریوں میں صبحِ صادق اور عشاء کا جو وقت لکھا ہوا ہے، وہ اس وقت کا ہے جب آفتاب اُفق سے اٹھارہ درجے نیچے ہوتا ہے، اس کی تصریح محکمۂ موسمیات نیول ہیڈکوارٹر کے خطوط رسالہ صبحِ صادق ص:۶۵ ج:۲ وص:۶۷ میں موجود ہے، اور نائیکل المینک جو گرین وچ سے شائع ہوتی ہے اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

۲:- اٹھارہ درجے زیرِ اُفق فلکیات کے جدید ماہرین کی تصریحات کے مطابق وہ وقت ہے کہ مشرق کی طرف صبح کو اس سے پہلے، اور مغرب کی طرف رات کو اس کے بعد کوئی ہلکی سی روشنی بھی اُفق پر نہیں ہوتی، آخرِ شب میں جو روشنی سب سے پہلے نمودار ہوتی ہے اسے اسٹرانومیکل ٹوایلائٹ کہتے ہیں۔

۳:- ہیئت کی قدیم کتابوں سے بھی قولِ راجح و مشہور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ درجہ زیرِ اُفق صبحِ کاذب کا وقت ہے، نہ کہ صبحِ صادق کا، بعض کتب میں سترہ زیرِ اُفق، اور بعض میں انیس زیرِ اُفق کے اقوال بھی بصیغۂ تمریض موجود ہیں، لیکن وہ مرجوح ہیں۔

۴:- اس مسئلے کے زیرِ غور آنے کے بعد متفرق ایام میں جتنے مشاہدات کئے گئے ان میں سے کسی میں بھی مروّجہ جنتریوں کے مطابق صبحِ صادق نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد ہوئی، ان سب اُمور سے ثابت ہوتا ہے کہ مروّجہ جنتریوں میں صبحِ صادق کے نام سے جو وقت لکھا گیا ہے وہ درحقیقت صبحِ کاذب کا ہے، اور غالباً روزے کے بارے میں احتیاط کے پیشِ نظر لکھا گیا ہوگا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ پھر صبحِ صادق کا صحیح وقت کیا ہے؟ اس کا تعین دو طریقوں سے ممکن تھا، ایک مشاہدات سے، دُوسرے حسابات سے۔ جہاں تک مشاہدات کا تعلق ہے ان کی بنیاد پر

کوئی جنتری اس وقت بنائی جاسکتی ہے جبکہ سالہا سال مکمل مشاہدات کئے جائیں، اور ظاہر ہے اس کے مواقع میسر نہیں، اور جو تھوڑے بہت مشاہدات کئے گئے ان سے سال بھر کے لئے اوقات کا تعین ممکن نہیں تھا۔ دُوسرا طریقہ حسابات کا تھا، حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہٗ نے بعض ہیئت کی کتابوں کی تصریح کے مطابق پندرہ درجے زیر اُفق صبحِ صادق کا وقت قرار دے کر حسابات سے اس کا نقشہ بنایا ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ صبحِ صادق اور صبحِ کاذب کے درمیان تین درجات کا فرق ہے، اور جب مذکورہ بالا دلائل کی رُو سے ثابت ہوا کہ صبحِ کاذب اٹھارہ درجے زیر اُفق پر ہوتی ہے تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ صبحِ صادق پندرہ درجے زیر اُفق پر ہوگی۔ اس بناء پر حضرت مفتی رشید احمد صاحب نے صبحِ صادق کے جو اوقات نکالے ہیں ان کا مقابلہ ٹنڈو آدم کے مشاہدات سے کیا گیا تو زیادہ سے زیادہ تین منٹ کا فرق نکلا، مگر یہ تین منٹ کا فرق صبحِ کاذب میں بھی تھا، اس لئے صبحِ کاذب اور صادق کے درمیان پر کوئی اثر نہیں پڑا، مفتی رشید احمد صاحب نے بارہ جون کو وہاں کے لئے چار بج کر تین منٹ صبحِ کاذب (اٹھارہ زیر اُفق) کا اور چار بج کر بیس منٹ صبحِ صادق (پندرہ درجہ زیر اُفق) کا وقت لکھا، مگر مشاہدے سے صبحِ کاذب پورے چار بجے اور صبحِ صادق چار بج کر سترہ منٹ پر نظر آئی، یہ تین منٹ کا فرق شبہے کی وجہ بن سکتا تھا، لیکن بقول حضرت مفتی صاحب مدظلہم طول وعرض نصف النہار کے پیشِ نظر اتنا فرق ہوسکتا ہے اس کے لئے مفتی صاحب کی رائے میں بھی پانچ منٹ کی احتیاط ضروری ہے اور بعد میں مفتی صاحب نے دوبارہ احتیاط کے ساتھ اس تاریخ اور اس طول وعرض کا حساب نکالا تو معلوم ہوا کہ فرق صرف ایک منٹ کا تھا اور پہلے حساب میں کچھ غلطی ہوگئی تھی۔

بہرکیف! مذکورہ بالا تحقیق سے ہمیں بھی یہ ظن غالب ہوتا ہے کہ مولانا مفتی رشید احمد صاحب نے جو حسابی طریقے سے اوقات نکالے ہیں اس کے مطابق نقشے بنالینے میں کوئی حرج نہیں، لیکن معلوم ہوا کہ بعض دُوسرے علماء کا اس پر اطمینان نہیں ہوسکا، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صبحِ صادق پندرہ درجے زیر اُفق سے پہلے ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ ہمارے ظن غالب کی بنیاد بھی حسابات ہیں نہ کہ ایسے مسلسل مشاہدات جو کہ دائمی جنتریوں کی بنیاد بن سکیں جبکہ شریعت میں اصل مدار مشاہدات پر ہے، اور حسابی جنتریوں پر اعتماد اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ مشاہدات سے متواتر تائید ہوگئی ہو، اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نقشوں میں وقتِ فجر کے لئے دو خانے الگ الگ لکھے جائیں، ایک کا عنوان ہو احتیاطی منتہاءِ سحر اور اس کے تحت قدیم معمول کے مطابق قدیم جنتریوں کے اوقات لکھے جائیں، دُوسرا عنوان ہو وقتِ اذانِ فجر اور اس میں حضرت مفتی رشید احمد کے نکالے ہوئے اوقاتِ صبحِ صادق لکھے

جائیں، دونوں کے درمیانی وقت میں نہ سحری کھائی جائے اور نہ نماز پڑھی جائے۔

احقر محمد تقی عثمانی
۱۴ر ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ

اس سے اتفاق ہے اگرچہ میں حاضرِ مجلس نہ تھا
محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۴ر ذیقعدہ ۱۳۹۲ ہجری
دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴

محمد عاشق الٰہی
رشید احمد
العبد محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

بندہ عبدالرؤف سکھروی
۲۱ر شعبان ۱۴۱۷ھ

(مذکورہ بالا تحریر کے علاوہ حضرتِ والا دامت برکاتہم نے سائل کے استفتاء کے جواب میں باقاعدہ فتویٰ بھی تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے۔ از مرتب عفی عنہ)

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، صبحِ صادق کے مسئلے پر حضرت والد صاحبؒ اور حضرت مولانا بنوری صاحب قدس سرہٗ کے زمانے میں مہینوں تحقیق جاری رہی، جس میں مشاہدات بھی کئے گئے اور حسابی تحقیق بھی کی گئی، آپ نے ٹنڈو آدم کے جس مشاہدے کا ذکر فرمایا ہے وہ متعدّد مشاہدات کا ایک مرحلہ تھا، کوئی حتمی مشاہدہ نہیں تھا، اس وقت یہ بات سب پر واضح تھی کہ مطلع گرد آلود ہونے کی بناء پر اس مشاہدے کو کسی حتمی فیصلے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، اس کے بعد بھی متعدّد مشاہدات کئے گئے، کتابی تحقیق بھی ہوئی، بالآخر حضرت والد صاحبؒ اور حضرت مولانا بنوری صاحبؒ دونوں نے حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کی تحقیق سے اختلاف اور اس پر عدمِ اطمینان کا اعلان فرمایا، اس کے بعد انہی حضرات کے حکم سے خود احقر نے ایک مفصل تحریر حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم العالی کی خدمت میں بھیجی جس میں ان بزرگوں کے فیصلے کی وجوہ عرض کی تھیں، حضرت مدظلہم کی طرف سے اس تحریر کا کوئی جواب بھی موصول نہیں ہوا، بہرصورت یہ مسئلہ مہینوں کی محنت اور تحقیق و مشاہدے کے بعد کم از کم ہماری حد تک واضح ہوگیا، افسوس ہے کہ اس کے باوجود ہر موقع پر ٹنڈو آدم کے اس ناتمام مشاہدے کی بنیاد پر بزرگوں کو مطعون کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور ان حضرات کی بعد کی تحریروں، مشاہدات اور زبانی گفتگو کا کوئی حوالہ نہیں دیا جاتا۔

بہرکیف! اگر کسی صاحب کو حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کی تحقیق پر ہی اعتماد ہے تو بے شک اس پر عمل فرمائیں، لیکن مذکورہ بزرگوں کے موقف کو اندھی تقلید پر مبنی قرار دینا اور ان وفات

یافتہ بزرگوں کے بارے میں زبانِ طعن دراز کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ والسلام

۱۴۱۷/۱۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۲/۲۶۰)

انتہاءِ زوال اور ابتداءِ ظہر میں فاصلے کی مقدار

سوال ۱:- انتہائے زوال اور ابتدائے ظہر میں کتنا فصل ہوتا ہے؟

۲:- زوال کی مدّت کتنے منٹ ہوتی ہے؟

جواب ۱،۲:- زوال ایک آنی چیز ہے جو ایک منٹ سے بھی کم وقت میں پورا ہوجاتا ہے، اور اس کے فوراً بعد ظہر کا وقت شروع ہوجاتا ہے، لہٰذا استواءِ شمس کے فوراً بعد نمازِ ظہر کا وقت آجاتا ہے، دونوں میں کوئی معتد بہ فاصلہ نہیں ہے، البتہ زوال کے اطمینان کے لئے پانچ منٹ کا احتیاطاً انتظار کرلینا چاہئے۔

وقد وقع فی عبارات الفقهاء أن الوقت المكروه هو عند انتصاف النهار الى أن تزول الشمس ولا يخفى أن زوال الشمس انما هو عقيب انتصاف النهار بلا فصل. (شامی ج:۱ ص:۲۴۸)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۸ھ
(فتویٰ نمبر ۲۶۰/۲۸ الف)

حنبلی مسلک میں زوال سے پہلے جمعہ کا وقت
اور اس کی بناء پر حنفی مقتدی کے لئے حکم

سوال:- کویت میں نماز کے اوقات کا ایک کتابچہ جس کا نام "نتيجة تقويم الهجرى"

---

(۱) رد المحتار ج:۱ ص:۳۷۱ (طبع سعيد). وفی فتح الملهم ج:۵ ص:۳۱۵ (طبع مكتبه دار العلوم كراچی) عن عقبة بن عامر الجهنیؓ يقول ثلث ساعات كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهانا أن نصلى فيهن أو أن نقبر فيهن موتانا، حين تطلع الشمس بازغة حتّى ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرية حتّى تميل الشمس وحين تضيف الشمس للغروب حتّى تغرب. رواه مسلم. وفی فتح الملهم قوله: وحين يقوم قائم الظهيرية .... الخ: هی شدة الحر فی نصف النهار، قال السندی: قال النوویؒ: الظهيرة حال استواء الشمس ومعناه حين لا يبقى للقائم فی الظهيرة ظل فی المشرق ولا فی المغرب وفی المجمع هو من قامت به دابته ووقفت يعنی ان الشمس اذا بلغت وسط السماء ابطأت حركته الى أن يزول فيحسب انها قد وقفت وهی سائرة لكن لا يظهر اثره ظهوره قبل الزوال وبعده انتهىٰ.

ہے، یہ کتابچہ حکومت کی طرف سے مفت مہیا کیا جاتا ہے، اوقات کے روزانہ تغیر کے ساتھ ساتھ نماز کے اوقات بھی بدلے جاتے ہیں، دو سال قبل جمعہ کی پہلی اذان ابتدائے ظہر پر کہی جاتی ہے اور دو رکعت ادا کرنے کے بعد امام منبر پر تشریف لاتا اور خطبہ کی اذان کہی جاتی، اس مختصر وقفے میں ہم پاکستانی چار رکعت نماز ادا کر لیتے، لیکن دو سال سے حکم جاری ہے جس کی بناء پر جمعہ کی پہلی اذان ظہر سے آدھا گھنٹہ پہلے ہوتی ہے اور ابتدائے ظہر پر خطبہ کی اذان کہی جاتی ہے، کبھی خطیب دو منٹ پہلے ہی منبر پر تشریف لے آتے ہیں اور اذان بھی اسی وقت ہوجاتی ہے، ان حالات میں چار رکعت قبلِ جمعہ کا کیا حکم ہے؟

جواب:- وہ لوگ حنبلی مسلک کے ہوں گے، ان کے مسلک میں جمعہ کا وقت زوال سے پہلے ہوجاتا ہے۔ بہرحال اس صورت میں حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ خطیب صاحب سے اپنی مشکل بیان کرکے انہیں اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ زوال کے بعد چار رکعات کا وقت دیا کریں، اُمید ہے کہ وہ اسے قبول کرلیں گے، اور اگر بالفرض وہ قبول نہ کریں تو سنتیں جماعت کے بعد ادا کرلی جائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۲/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۰/ ۲۸ الف)

ظہر کا وقت

سوال:- کیا ظہر کی نماز ایک بج کر ۵ منٹ پر ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ ہماری فیکٹری میں مستقل اسی وقت ظہر کی جماعت ادا کی جاتی ہے۔

جواب:- ظہر کا وقت زوالِ آفتاب کے فوراً بعد ہوجاتا ہے، اور زوالِ آفتاب کا وقت موسموں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اس کے لئے اوقات کے مفصل نقشے چھپے ہوئے عام ملتے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں، چونکہ اکثر موسموں میں ایک بجے سے پہلے ہی ظہر کا وقت ہوجاتا ہے اس لئے آپ ایک بجے نماز پڑھ سکتے ہیں۔

والسلام

۱۳۹۹/۱/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۱۷/ ۳۰ الف)

کینیڈا میں عصر اور عشاء کا وقت

سوال ا:- یہاں امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق نمازوں کے اوقات کا چارٹ چھپا ہوا

ہے، آپ عصر کی نماز کا وقت حنفی مسلک کے مطابق متعین فرمادیں۔

۲:- یہاں کینیڈا میں غروبِ آفتاب کے بعد شفقِ اَحمر تو غائب ہوجاتا ہے، مگر شفقِ اَبیض رات گیارہ بجے تک یا اس سے بھی دیر تک رہتا ہے، گیارہ بجے تک کا انتظار خاصا مشکل ہے اور نمازِ عشاء اکثر رہ جاتی ہے، یہ انتظار اس لئے بھی مشکل ہے کہ صبح جلدی اُٹھنا پڑتا ہے۔ آپ فرمائیں کہ مغرب کے بعد جلد سے جلد عشاء کی نماز کا وقت کب شروع ہوجاتا ہے؟

جواب ۱:- عصر کی نماز کا وقت حنفی مسلک میں اس وقت ہوتا ہے جب زمین پر ہر چیز کا سایہ (سایۂ اصل کے علاوہ) دُگنا ہوجائے،(۱) یہ وقت مختلف موسموں میں اور مختلف مقامات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اور وہاں ماہرین سے رُجوع کرکے معلوم کیا جاسکتا ہے، اور اگر وہاں مشکل ہو تو مولانا مفتی رشید احمد صاحب اشرف المدارس ناظم آباد کراچی ۴ کو لکھ کر ان سے پورا نقشہ بنوایا جائے، ان کو اس میں مہارت ہے، احقر کو مہارت نہیں۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں شفقِ اَحمر کے غروب ہوجانے کے بعد عشاء کی نماز ادا کرلینے کی گنجائش ہے، عملًا بقول الصاحبین فی مواقع العذر۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۶۵۰ د)

۱:- عصر میں اصفرارِ شمس تک تأخیر

۲:- عشاء کا وقت

سوال ۱:- احناف کے مسلک پر نمازِ عصر میں جو تأخیر افضل ہے تو اس افضلیت پر گھنٹوں

---

(۱) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فی تأخیر الظهر فی شدة الحر ج: ۱ ص: ۲۲، ۲۳ (طبع فاروقی کتب خانه) عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذا اشتد الحر فأبردوا عن الصلوٰة فان شدة الحر من فیح جهنم. طریقِ استدلال یہ ہے کہ حجاز کی گرمی کا ابراد مثلِ اوّل پر نہیں ہوتا۔ وفیه أیضًا ج: ۱ ص: ۲۳ عن أبی ذرؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم کان فی سفر ومعه بلال فأراد أن یقیم فقال: أبرد! ثم أراد أن یقیم فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: أبرد فی الظهر. قال: حتّی رأینا فیئَ التلول ثم أقام فصلّی، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان شدة الحر من فیح جهنم فابردوا عن الصلوٰة. وفی الصحیح للامام البخاریؒ ج: ۱ ص: ۷۶، ۷۷ (طبع قدیمی کتب خانه) حتّی ساوی الظل التلول. طریقِ استدلال یہ ہے کہ ٹیلوں کا سایہ ان کے مساوی ہونے کا حاصل یہ ہے کہ عرب کے ٹیلے عموماً منبسط ہوتے ہیں، اس لئے ان کا سایہ کافی دیر میں ظاہر ہوتا ہے، اور ان کا سایہ اس وقت ایک مثل ہوتا ہے جبکہ دُوسری چیزوں کا سایہ ایک مثل سے کافی زائد ہوچکا ہو، دیگر احادیث اور مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح الملهم ج: ۴ ص: ۲۹۷ تا ۳۰۶ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی) و درسِ ترمذی ج: ۱ ص: ۳۹۵۔

(۲) وفی اعلاء السنن ج: ۲ ص: ۱۱ (طبع ادارة القرآن کراچی) وفی البحر الشفق هو البیاض عند الامام الی أن قال فثبت أن قول الامام هو الأصح .... ولا یعدل عنه الی قولهما أو قول أحدهما أو غیرهما الا لضرورة من ضعف دلیل أو تعامل بخلافه کالمزارعة وأن صرح المشائخ بأن الفتوی علی قولهما کما فی هذه المسئلة وفی السراج الوهاج فقولهما أوسع للناس وقول أبی حنیفة أحوط. (محمد زبیر حق نواز)

کے حساب سے عصر اور مغرب کے درمیان کتنا وقت ہونا چاہئے؟

۲:- مغرب کی نماز کے کتنے وقت بعد عشاء کا وقت داخل ہوتا ہے؟

جواب ۱:- حنفیہ کے نزدیک عصر کی نماز اصفرارِ شمس یعنی سورج کے زرد ہونے سے پہلے تک تأخیر کرنا افضل ہے، لیکن جماعت میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ نماز ختم کرنے کے بعد اصفرار سے پہلے اتنا وقت باقی رہے کہ اگر نماز کا اعادہ کرنا ہو تو وہ بھی اصفرار سے پہلے کیا جاسکے، یہ وقت موسموں اور شہروں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اس لئے گھنٹہ منٹ کے حساب سے اس کی کوئی مقدار دائمی طور پر مقرّر نہیں کی جاسکتی۔[1]

۲:- جب شفقِ اَبیض (یعنی مغربی اُفق پر سفیدی) غائب ہوجائے تو عشاء کا وقت داخل ہوجاتا ہے،[2] اس کا مدار بھی شہر کے محلِ وقوع اور موسم پر ہوتا ہے، اس لئے گھنٹہ اور منٹ کے لحاظ سے اس کی بھی دائمی مقدار نہیں بتائی جاسکتی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۲ھ

نمازِ فجر میں اِسفار افضل ہے

سوال:- یہاں دیہی علاقے میں لوگ نمازِ فجر کافی دیر کرکے پڑھتے ہیں، مثلاً ۳/ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ کو جامع مسجد جیمس آباد میں نمازِ فجر ۶:۱۵ (سوا چھ بجے پڑھی گئی) جبکہ کراچی کی نسبت طلوع و غروب میں ۵ منٹ کا فرق ہے، براہِ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب:- نمازِ فجر حنفیہ کے نزدیک اِسفار یعنی اُجالے میں پڑھنا افضل ہے، البتہ نماز طلوعِ آفتاب سے اتنے پہلے ختم ہوجانی چاہئے کہ اگر کسی وجہ سے نماز کا اعادہ کرنا پڑے تو طوالِ مفصل

---

(۱) وقتِ عصر سے متعلق دلائل گزشتہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) فی الهداية ج:۱ ص:۸۲ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان) (مواقيت صلوٰة) وأول وقت العشاء اذا غاب الشفق وآخر وقتها ما لم يطلع الفجر. وفي الشامية ج:۱ ص:۳۶۱ تحت قوله واليه رجع الامام الخ .... قال في الاختيار الشفق البياض وهو مذهب الصديق ومعاذ بن جبل وعائشة رضي الله عنها وعنهم قلت رواه عبدالرزاق عن أبي هريرة وعن عمر بن عبدالعزيزؒ الى قوله قال العلامة قاسم فثبت أن قول الامام هو الأصح ومشى عليه في البحر .... الخ. وفي اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۱ وفي البحر الشفق هو البياض عند الامام الى أن قال فثبت أن قول الامام هو الأصح وبهذا ظهر أنه لا يفتى ولا يعمل الا بقول الامام الأعظم ولا يعدل عنه الى قولهما أو قول أحدهما أو غيرهما الّا لضرورة من ضعف دليل أو تعامل بخلافه كالمزارعة وان صرح المشائخ بأن الفتوىٰ على قولهما كما في هذه المسئلة وفي السراج الوهاج فقولهما أوسع للناس وقول أبي حنيفة أحوط. (محمد زبير)

کی قراءت کے ساتھ اعادہ ہوسکے اور پھر بھی کچھ وقت بچ رہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۲/۸/۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷۸۰/۲۷ و)

شرعی رات کی تحقیق

سوال:- شامی کتاب الصوم ج:۲ ص:۸۸ میں ہے کہ النہار الشرعی صبحِ صادق سے غروب تک ہے، باقی رات ہے، بخلاف عرفی نہار کے۔ یہاں رات شرعی مراد ہے یا عرفی؟

جواب:- غروب کے ساتھ ہی شرعی رات شروع ہوجاتی ہے، لقوله تعالیٰ: أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ.[2] ولما فی رد المحتار والمراد بالغروب زمان غيبوبة جرم الشمس بحيث تظهر الظلمة فی جهة الشرق قال صلى الله عليه وسلم: "اذا أقبل الليل من هٰهُنَا فقد أفطر الصائم" أی اذا وجدت الظلمة حسا فی جهة المشرق فقد ظهر وقت الفطر أو صار مفطرًا فی الحكم، لأن الليل ليس ظرفًا للصوم۔ (شامی ج:۲ ص:۸۰ اوّل کتاب الصوم)۔[3]

واللہ اعلم

۲۳/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۸ الف)

عشاء میں جلدی کا حکم

سوال:- عشاء کی اذان اور نماز میں اکثر مسجدوں میں اتنی جلدی کرتے ہیں کہ مغرب کی اذان سے عشاء کی جماعت تک ڈیڑھ گھنٹہ بھی ٹھیک سے نہیں ہوتا، تو کیا ایسی صورت میں اذان اور نماز ہوجاتی ہے؟

جواب:- ہر موسم میں مغرب اور عشاء کے درمیان فاصلہ الگ ہوتا ہے، اس کام کے لئے نقشے چھپے ہوئے ہیں، حافظ فریدالدین صاحب وکٹوریہ روڈ والے اوقاتِ نماز کا جو نقشہ چھاپتے ہیں اس

---

(۱) فی الكبيرى شرح منية المصلى ص:۲۳۲ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور) ويستحب فی صلاة الفجر الاسفار بها، بأن تصلى فی وقت ظهور النور وانكشاف الظلمة والغلس بحيث يرمی الرامی موقع نبله عندنا خلافا للثلاثة، لقوله عليه السلام: اسفروا بالفجر فانه أعظم للأجر. رواه الترمذی. وفی المراقی فی "حاشية الطحطاوی علىٰ مراقی الفلاح" ج:۱ ص:۲۵۲ (طبع مكتبة العلم الحديث دمشق) يستحب الاسفار وهو التأخير للاضاءة بالفجر بحيث لو ظهر فسادها اعادها بقراءة مسنونة قبل طلوع الشمس لقوله عليه السلام: اسفروا بالفجر فانه أعظم للأجر. وفيه أيضًا ج:۱ ص:۲۵۴ والاسفار بالفجر مستحب سفرًا وحضرًا. وفی الدر المختار ج:۱ ص:۳۶۶ (طبع سعيد) والمستحب للرجل الابتداء فی الفجر باسفار والختم به هو المختار بحيث يرتل أربعين اية ثم يعيده بطهارة لو فسد .... الخ. وفی الهداية ج:۱ ص:۸۲ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان) (باب المواقيت) ويستحب الاسفار بالفجر لقوله عليه السلام: اسفروا بالفجر فانه أعظم للأجر.

(۲) سورة البقرة:۱۸۷.

(۳) شامية ج:۲ ص:۳۷۱ (طبع ايچ ايم سعيد). (محمد زبیر حق نواز)

کے مطابق عمل کریں۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۰ھ

رمضان میں عشاء اور صبحِ صادق کا وقت

سوال:- رمضان المبارک میں عشاء کی نماز کا ابتدائی وقت (یعنی اذان کا وقت) کتنے بجے شروع ہوتا ہے؟ اور صبحِ صادق کا وقت کب تک رہتا ہے؟ اس مسئلے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ کئی مساجد میں اوقاتِ نماز کے دو مختلف نقشے آویزاں ہیں، ان میں تقریباً اوقاتِ صبحِ صادق اور وقتِ عشاء میں ۲۰-۲۵ منٹ کا فرق ہے، اور نقشے کے نیچے یہ درج ہے کہ اس میں اوقاتِ صبحِ صادق وعشاء کی تصحیح کی گئی ہے اس میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا بھی نام ہے، جبکہ عمل عموماً اس کے خلاف ہے، اب ہم کس نقشے کے مطابق اذانوں کا وقت متعین کریں؟ اور سحری کا وقت کس نقشے کے مطابق ہو؟ مفتی صاحب کا جس نقشے میں نام ہے اس میں اختتامِ سحری ۴ بج کر اُنسٹھ منٹ لکھا ہے، دُوسرے نقشے میں وقتِ سحری چار بج کر بیالیس منٹ لکھا ہے۔

جواب:- حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو شروع میں اوقاتِ فجر وعشاء کے بارے میں کچھ تردّد ہوگیا تھا، لیکن آخر میں ان کا فتویٰ یہی تھا کہ قدیم نقشے دُرست ہیں، چنانچہ گزشتہ رمضان میں خود انہوں نے جو نقشہ شائع کروایا وہ قدیم نقشوں کے مطابق تھا، اب آپ کو دیکھنا ہو تو دارالعلوم نانک واڑہ سے نقشہ حاصل کرلیجئے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۲/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۴۳ ج)

سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نماز پڑھنا

سوال:- فجر کی اذان سحری ختم ہوتے ہی دے دی جائے تو جائز ہے؟ اور سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نماز پڑھنا دُرست ہے؟

جواب:- احتیاط اس میں ہے کہ جب موجودہ نقشوں کے مطابق سحری کا وقت ختم ہوجائے تو فوراً نمازِ فجر نہ پڑھیں، بلکہ دس پندرہ منٹ انتظار کرکے پڑھیں تاکہ صبحِ صادق بلااختلاف ہوجائے، تاہم اگر کسی نے فوراً نماز پڑھ لی تو اس کی نماز ہوجائے گی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۶۸۰ د)

(۱،۲) اب اوقاتِ نماز کا ایک نقشہ خود حضرتِ والا دامت برکاتہم اور دیگر اکابر دارالعلوم کی زیرنگرانی بھی تیار کیا گیا ہے، جسے مکتبہ نعمانیہ کراچی نے شائع کیا ہے، بوقتِ ضرورت اس کی طرف مراجعت بھی مناسب ہے۔ (مرتب)

صبحِ صادق کے وقت پر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ سے اختلاف کی تحقیق (عربی فتویٰ)

سوال :- قال مولانا مفتی رشید أحمد ادام الله حیاته فی أحسن الفتاویٰ أن الجداول لأوقات الصلوٰت فی عامة المساجد لیست بصحیحة ونقل جهده وجهد علماء عصره بهٰذا الصدد وذکر اسمک بین هٰذه العلماء ونقل موافقتکم معه فی رأیه وذکر فی الأخر رجوعکم عن موافقة المذکورة وأسف علیٰ هٰذا شدیدًا وقال رجعوا بغیر دلیل واستدلال وبغیر قیل وقال.

جواب :- قد وقع تحقیق مسئلة وقت الصبح الصادق فی زمن والدی الشیخ المفتی محمد شفیع والعلامة الشیخ البنوری رحمهما الله تعالیٰ، وکانا فی أول الأمر قد مالا الیٰ رأی شیخنا المفتی رشید أحمد حفظه الله تعالیٰ ولٰکن بعد المشاهدات المتوالیة ومراجعة کتب الفقه والحساب عدلا عن رأیه.

المشاهدة التی ذکرها شیخنا المفتی رشید أحمد حفظه الله تعالیٰ فهی "مشاهدة ٹنڈو آدم" وکانت احدی المشاهدات ما بین عدة مشاهدات وکان مطلع الشرق اذ ذاک مغبرا ولم یکن أحد یری أن هٰذه المشاهدة کافیة للوصول الی نتیجة حاسمة فلا ینبغی التعویل علیها.

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۴۰۵/۵/۴ھ

عصر کی نماز کے لئے ساڑھے چار بجے کا وقت مقرّر کرنا

سوال :- مشکوٰۃ شریف اور ترمذی کی ایک حدیث ہے اور اس امامتِ جبرئیل والی حدیث میں زوال کے فوراً بعد ظہر کی نماز ادا کرنے کا ذکر ہے، اور عصر کی نماز جب سایہ ایک مثل ہوگیا تو اس کے بعد عصر کی نماز ادا کرنے کا ذکر موجود ہے۔

ان صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز سایہ کے ایک مثل ہوجانے کے بعد ادا فرمائی۔

اس حدیث کی روشنی میں، نیز چونکہ ہم سب کاروباری لوگ ہیں اور غرض یہ ہے کہ ہم سب جماعت کے ساتھ نماز ادا کرسکیں، اس کی بناء پر ہم نے مناسب یہ سمجھا کہ ساڑھے چار بجے عصر کی

جماعت کرالی جائے، یہ ٹائم ہم نے عصر کی جماعت کے لئے مقرّر کیا ہے، ہمارا یہ وقت مقرّر کرنا حدودِ جواز میں داخل ہے یا نہیں؟

جواب: – رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چونکہ گھڑیاں نہیں تھیں اس لئے اوقات کا تعین جنتری یا گھڑیوں کے حساب سے نہ تھا، بلکہ اوقات کی مختلف علامتیں مقرّر تھیں، ان علامتوں کا بیان مختلف احادیث میں آیا ہے اور اس بارے میں ایک دو نہیں، بہت سی احادیث مروی ہیں، امام ابوحنیفہؒ نے ان تمام احادیث کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عصر کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہر چیز کا سایہ اس سے دُگنا ہوجائے۔[1] یہ وقت موسموں اور مقامات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، کراچی میں عصر کا وقت کم سے کم چار بج کر آٹھ منٹ پر (۷/دسمبر کو) ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ پانچ بج کر تئیس (۱۵/جولائی کو) ہوتا ہے۔ آج یعنی (۱۴/مارچ کو) عصر کا وقت پانچ بج کر دو منٹ پر شروع ہوگا، اس سے پہلے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نماز پڑھنا دُرست نہیں۔ لہٰذا آپ نے آج کل ساڑھے چار بجے کا جو وقت مقرّر کیا ہوا ہے وہ حنفی مسلک کے لحاظ سے دُرست نہیں ہے۔ آپ کو چاہئے کہ اوقاتِ نماز کے جو طبع شدہ نسخے ملتے ہیں وہ اپنے پاس رکھیں اور اس میں روزانہ عصر کا وقت دیکھ کر اس کے مطابق جماعت کا وقت مقرّر فرمائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۱/۴/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۲۸۷ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب الصلوٰۃ ج: ۱ ص: ۳۵۹ و ۳۶۰ ووقت الظهر من زواله أی میل زکاء عن کبد السماء الی بلوغ الظل مثلیه. وفیه بعد أسطر ص: ۳۶۰ ووقت العصر منه الی قبیل الغروب وفی الشامیة تحته (قوله منه) أی من بلوغ الظل مثلیه .... الخ.

﴿فصل فی الأذان﴾
(اذان سے متعلق مسائل کا بیان)

اذان میں تجوید کی غلطی کا حکم

سوال:- ایک شخص اذان دیتے ہوئے بہت غلطیاں کرتا ہے، تلاوتِ قرآن شریف بھی بہت غلط پڑھتا ہے، جابجالحنِ جلی کرتا ہے، "حی علی الصلوٰۃ" میں حاء کو ھاء پڑھتا ہے، ایسا شخص اس منصب کے قابل ہے یانہیں؟ فتاویٰ رشیدیہ کا مسئلہ اس بارے میں دُرست ہے یانہیں؟

جواب:- مؤذّن کا تقرّر کرتے وقت اس بات کا پورا لحاظ رکھنا چاہئے کہ مؤذّن صحیح خواں ہو، اور کسی قسم کا لحن نہ کرتا ہو، پھر اگر وہ ایسی غلطی کرے جو معنی بگاڑ دے تو اذان ہی نہیں ہوتی، "حی علی الصلوٰۃ" کو "ھَیَّ علی الصلوٰۃ" پڑھنے سے معنی نہیں بگڑتے، البتہ اس غلطی کی اصلاح کے بغیر مؤذّن کا تقرّر نہ کرنا چاہئے، لیکن اگر تقرّر کرلیا گیا ہو تو اذان ہوجائے گی، فتاویٰ رشیدیہ[1] کا مسئلہ بالکل دُرست ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

۱۳۸۷/۱۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۹/۱۸ الف)

اذان سے پہلے دُرود وسلام پڑھنے کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ اذان سے پہلے بلند آواز سے دُرود وسلام پڑھنا شرعاً جائز ہے یانہیں؟ براہِ کرم تفصیل سے بتلایئے۔

جواب:- اذان سے پہلے بلند آواز کے ساتھ دُرود وسلام پڑھنا کسی حدیث یا صحابہ کرامؓ

(۱) فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۵۹ (ادارۂ اسلامیات، طبع محرم ۱۴۰۸ھ)۔

کے کسی عمل سے ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس کو زیادہ ثواب کا موجب سمجھ کر کرنا یا اس کی پابندی کرنا بدعت ہے،[1] بلکہ اذان کے کلمات میں اپنی طرف سے کچھ کلمات کا اضافہ کرنا ہے جو باتفاقِ اُمت ناجائز ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۳۰۴ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

جمعہ کی اذانِ ثانی کہاں دی جائے؟

سوال: – جمعہ کی اذانِ ثانی منبر اور خطیب کے سامنے دی جائے یا کہ مسجد کے باہر؟

جواب: – جمعہ کی اذانِ ثانی کا خطیب کے سامنے ہونا مسنون ہے، فی الدر المختار: ویؤذن ثانیًا بین یدیه أی الخطیب، وقال تحته أی علی سبیل السنیة کما یظهر من کلامهم، رملی۔ (شامی ج:۱ ص:۷۷۰)۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۱/۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۳۵۶ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی الابداع فی مضار الابتداع ص:۷۷، ۷۸ (طبع مکتبة علمیة مدینة المنورة) لا کلام فی ان الصلوٰة والسلام علی النبی صلی الله علیه وسلم عقب الأذان مطلوبان شرعًا لورود الأحادیث الصحیحة .... انما الخلاف فی الجهر بهما علی الکیفیة المعروفة، والصواب أنها بدعة مذمومة بهٰذه الکیفیة التی جرت بها عادة المؤذنین من رفع الصوت بهما کالأذان والتمطیط والتغنی فانّ ذلک احداث شعار دینی علی خلاف ما عهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وأصحابه والسلف الصالح من أئمة المسلمین ولیس لأحد بعدهم ذلک. وفیه بعد أسطر: ومن ثم قال العلامة ابن حجر فی فتاویه الکبریٰ من صلّی علی النبی صلی الله علیه وسلم قبل الأذان أو قال محمد رسول الله بعده معتقدًا سنّیته فی ذلک المحلّ ینهٰی ویمنع منه لأنه تشریع بغیر دلیل ومن شرع بغیر دلیل یزجر ویمنع. تفصیل کے لئے "کتاب السنة والبدعة" میں ص:۱۱۱ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) فتاویٰ شامیة ج:۲ ص:۱۶۱ (طبع ایچ ایم سعید). وفی الهدایة ج:۱ ص:۱۷۱ (مکتبه شرکت علمیه، ملتان) واذا صعد الامام المنبر جلس وأذن المؤذّنون بین یدی المنبر بذلک جری التوارث الخ.

وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۴۹ (مکتبه رشیدیه، کوئٹه) واذا جلس علی المنبر أذن بین یدیه واقیم بعد تمام الخطبة بذلک جری التوارث کذا فی البحر الرّائق. وفی غنیة المتملی ص:۵۲۱ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) واذا جلس الامام علی المنبر أذن المؤذن بین یدیه الأذان الثانی للتوارث. (وفی طبع مکة علی الصفحة:۳۳۱). (محمد زبیر عفی عنہ)

سیاسی مقاصد کے لئے اذان دینے کا حکم

سوال:- آج کل مساجد میں پانچ وقت کی اذانوں کے علاوہ جو اذانیں رات میں دی جارہی ہیں، شرعی طور پر اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:- قرآن وسنت اور فقہائے کرامؒ کی تصریحات سے اذان کے بعد جو مواقع ثابت ہیں، آج کل پانچ وقت کے علاوہ دی جانے والی اذانیں ان میں سے کسی میں داخل نہیں ہوتیں،[1] البتہ مسلمانوں پر کوئی عام مصیبت آئی ہو تو اس کے ازالے کے لئے فجر کی نماز میں قنوتِ نازلہ ثابت ہے،[2] اور ایسے مواقع پر اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

واللہ اعلم

۹/۶/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۵۶۲)

---

(۱) نماز کے علاوہ دیگر مواقعِ اذان کی تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاویٰ شامیة مطلب فی المواضع التی یندب لها الأذان فی غیر الصلوٰة ج:۱ ص:۳۸۵ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) وفی رد المحتار ج:۲ ص:۱۱ وان نزل بالمسلمین نازلة قنت الامام فی صلوٰة الجهر .... قنت فی صلوٰة الفجر الخ. تفصیل کے لئے فتاویٰ شامیة "مطلب فی القنوت للنّازلة" ج:۲ ص:۱۱ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

﴿فصل فی شروط الصلوٰۃ وأرکانها وواجباتها وسننها وآدابها﴾

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کے بیان میں)

سمتِ قبلہ کا مطلب

سوال: – نماز پڑھتے وقت کعبہ کا تعین مغرب کی سمت میں کیا جاتا ہے، جبکہ ضروری نہیں کہ دُنیا کے ہر حصے کے لئے یہ اُصول دُرست ہو۔ اگر یہ اُصول محض اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ تمام مسلمان ایک سمت کو سجدہ کریں تو نماز میں یہ کہنا کہاں تک دُرست ہے کہ ''میرا رُخ کعبے شریف کی طرف ہے'' جبکہ ہم کو یقین ہے کہ ہمارا منہ مغرب کی طرف ہے؟

جواب: – غالباً آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تمام دُنیا کے مسلمان خواہ وہ کہیں آباد ہوں، نماز کے وقت مغرب کا رُخ کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ اصل میں ہمیں نماز کے اندر کعبہ مشرفہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ہندوستان اور پاکستان وغیرہ کے لحاظ سے چونکہ کعبہ مغرب کی سمت میں ہے، اس لئے یہاں کے باشندے مغرب کا رُخ کرتے ہیں، لیکن جو لوگ مغربی ممالک مثلاً یورپ اور امریکہ وغیرہ میں بستے ہیں وہ نماز کے وقت مغرب کی بجائے مشرق کی طرف منہ کرتے ہیں، مدینہ طیبہ کے باشندے جنوب کی طرف رُخ کرتے ہیں، اور جنوبی افریقہ کے لوگ شمال کی طرف۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصل چیز کعبہ ہی کا استقبال ہے، وہ جس خطے کے لحاظ سے جس سمت میں ہو، ادھر ہی کا رُخ کیا جائے گا۔

واللہ اعلم

۲۰ ربیع الاوّل ۱۳۸۷ھ (۱)

حالتِ اِحرام میں جاءِ نماز پر سجدہ کا حکم

سوال: – لوگوں کا خیال ہے کہ حالتِ اِحرام میں ناک اور چہرہ جاءِ نماز سے نہیں لگنا چاہئے، بلکہ اپنے دونوں ہاتھ ملا کر سجدہ اس پر کرنا چاہئے، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

---

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

جواب:- حالتِ اِحرام میں جاءِ نماز پر سجدہ کرنا جائز ہے، دونوں ہاتھ ملاکر ان پر سجدہ کرنا دُرست نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۲/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۷۷ و)

ٹرین میں فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا

سوال:- سفر کے دوران عصر کی نماز کے لئے خانیوال اسٹیشن تجویز کیا کہ وہاں گاڑی تقریباً ۲۰ منٹ رُکتی ہے، چونکہ گاڑی تأخیر سے چل رہی تھی، اس لئے اس شش و پنج میں رہا کہ کہیں وہاں پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت تنگ نہ ہوجائے یا اس وقت تک وضو نہ ٹوٹ جائے، اس لئے گاڑی ہی میں نماز پڑھ لی، لیکن جب گاڑی خانیوال پہنچی تو عصر کا وقت اچھا خاصا تھا، میں نے گاڑی میں نماز بیٹھ کر پڑھی تھی اور خانیوال پہنچ کر اس نماز کو نہیں دُہرایا، کیا میری عصر کی نماز دُرست ہوگئی یا قضا لازم ہوگی؟

جواب:- فرض نماز شدید معذوری کے بغیر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں،(۱) لہٰذا ریل گاڑی میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی بناء پر اب اس نماز کا لوٹانا لازم ہے۔(۲) واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۳۴۰ ہ)

سجدے میں پیشانی کے ساتھ ناک رکھنے سے متعلق بہشتی زیور اور احسن الفتاویٰ میں تعارض کی تحقیق

سوال:- سجدے میں بہشتی زیور شبیری مکمل مدلل میں صفحہ نمبر ۸۹ پر تحقیقی عنوان سے ہے کہ پیشانی کے ساتھ ناک زمین پر رکھنا واجب نہیں ہے، صرف وضعِ جبہہ علی الارض سے بھی نماز دُرست ہوگی۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم نے اپنے احسن الفتاویٰ میں ناک رکھنا واجب لکھا ہے، اور اگر ناک نہ رکھے تو نماز واجب الاعادہ فرماتے ہیں۔ آپ حضرات اپنی تحقیق سے مطلع فرمائیں اور دلائل بھی تحریر فرمائیں۔ والسلام (حضرت مولانا) حکیم محمد اختر (صاحب مدظلہم)

جواب:- دراصل اس مسئلے میں بہشتی زیور اور احسن الفتاویٰ میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں کتبِ فقہ کے درمیان تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور سے کتبِ فقہ میں وہی مسئلہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۱۴۲ و ص:۴۴۴ (طبع سعید) من فرائضها .... ومنها القيام فی فرض لقادر عليه وفی الشامية تحته، قوله (لقادر عليه) فلو عجز عنه حقيقة وهو ظاهر أو حكمًا كما لو حصل له به ألم شيد أو خاف زيادة المرض وكالمسائل الآتية .... الخ.

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۹۳ و۳۹۴ سوال نمبر ۵۱۳ اور اس کا حاشیہ۔ (محمد زبیر)

درج ہے جو بہشتی زیور میں منقول ہے، چنانچہ بدائع، تحفہ اور الاختیار میں اقتصار علی الجبہہ کو بلا کراہت جائز قرار دیا ہے (کما فی البحر ج:۱ ص:۳۳۶)،[۱] اور اکثر کتبِ فقہ میں اس کو مطلق مکروہ لکھا ہے، چنانچہ عالمگیری میں ہے: وان کان من غیر عذر فان وضع جبهته دون أنفه جاز اجماعا، ویکره .... الخ۔ (ج:۱ ص:۷۰)۔[۲]

پھر بعض فقہاء نے اس کو مکروہِ تنزیہی پر محمول کیا، چنانچہ علامہ شامیؒ نے صاحبِ نہر کا قول نقل کیا ہے: لو حملت الکراهة فی رأی من أثبتها علی التنزیهیة ومن نفاها علی التحریمیة لارتفع التنافی، وعبارته فی السراج المستحب أن یضعهما۔ (منحة الخالق ج:۱ ص:۳۳۶)۔[۳]

اور صاحبِ بحر نے کراہتِ تحریمی کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے: وکره أی الاقتصار علیٰ أحدهما سواء کان الجبهة أو الأنف وهی عند الاطلاق منصرفة الی کراهة التحریم، وهکذا فی المفید والمزید فالقول بعدم الکراهة ضعیف۔ (ج:۱ ص:۳۳۶)۔[۴]

علامہ شامیؒ نے اسی بنیاد پر صاحبِ حلیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کراہتِ تحریم کا مقابل چونکہ واجب ہوتا ہے اس لئے وضع الانف واجب ہوا، چنانچہ فرماتے ہیں: فالأشبه وجوب وضعهما معًا وکراهة ترک وضع کل تحریما، واذا کان الدلیل ناهضا به فلا بأس بالقول به انتهیٰ۔ (شامی ج:۱ ص:۳۳۵)۔[۵]

اسی عبارت کی بناء پر مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم نے احسن الفتاویٰ میں وجوب کے قول پر اعتماد کیا ہے،[۶] لیکن خود علامہ شامی رحمہ اللہ نے البحر الرائق کے حاشیہ پر جو بحث کی ہے اس سے ان کا رُجحان عدمِ وجوب کی طرف معلوم ہوتا ہے، وہاں ان کی پوری عبارت یہ ہے:-

قال فی النهر: لو حملت الکراهة فی رأی من أثبتها علی التنزیهیة ومن نفاها علی التحریمیة لارتفع التنافی، وعبارته فی السراج: المستحب أن یضعهما (انتهیٰ). لکن قال الشیخ اسماعیل: وفی غرر الأذکار أن الاقتصار علی الجبهة یجوز بلا کراهة وان لم یکن علی الأنف عذرا اتفاقا، وکذلک فی مجموع المسائل وانه به یفتی، وفی الاختیار: وان اقتصر علیٰ جبهته جاز بالاجماع ولا اساءة بعد أن قال: فان اقتصر علی الأنف جاز وقد أساء، وقالا:

---

(۱) البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) عالمگیریة (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۳) منحة الخالق علی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع سعید).
(۴) البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۵) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۴۹۹ (طبع ایچ ایم سعید).
(۶) احسن الفتاویٰ ج:۳ ص:۲۱.

لا یجوز الا من عذر، انتهٰی کلامه فلیتأمل. ویبعد ما قاله فی النهر قول المتن وکره علٰی أحدهما، فانه لا یصح حمله علی التنزیهیة نظرا الی ترک السجود علی الجبهة لٰکن سیأتی حمل الکراهة علٰی طلب الکف طلبا غیر جازم. (منحة الخالق ج:۱ ص:۳۳۶)[1]۔

اس عبارت کے آخری جملے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ بنیاد منہدم کردی ہے جس کی وجہ سے سجود علی الانف کو واجب کہا گیا تھا، اور وہ یہ کہ مطلق کراہت کا اطلاق کراہتِ تحریمی پر ہوتا ہے جس کا مقابل واجب ہے۔ منحة الخالق میں ان کے قول کا حاصل یہ ہے کہ کراہت کا اطلاق طلب الکف طلبا غیر جازم پر بھی ہوتا ہے، جو کراہتِ تنزیہی کو بھی شامل ہے۔

علامہ شامیؒ کی اس رائے سے بہشتی زیور کی تائید ہوتی ہے، اور یہ اس لئے بھی راجح معلوم ہوتا ہے کہ اوّل تو اس سے فقہاء کے مختلف اقوال میں تطبیق ہوجاتی ہے، دُوسرے منحة الخالق، رد المحتار کے بعد لکھی گئی ہے، لہٰذا یہ ان کا آخری مسلک ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ رد المحتار سے جو وجوب سمجھ میں آتا ہے، اس پر عمل زیادہ قرینِ احتیاط ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۸/۱۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳/۱۱۷۳ ج ۲۸)

امام کا تکبیر کے وقت بیٹھے رہنا اور ''حی علی الفلاح'' پر کھڑا ہونا

سوال:- جب تکبیر شروع ہوتی ہے تو امام صاحب بیٹھے رہتے ہیں، اور ''حی علی الفلاح'' پر کھڑے ہوتے ہیں، یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- صحیح طریقہ یہ ہے کہ تکبیر کی ابتداء ہی میں تمام مقتدی کھڑے ہوکر صفیں دُرست کرلیں، اور بعض مقامات پر جو رواج ہوگیا ہے کہ امام اور مقتدی باہر سے آکر بیٹھ جانے کا اہتمام کرتے ہیں اور ''حی علی الفلاح'' سے پہلے کھڑا ہونے کو بُرا جانتے ہیں، یہ طرزِ عمل دُرست نہیں۔ فقہاء نے جو لکھا ہے کہ ''حی علی الفلاح'' پر کھڑے ہوجانا چاہئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ''حی علی الفلاح'' کہنے کے بعد کوئی بیٹھا نہ رہے، یہ مطلب نہیں کہ پہلے کھڑا ہونا ناجائز ہے۔ اس مسئلے کی پوری تفصیل جواہر الفقہ[2] مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں موجود ہے۔ تفصیل کے لئے اس کی طرف رُجوع فرمالیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۵/۱۰/۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۴۸ ہ)

---

(۱) منحة الخالق علی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۱۸ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) ج:۱ ص:۳۰۹ تا ۳۲۴.

تکبیر کے دوران نمازی کب کھڑے ہوں؟

سوال:- ایک مولوی صاحب نے وسیع طبع شدہ چارٹ لگایا جس میں اقوالِ نبویؐ، اقوالِ صحابہؓ اور مسلکِ بزرگانِ دین سے یہ ثابت کیا ہے کہ تکبیرِ اُولیٰ کے وقت بیٹھنا مستحب ہے، اور شروع میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، تو کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- درحقیقت مسئلہ یہ ہے کہ مقتدیوں کے کھڑے ہونے کا تکبیر کے کسی لفظ کے ساتھ تعلق نہیں ہے، بلکہ جس وقت مقتدی امام کو آتا دیکھیں اس وقت سے لے کر مکبّر کے "حی علی الفلاح" کہنے تک کسی بھی وقت کھڑے ہوسکتے ہیں، ہاں! اس کے بعد کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ "حی علی الفلاح" سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے، جو لوگ اس سے پہلے کھڑے ہوتے ہیں وہ کسی مکروہ عمل کا ارتکاب نہیں کرتے۔

مسند عبدالرزاق کی ایک حدیث میں ہے: عن ابن جریج عن ابن شهاب ان الناس كانوا ساعة يقول المؤذن: الله أكبر يقومون الى الصلوٰة فلا يأتى النبى صلى الله عليه وسلم مقامه حتى تعتدل الصفوف (فتح الباری)۔[1] اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: فأما اذا كان الامام خارج المسجد فان دخل المسجد من قبل الصفوف فكلما جاوز صفا قام ذٰلك الصف، واليه مال شمس الأئمة الحلوانى والسرخسى وشيخ الاسلام خواهر زاده، وان كان الامام دخل المسجد من قدامهم يقومون كما رأوا الامام۔ (عالمگیری ج:۱ ص:۴۴)۔[2]

اور جن کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ "حی علی الفلاح" کہنے پر سب کھڑے ہوجائیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ "حی علی الفلاح" کہنے پر کوئی شخص بیٹھا نہ رہے، یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔[3]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۱۳۹۱/۴/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۲۲/۵۴۷ الف)

---

(۱) فتح الباری، کتاب الأذان، باب متی یقوم الناس اذا رأوا الامام عند الاقامة، ج:۲ ص:۱۲۰ (طبع دار نشر کتب الاسلامیه لاهور).

(۲) فتاویٰ عالمگیریة ج:۱ ص:۵۷ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۳) تفصیل کے لئے جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۰۹ تا ۳۲۴ ملاحظہ فرمائیں۔

تکبیر کے دوران مقتدی کب کھڑے ہوں؟

سوال:- تکبیر کے وقت مقتدیوں کو "حی علی الصلوٰۃ" تک بیٹھنا ہے یا اوّل تکبیر پر کھڑا ہونا چاہئے، اور اگر پیش امام بیٹھا ہے اور مقتدی بھی کافی تعداد میں یا ایک دو افراد کھڑے ہوں تو ان کو زبردستی بٹھلانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اوّل تکبیر پر کھڑا ہونا بہتر ہے، کوئی شخص "حی علی الفلاح" کہنے تک بھی کھڑا ہوجائے تو ٹھیک ہے، لیکن اس سے پہلے کھڑے ہونے کو بُرا سمجھنا اور اہتمام کر کے لوگوں کو بٹھانا جائز نہیں۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۷ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۷۷ الف)

نماز کے لئے کیسا لباس پہننا ضروری ہے؟

اور صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھانے کا حکم

سوال:- لباسِ مسنونہ کون سا لباس ہوسکتا ہے؟ کیا نماز میں امام اور مقتدی کا لباس ایک جیسا ہونا چاہئے؟ کیونکہ دونوں نمازی ہیں، یا الگ الگ ہیں جیسا کہ بعض لوگ امام کے لئے عمامہ ضروری تصوّر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مسنون ہے، تو پھر امام اور مقتدی دونوں کے لئے ہونا چاہئے۔ اور صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھانے سے لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ مولانا احتشام الحق صاحبؒ ٹوپی پہن کر نماز پڑھاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:- نماز کے صحیح ہونے کے لئے کسی خاص وضع کا لباس شرط نہیں ہے، بلکہ ہر اس لباس میں نماز ہوجاتی ہے جس سے سترِ عورت پورا ہوجاتا ہو، البتہ جو پاجامہ ٹخنے سے نیچے لٹکا ہوا ہو یا ایسا لباس ہو جس میں غیر مسلم قوم کی مشابہت ہے تو اس کے ساتھ نماز مکروہ ہے،[2] فاسد پھر بھی نہیں ہوتی۔ اور عمامہ نہ امام کے لئے شرط ہے، نہ مقتدی کے لئے، کپڑے کی ٹوپی ہو یا کھال کی یا کسی اور چیز کی، ہر قسم کی ٹوپی سے نماز بلا کراہت جائز ہوجاتی ہے۔ جو لوگ عمامے کو امامت کے لئے شرط قرار

---

(۱) تفصیل کے لئے سابقہ فتویٰ اور جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۰۹ تا ۳۲۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی المشکوۃ ج:۱ ص:۷۵ قال علیہ السلام: ان اللہ لا یقبل صلاۃ رجل مسبل ازارہ. رواہ الترمذی (فی ج:۱ ص:۸۷). وقال الطحطاوی علی المراقی (فی المکروہات) ص:۱۸۹ وکذا ما ھو عادۃ أھل التکبر.

دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، البتہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت عمامہ زیبِ سر فرماتے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِتباع میں عمامہ باندھنا اور عمامے سے نماز پڑھنا افضل اور زیادہ موجبِ ثواب ہے، لیکن اس کے بغیر بھی نماز بلا کراہت صحیح ہوجاتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۲ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۰۵ ج)

ایک طرف سلام نہ پھیرنے سے نماز دُرست ہوگی یا نہیں؟

سوال:- امام کے آخری قعدے میں بیٹھ کر دائیں جانب سلام پھرانے کے بعد ایک مقتدی نے اللہ اکبر کہہ کر امام کو لقمہ دیا، لقمے کی آواز سے امام ٹھٹھک گیا، بائیں طرف سلام نہ پھرا کر کھڑے ہوکر سوال کیا کہ نماز پوری نہیں ہوئی؟ اکثر مقتدیوں نے کہا کہ نماز پوری ہوگئی، لقمہ دینے والے نے غلطی کی۔ کیا بائیں طرف نہ پھرانے سے نماز تمام ہوجائے گی یا اعادہ ضروری ہے؟

جواب:- نماز کے اختتام پر دونوں طرف سلام پھیرنا اصح قول کی بناء پر واجب ہے، (اگرچہ بعض فقہاء نے دُوسرے سلام کو سنت بھی کہا ہے) لہٰذا صورتِ مسئولہ میں امام نے ترکِ واجب کا ارتکاب کیا، جس کا حکم یہ ہے کہ نماز کی فرضیت تو ساقط ہوگئی لیکن وقت کے اندر اندر نماز کا اعادہ واجب تھا، اب جبکہ وقت بھی گزر چکا اور ان مصلیوں کا اجتماع نہ رہا تو نماز کراہت کے ساتھ ہوگئی، البتہ امام کو اس غلطی پر توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے۔

قال فی الدر المختار: ولفظ السلام مرتین، فالثانی واجب،[2] وفی مراقی الفلاح (فی بیان حکم الواجب فی الصلوٰۃ) (واعادتها بترکه عمدا) وسقوط الفرض ناقصا ان لم یسجد ولم یعد، وقال الطحطاوی تحت قوله (واعادتها بترکه عمدا) أی ما دام الوقت باقیا وکذا فی السهو ان لم یسجد له وان لم یعدها حتّی خرج الوقت تسقط مع النقصان وکراهة التحریم، ویکون فاسقًا اثمًا، وکذا الحکم فی کل صلوٰۃ أدیت مع کراهة التحریم، والمختار أن المعادة

---

(۱) وفی عمدة الرعایة علی هامش شرح الوقایة کتاب الصلوٰۃ ج:۱ ص:۱۶۹ (طبع سعید) وقد ذکروا أن المستحب أن یصلی فی قمیص وازار وعمامة ولا یکره الاکتفاء بالقلنسوة ولا عبرة لما اشتهر بین العوام من کراهة ذلک وکذا ما اشتهر أن الموتم لو کان معتما بعمامة والامام مکتفیا علی القلنسوة یکره .... الخ.

(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۴۶۸ (طبع سعید).

لترک واجب نفل جابر والفرض سقط بالأولیٰ. (الطحطاوی علی المراقی ص:۱۳۴ فی فصل بیان الواجب)۔[۱]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۰/۱۲/۲۷ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۱/۱۹۹ الف)

نماز میں ثناء اور دُرود شریف پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟

سوال:- نماز میں ثناء، دُرود شریف، دُعا وغیرہ کا پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟

جواب:- نماز میں ثناء، دُرود شریف اور اس کے بعد کی دُعا سننِ مؤکدہ میں سے ہے۔

لما فی الدر المختار وسننها .... الثناء والتعوّذ .... والصلوٰة علی النبی صلی الله علیه وسلم والدعاء۔[۲] اور "وسننها" کے تحت صاحبِ درمختار لکھتے ہیں: ترک السنة لا یوجب فسادا ولا سهوا بل اسائة لو عامدًا غیر مستخف .... الخ۔[۳] اور یہ تعریف سنتِ مؤکدہ کی ہے، کما یظهر من کلام الشامیؒ۔ (ج:۱ ص:۳۱۸ و ۳۱۹)۔[۴]

اس کے علاوہ فقہاء جب نماز کی سنت مطلق بولتے ہیں تو اس سے مؤکدہ ہی مراد ہوتی ہے، سننِ زوائد یا سننِ غیر مؤکدہ کو عموماً آداب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۶/۲۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۶۹۲ ب)

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه). وفی بدائع الصنائع ج:۱ ص:۱۹۴ وأما الذی هو عند الخروج من الصلوٰة فلفظ "السلام" عندنا، وعند مالک والشافعی فرض، والکلام فی التسلیم یقع فی مواضع فی بیان صفته أنه فرض أم لا وفی بیان قدره .... (وقال بعد أسطر:) ولنا ما روی عن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه أنه قال: صلیت خلف رسول الله صلی الله علیه وسلم وخلف أبی بکرؓ و عمرؓ وکانوا یسلمون تسلیمتین عن أیمانهم وعن شمائلهم وروی عن علی انّه قال: کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یسلّم تسلیمتین .... وأما الأحادیث فالأخذ بما روینا أولیٰ، لأن علیا وابن مسعود کانا من کبار الصحابة وکانا یقومان بقربه صلی الله علیه وسلم .... الخ. وکذا فی عامة کتب الفقه الحنفی.
نیز دونوں سلام کے وجوب سے متعلق محدثانہ کلام کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی کتاب درسِ ترمذی ج:۲ ص:۶۴ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲ تا ۴) الدر المختار ج:۱ ص:۴۷۳ - ۴۷۷ (طبع سعید). وفی تبیین الحقائق ج:۱ ص:۲۸۶ (طبع سعید) وسننها رفع الیدین للتحریمة .... والثناء والتعوّذ .... والصلوٰة علی النبی صلی الله علیه وسلم والدعاء یعنی بعد التشهد فی القعدة الأخیرة لقوله علیه السلام: اذا صلّی أحدکم فلیبدأ بالثناء علی الله تعالیٰ ثم بالصلوٰة ثم بالدعاء. وقال الشافعی رحمه الله: الصلوٰة علی النبی فرض .... ولنا أنه علیه السلام علم الأعرابی فرائض الصلوٰة ولم یعلمه الصلوٰة علی النبی صلی الله علیه وسلم. وفی شرح العنایة علی الهدایة علی هامش فتح القدیر ج:۱ ص:۳۴۱ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) وبالسنة ما فعله رسول الله صلی الله علیه وسلم بطریق المواظبة ولم یترکها الا لعذر کالثناء والتعوّذ وتکبیرات الرکوع والسجود، وکذا فی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۰۳ (طبع سعید).

تسمیہ، سورۂ فاتحہ سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟

سوال:- تسمیہ، الحمد سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟

جواب:- ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔[1] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح
محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/ ۱۸ الف)

باجماعت نماز ادا کرنا سنت ہے یا واجب؟

سوال:- نماز باجماعت ادا کرنا سنتِ مؤکدہ ہے یا واجب؟

نیز سفر کے دوران نماز باجماعت کا اہتمام ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- سنتِ مؤکدہ قریب بہ واجب ہے،[2] اور سفر میں اگر جماعت سے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی صورت میں ساتھیوں سے بچھڑنے کا خطرہ ہو یا سواری کی روانگی کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں جماعت کے بغیر اکیلے نماز پڑھنا جائز ہے۔ وفی بدائع الصنائع (ج:۱ ص:۱۵۳): وأمّا المسافرون فالأفضل لهم أن يؤذنوا ويقيموا ويصلّوا بجماعة، لأن الأذان والاقامة من لوازم الجماعة المستحبة والسفر لم يسقط الجماعة فلا يسقط ما هو من لوازمها .... الخ۔[3] تاہم حتی الامکان جماعت ہی سے نماز پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵/ ۵۸)

---

(۱) وفی غنیة المتملی ص:۳۰۶ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور) (يسمی) أی يقرأ بسم الله الرحمٰن الرحيم (فيأتی بها) أی بالتسمية (فی أول كل ركعة). وفی الهندية ج:۱ ص:۷۴ (طبع رشيديه كوئٹه) ويأتی بها فی أول كل ركعة وهو قول أبی يوسفؒ وفی الحجة وعليه الفتوىٰ. وفی التنوير مع شرحه باب صفة الصلوٰة ج:۱ ص:۴۹۰ (طبع سعيد) وكما تعود سمّٰی سرًا فی أول كل ركعة.

(۲) وفی الدر المختار باب الامامة ج:۱ ص:۵۵۲ (طبع سعيد) (والجماعة سنة مؤكدة للرجال) قال الزاهدی أرادوا بالتأكيد الوجوب الا فی جمعة وعيد فشرط .... الخ. وفی رد المحتار تحت (قوله قال الزاهدی) توفيق بين القول بالسنية والقول بالوجوب الاتی وبيان أن المراد بهما واحد أخذا من استدلالهم بالأخبار الواردة بالوعيد الشديد بترك الجماعة، وفی النهر عن المفيد الجماعة واجبة وسنة لوجوبها بالسنة .... الخ.

(۳) وفی الدر المختار باب الامامة ج:۱ ص:۵۵۴ - ۵۵۶ فتسن أو تجب (الجماعة) على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلوٰة بالجماعة من غير حرج، فلا تجب على مريض .... وارادة سفر. وفی الشامية تحت قوله (وارادة سفر) أی واقيمت الصلوٰة ويخشٰی ان تفوته القافلة بحر، واما السفر نفسه فليس بعذر كما فی القنية.

نیز جماعت کے ''سنتِ مؤکدہ قریب بہ واجب'' ہونے کے مطلب سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۳۳ تا ۵۳۵۔ (محمد زبیر حق نواز)

اِستقبالِ قبلہ شرط ہے، اِستقبالِ قبلہ کی نیت شرط نہیں

(نیتِ اِستقبالِ قبلہ کی مختلف صورتوں کا تفصیلی جائزہ اور ان کا حکم)

سوال:- زید اِستقبالِ خانہ کعبہ کی نیت سے نماز شروع کرتا ہے، کیا اس کی نماز ہوجائے گی یا نہیں؟ علامہ شامیؒ نے تذبذب میں ڈال دیا ہے، کیونکہ ان کی مندرجہ ذیل عبارت ج:۱ ص:۳۳۲ سے راجح وصحیح جواز معلوم ہوتا ہے:-

اما علی القول الراجح من انه لا یشترط نیتها فلا یضره نیة غیرها بعد وجود الاستقبال الذی هو الشرط .... فما ذکره الشارح تبعًا للبحر والحلیة صحیح.(۱)

اور اس کے بعد عبارت نمبر۲ جو شرح منیہ سے نقل فرمائی ہے کہ:-

ان نیة القبلة وان لم تشترط لٰکن عدم نیة الاعراض عنها شرط وعلیه فهو مفرع علی الراجح۔(۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ راجح قول عدمِ جواز کا ہے، لہٰذا براہِ کرم محقق مفتیٰ بہ جواب عنایت فرما کر عنداللہ مأجور ہوں۔

جواب:- بیشتر فقہاء نے مسئلہ یہی لکھا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے کہ نماز میں اِستقبالِ قبلہ شرط ہے، لیکن اِستقبالِ قبلہ کی نیت ضروری نہیں، بغیر نیت اِستقبال ہوجائے گا، تب بھی نماز دُرست ہوگی۔ خود شارحِ منیہ نے بھی یہ مسئلہ ذکر کرکے اس کو صحیح قرار دیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:-

وقال صاحب الهدایة فی التجنیس نیة الکعبة لیست بشرط فی الصحیح من الجواب لأن استقبال القبلة شرط فلا یشترط فیه النیة کالوضوء انتهٰی. وهٰذا لأن الشروط یراعی وجودها تبعًا لا وجودها قصدًا لأنها وسائل لیست بمقصودة بالذات. (کبیری شرح منیة)۔(۳)

البتہ آگے چل کر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ اِستقبالِ قبلہ کی نیت شرط نہیں لیکن عدم نیة الاعراض عن القبلة شرط ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اعراض عن القبلة کی نیت کرے گا تو اس کی نماز فاسد ہوجائے گی۔ علامہ شامیؒ نے ان کا یہ قول محتمل طریقے سے نقل فرمایا ہے، اس لئے تردّد ہوتا ہے، لیکن علامہ ابراہیم حلبیؒ شارحِ منیہ کی عبارتیں دیکھنے کے بعد ان کے قول کا جو منشاء سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ مسئلے کی چند صورتیں ہیں:-

---

(۱، ۲) رد المحتار ج:۱ ص:۴۲۵ (طبع سعید).

(۳) غنیة المتملی ص:۲۱۸ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

۱:- اِستقبالِ قبلہ بھی ہو اور اس کی نیت بھی ہو، یہ بالاتفاق دُرست ہے۔

۲:- اِستقبالِ قبلہ ہو اور نیت کچھ نہ ہو، اس صورت میں راجح قول کی بناء پر نماز دُرست ہے، کما مرّ قول شارح المنية عن صاحب الهداية وهو الذى اختاره فى تنوير الأبصار والدر المختار۔

۳:- اِستقبالِ قبلہ ہو اور نیت غیرِ قبلہ کی ہو، اس معنی میں کہ وہ کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی بجائے اور چیز کو قبلہ سمجھ کر اس کا رُخ کرنا چاہتا ہو، یہ وہ صورت ہے جس میں شارحِ منیہ نے نماز کو فاسد کہا ہے۔

كمن توجه الى الركن اليمانى ناويًا الصلوٰة الى بيت المقدس فان نية القبلة وان لم يشترط الا ان عدم نية الاعراض عنها شرط. (كبيرى ص:۲۲۲)۔[1]

اس پر قیاس کر کے انہوں نے یہ مسئلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ:-

ان نوى المصلّى يعنى وقت الشروع ان قبلته محراب مسجده لا تجوز صلوٰته لأنه علامة علىٰ جهة القبلة. (بحوالہ مذکورہ)۔[2]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ فسادِ صلوٰۃ کی صورت یہ ہے کہ محراب کی طرف اس خیال سے رُخ کرے کہ قبلہ یہی ہے۔ اس پر علامہ شامیؒ نے اس صورت کو بھی قیاس فرمایا ہے کہ کوئی شخص بناءِ کعبہ کی نیت کرے تو اس کا بھی حکم یہی ہوگا۔ لیکن مقیس علیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ اس وقت ہے جب وہ عرصۂ کعبہ سے صراحۃً اعراض کرنے کی نیت کرے اور محض بناء و جدران کو قبلہ سمجھے، جس کی علامت یہ ہے کہ اس کا خیال یہ ہو کہ اگر یہ پتھر اس مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیئے جائیں تو وہی قبلہ ہوں گے اور انہی کا استقبال کیا جائے گا، تب اس کی نماز فاسد ہوگی، لیکن ظاہر ہے ایسا خیال کرنا بہت بعید ہے۔

۴:- چوتھی صورت اس سے خود بخود نکل آئی اور وہ یہ کہ کوئی شخص کسی مسامت قبلہ چیز کے اِستقبال کی نیت کرے، نہ اس وجہ سے کہ وہ قبلہ ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ جہتِ قبلہ کی علامت ہے تو اس صورت میں نماز ہوجائے گی، مثلاً محراب کے اِستقبال کی نیت کرے، لیکن مقصد یہ نہ ہو کہ محراب، قبلہ ہے، بلکہ یہ ہو کہ قبلہ کی علامت ہے۔ تو درحقیقت یہ اِستقبالِ محراب کی نیت نہیں ہوگی بلکہ اس کو اِستقبالِ قبلہ کی نیت ہی کہا جائے گا، اس لئے نماز جائز ہوگی۔

كما يفيده قول المنية ان نوى المصلّى ان قبلته محراب مسجده .... الخ. وقوله

(۱، ۲) غنية المتملى ص:۲۲۳ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور).

لأن علامة على جهة القبلة .... الخ۔[1]

اسی طرح اگر کوئی شخص بناءِ کعبہ کی نیت کرے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ قبلہ ہے، بلکہ اس لئے کہ قبلہ کی علامت ہے تو بلاشبہ اس کی نماز دُرست ہوگی۔ اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اگر کوئی شخص نماز میں کعبہ کا رُخ کرنے کی نیت کرے تو اس کی نماز دُرست ہوگی، کیونکہ اس نیت کا مفہوم عرفاً یہی ہے کہ مقصود اِستقبالِ قبلہ وکعبہ ہے، اور خانۂ کعبہ کو عرف میں لفظ کعبہ ہی کے لئے بولتے ہیں، نیز اگر اس سے بناءِ کعبہ ہی مراد ہو تب بھی اس کے اِستقبال کی نیت بوجہ علامت ہونے کے ہے، نہ کہ بوجہ قبلہ ہونے کے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اگر بناء کے پتھر وہاں سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیئے جائیں تو یہ مصلّی ان کا اِستقبال نہیں کرے گا لہٰذا اس کی نماز دُرست ہے، ہاں! اگر کوئی شخص ان پتھروں کو قبلہ سمجھے اور ان کے اپنی جگہ سے ازالے کے بعد انہی کی طرف رُخ کرنے کا قائل ہو تو اس کی نماز دُرست نہیں ہوگی، وھذا لا یتصوّر فی مسلم۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۲/۲۸ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۲۲/۳۲۹ الف)

بیٹھ کر نماز پڑھنے کے دوران کھڑے ہوجانا

سوال:- نماز بیٹھ کر پڑھنے کے دوران ایک رکعت کے بعد طاقت محسوس کی تو اَب کھڑے ہوجانا دُرست ہے یا نہیں؟ اور بیٹھے ہوئے پڑھنے میں حرج تو نہیں؟

جواب:- نفلوں میں اس طرح کرنا بہتر ہے، اور اگر فرض مجبور ہوکر بیٹھ کر پڑھ رہا تھا اور طاقت آگئی تو کھڑا ہونا فرض ہے۔[2]

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۷/ ۱۸ الف)

---

(۱) غنية المتملى ص: ۲۲۳ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور).

(۲) وفى مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج: ۱ ص: ۲۲۹ ولو افتتحها قاعدًا للعجز يركع ويسجد فقدر على القيام بنى قائمًا عند الشيخين .... الخ.

﴿فصل فی الامامة والجماعة﴾
(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

امامت کی نیت کا طریقہ

سوال:- اگر کسی کو امام بنادیا جائے تو اس کو امامت کی نیت کس طرح کرنی چاہئے؟

جواب:- بس یہ نیت کرلیں کہ میں ان تمام لوگوں کی امامت کر رہا ہوں جو میری اقتداء کریں۔ نیت، زبان سے ہونی ضروری نہیں، دِل میں یہ ارادہ کرلینا کافی ہے۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۲/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۶ الف)

امام کے شرعی اوصاف

سوال:- ایک امام جو تمام اوقات کی نماز پڑھاتا ہو، اس کے شرعی اوصاف کیا ہونے چاہئیں؟ کیا اس میں جسمانی اعضاء کا بھی لحاظ ہے؟ مثلاً جس شخص کا ہاتھ پیدائشی طور پر مفلوج ہو، یا پیدائشی چھوٹا ہو اور وہ تکبیر کے وقت ہاتھ کانوں تک نہ لے جاسکتا ہو، کیا اس عذر کا شخص نماز پڑھانے کا اہل ہے؟

جواب:- سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ امام، بارگاہِ خدواندی میں مسلمانوں کی درخواست پیش کرنے کے لئے ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے شریعت کی طرف سے اس کے کچھ مخصوص اوصاف مقرّر کئے گئے ہیں، تاکہ یہ نمائندہ مسلمانوں کے شایانِ شان ان کی نمائندگی کرسکے۔ ان اوصاف میں سے بعض تو لازمی ہیں، اور جس شخص میں یہ اوصاف نہ پائے جاتے ہوں اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، اور بعض اوصاف ایسے ہیں کہ ان کے بغیر نماز ہوجاتی ہے، مگر مکروہ رہتی ہے، اور بعض اوصاف صرف مستحسن اور پسندیدہ ہیں، ان کے بغیر نماز میں کوئی کراہت نہیں آتی، مگر بہتر یہ ہے کہ امام اسی شخص کو بنایا جائے جس میں یہ اوصاف بھی موجود ہوں۔

---

(۱) دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ج: ۱ ص: ۴۱۵ (طبع سعید) و عالمگیریة ج: ۱ ص: ۶۵ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

لازمی اوصاف جن کے بغیر مقتدیوں کی نماز ہی نہیں ہوسکتی، مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- امام مسلمان ہو، بالغ ہو، دیوانہ نہ ہو، نشے میں نہ ہو۔

۲:- نماز کا طریقہ جانتا ہو۔

۳:- نماز کی تمام شرائط وضو وغیرہ اس نے پوری کر رکھی ہوں۔

۴:- کسی ایسے مرض میں مبتلا نہ ہو، جس کی وجہ سے اس کا وضو قائم نہ رہتا ہو، مثلاً مسلسل نکسیر وغیرہ (ایسے شخص کو فقہاء معذور کہتے ہیں، ایسا شخص اپنے جیسے معذور کی امامت تو کرسکتا ہے، مگر تندرست لوگوں کا امام نہیں بن سکتا)۔

۵:- رُکوع اور سجدے پر قادر ہو، اگر کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے وہ رُکوع سجدے پر قادر نہ ہو تو تندرست لوگوں کی امامت نہیں کرسکتا۔

۶:- گونگا، توتلا یا ہکلا نہ ہو۔[1]

اور دُوسری قسم کے اوصاف جن کے بغیر نماز مکروہ رہتی ہے، مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- صالح ہو، یعنی کبیرہ گناہوں میں مبتلا نہ ہو۔

۲:- فاسد العقیدہ نہ ہو۔

۳:- نماز کے ضروری مسائل سے واقف ہو۔

۴:- قرآنِ کریم کی تلاوت صحیح طریقے سے کرسکتا ہو۔

۵:- کسی ایسے جسمانی عیب میں مبتلا نہ ہو جس کی وجہ سے اس کی پاکیزگی مشکوک ہوجائے، یا لوگ اس سے گھن یا اس کا استخفاف کرتے ہوں۔ اسی وجہ سے نابینا، مفلوج، ابرص وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھنے کو فقہاء نے خلافِ اَوْلیٰ قرار دیا ہے، لیکن یہ کراہت اسی وقت ہے جب اس سے بہتر دُوسرا امام مل سکتا ہو، اگر اس سے بہتر نہ مل سکے تو کوئی کراہت نہیں ہے۔ (شامی ج:۱ ص:۵۲۳ تا ۵۲۵)[2]

یہ تمام اوصاف تو قانونی انداز کے تھے، ان کے علاوہ چونکہ امامِ مسجد اپنے محلے کا دینی مرکز اور ایک طرح سے مربی بھی ہوتا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ مندرجہ ذیل مزید اوصاف اس میں پائے جاتے ہوں:-

حاضرین میں علمِ دین اور تلاوتِ قرآن کے اعتبار سے سب سے زیادہ بلند رُتبہ ہو۔

خوش اخلاق، شریف النسب، باوقار اور وجیہ ہو۔

---

(۱) یہ تمام اوصاف رد المحتار لابن عابدین الشامیؒ ج:۱ ص:۵۵۷ تا ۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید) میں موجود ہیں۔

(۲) شامی ج:۱ ص:۵۶۰ - ۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید).

صفائی، ستھرائی، تقویٰ اور طہارت کا خیال رکھتا ہو۔

مستغنی طبیعت رکھنے والا اور سیر چشم ہو، اور محلے کی دینی تربیت کے لئے جتنے اوصاف کی ضرورت ہے، وہ اس میں پائے جاتے ہوں۔

محلے کی مساجد میں امام کا انتخاب کرتے وقت ان اوصاف کی رعایت کرلی جائے تو محلے میں ایک نہایت خوشگوار دینی ماحول پیدا ہوسکتا ہے۔ مذکورہ بالا تشریح کے بعد آپ کے تمام سوالات کا جواب خود بخود واضح ہوجاتا ہے۔ جس شخص کے ہاتھ اتنے چھوٹے ہوں کہ وہ کانوں تک نہ پہنچتے ہوں تو اگر اس میں کوئی اور عیب نہیں ہے تو اس کے پیچھے بلا کراہت نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم

۲۵ محرم ۱۳۸۷ھ[1]

جس کا علم زیادہ ہو، اسے امام بنانا افضل ہے

سوال:- ایک مسجد میں دو اُستاذ بچوں اور بچیوں کو پڑھاتے ہیں، ایک اُستاذ مقامی ہیں، جو کہ صرف عالم ہی ہیں، دُوسرے غیر مقامی ہیں جو کہ عالم، قاری اور حافظ بھی ہیں۔ مقامی اُستاذ صرف بچیوں کو پڑھاتے ہیں، دُوسرے اُستاذ بچوں کو سارا دن صبح شام پڑھاتے ہیں، جبکہ نمازیں اور جمعہ کی نماز مقامی اُستاذ پڑھاتے ہیں۔ ان دونوں میں سے نماز اور جمعہ پڑھانے کا کون زیادہ مستحق ہے؟ اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ کوئی اختلاف ہے۔

جواب:- ان دونوں میں سے جن کا علم زیادہ ہو، خاص طور سے نماز کے مسائل سے جو صاحب زیادہ واقف ہوں اور جن کے علم وتقویٰ پر لوگ زیادہ اعتماد کرتے ہوں، ان کو امام بنانا زیادہ بہتر ہے،[2] ویسے جائز دونوں کی امامت ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۷۹۱ ب)

شرعی مسئلے کو نہ ماننے والے کی امامت کا حکم

سوال:- زید کسی جامع مسجد میں امام ہے، اس میں مندرجہ ذیل عیوب موجود ہیں:-

۱:- جملہ مقتدی اس سے ناراض ہیں، ناراضگی دُنیوی کاموں پر ہے، سوائے متولّی کے جو کہ اس

---

(۱) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ صفر ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔

(۲) وفی الدر المختار (باب الامامة ج:۱ ص:۵۵۷) والاحق بالامامة تقديما بل نصبا الأعلم بأحكام الصلاة فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة .... ثم الأورع .... الخ. وفی الهندية (الباب الخامس فی الامامة الفصل الثانی ج:۱ ص:۸۳) الأولى بالامامة أعلمهم بأحكام الصلوة هكذا فی المضمرات، وهو الظاهر هكذا فی البحر الرائق هذا اذا علم من القراءة .... قدر ما تقوم به سنة القراءة ولم يطعن فی دينه.

سے مجبور ہے، اس ناراضگی کی وجہ سے محلے کے لوگوں نے اسے لاٹھی بھی ماری، پھر بھی وہ پیش امام ہے۔

۲:- مقتدیوں پر بہتان اور ان کے عیوب کو افشاء کرنا اس پیش امام کی عادت ہے۔

۳:- غرور سے اتنا بھرا ہوا ہے کہ اگر نماز میں کوئی خلل واقع ہو، خود نہیں جانتا، اور اگر مقتدی کسی صاحبِ علم سے مسئلہ تحقیق کر کے بتائیں تو ان کی باتوں کو نہیں مانتا، علماء کو غلط کہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایسا امام امامت کا حق دار ہے یا اس کو مسجد سے نکال دیں؟

جواب:- اگر سوال میں درج شدہ واقعات دُرست ہیں، یعنی امام خود عالم نہیں ہے اور علماء کے بتائے ہوئے مسئلے کو مانتا نہیں اور مسلمانوں پر بہتان لگاتا ہے تو اسے مقتدیوں کی امامت سے الگ ہوجانا چاہئے، کیونکہ حدیث میں ایسے شخص کی امامت پر اصرار کرنے پر وعید آئی ہے۔[1] اگر وہ خود مستعفی نہ ہو تو متولّیٔ مسجد کو بھی اختیار ہے کہ وہ اسے معزول کردے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۹/۱۱/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷۷۰ ج)

بدکردار شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ۱:- ایک شخص جو کچھ خفیہ اور اندرونی کوششوں کے ذریعے سے محکمۂ اوقاف کو جل دے کر ایک جامع مسجد میں خطیب اور امام کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۲:- اس شخص کو جس نے خود کو مصنوعی طور پر عالم اور قاری مشہور کر رکھا ہے، مسجد میں کم و بیش ایک سال کا عرصہ امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے ہوئے گزر چکا ہے۔ اس طویل عرصے میں متعدّد نمازیوں کو اس شخص کے علم وفضل، رفتار وگفتار اور کردار واخلاق کے بارے میں قابلِ اعتراض شہادتیں فراہم ہوچکی ہیں، بایں وجہ ایک کثیر تعداد نمازیوں کی اس شخص کی وجہ سے مسجد کو چھوڑنے پر مجبور ہوئی اور دُور دُور جاکر فریضۂ نماز ادا کرنے کی زحمت اُٹھا رہی ہے۔ ۳:- یہ شخص تلاوتِ قرآن مجید کے دوران فاسد قسم کی غلطیاں کرتا ہے اور ارکانِ نماز پوری طرح ادا نہیں کرتا اور لوگوں کو غلط مسائل اور فتوے دیتا ہے۔ ۴:- اس شخص کے کردار کے بارے میں بھی بہت سے سنجیدہ لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات موجود ہیں، اور بعض باتیں ایسی کہی جاتی ہیں کہ اگر ان کی تحقیق کرلی جائے تو اس شخص کا بدکردار ہونا ثابت ہوسکتا ہے۔ ۵:- یہ شخص مفتی اور مفسر بھی ہے، اس نے مسجد کے مسلمانوں کی جماعت میں شدید

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹ (طبع سعید) (ولو أم قومًا وهم له كارهون ان) الكراهة لفساد فيه أو لأنهم أحق بالامامة منه كره له ذلك تحريمًا لحديث أبی داوٗد: "لا يقبل الله صلاة من تقدم قوما وهم له كارهون."

وفيه أيضًا ج:۱ ص:۵۵۷ والأحق بالامامة تقديما بل نصبا مجمع الأنهر الأعلم بأحكام الصلاة فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة. وفی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) واما الكراهة فمبينة على قلة رغبة الناس فی الاقتداء بهؤلاء فيؤدی الى تقليل الجماعة المطلوب تكثيرها تكثيرا للأجر.

قسم کا انتشار برپا کردیا ہے اور غلط باتوں کے ذریعہ آپس میں لڑادیتا ہے۔ ۶:- یہ شخص محکمۂ اوقاف کے افسران سے خفیہ ربط وتعلق رکھتا ہے اور ناجائز اثرات استعمال کرکے مسجدِ مذکورہ کے ایک مؤذّن کو جو حافظ و عالم تھے، مختلف قسم کے غلط الزامات لگاکر اور سازش و شرارت کرکے علیحدہ کرواچکا ہے۔ ۷:- اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس مسجد کے نمازی سخت تکلیف اور اذیت میں مبتلا ہیں، اور اس شخص سے خلاصی پانے کے لئے انہوں نے کچھ تحقیقات کی ہیں اور جن جن مساجد میں اس نے ملازمت کی ہے، وہاں جاکر دریافتِ حال کیا تو معلوم ہوا کہ یہ شخص شدید قسم کا بدکردار، اوباش، مفسد، بددیانت اور بےعلم ہے، اور وہاں سے شدید نفرت کے ساتھ نکالا جاچکا ہے، اور یہ ایک مسجد سے دُوسری مسجد بھاگ نکلا ہے، اور وہاں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اس کے لئے کلمۂ خیر کہہ سکتا ہو، مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ غیر شادی شدہ ہے اور اپنے ساتھ ایسے دوستوں کو رکھتا ہے جس سے ماحول مکدر ہورہا ہے، مندرجہ بالا کوائف پیش کرکے آپ سے التماس ہے کہ یہ شخص قابلِ امامت ہے یا نہیں؟

جواب:- امام کسی ایسے شخص کو بنانا چاہئے جو صحیح العقیدہ، متقی، پرہیزگار اور ضروری دینی مسائل سے کماحقہ باخبر ہو، نیز قراءت صحیح کرتا ہو، اور کم از کم نماز کے مسائل سے پوری طرح باخبر ہو۔[1] لہٰذا سوال میں جو باتیں لکھی گئی ہیں اگر وہ دُرست ہیں تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے،[2] اسے معزول کرکے کسی ایسے شخص کو امام بنانا چاہئے جس میں مذکورہ شرائط پائی جاتی ہوں، البتہ جب تک کسی دُوسرے امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک ان کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور جو نمازیں اس طرح پڑھی جائیں گی وہ ہوجائیں گی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۷۳۵ و)

کسی ناجائز فعل سے منع کرنے پر امامت سے معزول کرنا

سوال:- عرض یہ ہے کہ سائل امامِ مسجد موضع بٹ تھانہ شیروان ضلع ایبٹ آباد کی جدی طور سے پشت در پشت ۲۱۵ سال سے دیہہ مذکور میں امامت چلی آرہی ہے، اور اب سائل امامت وخطابت

---

(۱) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۵۵۷ (طبع ایچ ایم سعید) والأحق بالامامة تقدیما بل نصبا مجمع الأنهر، (الأعلم بأحکام الصلوٰة) فقط صحة وفسادًا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة .... (ثم الأحسن تلاوة) وتجویدًا (للقراءة ثم الأورع) أی الأکثر اتقاء للشبهات والتقوی اتقاء المحرمات. وفی الشامیة تحته (قوله بأحکام الصلوٰة فقط) أی وان کان غیر متبحر فی بقیة العلوم .... (قوله بشرط اجتنابه .... الخ) .... الأعلم بالسنة أولی الا أن یطعن علیه فی دینه، لأن الناس لا یرغبون فی الاقتداء به وفی البحر الرائق ج: ۱ ص: ۳۴۸ وأما الکراهة فمبنیة علی قلة رغبة الناس فی الاقتداء بهؤلاء فیؤدی الی تقلیل الجماعة المطلوب تکثیرها تکثیرًا للأجر.

(۲) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۵۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) (ولو أم قوما وهم له کارهون ان) الکراهة (لفساد فیه .... کره) له ذلک تحریمًا. وفیه أیضا ج: ۱ ص: ۵۵۹ و ۵۶۰ ویکره امامة عبد .... وفاسق .... الخ.

کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔

سائل مستند عالمِ دین فارغ التحصیل از مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی ہے۔ مؤرخہ ۱۹۸۳/۹/۲۲ء کو دیہہ مذکورہ کے زرین وغیرہ مسجد شریف کا جنریٹر (بجلی) بدون اجازت سینہ زوری سے اپنے مال و دولت کے نشے میں اپنے عبدالستار کی شادی میں لے گئے تھے۔ ان کے اس فعلِ مجرمانہ پر میں نے بحیثیت امام کے ان کو آگاہ کیا، اور خدا کا خوف دِلایا، کیونکہ جنریٹر بجلی مسجد شریف کی ملکیت کا استعمال ان لوگوں نے ناچ گانے والی عورتوں کے تماشے پر صرف کیا۔ ان ملزموں کو ان کے اس فعل سے باز رکھنے کے لئے جب میں نے وعظ ونصیحت کی تو اُلٹا انہوں نے میرے گھر پر پتھراؤ کیا، گالی گلوچ کی اور مجھ پر حملہ آور ہوئے، اور مجھے امامت سے برطرف کردیا۔ ملزموں نے مجھے امامت سے اس لئے برطرف کیا ہے کہ میں نے انہیں مضمون جاری کیا اور یہ کہ میں نے انہیں مسجد شریف کی ملکیت جنریٹر ناچ گانوں میں استعمال کرنے سے کیوں منع کیا، اور اس منع کرنے پر ان کی توہین ہوئی، لہٰذا اس کی سزا یہ ہے کہ مسجد شریف کی امامت سے مجھے برطرف کردیا گیا۔ لہٰذا آپ بحیثیت مفتی وشرعی جج ہونے کے فیصلہ صادر فرمادیں کہ سائل یہاں امامت وخطابت کا اہل وحق دار ہے یا نہیں؟

۱:- سائل بفضلہٖ تعالیٰ مستند عالم ہے۔

۲:- باشرع ہے، صاحبِ اولاد ہے، چھ بچوں کا باپ ہے، کسی قسم کا کوئی عیب شرعی نہیں ہے۔

جواب:- اگر واقعات مندرجہ سوال دُرست ہیں اور سائل میں کوئی شرعی نقص نہیں ہے تو ان کے پیچھے نماز بلاشبہ ہوجاتی ہے، اور ایک بُری بات سے منع کرنے کی بناء پر ان کو معزول کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ جہاں تک معزولی کے شرعاً معتبر ہونے کا تعلق ہے وہ یہ جاننے پر موقوف ہے کہ شرائطِ ملازمت کیا تھیں؟

واللہ اعلم

۱۴۰۷/۸/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۸/۱۳۸۴ د)

جس امام سے مقتدی راضی نہ ہوں، اس کی امامت کا حکم

سوال:- ایک صاحب گزشتہ پندرہ سال سے ایک مسجد میں امامت کراتے ہیں، مگر علمی قابلیت کے مالک نہیں، جمعہ کی تقریر کے لئے دُوسرے مولانا صاحب آتے ہیں جو مستند عالم ہیں۔ قراءۃ بھی تجوید کے مطابق ہے، لیکن یہ فقط تقریر کرتے ہیں اور نمازِ جمعہ پیش امام مسجد پڑھاتے ہیں، جبکہ لوگوں کی خواہش ہے کہ مقرّر ہی نمازِ جمعہ پڑھائیں، لیکن مذکورہ امام اس وجہ سے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ کہیں خطیب صاحب قابض نہ ہوجائیں، جبکہ خطیب صاحب اس کا اقرار کرتے ہیں کہ میرا

مقصد ان کی جگہ پر قبضہ کرنا نہیں۔ کئی لوگ مذکورہ امام کے پیچھے کئی وجوہ سے نماز نہیں پڑھتے:-

۱:- امام صاحب قرآن وحدیث کا علم نہیں رکھتے۔ ۲:- قراءۃِ قرآن مجہول ہے۔ ۳:- خطبہ بھی غلط پڑھتے ہیں۔ ۴:- ذرا سی بات بھی خلافِ طبع ہوجائے تو فحش گالیاں دیتے ہیں۔ ۵:- لوگ ان کے طرزِ عمل پر انہیں غور کرنے کو کہتے ہیں تو وہ لوگوں کو نماز پڑھنے سے منع فرمادیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی اقتداء صحیح ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں جبکہ مقتدی ان امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھنے سے خوش نہیں ہیں اور ان سے زیادہ علم رکھنے والا امام موجود ہے تو ان امام صاحب کا اپنی امامت پر اصرار کرنا مکروہِ تحریمی ہے، لیکن جو لوگ مذکورہ وجوہات کی بناء پر ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے بجائے گھر میں اکیلے نماز پڑھتے ہوں وہ بھی غلطی پر ہیں، انہیں چاہئے کہ ان کی جگہ افضل امام کو مقرر کرنے کی کوشش فتنہ برپا کئے بغیر جاری رکھیں اور جب تک دُوسرے امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک انہی امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں، کیونکہ ان کے پیچھے نماز بہرحال ہوجائے گی، اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا اکیلے پڑھنے سے بہتر ہے۔

فی الدر المختار: ولو أم قوما وهم له كارهون ان الكراهة لفساد فيه أو لأنهم أحق بالامامة منه كره له ذٰلک تحريمًا (ج:۱ ص:۳۷۶)۔ (۱)

وفی رد المحتار تحت قوله: "صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة" أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع لحديث: من صلّٰى خلف عالم تقي فكأنما صلّٰى خلف نبي۔ (شامی ج:۱ ص:۳۷۷)۔ (۲)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۷۴۹ و)

علمائے دیوبند کے عقائد سے جزوی اختلاف رکھنے والے ایک امام کی امامت سے متعلق تفصیلی فتویٰ

(ژوب بلوچستان کے کچھ علمائے کرام اپنے ایک مقامی امام کے عقائد اور نماز میں اس کی اقتداء سے متعلق تنازعے کے تصفیے کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے پاس آئے تھے، حضرتِ والا دامت برکاتہم نے فریقین کو ایک متفقہ استفتاء مرتب کرنے کی ہدایت فرمائی جس کا حضرتِ والا

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) وفی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸ وأما الكراهة فمبنية على قلة رغبة الناس فی الاقتداء بهؤلاء فيؤدی الى تقليل الجماعة المطلوب تكثيرها تكثيرا للأجر.

(۲) فتاویٰ شامية ج:۱ ص:۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید).

دامت برکاتہم نے تفصیلی جواب تحریر فرمایا، اور اس سے پہلے ریکارڈ میں وضاحت اور یادداشت کے لئے ایک تحریر بھی مرتب فرمائی، ریکارڈ سے یہ وضاحتی تحریر، اس کے بعد فریقین کا متفقہ استفتاء اور حضرتِ والا دامت برکاتہم کی جانب سے اس کا جواب درج ذیل ہے۔ حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس جواب پر بعض حضرات کی طرف سے دوبارہ استفتاء کیا گیا وہ استفتاء اور اس کا جواب بھی آخر میں درج ہے۔) (محمد زبیر عفی عنہ)

حضرتِ والا دامت برکاتہم کی وضاحتی تحریر

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ۔ عرض گزار ہے کہ علاقہ ژوب بلوچستان کے دو فریق احقر کے پاس اپنے ایک تنازعے کے سلسلے میں تحکیم کے لئے تشریف لائے۔ ان میں سے ایک فریق مولانا محمد شیرانی صاحب اپنے چند رفقاء کے ہمراہ پہلے تشریف لائے، پھر دُوسرا فریق یعنی مولانا صبغت اللہ صاحب اپنے چند رفقاء کے ہمراہ اگلے روز تشریف لائے۔ دونوں نے احقر سے الگ بھی باتیں کیں اور اجتماعی طور پر بھی، دونوں کی خواہش یہ تھی کہ احقر ان کے درمیان حَکَم بن کر ان کے تنازعے کا فیصلہ کرے، لیکن چونکہ احقر کے لئے واقعات کی چھان بین اور تفتیش ممکن نہیں تھی، اس لئے احقر نے تحکیم سے معذوری ظاہر کی، اور یہ عرض کیا کہ اگر دونوں فریق کوئی متفقہ استفتاء مرتب فرمالیں تو احقر اس کا جواب لکھ کر دیدے گا۔

تنازعہ اس بات پر تھا کہ مولانا صبغت اللہ صاحب اپنے عقائد ونظریات کے لحاظ سے مستحقِ امامت ہیں یا نہیں؟ اس لئے احقر نے تجویز پیش کی کہ ان کے متنازعہ عقائد لکھ کر متفقہ طور پر استفتاء کرلیا جائے، اس پر مولانا شیرانی صاحب کو اعتراض یہ تھا کہ اس وقت مولانا صبغت اللہ صاحب جو عقائد و نظریات لکھ کر دیں گے وہ ان کے ان حقیقی عقائد ونظریات سے بہت کم اور اَخف ہوں گے جو وہ علاقے میں بیان کرتے رہتے ہیں، اس لئے استفتاء سے صحیح صورتِ حال واضح نہیں ہوگی۔ لیکن بالآخر انہوں نے اس شرط پر متفقہ استفتاء مرتب کرنے کو قبول کرلیا کہ وہ کم سے کم اُمور جن کا انہوں نے اعتراف کیا ہو، اس استفتاء میں درج کئے جائیں گے، اور دُوسرے اُمور چونکہ متفقہ استفتاء میں درج نہیں ہوسکتے، اس لئے یہاں ان کو درج نہیں کیا جارہا، ان کے بارے میں ہم اپنا حقِ استفتاء الگ محفوظ رکھیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد متفقہ استفتاء مرتب کیا گیا اور اس پر دونوں فریقوں نے دستخط کردیئے۔ یہ استفتاء اور اس پر احقر کا جواب اس تحریر کے ساتھ منسلک ہے۔

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۴/۸/۱۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۱۰۳)

فریقین کی طرف سے پیش کیا گیا استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک صاحب کے عقائد کے بارے میں یہ تنازعہ ہے کہ ان کے عقائد جمہور اہلِ سنت والجماعت بالخصوص مسلکِ علمائے دیوبند کے مطابق ہیں یا نہیں؟ نیز ان کے عقائد کے پیشِ نظر انہیں امام بنانا شرعاً دُرست ہے یا نہیں؟ اور جو نمازیں ان کے پیچھے ادا کی گئیں ان کا کیا حکم ہے؟ چنانچہ ان صاحب سے ان کے عقائد کے سلسلے میں کچھ سوالات کئے گئے جن کا جواب انہوں نے تحریری شکل میں دیا ہے۔

آپ ان جوابات[1] کا بغور مطالعہ فرما کر یہ تحریر فرمائیں کہ مسلکِ علمائے دیوبند کے مطابق یہ جوابات کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ اور مذکورہ صاحب کی امامت کے بارے میں شرعی استفتاء کے ساتھ سات ورق میں منسلک ہیں۔

جواب:- استفتاء کے ساتھ منسلک مولانا صبغت اللہ صاحب کے لکھے ہوئے چودہ سوالات کے جوابات[2] کا احقر نے بغور مطالعہ کیا، اور بعض اُمور میں مولانا موصوف سے زبانی وضاحتیں بھی طلب کیں، ان میں سے بعض اُمور میں بعض جوابات واضح طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق ہیں، مثلاً اوقاتِ مکروہہ ومنہیہ میں تحیۃ المسجد کا ممنوع ہونا، یا سوال نمبر۶ کے جواب میں دُعا کے وقت فی الجملہ رفعِ یدین کو موافقِ سنت کہنا، لیکن بعض جوابات مجمل ہیں، مثلاً شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور علامہ ابنِ تیمیہؒ کے بارے میں انہوں نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ جن مسائل میں علمائے دیوبند کو ان حضرات سے اختلاف ہے ان مسائل میں مولانا موصوف کا موقف کیا ہے؟ نیز سوال نمبر۴ کے جواب میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ تین دن کے بعد میّت کے گھر جا کر تعزیت کرنے کو مولانا موصوف علی الاطلاق بدعت وناجائز کہتے ہیں یا اس کی کسی خاص ہیئت کو؟

لیکن مولانا موصوف کے جوابات میں چار اُمور ایسے ہیں جو صراحۃً علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہیں، اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱:- مولانا نے حدیثِ مبارک: "لا تشد الرحال الّا الیٰ ثلاثة مساجد" کی اس تشریح کی طرف اپنا رُجحان ظاہر کیا ہے جو علامہ ابنِ تیمیہؒ سے منقول ہے، چنانچہ وہ زیارتِ قبور کے لئے سفر کو حدیثِ مذکور کی نہی میں شامل سمجھتے ہیں یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی

(۱،۲) امام صاحب کی طرف سے اہلِ علاقہ کو اپنے عقائد سے متعلق دیئے گئے ان وضاحتی جوابات کی تحریر ریکارڈ میں موجود نہیں ہے، تاہم آگے حضرتِ والا دامت برکاتہم کی طرف سے دیئے گئے فتویٰ میں چونکہ ان کے عقائد کا جائزہ لیا گیا ہے لہٰذا اس سے امام صاحب کے عقائد بھی واضح ہوجاتے ہیں۔ (محمد زبیر عفی عنہ)

زیارت کی نیت سے سفر کرنے کو بھی دُرست نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے نزدیک سفر کا مقصد مسجدِ نبوی کی زیارت ہونا چاہئے اور ضمناً روضۂ اقدس کی زیارت بھی ہوجائے تو مضائقہ نہیں۔ انہوں نے احقر سے زبانی یہ بیان کیا کہ اب تک مجھے چونکہ کوئی نقلی دلیل زیارتِ روضۂ اقدس کے استحباب کی نہیں ملی، اس لئے میرا عمل یہ ہے کہ میں نے مسجدِ نبوی کے قصد سے مدینہ طیبہ کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر روضۂ اقدس کی زیارت بھی ہوگئی، اور آئندہ بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔

مولانا کا یہ نظریہ علمائے دیوبند کے مسلک کے صراحۃً مخالف ہے، اس بارے میں بہت سی تحریریں موجود ہیں، لیکن خاص طور سے "المهند على المفند" جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہٗ کی مرتب فرمودہ کتاب ہے، اور جس پر اس وقت کے تمام اکابر علمائے دیوبند کے دستخط ہیں، اس کی عبارت یہ ہے کہ:

''ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک زیارتِ قبرِ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجے کی قربت اور نہایت ثواب اور سببِ حصول نصیب ہے، اور سفر کے وقت آپ کی زیارت کی نیت کرے اور ساتھ میں مسجدِ نبوی اور دیگر مقامات و زیارت گاہ ہائے متبرکہ کی بھی نیت کرے، پھر جب وہاں حاضر ہوگا تو مسجدِ نبوی کی بھی زیارت ہوجائے گی.....

رہا وہابیہ کا یہ کہنا کہ مدینہ منوّرہ کی جانب سفر کرنے والے کو صرف مسجدِ نبوی کی نیت کرنی چاہئے اور اس قول پر حدیث کو دلیل لانا کہ کجاوے نہ کسے جاویں مگر تین مسجدوں کی جانب، سو یہ قول مردود ہے ....الخ۔'' (عقائد علمائے دیوبند ص:۶)

۲:- اسی طرح مولانا نے اپنے جواب میں تعویذ کی ہر قسم کو کم از کم مکروہ بتایا ہے۔ جہاں تک ایسے تعویذات کا تعلق ہے جن میں استمداد بغیر اللہ ہو یا جو غیر معلوم المعنی ہوں تو ان کے حرام ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں، لیکن جن نقوش اور ہندسوں کے معنی معلوم ہوں انہیں حرام کہنا، یا آیاتِ قرآنی اور اسمائے حسنیٰ کے ذریعے تعویذ کو مکروہ قرار دینا علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہے، جس کی تصریحات علمائے دیوبند کے فتاویٰ میں موجود ہیں، مثلاً ملاحظہ ہو فتاویٰ رشیدیہ صفحہ:۲۱۸، وعزیز الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۵۲۔ تمام علمائے دیوبند کا عمل بھی اس پر رہا ہے اور حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایک مستقل کتاب ''اعمالِ قرآنی'' اسی مقصد کے لئے تألیف ہوئی ہے، لہٰذا اس عمل کو مکروہ کہنا مسلکِ علمائے دیوبند کے بالکل خلاف ہے۔[1]

---

(۱) تفصیلی دلائل کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں: ابوداؤد ج:۲ ص:۱۸۶، مشكوٰة المصابيح ج:۲ ص:۳۸۸ (طبع قديمی كتب خانه)، شامية ج:۶ ص:۳۶۳ (طبع ايچ ايم سعيد)، و تكملة فتح الملهم ج:۴ ص:۳۱۷.

۳:- فرض نمازوں کے بعد بہ ہیئتِ اجتماعی ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنے کا استحباب کتبِ فقہ میں مصرح ہے، اور اگر اسے مستحب سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے تو علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق دُرست ہے، لیکن مولانا نے اپنے جواب نمبرا میں جس شدّت اور عموم کے ساتھ اس پر نکیر کی ہے اور اسے بدعت اور واجب الترک بتایا ہے، وہ علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا ایک پورا رسالہ اسی موضوع پر ہے، اس میں وہ حدیث وفقہ کے مفصل دلائل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

''یہ روایاتِ فقہیہ ہیں جن سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ فرض نماز کے بعد امام اور مقتدی سب مل کر دُعا مانگیں اور دُعا سے فارغ ہوکر ہاتھ منہ پر پھیریں۔'' (کفایت المفتی ج:۳ ص:۲۹۷)[1]

اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اعلاء السنن میں اس مسئلے پر بیس صفحات میں بحث کی ہے، اور آخر میں لکھا ہے: فثبت أن الدعاء مستحب بعد كل صلاة مكتوبة متصلا بها برفع اليدين كما هو شائع فى ديارنا وديار المسلمين قاطبة۔ (اعلاء السنن ج:۳ ص:۲۱۱،۲۱۲)[2]۔ اسی طرح حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ نے معارف السنن میں اس مسئلے پر مفصل بحث کرنے کے بعد لکھا ہے: فهذه وما شاكلها من الروايات فى الباب تكاد تكفى حجة لما اعتاده الناس فى البلاد من الدعوات الاجتماعية دبر الصلوات، ولذا ذكره فقهاؤنا أيضًا كما فى نور الايضاح۔ (معارف السنن ج:۳ ص:۱۲۳ باب ما يقول اذا سلم)۔ اور العرف الشذی کی نقل اس کے مقابلے میں موثوق نہیں ہے، بہرصورت علمائے دیوبند کے مسلک میں فرائض کے بعد دُعا مع رفع الیدین مستحب ہے، بدعت نہیں ہے۔

۴:- مولانا نے نماز کی نیت کے تلفظ کو بھی بدعت قرار دیا ہے، حالانکہ اگر احضارِ نیت کے خیال سے اس کو سنتِ نبوی یا واجب سمجھے بغیر تلفظِ نیت کیا جائے تو وہ علمائے دیوبند کے نزدیک بدعت نہیں ہے۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں: واباحه بعض لما فيه من تحقيق عمل القلب وقطع الوسوسة، وما روى عن عمرؓ أنه أدب من فعله فهو محمول علىٰ أنه انما زجر من جهر به. (فأما المخافتة به) فلا بأس بها فمن قال من مشائخنا: ان التلفظ بالنية سنة لم يرد بها سنة النبى صلى الله عليه وسلم بل سنة المشائخ لاختلاف الزمان وكثرة الشواغل على

---

(۱) كفايت المفتى ج:۳ ص:۳۴۵، ۳۴۶ (جدید ایڈیشن ۲۰۰۱ء، دارالاشاعت).

(۲) اعلاء السنن باب الانحراف بعد السلام وكيفيته، وسنية الدعاء والذكر بعد الصلوٰة. ج:۳ ص:۱۶۷ (طبع ادارة القرآن كراچى).

القلوب .... الخ۔ (اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۳۴)۔[1]

بہرکیف! مذکورہ چار مسائل میں مولانا صبغت اللہ صاحب نے اپنا جو موقف بیان فرمایا ہے وہ علمائے دیوبند کے موقف سے مختلف ہے، اور مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا موصوف، علمائے دیوبند کے مسلک کے کلی طور پر پابند نہیں ہیں بلکہ بعض مسائل میں ان کی اپنی تحقیقات ہیں جو زیادہ تر علامہ ابنِ تیمیہؒ اور علامہ ابنِ قیمؒ کی تحقیقات پر مبنی ہیں۔ لہٰذا جس مقام پر مقتدی حضرات علمائے دیوبند سے وابستہ ہوں وہاں ایسے شخص کو امام مقرر کرنا چاہئے جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کا قائل ہو، اور اگر وہاں کوئی ایسا شخص امامت کے لئے موجود ہو تو ایسے مقام پر مولانا موصوف مستحقِ امامت نہیں، تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئی ہیں وہ ادا ہوگئیں، ھٰذا ما عندی!

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۰/۸/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۹۱/۳۱ د)

مذکورہ جواب کے چند اُمور کی مزید وضاحت کے لئے

دُوسرا استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- حضرت علامہ محمد تقی عثمانی صاحب

السلام علیکم! گزارش کی جاتی ہے کہ جنابِ والا نے جو حکم درباره فیصله بین الفریقین یعنی مولوی محمد خان و رفقاؤہ وصبغت اللہ و رفقاؤہ دیا تھا، اس میں آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ: ''جہاں پر مقتدی حضرات علمائے دیوبند سے وابستہ ہوں وہاں ایسے شخص کو مقرّر کرنا چاہئے جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کا قائل ہو، اور وہاں کوئی ایسا شخص امامت کے لئے موجود ہو تو ایسے مقام پر مولانا موصوف مستحقِ امامت نہیں ہیں۔''

اس میں سخت اجمال ہے، کیونکہ اس کا یہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے کہ اس وجہ سے مستحق نہیں کہ دائرۂ اسلام میں نہیں، اور یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہے۔ پھر سوال پیدا ہوگا کہ ان مذکورہ فی الفتویٰ چار مسائل کا قائل کیا اہلِ سنت والجماعت میں نہیں رہتا؟

اور یہ امکان بھی رکھتا ہے کہ ان مسائل والا متبعِ مذہبِ حنفی نہیں سمجھا جاتا تو پھر یہ شبہ پیدا ہوگا

---

(۱) اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۴۹ (طبع ادارۃ القرآن کراچی) اس مسئلے سے متعلق مزید تفصیلی دلائل کے لئے دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۴۱۵ (طبع ایچ ایم سعید)، اور فتاویٰ عالمگیریہ ج:۱ ص:۶۵ (طبع مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ) اور فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۲ ص:۱۴۷۔

کہ آیا مذاہبِ اربعہ جو سب اہلِ سنت والجماعت ہیں ان کی ایک دُوسرے کے پیچھے نمازیں صحیح نہیں، فاسد ہیں؟ حالانکہ یہ کہنا کتنے خراب نتائج پیدا کرے گا، بہرحال یہ اجمال محتاجِ ازالہ ہے۔ واضح کر کے مطمئن فرمایا جائے، کیونکہ جب موصوف مستحقِ امامت نہیں ہے تو پھر کوئی بھی کہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہ جانے گا بلکہ نہ اس سے تعلیم حاصل کرے گا، نہ اس کے وعظ ونصیحت کو کوئی سننے کو تیار ہوگا۔ حاصل یہ کہ اس پر اور اس کے ہم خیال لوگوں پر دین کی خدمت کے تمام راستے بند ہو جائیں گے اور اس کی ساری زندگی اُلجھن میں رہے گی، خویش واقارب واغیار ہمیشہ اس کو شک واشتباہ کی نظروں سے دیکھیں گے۔ اگر وہ واقعی اس کا از رُوئے دلیل مستحق ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کا عذر خدا کے نزدیک بن جائے گا اور مخالفین کے ساتھ خدا کا حساب کیسے ہوگا۔ برائے مہربانی اصل حقیقت سے واضح الفاظ میں آگاہ فرماویں، خدا تعالیٰ جزائے خیر دیں۔

جواب:- جس استفتاء اور اس کے جواب کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس میں مولانا صبغت اللہ صاحب کو اس محلے میں غیر مستحقِ امامت قرار دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ معاذ اللہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں یا ان کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہے، بلکہ اس کی بنیاد اس بات پر تھی کہ ان کو اپنی بعض ایسی تحقیقات پر اصرار ہے جو علمائے دیوبند کے عام مسلک سے مختلف ہیں، اس لئے جہاں علمائے دیوبند سے وابستہ حضرات آباد ہوں، وہاں ان کی امامت موجبِ فتنہ بن سکتی ہے۔ اسی طرح جن چار نظریات کی بناء پر مذکورہ فتویٰ دیا گیا تھا وہ نظریات علمائے دیوبند کے مسلک کے خلاف ہیں، لیکن محض ان چار نظریات کی وجہ سے نہ کوئی شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہوسکتا ہے اور نہ اسے اہلِ سنت والجماعت سے خارج کیا جاسکتا ہے، اور نہ اس کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہے۔ چنانچہ مذکورہ فتویٰ ہی میں یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئی ہیں وہ ادا ہوگئیں۔ البتہ اس فتویٰ کا حاصل صرف یہ ہے کہ جہاں ایسا امام دستیاب ہو جو کلی طور پر علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق ہو، وہاں ایسے متفرّد نظریات کا حامل مستحقِ امامت نہیں۔ لہٰذا اس فتویٰ کی بنیاد پر مولانا موصوف کو دائرۂ اسلام سے یا اہلِ سنت والجماعت سے خارج سمجھ کر ان سے کافروں یا غیر اہلِ سنت جیسا برتاؤ کرنا ہرگز دُرست نہیں ہوگا۔ آخر میں عرض ہے کہ خدارا ہر فریق اپنی آخرت کی فکر کرے، ایک دُوسرے پر طعن وتشدّد سے گریز کرے اور مسلمانوں کو ہر قیمت پر فتنے سے بچائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۲۱ر شعبان سنہ ۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۱۳۶ د)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر ناظر ماننے والے کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- اپنے محلّہ کی مسجد میں عرصہ دو مہینے سے مسجد کمیٹی نے ایک پمفلٹ دیا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر ناظر ہونے کا بیان ہے۔ ایسے امام کے پیچھے جس کا یہ عقیدہ ہو، نماز جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نبی یا ولی کے لئے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو ایسے شخص کو امام بنانا دُرست نہیں۔ واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۶۲ ہ)

داڑھی منڈانے والے کو امام بنانا

سوال:- جو شخص داڑھی منڈاتا یا کتراتا ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور تراویح میں ایسے شخص کو امام بنایا جاسکتا ہے؟

جواب:- ایسے شخص کو باختیارِ خود امام بنانا جائز نہیں[1]، اور صالح و متدین امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی کوشش ضروری ہے، تاہم اس کی اقتداء نہ کرنے کی صورت میں جماعت بالکل فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا انفراداً نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔[2] اور تراویح میں بھی ایسے شخص کو امام بنانا جائز نہیں، اگر اور کوئی مہیا نہ ہو تو "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے پڑھ لینا بہتر ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۹/۶/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰/۹۷۵ ج)

داڑھی مونڈنے والے کو امام بنانے کا حکم

سوال:- اگر بالغ شخص جو داڑھی، مونچھ مونڈتا ہے، کیا وہ امامت کرسکتا ہے؟

(۱،۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامة عبد .... وفاسق. وفی رد المحتار قولہ (وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر .... وفی المعراج قال أصحابنا: لا ینبغی أن یقتدی بالفاسق .... الخ. وفیہ أیضًا: وأما الفاسق فقد عللوا کراھة تقدیمہ بأنہ لا یھتم لأمر دینہ وبأن فی تقدیمہ للامامة تعظیمہ وقد وجب علیھم اھانتہ شرعًا. وکذا فی مراقی الفلاح ص:۱۶۵ وفی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۱۸ وأما الأخذ منھا وھی دون ذٰلک کما فعلہ بعض المغاربة مخنثة الرجال فلم یبحہ أحد وأخذ کلھا فعل یھود الھنود ومجوس الأعاجم. وفیہ أیضًا ج:۱ ص:۵۶۲ صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة، وقال الشامیؒ تحتہ (قولہ نال فضل الجماعة) أفاد ان الصلوٰة خلفھما أولٰی من الانفراد لٰکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع. وکذا فی کفایت المفتی ج:۳ ص:۷۹ و ۹۹ (طبع دار الاشاعت) وفتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۳ ص:۲۲۶ و ۲۴۰.

جواب:- داڑھی مونڈنا موجبِ فسق ہے، اور ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے،(۱) تاہم جو نماز اس کے پیچھے پڑھ لی گئی وہ ہوگئی۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵۷/ ۲۸ ب)

ایک مشت سے کم داڑھی والے کی امامت کا حکم

سوال:- ہمارا امام کچھ جدّت پسند ہے، ویسے تو دین دار آدمی ہے، مگر داڑھی ایک مشت سے کم رکھتا ہے، نیز وہ بعض فلموں کو جائز سمجھتا ہے، جیسے جن فلموں میں حج وغیرہ دِکھایا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے نماز کا کیا حکم ہے؟

جواب:- ایک مشت سے کم داڑھی کو کٹوانا ناجائز ہے، اور جو شخص اس پر اصرار کرے اس کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہے۔(۲) واللہ اعلم بالصواب

۱۳۸۷/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۷/ ۱۸ الف)

ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے شخص کے پیچھے نماز پڑھنی چاہئے یا نہیں؟

جواب:- قبضہ سے کم داڑھی کتروانا گناہ ہے، ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے،(۳) لیکن اگر ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی گئی تو نماز ہوگئی، اور اگر کوئی متشرّع امام نہ ملے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا پڑھنے سے بہرحال بہتر ہے۔(۴) واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۵/۷ھ

ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- ایک بریلوی نے کسی آدمی کی نمازِ جنازہ پڑھائی، اس کی داڑھی قبضہ سے بالکل کم ہے، بندہ نے کہا کہ ایسے آدمی کے پیچھے نمازِ جنازہ بالکل نہیں ہوسکتی، بندہ کا کہنا صحیح ہے یا غلط؟

جواب:- داڑھی کو قبضہ سے اُوپر کٹوانا ناجائز ہے،(۵) اور جو شخص اس ناجائز کام کا مرتکب ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے،(۶) لیکن اگر کوئی نماز اس کے پیچھے پڑھ لی گئی تو نماز کراہت کے ساتھ ہوگئی، اس کا اعادہ بھی واجب نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۴۲۵/ ۲۷ ہ)

(۱ تا ۶) دیکھئے پچھلے صفحہ کا حاشیہ۔

عرش پر اللہ تعالیٰ کے جسمانی قیام کا عقیدہ رکھنے والے شخص کی امامت کا حکم

سوال:- ہم سب اہلِ محلّہ حنفی المسلک ہیں اور ہمارے جو پیش امام تھے وہ بھی حنفی المسلک کے دعویدار تھے، لیکن دو سال ہوئے ہیں وہ سعودی عرب گئے وہاں تقریباً ایک سال سے زائد عرصہ گزارا اور وہاں مبلغ بھی رہ چکے ہیں، واپسی پر جب آئے ہیں تو ان سے ایسے افعال اور اقوال صادر ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مقلد ہیں، بلکہ حنفی المسلک بالکل نہیں ہیں، کیونکہ وہ صاف الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں جب حدیثِ نبوی ملتی ہے تو ہم کسی شخص کی تابعداری نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ صبح کی سنتیں اور فرض کے درمیان تحیۃ المسجد پڑھنا اور اوقاتِ مکروہہ میں نماز دُرست کہنا بلکہ فرض نمازوں کے بعد دُعا کو بدعت کہنا، کھانا کھانے کے بعد میزبان کو دُعائے خیر کرنا، مردے کے گھر جاکر ورثاءِ میّت کو دُعا کرنا بدعت سمجھتا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے قصد پر جانا حرام اور ناجائز سمجھتا ہے، اور حدیث "لا تشد الرحال .... الخ" سے دلیل پیش کرتا ہے، اللہ جل شانہ کے لئے عرش پر مکان اور قیام کا قائل ہے۔

مندرجہ بالا افعال و اقوال کے بعد اس شخص کو امام رکھنا ٹھیک ہے یا کہ سبکدوش کیا جائے؟ جبکہ ہمارے سب علماء نے بھی سبکدوشی کا مشورہ دیا ہے، لیکن مولوی موصوف شرعی حکم کے بغیر سبکدوش نہیں ہوتا، جبکہ مسجد میں ایک دو دفعہ جھگڑا بھی ہوا ہے، اور گورنمنٹ سے موصوف نے عدم مداخلت فی المسجد کی ضمانت بھی لی ہے۔ کیا اہلِ محلّہ مولوی صاحب کو سبکدوش کرنے کا حق رکھتے ہیں یا نہیں؟ اور تمام اہلِ محلّہ اس کی امامت پر ناراض ہیں، کیا حکم ہے؟

جواب:- سوال میں امام صاحب موصوف کی طرف جو خیالات منسوب کئے گئے ہیں اگر واقعۃً ان امام صاحب کے عقائد و خیالات یہی ہیں تو انہیں حنفی مقتدیوں کا امام مقرّر کرنا دُرست نہیں، خاص طور سے اگر وہ باری تعالیٰ کے لئے عرش پر جسمانی قیام کا عقیدہ رکھتے ہیں تو یہ اہلِ سنت والجماعت کے عقائد کے قطعی خلاف ہے، ایسے عقیدے والے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے[1]، ان کے بجائے کوئی صحیح العقیدہ امام متعین کیا جائے۔

واللہ اعلم

۴/۸/۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۰۴۹ ج)

---

(۱) کیونکہ فسقِ اعتقادی، فسقِ عملی سے زیادہ بُرا ہے، جیسا کہ حلبی کبیر شرح المنیۃ ص: ۵۱۴ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) میں ہے:
ویکرہ تقدیم المبتدع أیضًا، لأنہ فاسق من حیث الاعتقاد وھو أشد من الفسق من حیث العمل.

معراجِ جسمانی کے قائل کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال: – ایک شخص کہتا ہے کہ صحیح مذہب یہ ہے کہ معراج جسمانی ہے، اور وہ کہتا ہے کہ جو لوگ معراجِ رُوحانی کے قائل گزرے ہیں ان کی وہ شخص تکفیر نہیں کرتا، ایسے شخص سے کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟ امامت کا حق دار ہوسکتا ہے؟ اپنے کو حنفی دیوبندی کہلاتا ہے۔

جواب: – جمہور اہلِ سنت کا عقیدہ یہی ہے کہ معراج جسمانی ہے،(۱) جو شخص معراجِ جسمانی کا منکر ہو وہ فاسق اور مبتدع ہے، لیکن اگر اسراءِ جسمانی کا قائل ہے تو کافر نہیں،(۲) لہٰذا مذکورہ بالا صاحب کا عقیدہ دُرست ہے اور ان کے پیچھے نماز دُرست ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۳۸۶/۱۸ الف)

الجواب صحیح، قرآن میں مسجدِ اقصیٰ تک بھی ایک رات میں سیر کرانے کی تصریح ہے، اور یہ لفظ ''عبدہٖ'' کے ساتھ ہے جو جسمانی طور پر سیر کرانے کے لئے بالکل واضح اور صریح ہے، لہٰذا مسجدِ اقصیٰ تک کی جسمانی سیر کا منکر کافر ہوگا۔ مُلّا علی قاریؒ شرح فقہ اکبر ص:۱۳۵ پر لکھتے ہیں: من أنكر المعراج ينظر ان أنكر الاسراء من مكة الى بيت المقدس فهو كافر۔(۳) اور علامہ تفتازانیؒ شرح عقائد میں لکھتے ہیں: وقوله الى السماء اشارة الى الرد على من زعم أن المعراج فى اليقظة لم يكن الا الى بيت المقدس على ما نطق به الكتاب۔(۴)

بندہ محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

---

(۱) وفى شرح المسلم للنووىؒ ج:۱ ص:۹۱ (طبع قديمى كتب خانه) والحق الذى عليه أكثر الناس ومعظم السلف وعامة المتأخرين من الفقهاء والمحدثين والمتكلمين أنه أسرى بجسده صلى الله عليه وسلم والأثار تدل عليه، وفى التفسير المظهرى سورة الأسرى ج:۵ ص:۴۰۱ والأكثرون على أن الله تعالى أسرى بعبده محمد صلى الله عليه وسلم ليلة المعراج بجسده فى اليقظة وتواترت الأخبار الصحيحة بذلك وعليه انعقد الاجماع ولو كان المعراج فى المنام لما أنكر عليه قريش اذ لا استبعاد فى الرؤيا .... الخ. وفى أيسر التفاسير ج:۲ ص:۵۸۱ تحت الاية: ''سُبْحٰنَ الَّذِىْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ'' الأية، تقرير عقيدة الاسراء والمعراج بالنبى صلى الله عليه وسلم بالروح والجسد معًا من المسجد الحرام الى المسجد الأقصى ثم الى السموات العلى. مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا رسالہ تنویر السراج فی لیلۃ المعراج، اور تفسیر معارف القرآن ج:۵ ص:۴۶۶۔

(۲) مکہ سے بیت المقدس، اسراءِ جسمانی کا منکر کافر ہے، جبکہ بیت المقدس سے آسمان تک معراجِ جسمانی کا منکر کافر نہیں، فاسق اور گمراہ ہے، چونکہ سوالِ مذکور میں امام صاحب معراجِ جسمانی کے منکر کی تکفیر نہیں کرتے لہٰذا یہ دُرست ہے، کیونکہ معراجِ جسمانی کا منکر کافر نہیں فاسق ہے۔ البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) میں ہے: ومن أنكر الاسراء من مكة الى بيت المقدس فهو كافر، ومن أنكر المعراج من بيت المقدس فليس بكافرٍ.

(۳) الفقه الأكبر ص:۱۰۰ (طبع دار الكتب العربية الكبرى).

(۴) شرح عقائد ص:۱۴۵ (طبع قديمى كتب خانه).

شیعہ کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال:- ہمارے محلے میں شیعہ اور سنی آبادی ملی جلی ہے، اگر ہم الگ جماعت کرتے ہیں تو آپس میں لڑائی جھگڑے کا خطرہ ہے، اگر ہم مصالحت کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز پڑھ لیں تو جائز ہے یا نہیں؟ یا فرداً فرداً نماز ادا کریں؟

جواب:- شیعہ حضرات کے پیچھے نماز جائز نہیں،(۱) ان کے عقائد سے قطعِ نظر بھی کرلی جائے تو نماز کے اَحکام اتنے مختلف ہیں کہ اہلِ سنت کے ساتھ نماز کے اتحاد کی کوئی شکل نہیں۔ لہٰذا کوشش کی جائے کہ اہلِ سنت حضرات اپنی مسجد الگ بنائیں اور اس میں باجماعت نماز ادا کرلیں، اور جب تک یہ ممکن نہ ہو کسی کے گھر میں جماعت کرلی جائے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۵/۲۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۶۱۸ الف)

شیعہ سے اپنی بیٹی کا نکاح کرانے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- گزارش یہ ہے کہ سنی عقیدہ سے منسلک آدمی نے اپنی بیٹی کا نکاح باوجود عوام و خواص و اعزّہ کے روکنے کے، ایک شیعہ آدمی سے کردیا، اور اپنے لڑکوں کا نکاح شیعہ لڑکیوں سے کردیا، حالانکہ داماد اور بہوؤں کا شیعہ ہونا ظاہر اور مشہور ہے۔ اس شیعہ داماد کا شیعہ مدارس میں تعلیم حاصل کرنا واضح ہے، نیز شیعہ مسلک سے منسلک مدرسہ کا اہتمام بھی اس کے پاس ہے، شیعوں سے چندے لیتا ہے، شیعوں سے قریبی روابط ہیں، شیعوں کا امام اور خطیب نیز ذاکر بھی ہے۔

جواب طلب اَمر یہ ہے کہ اہلِ سنت والجماعت کے علمائے کرام کے فتاویٰ کے مطابق اثناء عشری شیعہ، امامت، عصمتِ ائمۂ کرام، تحریفِ قرآن وغیرہ جیسے اُمور کی وجہ سے کافر ہیں اور مرتد ہیں، ان کے ساتھ معاملات مرتد جیسے ہونے چاہئیں۔

---

(۱) وفی الکفایة شرح الهدایة ج:۱ ص:۳۰۵ ویکره الاقتداء بصاحب الهوٰی والبدعة والحاصل ان کل من کان من أهل قبلتنا ولم یفعل فی هواه حتّی یحکم بکفره تجوز الصلاة (مع الکراهة التحریمیة) خلفه، وان کان هوی یکفر أهلها کالجهمی والقدری الذی قال بخلق القرآن والرافضی الغالی الذی ینکر خلافة أبی بکرؓ لا تجوز.

وفی البحر الرائق (ج:۱ ص:۴۳۸ الامامة) وکره امامة العبد والاعربی والفاسق والمبتدع. وفیه أیضًا ج:۱ ص:۳۴۹ (المبتدع) بأن لا تکون بدعته تکفره، فان کانت تکفره فالصلوٰة خلفه لا تجوز.

وفی البحر الرائق أیضًا ج:۱ ص:۳۴۹ والرافضی ان فضل علیًّا علٰی غیره فهو مبتدع. وفی الهندیة ج:۱ ص:۸۴ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) قال المرغینانی: تجوز الصلاة خلف هوی وبدعة ولا تجوز خلف الرافضی والجهمی .... الخ. وفی الکبیری شرح المنیة ص:۵۱۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ویکره تقدیم المبتدع أیضًا لأنه فاسق من حیث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حیث العمل.

ترکِ نماز مع الجماعت سے بچنے کے لئے اس کی امامت میں کبھی کبھی نماز جائز ہوسکتی ہے؟ جبکہ یہ آدمی اپنے آپ کو سنی کہتا ہے اور شیعہ کو اپنی زبانی غلط سمجھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میرا داماد پیسوں کی وجہ سے شیعہ ہے۔ کیا حکم ہے؟ (از مقامی علمائے کرام موضع سلطانی ضلع رحیم یار خان)

جواب:- شیعہ خواہ کافرانہ عقیدے رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، دونوں صورتوں میں کسی سنی کے لئے ان سے نکاح کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، اور پہلی صورت میں نکاح منعقد بھی نہیں ہوتا۔ اب جس شخص کو دین یا عقائدِ دین کی اہمیت کا اتنا بھی احساس نہیں ہے وہ شخص امام بنانے کے لائق نہیں ہے۔[1] تاہم اگر کسی وقت ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی گئی تو کراہت کے ساتھ نماز ہوجائے گی، اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

واللہ اعلم

۱۰/۱۱/۱۴۱۰ھ

(فتویٰ نمبر ۴۱/۲۳۹ ز)

لواطت کے مرتکب کی امامت کا حکم

سوال:- ایک پیش امام نے جو شادی شدہ بھی ہے، ایک لڑکے سے لواطت کی اور اس پر دو عادل نمازیوں نے گواہی دی، یہ تمام ماجرا بستی کے مولوی صاحب سے (جو پیش امام کے علاوہ ہے) بیان کیا، مولوی صاحب نے پیش امام سے اس بارے میں معلومات حاصل کیں تو پیش امام نے اقرارِ جرم کرلیا، بعد ازاں پیش امام مذکور کو اپنے عہدے سے الگ کردیا گیا، اور تمام لوگوں میں اس بات کی تشہیر کردی گئی، اس کے بعد اس پیش امام نے ایک دفعہ نماز پڑھائی ہے، کیا کوئی صورت ہے کہ امامِ مذکور کو واپس اپنے منصب پر لایا جائے؟

جواب:- لواطت کا مرتکب فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے،[2] لیکن اگر نماز پڑھ لی جائے تو ہوجاتی ہے، اور جب تک وہ شخص توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں، البتہ اگر وہ صدقِ دِل سے توبہ کرے تو اسے امام بنایا جاسکتا ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۷/۱۱/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۳۷۶ الف)

الجواب صحیح، لیکن ایک مسلمان کے گناہ کی تشہیر کرنا ٹھیک نہیں، صرف اتنا کافی تھا کہ ان کو امامت سے معزول کردے۔

محمد عاشق الٰہی

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامۃ عبد .... وفاسق. وفی الشامیۃ (قولہ وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ، ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی .... الخ. وراجع أیضا البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸، والھندیۃ ج:۱ ص:۸۴.

گالی دینے والے کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک امام بدگو، جلد مشتعل ہوجانے والا اور غصّے میں آپے سے باہر ہوجانے والا ہے، نیز غیبت و دروغ گوئی کا بھی عادی ہے، ایسے امام کی اقتداء میں نماز ہوجاتی ہے یانہیں؟ ایک امام جس کے پیچھے اس کی اخلاقی پستیوں کی بناء پر نماز پڑھنے کی طرف دِل مائل نہ ہو اور دُوسری مسجد بھی نزدیک نہ ہو، تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز باجماعت پڑھنے سے نماز ادا ہوجائے گی؟

جواب:- سب وشتم کا عادی، جھوٹ بولنے اور غیبت کرنے والا فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہے،[1] تاوقتیکہ وہ ان گناہوں سے توبہ نہ کرے، البتہ جو نمازیں اس کے پیچھے پڑھ لی گئی ہوں وہ ادا ہوجاتی ہیں، ان کا لوٹانا ضروری نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۷/۱۱/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۳۷۲ الف)

امام کی بُرائی کرنے والے کا اسی امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا

سوال:- ایک شخص امام کے پیچھے ہر وقت بُرائی کرتا ہے اور پھر اس کے پیچھے نماز بھی پڑھتا ہے، یہ جائز ہے یانہیں؟

جواب:- پیش امام لائقِ احترام ہے، اس کی بے عزّتی کرنا جائز نہیں، بُرائی کرنا تو ہر مسلمان کا بُرا ہے، خاص طور سے پیش امام کی بُرائی کرنا اور بھی قبیح ہے، لیکن اس سے اس پیش امام کے پیچھے بُرائی کرنے والے کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔

سوال:- ایک شخص پیش امام کے مارنے کے لئے ہاتھ اُٹھالیتا ہے اور پھر بھی وہ اس کے پیچھے نماز پڑھتا ہے، جائز ہے یانہیں؟

جواب:- سابق میں ملاحظہ فرمائیں۔ واللہ اعلم

۱۷/۱/۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۷۷ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ (ایچ ایم سعید) ویکرہ امامة عبد .... وفاسق .... الخ.
وفی الدر المختار أیضًا ج:۱ ص:۵۶۲ صلّٰی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. وقال الشامی تحته (قوله نال فضل الجماعة) أفاد ان الصلاة خلفهما أولیٰ من الانفراد لٰکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع. وکذا فی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸، ۳۴۹، والهندیة ج:۱ ص:۸۴.

فسقیہ افعال کے مرتکب کو امام بنانا

سوال:- ایک پیش امام جو عورتوں کو گنڈا تعویذ دیتا ہو اور اکثر و بیشتر وقت عورتوں کے جھرمٹ میں گزارتا ہو، غیر شادی شدہ ہونا ظاہر کر کے شادی کی خواہش رکھتا ہو، اور لڑکیوں کی فوٹو منگوا کر بھی دیکھتا ہو، اور جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے کی عادت ہو تو کیا ایسے پیش امام کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے؟

جواب:- جو شخص جھوٹ بولنے، دھوکا دینے اور نامحرم عورتوں سے آزادانہ میل جول رکھنے کا مرتکب ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے،[1] تاوقتیکہ وہ اپنے ان گناہوں سے توبہ نہ کرے۔

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۳ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۳۸ الف)

گالی گلوچ کرنے والے شخص کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک مستفتی نے کافی طویل خط لکھا جس میں اصل سوال کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱:- ایک امام گالی گلوچ، جھوٹ بیانی اور ہر وقت لڑائی جھگڑے کا مرتکب رہتا ہے، اس کے ان افعال سے تنگ آکر مستفتی نے الگ مسجد بنائی ہے، کیا اس مسجد میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ ۲:- ایسے افعال والے امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- مستفتی نے جو علیحدہ مسجد بنائی ہے، اگر اس میں تمام لوگوں کو آنے کی اجازت عام ہو تو اس میں جمعہ کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ ۲:- جو شخص گالی گلوچ، دروغ بیانی اور لڑائی جھگڑے کا مرتکب ہو وہ فاسق ہے، جب تک وہ اپنے ان افعال سے اعلانیہ توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں،[2] مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اسے نرمی سے سمجھائیں، اور اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے بیزاری کا اظہار کریں۔

(آپ کے اتنے طویل خط سے یہی دو معقول سوال سمجھ میں آتے ہیں جن کا جواب لکھ دیا گیا)۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۱/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۶۶ الف)

(۱،۲) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامۃ عبد .... وفاسق، وفی الشامیۃ (قولہ وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی. وکذا فی البحر الرائق ج: ۱ ص: ۳۴۸، والھندیۃ ج: ۱ ص: ۸۴.

کس مسجد کے امام کے پیچھے نماز پڑھنا اَوْلیٰ ہے؟

سوال:- ایک مسجد نئی بن رہی ہے، لوگوں کا عقیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کا اور کھڑے ہوکر سلام پڑھنے کا ہے، وہ لوگ مجھے اس مسجد میں نماز پڑھنے کی دعوت دے رہے ہیں کہ قرآنی آیات اور حدیث پڑھنے، سننے کو، کوئی منع نہیں کرسکتا، جبکہ میں پہلے سے ایک مسجد میں نماز پڑھ رہا ہوں، میرے لئے کیا حکم ہے؟

جواب:- جس مسجد کا امام صحیح العقیدہ اور عملی اعتبار سے زیادہ متقی پرہیزگار ہو اس میں نماز پڑھیئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۳۵۱ ب)

تصویر کھینچنے اور کھنچوانے والے کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- عرض اینکہ ماہِ رمضان المبارک میں ایک مسجد کے اندر ایک حافظِ قرآن صاحب جو مسجد میں تراویح کی نماز پڑھاتے ہیں، اسی مسجد میں پیش امام اور مسجد کے مدرسہ تعلیم القرآن میں مدرّس بھی ہیں۔ حافظ صاحب کی اعانت کے لئے ایک نائب مدرّس بھی ہے جو اِن ہی حافظ صاحب کا شاگرد ہے۔ ۲۷/رمضان کی رات ختمِ قرآن کی مجلس میں جن بچوں نے اس سال قرآن شریف ختم کیا تھا اور جو بچے مائک پہ آکر تلاوت کررہے تھے، ان بچوں کو خطیبِ مسجد کے ہاتھ سے انعام دیا جارہا تھا، اس وقت نائب مدرّس نے تصویر کھینچنا شروع کردیا، جس پر ایک شخص نے فوراً تصویر کشی سے منع کردیا اور خطیب صاحب سے مخاطب ہوکر کہا کہ کیا تصویر کھینچنا مسجد میں جائز ہے؟ خطیب صاحب نے کہا مکروہ ہے۔ اس کے بعد وہ نائب مدرّس اس صاحب (جنھوں نے منع کیا تھا) کے پاس آیا اور کہا کہ حافظ صاحب کی اجازت سے کیمرہ میں رِیل بھری گئی ہے میں تصویر کھینچوں گا۔ حالانکہ ان سے کہا گیا کہ دوبارہ حافظ صاحب سے پوچھ لو مگر اس نے ضد کی اور جب حافظ صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوگئے تو ان کی کئی جانب سے تصویر کھینچی، حافظ صاحب نے اس کو منع نہیں کیا، بعد میں دُوسرے روز حافظ صاحب نے قرآنِ پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ میں نے نہ اجازت دی ہے، نہ رِیل بھروائی ہے۔ کیا مسجد میں تصویر کشی جائز ہے؟ ایسے امام کی اقتداء میں جس نے قسم کھا کر اپنی صفائی پیش کردی

---

(۱) وفی الدر المختار ج: ۱ ص:۵۵۷ (طبع ایچ ایم سعید) والأحق بالامامة تقديمًا بل نصبًا مجمع الأنهر (الأعلم بأحكام الصلوٰة) فقط صحةً وفسادًا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة. وفی الشامية (قوله بشرط اجتنابه للفواحش) الأعلم بالسنة أولىٰ الا ان يطعن عليه فی دينه .... الخ.

ہو، نماز پڑھنا جائز ہے؟

جواب:- تصویر کھینچنا اور کھینچوانا مسجد سے باہر بھی ناجائز ہے، خاص طور پر مسجد کو اس ناجائز فعل سے آلودہ کرنا تو اور بھی گناہ ہے۔ اگر واقعۃً ان کی اجازت سے رِیل بھری گئی تھی اور انہوں نے تصویر کھینچتے دیکھ کر قدرت کے باوجود منع نہیں کیا، اس کے باوجود قسم کھالی کہ میری اجازت سے تصویر نہیں کھینچی گئی تو انہوں نے سخت گناہ کا ارتکاب کیا، اگر وہ اس گناہ پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلیں تو خیر ورنہ اگر اصرار کریں تو انہیں اپنے اختیار سے امام نہیں بنانا چاہئے۔[1] تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئیں وہ ادا ہوگئیں۔

واللہ اعلم

۱۱/۱۱/۱۴۰۸ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۲۳۴۰ ز)

جھوٹ بولنے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- امام اگر جھوٹ بولے یا جھوٹی قسم کھائے تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی کیا سزا ہوگی؟

جواب:- جو شخص جھوٹ بولتا ہو یا جھوٹی قسم کھاتا ہو وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہے اور فاسق ہے، جب تک ان گناہوں سے توبہ نہ کرے، اس وقت تک اسے امام بنانا جائز نہیں۔[2] شرعی سزاؤں کو نافذ کرنے کا اختیار صرف اسلامی حکومت کو ہے، عوام کو نہیں۔[3]

واللہ اعلم بالصواب

۱/۱۱/۱۳۸۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۳۲۷ الف)

بدعتی اور مجہول پڑھنے والے کی اقتداء کا حکم

سوال:- ایک شخص ہمیشہ تارکِ صلوٰۃ جماعت ہے، بدعتی ہے، قرآن مجید غلط پڑھتا ہے، ایسا غلط کہ معنی غلط ہوجاتا ہے، حرام کو حلال کہتا ہے، پردہ کو عورتوں کے لئے غیر ضروری کہتا ہے، مسلمانوں کے ساتھ بائیکاٹ کرنے پر لوگوں کو دُعائے خیر دیتا ہے۔ ایک شخص کی شادی میں نٹولے اور

(۱، ۲) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۵۵۹، ۵۶۰ (طبع ایچ ایم سعید) ویکرہ امامۃ عبد .... وفاسق. وفی الشامیۃ قولہ (وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ، ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر ..... وفی المعراج قال أصحابنا: لا ینبغی أن یقتدی بالفاسق .... الخ. وفیہ أیضًا: وأما الفاسق فقد عللوا کراھۃ تقدیمہ بأنہ لا یھتم لأمر دینہ وبأن فی تقدیمہ للامامۃ تعظیمہ وقد وجب علیھم اھانتہ شرعًا. وفی الھدایۃ ج: ۱ ص: ۱۲۲ ویکرہ تقدیم العبد .... والفاسق لأنہ لا یھتم لأمر دینہ .... وان تقدموا جاز لقولہ علیہ السلام: صلّوا خلف کل بر وفاجر .... الخ.

(۳) دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ج: ۶ ص: ۵۴۹ (طبع سعید).

مجلس آئی ہوئی تھی، لوگوں نے کہا کہ ہم تیری دعوت کا کھانا نہیں کھاتے اس لئے کہ تم نے بدعت کا کام کیا ہے، یعنی مجلس بلوائی ہے، لیکن یہ شخصِ مذکور شریک ہوا اور کہتا ہے کہ کھانا جائز ہے۔ اب اس کی امامت کی وجہ سے لوگوں میں جھگڑا پیدا ہونے کا خطرہ ہے، اس نے اپنے چچا کو بھی دیوث کہا ہے، ایک شخص نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے لواطت بھی کی ہے، قبر میں نورنامہ رکھنا جائز قرار دیتا ہے، ایسے شخص کی اقتداء کیسی ہے؟

جواب: – مذکورہ شخص کے بارے میں جو باتیں سوال میں درج ہیں اگر وہ دُرست ہیں تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے اور ایسے شخص کو امام بنانا دُرست نہیں، کیونکہ مذکورہ باتوں میں سے بہت سی موجبِ فسق ہیں۔ لہٰذا ایسے امام کو بدلنا چاہئے،(۱) البتہ جب تک کسی دُوسرے نیک صحیح العقیدہ امام کا انتظام نہ ہو اس وقت تک جو نمازیں اس کے پیچھے پڑھی جائیں گی وہ ہوجائیں گی، اور اگر دُوسرے امام کے پیچھے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔(۲)

واللہ اعلم

۱۹/۶/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۶۳۶/۲۸ ب)

جماعتِ اسلامی کے رکن کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال: – چند مہینوں سے یہ مہم چلی آرہی ہے کہ جماعتِ اسلامی اور اس کے اہل کاروں کے پیچھے نماز کی اقتداء جائز نہیں، اور جیسا کہ جناب کو معلوم ہے کہ یہ فتویٰ ہزاروی گروپ نے صادر کیا ہے، کیا یہ فتویٰ صحیح ہے یا غلط؟

جواب: – امیرِ جماعتِ اسلامی کے بعض نظریات جمہور اہلِ سنت کے خلاف ہیں، خاص طور سے بعض انبیاءؑ وصحابہؓ پر جو تنقیص آمیز تنقید انہوں نے کی ہے اس سے اہلِ سنت کے متفقہ عقائد مجروح ہوتے ہیں، لہٰذا جو شخص ان کے ان خیالات سے متفق ہو اسے امام بنانے سے احتراز کرنا چاہئے اور کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو امام بنانے کی کوشش کرنی چاہئے، البتہ اگر کسی وقت ایسا امام میسر نہ ہو اور امیرِ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ ویکرہ امامۃ عبد .... وفاسق. وفی رد المحتار قولہ (وفاسق) من الفسق وھو الخروج عن الاستقامۃ، ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر .... وفی المعراج قال أصحابنا: لا ینبغی أن یقتدی بالفاسق .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۲ صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعۃ، وقال الشامیؒ تحتہ (قولہ نال فضل الجماعۃ) أفاد ان الصلاۃ خلفھما أولٰی من الانفراد لٰکن لا ینال کما ینال خلف تقی ورع.

جماعتِ اسلامی کے خیالات کے کسی شخص نے نماز پڑھادی تو نماز ہوجائے گی، کیونکہ نماز ہر مسلمان کے پیچھے ہوجاتی ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۰/۱۲/۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۸۸/۱۸ الف)

لڑکی کو بیچنے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک آدمی مسمّٰی احمد دین جو ایک گاؤں کا پیش امام بھی ہے، پچیّس آدمیوں کے رُوبرو قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتا ہے کہ میں نے اپنی زمین فلاں شخص کو اتنے روپیہ پر فروخت کردی ہے، کچھ رقم نقد بھی وصول کرلی ہے اور باقی بوقت بیع نامہ وصول کروں گا۔ دو ماہ کے بعد مسمّٰی مذکور اپنے وعدے سے منحرف ہوگیا کہ میں زمین نہیں دیتا ہوں۔ مسمّٰی مذکور نے اپنی دُختر فروخت کردی تھی جس کا عوام کو ابھی تک علم نہیں ہوا ہے، اور رقم لے کر ہضم کرچکا ہے، جو ایک زندہ خاوند کی بیوی تھی، اور بدستور امامت بھی کرتا ہے۔ کیا ایسے شخص کی اقتداء دُرست ہے؟

جواب:- ایسا شخص جو وعدہ خلافی اور لڑکی کو بیچنے اور دُوسروں کی رقم ناجائز طور سے کھانے کا مرتکب ہو، فاسق ہے، اور جب تک وہ ان گناہوں سے علانیہ توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں،[2] لیکن اگر کسی وجہ سے کوئی نماز پڑھ لی گئی تو نماز ہوجائے گی، واجب الاعادہ نہ ہوگی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۲ صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. وقال الشامیؒ تحته أفاد ان الصلوة خلفهما أولٰی من الانفراد .... الخ. نیز اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی کتاب جواہر الفقہ ج:۲ ص:۱۷۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وفی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص:۱۸۱ (مطبع مصطفی البابی، مصر) (و) لذا کره امامة الفاسق العالم لعدم اهتمامه بالدین فتجب اهانته شرعا فلا یعظم بتقدیمه للامامة، قال الطحطاوی: فتجب اهانته شرعا فلا یعظم بتقدیمه للامامة تبع فیه الزیلعی ومفاده کون الکراهة فی الفاسق تحریمیة. وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ (ویکره امامة عبد .... وفاسق) وفی رد المحتار (وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من یرتکب الکبائر .... وفیه أیضًا: وأما الفاسق فقد عللوا کراهة تقدیمه بأنه لا یهتم لأمر دینه وبأن فی تقدیمه تعظیمه وقد وجب علیهم اهانته شرعاً. وکذا فی فتاوی دار العلوم دیوبند ج:۳ ص:۱۳۶.

خائن شخص کو امام بنانے کا حکم

سوال:- ایک شخص میں مندرجہ ذیل عیوب موجود ہیں:-

۱:- جھوٹ بولنے کا عادی ہے۔۲:- نام نہاد مدرسہ کے طلبہ اور یتامیٰ کے نام سے زکوٰۃ، فطرہ، صدقہ، خیرات، قربانی کی کھالیں اور عشر وغیرہ وصول کر کے ناجائز طور پر اپنے مصرف میں لاتا ہے، حالانکہ تنخواہ اس کے علاوہ وصول کرتا ہے۔ یہ باتیں عام لوگوں کو معلوم ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کا اعتماد اس سے اُٹھ گیا ہے۔۳:- اپنے عیوب چھپانے کے لئے دُوسروں پر بیباکانہ طور پر اتہام لگاتا ہے۔ کیا اس کے پیچھے نماز صحیح ہے؟

جواب:- اگر واقعۃً کسی شخص میں مذکورہ بالا عیوب پائے جاتے ہوں تو اسے امام بنانا جائز نہیں۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۰/۱۰/۲۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۶۲/۲۱ الف)

ماموں سے ناراض شخص کے پیچھے نماز پڑھنا

سوال:- ایک شخص نے اپنے ماموں سے قرآن شریف پڑھا ہے، اب اس کا ماموں اس سے سخت ناراض ہے اور اپنے حقوق اس کو نہیں بخشتا، کیا اب اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے جبکہ اس کو ماموں اپنے رشتہ داری کے حق حقوق بھی نہیں بخشتا؟

جواب:- اگر ماموں کسی معقول اور شرعی وجہ سے ناراض ہے تو اس پر واجب ہے کہ ان کو راضی کرنے کی کوشش کرے، اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا مسئلہ اس پر موقوف ہے کہ ماموں کی ناراضگی کی وجہ معلوم ہو۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۴ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۲۵/۱۹ الف)

بے خبری میں بریلوی امام کی اقتداء میں نماز پڑھ لی تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ایک شخص ایک مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے گیا، اسے معلوم نہ تھا کہ یہ مسجد کس مسلک

---

(۱) پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

کے لوگوں کی ہے۔ بعد ازاں اسے پتہ چلا کہ امام صاحب بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھ لینی چاہئے یا نہیں؟ اگر پڑھ لی گئی تو ادا ہوگی یا نہیں؟

جواب: - نماز پڑھنے کے لئے ایسا امام منتخب کرنا چاہئے جو صحیح العقیدہ ہو، تاہم اگر بریلوی مسلک کے کسی امام کے پیچھے نماز بے خبری میں پڑھ لی گئی یا اس کے علاوہ کہیں اور جماعت ملنا ممکن نہ تھا اس حالت میں پڑھ لی گئی تو نماز ہوگئی۔[1]

واللہ اعلم

۱۵/۱۱/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۷ ج)

جرگے کا فیصلہ مقدم ہے یا باجماعت نماز؟

شور جھگڑے کی بناء پر جماعت کی نماز توڑنا

سوال ۱: - نماز کا وقت ہوگیا تھا اور مولوی صاحب مسجد کے سامنے جرگے میں بیٹھے تھے، مولوی صاحب کو دو بار آواز دی گئی کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے لوگ انتظار کر رہے ہیں، اس پر مولوی صاحب نے کہا کہ فرض نماز سے پہلے جرگے کا فیصلہ اہمیت رکھتا ہے۔ آئندہ ایسے مولوی صاحب کی اقتداء جائز ہے یا نہیں؟

۲:- عصر کی نماز کی جماعت کھڑی تھی، مولوی صاحب خود جماعت کرا رہے تھے، محلے میں شور جھگڑا ہوگیا، مولوی صاحب نماز فوراً توڑ کر مسجد سے باہر بھاگ گئے۔ ایسے مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب ۱: - جرگے کا فیصلہ کرنے کے لئے جماعت ترک کرنا جائز نہیں ہے، اِلّا یہ کہ مسئلہ ایسا ہو کہ اس وقت فیصلہ بیچ میں چھوڑ دینے سے کسی بڑے فتنے فساد کا اندیشہ ہو، لہٰذا مسئلے کا جواب اس فیصلے کی صحیح نوعیت پر موقوف ہے۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں نماز توڑنا جائز نہیں تھا، جن امام صاحب نے ایسا کیا انہیں اپنے اس عمل پر توبہ و اِستغفار کرنا چاہئے، اور وہ ایسا کرلیں تو ان کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

واللہ اعلم

۵/۱۰/۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۳۴۶/۲۷ ہ)

---

(۱) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید) صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. وقال الشامی تحته (قوله نال فضل الجماعة) أفاد ان الصلوٰة خلفهما أولی من الانفراد .... الخ.

سیاسی اختلاف کی بناء پر امامت سے معزول کرنا

سوال:- زید اپنے باپ دادا کے وقتوں سے ایک محلے میں امام چلا آرہا ہے، اچھا عالم ہے، بچوں کو خوب قرآن پڑھاتا ہے، محلے کے دو تین افراد جو اثر و رُسوخ والے ہیں اور پیپلز پارٹی والے ہیں، امام صاحب کے مخالف ہیں، امام صاحب کے حامی عوام غریب ہیں اور ان دو تین افراد کے سامنے کچھ بول نہیں سکتے۔ بھٹو صاحب کے آخری دور میں سیاسی اختلاف کی بناء پر امام صاحب کو نکال کر دُوسرا امام لائے، اب دُوسرے امام کے پیچھے شرعاً نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جب پہلے امام میں کوئی خرابی نہیں تھی تو ان کو محض سیاسی اختلاف کی بناء پر معزول کرنا کسی طرح دُرست نہیں تھا، لیکن اب جبکہ دُوسرے امام صاحب کا تقرّر کر دیا گیا ہے تو اگر ان میں کوئی بات موجبِ کراہت نہیں ہے تو ان کے پیچھے بھی نماز جائز ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۳/۸/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۸۷۷ ج)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ''عالم الغیب'' اور ''حاضر و ناظر'' ماننے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- اگر کوئی مولوی صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر سمجھتا ہو یا ان کو عالم الغیب سمجھتا ہو، نیز یہ بھی کہتا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی علم ہے کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ بارش کب ہوگی؟ کوئی کب مرے گا؟ یا ان کو نور مانتا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:- جس امام کے بارے میں یہ تحقیق ہو کہ وہ مذکورہ عقائد کا قائل ہے اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔[1] واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۵/۵/۱۳۹۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۶۸۶ ب)

---

(۱) وفی الکبیری شرح المنیة ص:۵۱۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ویکره تقدیم المبتدع أیضًا لأنه فاسق من حیث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حیث العمل. وفی تنویر الأبصار مع شرحه ج:۱ ص:۵۵۹-۵۶۱ یکره امامة عبد .... ومبتدع أی صاحب بدعة وهی اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول صلی الله علیه وسلم لا بمعاندة بل بنوع شبهة .... لا یکفرها، وان کفر بها فلا یصح الاقتداء به أصلا .... الخ. وفی غنیة المتملی ص:۵۱۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) وانما یجوز الاقتداء به مع الکراهة اذا لم یکن ما یعتقده یؤدی الی الکفر عند أهل السنة، اما لو کان مؤدیا الی الکفر فلا یجوز أصلا. نیز دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند ۱۲/۳، ۱۷۰۔

مسجد کی دُوسری منزل پر جماعت کرانے کا حکم

سوال:- دو منزلہ مسجد کی دُوسری منزل پر نماز باجماعت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ منزلِ اوّل بالکل خالی ہو اور امام اور مقتدی سب دُوسری منزل پر نماز ادا کرتے ہوں۔

جواب:- وكره تحريما الوطئ فوقه والبول والتغوط، لأنه مسجد الى عنان السماء. (درمختار مع شامی ج:۱ ص:۴۱۲)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد آسمان تک مسجد ہی مسجد ہوتی ہے اور اُوپر کی منزل بھی مسجد ہی ہے۔ لہٰذا اس میں جماعت کرنے میں کوئی حرج نہیں[2]، البتہ بلاضرورت ایسا نہ کیا جائے، کیونکہ یہ تقلیلِ جماعت کا سبب بن سکتا ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۸۷/۱۲/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۴۴۵ الف)

امام اگر سائبان کے نیچے کھڑا ہو اور مقتدی پیچھے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ہماری مسجد میں صحن میں سائبان پڑا ہوا ہے، اس کے بعد صحن شروع ہو جاتا ہے، امام صاحب سائبان کے نیچے کھڑے ہوتے ہیں۔ اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ اس طرح نماز ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک صف امام کے ساتھ سائبان کے نیچے ہونا ضروری ہے، اگر ایسا نہیں ہوا تو نماز نہیں ہوگی، اگر ہوگی تو مکروہ ہوگی۔

جواب:- صورتِ مسئولہ میں نماز دُرست ہے، اور اس میں کوئی کراہت بھی منقول نہیں ملی، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ امام سائبان سے ذرا پیچھے کھڑا ہو جائے اس طرح کہ اس کے قدم سائبان سے باہر ہوں، سجدہ خواہ سائبان کے نیچے ہو جائے، أخذ مما فى الدر المختار وقيام الامام فى المحراب لا سجوده فيه (أى يكره ذلك)۔[3]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۲۸ ج)

کیا امام، امامت سے اُستاذ بن جاتا ہے؟

سوال:- چند مسائل درپیش ہیں، جن کا جواب درکار ہے۔

۱:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرعِ متین دریں مسئلہ کہ کسی شخص کے پیچھے نماز پڑھنے سے

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۶۵۶ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) اس مسئلے سے متعلق مکمل تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۵۹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) الدر المختار ج:۱ ص:۶۴۵ (طبع ایچ ایم سعید)

وہ اُستاذ بنتا ہے یا نہیں؟ اور اگر وہ اُستاذ بن جاتا ہے تو کیا اس کا احترام بھی اسی طرح ضروری ہے جیسا کہ عام مروّجہ اُستاذوں کا احترام کیا جاتا ہے؟

۲:- عام عرف میں امام کو اُستاذ کہا جاتا ہے، کیا یہ اُستاذیت، امامت کی خصوصیت ہے یا مطلق نماز پڑھنے کی؟

۳:- ایک حافظِ قرآن دُوسرے حافظِ قرآن کی منزل سنتا ہے، کیا یہ منزل سننا تعلیم میں شمار ہوتا ہے یا کہ تذکرہ میں؟ اور یہ بھی بتائیں کہ اُستاذ کب اور کیسے بنتا ہے؟ ذرا تفصیل کے ساتھ بیان فرمائیں۔

جواب ۱:- محض امامت سے اُستاذ نہیں بنتا، مگر امام کی بھی تعظیم کرنی چاہئے۔

۲:- یہ عرف صحیح نہیں ہے، ہاں! اگر امام سے کوئی دین کی بات سیکھی ہو تو وہ اُستاذ ہو گیا۔

۳:- شرعاً اس سے اُستاذ نہیں بنتا، مگر چونکہ قرآن یاد کرنے میں ایک دُوسرے کی مدد ہوئی، اس لئے ایک دُوسرے کی عزّت کرنی چاہئے۔

واللہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۵۶/۱۳۸)

ریڈیو سننے والے کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک شخص ایک حد تک بڑا پابندِ شریعت ہے، صرف ایک بات اس میں پائی جاتی ہے یعنی ریڈیو سنتا ہے، ریڈیو میں صرف تلاوتِ قرآن مجید اور ترجمہ اور کوئی مسائل دینی اگر نشر ہوں تو سنتا ہے اور خبریں بھی، باقی فلمی ریکارڈ وغیرہ نہیں سنتا، اور لوگوں کا امام ہے۔ نماز اس کے پیچھے جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر ساز و موسیقی اور دُوسری ناجائز چیزیں سننے سے اجتناب کیا جائے تو ریڈیو سننا بالکل جائز ہے اور اس کی وجہ سے نماز میں کوئی خلل نہیں آتا، چنانچہ شخصِ مذکور کے پیچھے نماز دُرست ہے۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۳۲۲ الف)

بلا ثبوت، زنا کی تہمت لگانے والے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال:- ایک شخص کسی پر بلا ثبوت، زنا کی تہمت لگاتا ہے، ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟ اور اس

کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا دُرست ہے؟

جواب:- کسی شخص پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا گناہِ کبیرہ ہے،[1] اگر ایسا کرنے والا توبہ نہ کرے تو فاسق ہے،[2] اور اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، لیکن اگر نماز پڑھ لی گئی تو ادا ہوجائے گی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۵/۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۵۹۶ ب)

امام کا امامت برقرار رکھنے کے لئے چند شرائط لگانے کا حکم

سوال ۱:- ایک مولانا صاحب ہندوستان سے فارغ ہے، یہاں ایک جامع مسجد میں پیش امام ہے، اور اپنے مقتدیوں کو یوں تقریر کرتا ہے کہ اگر امامت کو برقرار رکھنا ہے تو میری نصیحت پر عمل کرو۔

۲:- تم لوگوں پر میری ماہوار تنخواہ کا جو حصہ لگایا جائے گا اس کو ہر مہینے میں دینا ہوگا۔

۳:- پورے مہینے امام کو عمدہ کھانا کھلانا ہوگا۔

۴:- مسجد کی موقوفہ زمین امام کے نام پر رجسٹری وقف کرنا ہوگی۔

۵:- میں گھر جاؤں تو کسی اور کو امام بناؤں گا۔

۶:- جو مقتدی مذکورہ شرائط پر عمل نہ کرے گا، امام اس مقتدی کے کسی دینی دُنیوی کام میں شرکت نہ کرے گا، یعنی میّت کی جنازہ وغیرہ۔

۷:- اور یہی وصیت اپنے خلیفہ کو بھی کرتا ہے۔

جواب:- امام صاحب کی لگائی ہوئی شرائط میں سے نمبر ۳، ۶ و ۷ شریعت کے مطابق نہیں، انہیں چاہئے کہ یہ شرائط عائد نہ کریں، لیکن ان شرائط کے عائد کرنے کی وجہ سے ان کے پیچھے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

واللہ اعلم

۱۳۸۸/۱/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۶۰ الف)

کشفِ قبور کے قائل کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال:- جو شخص کشفِ قبور کا قائل ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

(۱، ۲) تفصیل کے لئے دیکھئے سورۂ نور کی آیت: ۴ "وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ" (الآية) کے تحت تفسیر معارف القرآن ج: ۶ ص: ۳۵۳۔

جواب:- کشفِ قبور کوئی اَمرِ محال نہیں، بعض اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف سے یہ ملکہ دے دیا جاتا ہے، اگر کوئی اس کا قائل ہو تو مضائقہ نہیں، البتہ کشفِ قبور کے ذریعے کسی خلافِ شریعت بات پر استدلال کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ جو شخص کشفِ قبور کے ذریعے کسی ناجائز بات پر استدلال کرے وہ مرتکبِ بدعت ہے، اس کو امام بنانے سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی صحیح العقیدہ امام نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، نماز ہوجائے گی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۱/۵ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۱۹ الف)

جھوٹ بولنے والے اور مسجد کا سامان اپنے گھر میں استعمال کرنے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال:- عرض یہ ہے کہ یہاں سعودی گورنمنٹ بلا تابعیہ مسجد بنانے نہیں دیتی، اس لئے مولوی صدیق تابعیہ والا کے نام سے ہمارے محلے کی مسجد کو تعمیر کرنا پڑا۔ مولوی موصوف چونکہ تابعیہ والا ہے اس لئے مولوی موصوف کو متولّی مسجد بنا کر ہم نے تقریباً پندرہ سولہ سال تک مسجد کو چلایا ہے، آج عرصہ تین سال سے مولوی موصوف نے ایک مولوی صاحب کو ہماری مسجد کا امام بنادیا ہے، مولوی موصوف نے امامِ مسجد کو خادم کہہ کر اقامہ بھی بنادیا ہے، مولوی موصوف خود امام کا کفیل بھی ہے، جس پاسپورٹ پر اقامہ بنادیا ہے وہ پاسپورٹ چونکہ جعلی تھا، گزشتہ سال جب جعلی پاسپورٹ والوں کی یہاں جوازات کی طرف سے پکڑ دھکڑ اور تلاش ہو رہی تھی تو امام صاحب نے اپنا پاسپورٹ چھپالیا، پھر حکومت میں پاسپورٹ گم ہونے کا اعلان کر کے درخواست دے دی، پھر سفارت خانے سے نیا پاسپورٹ حاصل کیا، اس پر پھر اقامہ بنایا۔ امام صاحب نے پاسپورٹ گم ہونے کا جو اعلان کیا ہے وہ بالکل جھوٹ اور کذب ہے، اس میں توریہ وتعریض بھی نہیں کیا، حالانکہ پہلا پاسپورٹ امام کے پاس موجود ہے۔ اس بات پر مقتدیوں نے امام سے ناراض ہوکر اس کے خلف میں اقتداء کرنا چھوڑ دیا، مقتدیوں نے دُوسری مسجد میں جا کر نماز پڑھنا شروع کردیا ہے۔ یہ تو ساری پہلی بات تھی۔

دُوسری بات یہ ہے کہ اس امام صاحب نے مسجد کا سامان گھر میں استعمال کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ایک آدمی نے مسجد کے لئے پانی دیا تھا، تاکہ اس سے لوگ وضو کریں، امام صاحب نے یہ پانی بجائے مسجد کے مدرسہ میں اور مسجد کے کرایہ کے مکانوں میں خرچ کیا، جب

محلے کے لوگوں نے امام صاحب سے یہ سب باتیں پوچھیں تو امام صاحب سختی سے پیش آیا، جھگڑا فساد کیا ہے، ان کی وجہ سے محلے کے اکثر لوگوں نے ناراض ہوکر اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا چھوڑ دیا، دُوسری مسجد میں نماز پڑھنا شروع کردیا۔ مولوی صدیق صاحب نے مذکورہ امام کو معزول کرنے کی اور دُوسرا امام رکھنے کی اجازت تو دی ہے مگر موجودہ امام متولّیٔ مسجد رہے گا اور سب کا سرپرست ہوگا۔ یہ بات محلے والوں پر مشکل گزری۔ خلاصہ یہ ہے کہ اوّلاً امام صاحب نے اقامہ اور پاسپورٹ کی وجہ سے صریح جھوٹ بولا، ثانیاً مسجد کے فرش، مسجد کے ایئرکنڈیشن اور مسجد کے پانی میں ناجائز تصرف کیا، ثالثاً امام صاحب مقتدیوں سے سختی سے پیش آیا، جھگڑا فساد کیا، رابعاً امام صاحب کو معزول کرنے کی طاقت بھی مقتدیوں کو نہیں ہے، اور امام صاحب کے ساتھ اختلاط کی صورت میں فتنہ وفساد کا قوی اندیشہ ہے، شرعی حکم سے آگاہ کریں، ان وجوہ کی بناء پر جو لوگ دُوسری مسجد میں نماز پڑھتے ہیں کیا وہ لوگ غلطی پر ہیں؟

جواب: – جھوٹ بولنا اور مسجد کا سامان گھر میں استعمال کرنا حرام ہے، جو اس حرام کا مرتکب ہو جب تک وہ اس سے توبہ نہ کرے فاسق کے حکم میں ہے، اسے باختیارِ خود امام بنانا یا کسی صالح امام کے ہوتے ہوئے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ تاہم جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئیں وہ ادا ہوگئیں، اعادے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر یہ اُمورِ محرّمہ ان سے ثابت ہوں اور توبہ بھی نہ کریں تو منتظمینِ مسجد پر واجب ہے کہ وہ کسی صالح امام کا انتظام کریں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۸/۷/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۱۴۹۹ ہ)

اپنے اُوپر عائد شدہ مختلف الزامات کے دُرست جوابات دینے والے امام کی اقتداء کا حکم

سوال: – کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ ایک امام صاحب کو مسجد کے احاطے کے اندر کونے میں ایک مکان بنا کر دیا ہوا ہے، اور تقریباً ۱۴–۱۵ سال سے وہ اس مسجد کی امامت کررہے ہیں اور اسی کے احاطے کے اندر ایک مدرسہ ہے، اس مدرسہ کے مہتمم بھی امام صاحب ہیں، مسجد و مدرسہ دونوں کی طرف سے امام کو مبلغ ۶۰ روپے ماہانہ ملتے ہیں، مسجد و مدرسہ کی کمیٹی کے آفس عہدیداران کی طرف سے امام ومہتمم صاحب پر مندرجہ ذیل الزامات لگائے گئے ہیں، کمیٹی کے یہ الزامات اور امام صاحب کے جوابات ذیل میں درج ہیں، آپ اپنے شرعی فیصلہ سے مطلع فرما کر مشکور فرماویں۔

(کمیٹی کی طرف سے امام صاحب سے کئے گئے سوالات اور امام صاحب کے جوابات)

سوال:- آپ کو جو مکان مسجد کی طرف سے ملا ہے، اس کی چھت پر مرغیوں کے پالنے کی جگہ کس کی اجازت سے بنائی ہے؟

جواب:- (عرصہ ایک سال ہوا جب بنائی تھی)۔ صدر کمیٹی صاحب سے پوچھا تھا، بنانے سے قبل میں صدر صاحب کے گھر گیا ان سے کہا کہ جناب تنخواہ کم ہے، عیال دار ہوں، خیال ہے کہ جس مکان میں رہ رہا ہوں اس کی چھت پر کچھ مرغیوں کی جگہ اپنے خرچ سے بناؤں، آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمانے لگے اچھا روزگار ہے، بسم اللہ کر کے شروع کریں۔ مگر اب جبکہ ایک سال کے بعد یہ مسئلہ اُٹھا تو صدر صاحب انکار کرتے ہیں کہ میں نے کوئی اجازت نہیں دی تھی۔

جناب صدر صاحب قسم کھانے کو تیار ہیں اور امام صاحب بھی قسم اُٹھانے کو تیار ہیں اور کہتے ہیں کہ صدر صاحب کو وہ اجازت یاد نہیں ہے۔

(نوٹ:- مذکورہ مرغیوں کی جگہ بمع اس کے اسباب کے، امام صاحب نے ذاتی خرچ سے کیا تھا، مسجد کے نام وقف کر دیا ہے تا کہ تمام اعتراض ختم ہو۔)

سوال:- مسجد کمیٹی نے آپ کو ذاتی مصرف کے لئے جو بجلی دے رکھی تھی وہ مرغیوں میں آپ نے کس کی اجازت سے جلائی؟

جواب:- مکان کی چھت پر ایک بلب پہلے ہی لگا ہوا تھا اور تقریباً دس گیارہ بجے رات تک ہم اپنے مصرف کی روشنی کے لئے جلاتے تھے، اس بلب سے مرغیوں کی جگہ اور باہر کا کام لیتا رہا اور ایک سال تک یہ بلب اسی طرح جلتا رہا، ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس طرح کرنا بھی اچھا نہیں ہے، اب جبکہ اس سال تین بلب جلانے کی نوبت آئی ہے تو آپ حضرات کے اعتراض کرنے سے پہلے ہی میں حساب کروا رہا تھا کہ ایک بلب ۶۰ واٹ کا اگر روزانہ اتنا جلے تو مہینے میں کتنی بجلی خرچ ہوتی ہے تا کہ رقم، میں مسجد میں جمع کروادوں، مگر اس سے قبل کہ میں حساب کروا کر جمع کرواتا آپ حضرات کی طرف سے سوال ہو گیا، گزشتہ سال جو ایک بلب جلتا رہا کمیٹی چاہے تو چھوڑ دے اور چاہے تو اس کا سارا حساب کر کے مجھ سے رقم وصول کر لے۔

سوال:- گیس کی پکی ہوئی اینٹیں کسی صاحب نے مدرسہ کو دی تھیں، آپ نے اپنی مرغیوں کی جگہ پر کیوں لگائیں؟

جواب:- مدرسہ کے مدرّس کے لئے ایک کمرہ میری نگرانی میں بنایا گیا، جب اس کی بنیاد

کھودی تو شومئ قسمت سے مستری کے منہ سے نکل گیا کہ کنکر اینٹیں جو پڑی ہیں بنیادوں میں لگ جائیں تو اس کمرہ کی بنیاد مضبوط رہے، وہ کنکر اینٹیں میں نے اپنی مرغیوں کی جگہ بنانے کے لئے منگوائی تھیں، میں نے اس وقت مدرسہ کا فائدہ مدِنظر رکھ کر مستری سے کہا کہ میری اینٹوں سے یہ کنکر اینٹ بنیادوں میں لگادو اور مدرسہ کی اینٹوں کی اتنی تعداد میری اینٹوں میں ڈال دو، اس وقت مدرسہ کا فائدہ ذہن میں تھا، مسئلہ کی حقیقت ذہن میں نہیں آئی کہ میں اس طریقے سے مدرسہ کے لئے نہ اپنی اینٹیں دے سکتا ہوں اور نہ اس طرح لے سکتا ہوں، جب اعتراض اُٹھا تب یہ حقیقت کھلی کہ میں غلط قدم اُٹھاچکا ہوں مگر میرے اس طرح کرنے سے مدرسہ کو فائدہ ہوا، کچھ نقصان نہیں ہوا۔

سوال:- مدرسہ کی تعمیر کے سلسلے میں جو لوہا، ریتی، سیمنٹ وغیرہ آیا ہوا ہے اس کو آپ اپنی مرغیوں کی جگہ کے مصرف میں کیوں لائے؟ اور کس کی اجازت سے لائے؟

جواب:- اینٹیں میں نے خود اپنی رقم سے مدرسہ کے آرڈر کے ساتھ منگوائیں رسید میرے پاس ہے (جو دِکھائی گئی)، سیمنٹ اس کام کے لئے میں نے خود خریدا اس کی رسید بھی میرے پاس ہے (جو دِکھائی گئی)، البتہ میرے مزدوروں اور مستری سے ایک موقع پر یہ غلطی ہوگئی وہ یہ کہ میں گھر میں موجود نہیں تھا اور کام کرتے ہوئے سیمنٹ ختم ہوگیا تو مستری اور مزدور اپنی یومیہ مزدوری کے خوف سے مدرسہ کا سیمنٹ اُٹھا کر لے گئے کہ یہ کام بھی امام صاحب کروا رہے ہیں اور مدرسہ کا کام بھی امام صاحب ہی کروا رہے ہیں وہ ادا کردیں گے، میں شام کو جب واپس آیا تو مجھے انہوں نے بتلایا جس پر میں ان پر خفا ہوا، اس سیمنٹ کی جتنی قیمت بنتی تھی اس وقت کے نرخ کے حساب سے وہ رقم مدرسہ کے فنڈ میں جمع کروا کر رسید کاٹ دی وہ رقم کی رسید اور جن مزدوروں نے سیمنٹ اُٹھایا تھا ان کا حلفیہ بیان میرے پاس موجود ہے (جو دِکھایا گیا)۔

سریئے کے ردّی ٹکڑے جو بچتے تھے، مؤذّن کو میں کہہ دیتا تھا کہ کوئی ردّی والا آئے تو اسے دے دیا کرو، ایک موقع پر تھوڑے سے مجھے ضرورت پڑے، میں نے لے لئے اور اندازے سے ان کی قیمت ادا کردی (مگر غلطی یہ ہوئی کہ تول کر نہیں لئے)۔

سوال:- مدرسہ میں جو رقم زکوٰۃ وفطرہ اور چرمِ قربانی کی وصول ہوئی وہ مدرسہ کے اکاؤنٹ میں اب نہیں ہے، وہ مدرسہ کے کس مصرف میں استعمال کی؟

جواب:- مدرسہ کی رقم بینک میں جمع تھی، میں تو تعمیری اخراجات کا بل بنا کر صدر صاحب کے حوالے کردیتا تھا، صدر صاحب اس کو پاس کرتے تھے اور خازن صاحب کے پاس چیک بک تھی وہ چیک بناتے تھے، جس پر صدر صاحب اور دیگر تین آدمیوں میں سے دو کے دستخط ضروری تھے، میں ازخود

تو ایک پائی بھی بینک سے نہیں نکال سکتا تھا، یہ سوال تو ان لوگوں سے پوچھنا چاہئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں نے خیال نہیں کیا کہ جن کی ذمہ داری تھی اور نہ میں بینک سے معلوم کرسکا اور بظاہر اب وہ رقم بھی تعمیری رقم کے ساتھ مدرسہ کی تعمیر میں خرچ ہوگئی، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اب مدرسہ کی تعمیر کے لئے جو رقم آئے گی اس میں سے مذکورہ رقم نکال کر اس فنڈ کو پورا کرلینا۔

مذکورہ بالا سوالات و جوابات کو ملاحظہ فرما کر شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمائیں کہ مذکورہ الزامات کے جوابات پڑھنے کے بعد امام صاحب کس قدر مجرم ہیں؟ آیا ان کو امام رکھنا چاہئے یا نہیں؟ اور ان کے پیچھے نماز صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟

نوٹ:- چھت پر مرغیوں کے لئے جگہ بنانے کے سلسلے میں جو خرچ اُٹھا اس پر کل ..... روپے امام صاحب کے خرچ ہوئے، وہ سارا تعمیری ملبہ بمع تعمیر کے امام صاحب نے مسجد و مدرسہ کو وقف کردیا ہے، اور کمیٹی نے ایک سال ہوا اس پر رضامند ہوکر متفقہ فیصلہ کرلیا تھا، مگر اب پھر فتویٰ نمبرا کے چار سوالوں کے ساتھ گزشتہ دو برس کے الزاموں کو شامل کرکے حقیقت میں مفتی صاحب کے سامنے امام صاحب کے جرموں کو سنگین شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ فقط والسلام!

جواب:- مذکورہ سوالات کے جو جواب امام صاحب نے دیئے ہیں، اگر وہ دُرست ہیں تو امام صاحب بالکل بری الذمہ ہیں اور ان پر کوئی اعتراض واقع نہیں ہوتا۔ جہاں تک پہلے دو سوال کا تعلق ہے وہ تو سوال ہی نامعقول اور غیر منصفانہ ہیں، جو مکان امام صاحب کو رہنے کے لئے دیا گیا ہے اگر وہ اس میں اپنے معاش کے لئے کوئی کام کریں تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے، اسی طرح بجلی کا استعمال اپنی ہر ضرورت کے لئے کرسکتے ہیں، کمیٹی والوں نے اس بارے میں جواب طلبی کرکے زیادتی کی ہے، باقی سوالات تو دُرست ہیں، لیکن جوابات بھی معقول ہیں، اور اگر ان کی صحت ثابت ہوجائے تو امام صاحب پر اعتراض کسی طرح دُرست نہیں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۱۴/۳۰ د)

ایک امام کی امامت سے متعلق تفصیلی استفتاء اور اس کا جواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں، یہ کہ ہماری مسجد میں جو امام صاحب ہیں اور جو کہ مسجد کے ملحق دارالعلوم کے مہتمم بھی ہیں، موصوف کو کمیٹی کی طرف سے دو تنخواہیں ملتی ہیں، ۲۳۵ روپے مسجد کی امامت کے اور ۱۲۵ روپے مہتمم ہونے کے، جملہ ۳۶۰ روپے تنخواہ ملتی ہے، گزشتہ مہینے انتظامیہ کی طرف سے امام صاحب کو ایک اظہارِ وجوہ کا نوٹس

ملا ہے جس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے اور نمبروار جوابات بھی درج ہیں۔

(سوالات از کمیٹی)

۱:- گزشتہ تین ماہ سے اہلِ محلّہ کی مسلسل درخواستیں آرہی ہیں کہ آپ کسی نہ کسی نماز میں روزانہ ضرور غیر حاضر رہتے ہیں، نمازی انتظار کرتے ہیں، پھر کوئی دُوسرا نماز پڑھا دیتا ہے، اس پر آپ کو متوجہ کیا گیا، ہنوز اثر نہ ہوا۔

۲:- باوجود منع کرنے کے آپ نے مسجد کی سیڑھی کرائے پر دی اور رقم وصول کی، نوٹس ملنے پر غلط بیانی تحریر کی۔

۳:- آپ کو معلّمِ مدرسہ کی غیر موجودگی میں صرف تھوڑا وقت پڑھانے کو کہا گیا، مگر آپ نے صاف انکار کردیا۔

۴:- باوجود صدر کمیٹی کے منع کرنے کے آپ نے اپنے مکان (مسجد کی ملکیت جو امام صاحب کو ملا ہوا ہے) پر پائخانہ بنوایا۔

(جوابات از امام صاحب)

۱:- گزشتہ دو ماہ یعنی اپریل ومئی میں کچھ وقتوں کی نمازوں میں غیر حاضری کی وجہ یہ ہے کہ اپریل ۱۹۷۸ء میں دو روزہ ختمِ نبوّت کانفرنس ہوئی (چونکہ میں یہاں حیدرآباد کی مجلس ختمِ نبوّت کا ضلعی ناظم ہوں) اس کے انتظام کے سلسلے میں مجھے کافی بھاگ دوڑ کرنی پڑی، جس کی وجہ سے اکثر نمازوں میں غیر حاضر ہوجاتا تھا (مگر اپنی جگہ قائم مقام مقرّر کرجاتا تھا، اِلّا ماشاء اللہ) مگر صدر منتظم صاحب کو میں نے زبانی کہہ دیا تھا کہ کانفرنس کے انتظامات کے سلسلے میں اکثر نمازوں میں میری غیر حاضریاں ہوں گی، میری غیر موجودگی میں مدرّسِ قرآن قاری صاحب یا مؤذّنِ مسجد صاحب نمازیں پڑھائیں گے، صدر صاحب نے فرمایا کہ اللہ مالک ہے، فکر نہ کریں۔ اور ایک دن کے لئے اپنے ایک ضروری کام کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا، اس کی اطلاع بھی جناب صدر صاحب کو زبانی کرگیا۔ مئی کے شروع میں ایک گھریلو جھگڑے کو نمٹانے ایک دن پھر کراچی جانا پڑا، اس کی اطلاع بھی جناب صدر صاحب کو زبانی کرکے گیا اور صدر نے اجازت دی، اور پھر اس مہینے ہمارے حضرت مولانا غلام حبیب صاحب حلوائی اچانک کراچی تشریف لائے ان سے ملاقات کے لئے کراچی جانا پڑا، اور جب حضرت مولانا حیدرآباد تشریف لائے اور پھر دو روز حضرت کا قیام رہا، میں بھی ساتھ رہا، مگر صدر موصوف سے پوچھ کر گیا۔ علاوہ مذکورہ وجہوں کے، ہفتے میں یوں بھی ایک دو غیر حاضریاں ہوجاتی ہیں کہ لطیف آباد سے شہر گیا واپسی میں وقت پر آنا تو چاہتا ہوں مگر سواری نہیں ملتی یا راستے میں سواری خراب ہوجاتی ہے، کسی شادی و غمی میں جانا پڑتا ہے، بچوں کے علاج و معالجے کے لئے ڈاکٹر کے پاس ہسپتال گیا، وہاں ڈاکٹر کی

مصروفیت کی وجہ سے دیر ہوگئی، وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی غیر حاضریاں کوئی جان بوجھ کر نہیں کی جاتیں، بلکہ ہر امامِ مسجد سے اس قسم کی غیر حاضریاں ہو ہی جاتی ہیں، آئندہ کے لئے وعدہ کرتا ہوں کہ عمداً کوئی غیر حاضری نہیں کروں گا، مگر مذکورہ دُوسری قسم کی غیر حاضری تو ہو ہی جاتی ہے۔

۲:- جب سے مجھے منع کیا گیا ہے میں نے خود کسی کو مدرسہ یا مسجد کی سیڑھی کرایہ پر نہیں دی اور بچوں کو بھی منع کردیا کہ کسی کو نہ دینا، مگر اس آٹھ نو ماہ کے عرصے میں پھر بھی تین دفعہ میری عدم موجودگی میں لوگ سیڑھی لے گئے اور بچوں سے کذب بیانی کرکے لے گئے، اور یہ نکال لے جانا اور چھوڑ جانا میری غیر موجودگی میں رہا، مجھے اس کا کوئی کرایہ وغیرہ نہیں ملا، نام ان کے لکھے دیتا ہوں فلاں فلاں ہیں، ایک مرتبہ کا کرایہ میری غیر موجودگی میں ایک آدمی میرے گھر دے کر گیا، اس کو میں نے جمع کروادیا مدرسہ کی رسیدوں میں دیکھ سکتے ہیں، سیڑھی ہر وقت مسجد میں رہتی ہے کوئی لے جائے یا لے آئے، مجھے کیسے پتہ چل سکتا ہے؟ آپ لوگ ذرا ذرا سی بات پر اپنے امام پر بدگمانی کرتے ہیں اور پیچھے نمازیں بھی پڑھتے ہیں، تعجب ہے!

۳:- اس کا جواب میں نے جنرل سیکریٹری جناب ڈاکٹر صاحب کو زبانی دے دیا اور انہوں نے اس وقت میرا عذر قبول کرلیا تھا۔ وہ عذر یہ تھا کہ میرے ذمہ آٹھ دس آدمی اہلِ خانہ کی کفالت کا بوجھ ہے، اس دور میں مہنگائی میں آٹھ نو سو روپے ماہانہ خرچ ہوجاتے ہیں، جبکہ مسجد اور مدرسہ سے بحیثیت امام ومہتمم مجھے کل ۳۶۰ روپے ماہانہ ملتے ہیں، بقایا اخراجات اس طرح پورا کرتا ہوں کہ صبح ایک اسکول میں جاتا ہوں، ۲۷۵ روپے ادھر سے ملتے ہیں، اور شام بعد نماز ظہر تھوڑا سا آرام کرکے اسکول کے بورڈنگ میں قراءت پڑھانے جاتا ہوں، ۲۰۰ روپے ادھر سے ملتے ہیں، تو اس طرح گھر کا خرچ پورا کرتا ہوں۔

صبح کو بچوں کو پڑھاؤں تو اسکول سے چھٹی ملتی ہے، اور شام کو بورڈنگ جانا بند کروں تو یہ ٹیوشن جاتی ہے۔ آپ میرا یہ عذر قبول کرتے ہوئے مجھے معاف کریں تو احسان ہوگا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کچھ وقت نکال لیتے تو اچھا ہوتا، خیر کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا ابھی کوئی عارضی مدرّس رکھ لیں۔ اصل مدرّس کی میں بھی تلاش کرتا ہوں، آپ بھی کریں، اتنی سی بات ہونے کے بعد میں مطمئن ہوگیا کہ ڈاکٹر موصوف صاحب نے میرا عذر قبول کرلیا ہے۔

۴:- مسجد کے جس مکان میں رہ رہا ہوں اس کے فرش وغیرہ کی اور چھت پر بیت الخلاء کی جس قدر مرمت وغیرہ کی گئی صدر کمیٹی سے اجازت لے کر کروائی ہے، اپنی مرضی سے ایک اینٹ بھی نہیں لگوائی۔ اس مرمت اور چھت پر بیت الخلاء وغیرہ بنانے کی جس کا بھی صدر صاحب انکار کردیں

میں اس کا ہرجانہ دینے کو تیار ہوں۔

مذکورہ سوالات و جوابات میں سے سوال نمبر ایک کے سلسلے میں صدر صاحب نے فرمایا کہ مجھ سے باقاعدہ چھٹیاں نہیں لی گئیں صرف زبانی کلامی مجھ سے کبھی کبھی پوچھ لیا جاتا رہا ہے۔

سوال ۳ کے سلسلے میں جنرل سیکریٹری صاحب نے فرمایا کہ میں بالکل مطمئن نہیں ہوا تھا بلکہ مدرسہ کا مہتمم ہوتے ہوئے اور مہتممی کی تنخواہ لیتے ہوئے مہتمم کا یہ فرض ہوتا ہے جب کوئی مدرّس غیر حاضر ہو، یا اس کو کمیٹی نکال دے تو اس کی جگہ وہ بچوں کو قرآن مجید وغیرہ پڑھائے، لہٰذا مہتمم نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی ہے، ان کو نکال دینا چاہئے۔

سوال ۴ کے سلسلے میں صدر صاحب نے فرمایا کہ فرش کی مرمت کی میں نے اجازت دی تھی، مگر بیت الخلاء کی اجازت نہیں دی، اور کبھی کہتے ہیں کہ جب بار بار مجھے مجبور کیا گیا تو میں مجبوراً ہاں نہ کرتا تو کیا کرتا؟ جبکہ بیت الخلاء بنانے میں کل ۱۵۰ (ایک سو پچاس) روپے خرچ ہوئے۔

اب مذکورہ سوالات و جوابات غور وفکر سے پڑھ کر شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں جوابات سے جلد مشکور فرما کر عنداللہ مأجور ہوں، یعنی:-

۱:- مذکورہ امام صاحب امامت کے قابل ہیں اور ان کے پیچھے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟ یا پھر غیر ذمہ دار سمجھ کر ان کو امامت سے برطرف کردینا چاہئے، (جبکہ پنج وقتہ نمازیوں نے ۹۵ فیصد اپنے دستخط سے ایک یادداشت کمیٹی کے نام بھیجی ہے کہ ہم اپنے امام صاحب پر رضامند ہیں اور ان کے خلاف فیصلہ کرنا ہمارے جذبات کو مجروح کرنا ہوگا)۔

۲:- مہتمم ہوتے ہوئے مہتمم نے بچوں کی پڑھائی سے انکار کیا، اس صورت میں ان کو مہتممی سے الگ کردینا چاہئے یا نہیں؟

۳:- صدر صاحب کے انکار پر یا کسی اور کی بات پر امام صاحب کو جھوٹا اور خائن سمجھ کر نکالنا جائز ہے؟ یا صدر صاحب کی بھول سمجھ کر امام صاحب سے کوئی تعارض نہیں کرنا چاہئے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں امام صاحب نے اپنے اُوپر عائد کردہ الزامات کا جو جواب دیا ہے، اگر وہ واقعہ کے مطابق ہے تو امام صاحب پر اس بارے میں کوئی اعتراض لازم نہیں آتا، اور ان الزامات کی بناء پر انہیں امامت یا مدرسہ کے اہتمام سے سبکدوش کرنا دُرست نہیں۔ کمیٹی کے افراد کو چاہئے کہ وہ امام صاحب کی کماحقہ عزّت کریں اور اس قسم کے الزامات عائد کرکے انہیں پریشان نہ کریں اور امام صاحب کا فرض ہے کہ وہ اپنے مفوضہ فرائض دیانت داری سے ادا کریں۔

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۹/۲۹ھ

﴿فصل فی المسبوق واللاحق﴾
(مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان)

مسبوق، سجدۂ سہو کے لئے امام کے سلام میں شرکت نہ کرے

سوال:- مسبوق، امام کے سجدۂ سہو کے لئے سلام میں شرکت کرے یا نہیں؟

جواب:- جس شخص کی کچھ رکعتیں امام کے ساتھ رہ گئی ہوں اسے سجدۂ سہو کے وقت سلام نہ کرنا چاہئے، البتہ امام کے ساتھ سجدہ کرنا ضروری ہے، کذا فی رد المحتار۔[1] واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۰/۲۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۲۵/۱۸ الف)

مسبوق کی نماز کا طریقہ

سوال:- ایک آدمی نے چار رکعت والی نماز میں دُوسری یا تیسری رکعت میں امام کے ساتھ شرکت کی، باقی نماز کس طرح ادا کرے؟ ایک صاحب نے بتایا ہے کہ باقی رکعتوں میں صرف فاتحہ پر اکتفاء کرنا چاہئے۔ مغرب میں اگر ایک رکعت ہو تو باقیوں میں سورۃ ملائی جائے یا صرف فاتحہ پر اکتفا کیا جائے؟ اس نماز کے بارے میں بھی ان صاحب نے بتایا ہے کہ ایک میں تو سورۃ ملادے، باقی دُوسری رکعت میں فاتحہ پر اکتفاء کیا جائے۔

جواب:- جس شخص کی ایک یا دو رکعت چھوٹ گئی ہو اُسے مسبوق کہتے ہیں، قراءت کے بارے میں اس کا حکم یہ ہے کہ جب امام کے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی نماز پوری کرے گا تو قراءت کے لحاظ سے یہ اس کی پہلی رکعت سمجھی جائے گی، لہٰذا اس رکعت میں وہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ قرآنِ کریم

---

(۱) وفی بدائع الصنائع فصل فی بیان من یجب علیه سجود السهو ج:۱ ص:۱۷۶ (طبع سعید) ثم المسبوق انما یتابع الامام فی السهو (أی فی سجدة السهو بأن سجد هو) دون السلام بل ینتظر الامام حتی یسلم فیسجد فیتابعه فی سجود السهو لا فی سلامه. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۸۲ (طبع ایچ ایم سعید) والمسبوق یسجد مع امامه مطلقًا. وفی الشامیة (قوله والمسبوق یسجد مع امامه) قید بالسجود لأنه لا یتابعه فی السلام.
وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۱۰۰ (طبع ایچ ایم سعید) ثم المسبوق انما یتابع الامام فی السهو لا فی السلام، فیسجد معه ویتشهد .... الخ. وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۹۲ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

کی دُوسری آیات بھی پڑھے گا۔ اگر اس کی دو رکعتیں چھوٹی ہیں تو دُوسری رکعت میں بھی سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی اور سورت پڑھنا اس کے لئے ضروری ہے، اور اگر تین یا چار رکعتیں چھوٹی ہیں تو پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھے گا مگر اس کے بعد والی رکعتوں میں نہیں پڑھے گا۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۹ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۱۴ الف)

مسبوق اپنی نماز کس طرح پوری کرے؟

سوال:- چار رکعتوں میں جس کی ایک رکعت چھوٹ گئی ہو وہ اپنی بقیہ نماز کس طرح پوری کرے؟

جواب:- امام کی نماز ختم ہونے کے بعد اپنی چھوٹی ہوئی رکعت پوری کرلے اور اس میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ پڑھنا بھی ضروری ہے۔[2]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح

محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۴۰۰ الف)

مسبوق کی ثناء سے متعلق شرح وقایہ کی ایک عبارت کی تحقیق

سوال:- شرح وقایہ باب صفة الصلوٰة کی عبارت یہ ہے: ''ان المسبوق یقرأ ولا یثنی فیتعوذ'' اس عبارت میں ''ولا یثنی'' کا کیا مطلب ہے؟ یا لفظ ''لا'' غلط ہے، کیونکہ تعوذ پڑھنا اور ثناء ترک کرنا کسی کتاب میں نظر نہیں آتا؟

جواب:- شرح وقایہ کے دستیاب نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے،[3] اور اس پر آپ کا اعتراض

(۱، ۲) فی الدر المختار ج: ۱ ص: ۵۹۶ (باب الامامة) (والمسبوق من سبقه الامام بها أو ببعضها وهو منفرد) حتی یثنی ویتعوذ ویقرأ، وان قرأ مع الامام لعدم الاعتداد بها لکراهتها، مفتاح السعادة (فیما یقضیه) أی بعد متابعته لامامه فلو قبلها فالأظهر الفساد ویقضی أول صلاته فی حق قراءة واخرها فی حق تشهد، فمدرک رکعة من غیر فجر یأتی برکعتین بفاتحة وسورة وتشهد بینهما وبرابعة الرباعی بفاتحة فقط ولا یقعد قبلها وفی رد المحتار (قوله حتی یثنی .... الخ) تفریع علی قوله: منفرد فیما یقضیه بعد فراغ امامه فیأتی بالثناء والتعوذ، لأنه للقراءة، ویقرأ لأنه یقضی أول صلاته فی حق القراءة کما یأتی وکذا فی الفتاوی الهندیة ج: ۱ ص: ۹۱، ۹۲ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

نیز دیکھئے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۳ ص:۳۷۷، وعزیز الفتاویٰ ص:۲۲۵۔

(۳) شرح الوقایة ج: ۱ ص: ۱۴۴ (طبع ایچ ایم سعید) (محمد زبیر حق نواز)۔

دُرست ہے، مسئلہ یہی ہے کہ مسبوق کو ثناء پڑھنی چاہئے، تمام متونِ معتبرہ میں مسئلہ یوں ہی لکھا ہے۔

قال فی غنیة المتملّی: والمسبوق یأتی بالثناء اذا أدرک الامام حالة المخافتة ثم اذا قام الی قضاء ما سبق یأتی به أیضًا، کذا ذکره فی الملتقط، ووجهه أن القیام الی قضاء ما سبق کتحریمة أخری للخروج به من حکم الاقتداء الی حکم الانفراد.

(۱)
(کبیری ص:۲۹۷، فصل صفة الصلوٰة)

وقال فی الدر المختار: وهو (أی المسبوق) منفرد حتی یثنی ویتعوذ ویقرأ.

(۲)
(شامیة ج:۱ ص:۱۰۴ أواخر باب الامامة)

اس سے معلوم ہوا کہ مسبوق جب جماعت میں شامل ہو (اور امام قراءت نہ کر رہا ہو) اس وقت بھی ثناء پڑھے، اور جب اپنی نماز پوری کرنے کے لئے کھڑا ہو اس وقت بھی، البتہ پہلے موقع پر امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق تعوّذ نہیں پڑھے گا کیونکہ ان کے نزدیک تعوّذ قراءۃ کے تابع ہے، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک دونوں مرتبہ تعوّذ بھی پڑھے گا کیونکہ ان کے نزدیک تعوّذ ثناء کے تابع ہے، اور فتویٰ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول پر ہے: لما فی رد المحتار لکن مختار قاضی خان والهدایة وشروحها والکافی والاختیار وأکثر الکتب هو قولهما أنه تبع للقراءة وبه نأخذ.

(۳)
(شامی ج:۱ ص:۳۲۹ باب صفة الصلوٰة)

بہرحال! شرح وقایہ میں ثناء کی نفی متون کے خلاف ہے، لہٰذا یا تو کتابت کی غلطی سے لفظ "لا" بڑھ گیا ہے یا مصنف شرح وقایہ سے تسامح ہوا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۳/۱/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۵۳/۲۵ الف)

امام کے سلام کی صورت میں مسبوق تشہد پورا کرے گا یا نہیں؟

(عالمگیری اور شامی و امداد الفتاویٰ میں تعارض کی تحقیق)

سوال:- اگر کوئی مسبوق قعدۂ اخیرہ میں شریک ہوا اور تشہد پورا کرنے سے قبل امام نے سلام پھیرا تو وہ مسبوق اپنا تشہد پورا کئے بغیر اپنی نماز ادا کرنے کے لئے کھڑا ہوسکتا ہے یا تشہد پورا کرنا ضروری ہے؟ عالمگیری سے معلوم ہوا کہ پورا کرنا ضروری نہیں ہے، اور امداد الفتاویٰ سے بحوالۂ شامی

---

(۱) غنیة المتملّی ص:۳۰۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).
(۲) فتاوی شامیة ج:۱ ص:۵۹۶ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) شامیة ج:۱ ص:۴۹۰ (طبع ایچ ایم سعید).

معلوم ہوتا ہے کہ پورا کرنا ضروری ہے، جواب سے مطمئن فرمایا جاوے۔

جواب: – عالمگیری اور شامی اور امداد الفتاویٰ میں کوئی تعارض نہیں ہے، سب کا منشأ یہی ہے کہ مسبوق کے لئے تشہد کو پورا کر کے اُٹھنا افضل ہے، لیکن اگر وہ پورا کئے بغیر اُٹھ جائے تو نماز سب کے نزدیک بلا کراہت ہوجاتی ہے۔ علامہ شامیؒ اس مسئلے کو نقل کر کے لکھتے ہیں: ومقتضاه أنه يتم التشهد ثم يقوم ولم أره صريحا ثم رأيته فى الذخيرة ناقلا عن أبى الليث المختار عندى أنه يتم التشهد وان لم يفعل أجزأه. ولله الحمد. (جلد اوّل باب صفة الصلوٰة بيان الرُكوع)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۲ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) فتاویٰ شامية ج:۱ ص:۴۹۶ وفتاویٰ عالمگيرية الفصل السادس فيما يتابع الامام وفيما لا يتابعه ج:۱ ص:۹۰ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه)، امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۳۹. وكذا فى امداد الأحكام ج:۱ ص:۵۵۱ وعزيز الفتاویٰ ص:۲۲۵، وفتاویٰ دار العلوم ديوبند ج:۳ ص:۳۷۹.

﴿فصل فیما یفسد الصلوٰۃ وما یکرہ فیھا﴾

(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)

پہلی صف میں نابالغ بچے کا کھڑا کرنا

سوال:- اگر نابالغ بچے پہلی صف میں کھڑے ہوجائیں تو نماز دُرست ہوجاتی ہے یا مکروہ؟

جواب:- نماز تو ہوجاتی ہے، مگر ایسا کرنا مکروہ ہے۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۲۵ ج)

آدھی آستین والی قمیص میں نماز پڑھنا

سوال:- آدھی آستین والی قمیص پہن کر یا آدھی آستین چڑھا کر نماز پڑھنے سے نماز دُرست ہوگی یا نہیں، بغیر کسی مجبوری کے؟

جواب:- مکروہ ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۳۲ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۵۷۱ (طبع ایچ ایم سعید) (ویصف) الرجال ظاھرہ یعم العبید ثم الصبیان ثم الخناثی ثم النساء، وفی الشامیة تحتہ (قولہ ظاھرہ یعم العبید) أشار بہ الی أن البلوغ مقدم علی الحریة لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم: لیلینی منکم أولوا الأحلام والنھی. وفی الدر المختار أیضًا ج: ۱ ص: ۶۵۶، ۶۵۷ (طبع ایچ ایم سعید) ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسھم والا فیکرہ وفی الشامیة .... والمراد بالحرمة کراھة التحریم .... والا فیکرہ أی تنزیھا.

(۲) اس مسئلے سے متعلق تفصیل کے لئے حضرتِ والا دامت برکاتہم ہی کا مصدقہ، راقم مرتب کا فتویٰ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال:- اگر کوئی آدمی آستین چڑھا کر نماز پڑھے تو کیا یہ جائز ہے؟ کہنیاں کھلی ہوئی ہوں یا نہ کھلی ہوئی ہوں، دونوں صورتوں میں کیا حکم ہے؟

جواب:- اگر کہنیاں کھلی ہوئی ہوں تو اس طرح نماز پڑھنا مکروہ ہے، اور اس سے کم ہو تو اس میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک مکروہ نہیں، کیونکہ فقہی دلائل میں "مرفقین" "کہنیوں تک" کے الفاظ آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کم ہو تو مکروہ نہیں۔ وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۶۴۰ (طبع ایچ ایم سعید) وکرہ کفہ أی رفعہ ولو لتراب کمشمر کم أو ذیل وفی الشامیة وقید الکراھة فی الخلاصة والمنیة بأن یکون رافعًا کمیہ الی المرفقین وظاھرہ أنہ لا یکرہ الی ما دونھما.

(باقی اگلے صفحہ پر)

تصویر والے کمرے میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- جس کمرے میں کسی مرد یا عورت کا فوٹو آویزاں ہو تو اس جگہ نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- جس مکان میں کسی ذی رُوح کی تصویر لگی یا لٹکی ہو اس میں نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، اور سب سے زیادہ کراہت اس تصویر میں ہے جو نمازی کے سامنے جانبِ قبلہ میں ہو، پھر وہ جو نمازی کے سر پر معلق ہو، پھر وہ جو اس کے داہنے ہو، پھر وہ جو بائیں جانب ہو، اور سب سے کم کراہت اس میں ہے کہ نمازی کے پیچھے کسی دیوار وغیرہ میں ہو، اور اگر تصویر قدموں کے نیچے ہو تو اس وقت بھی بعض فقہاء کے نزدیک کراہت ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے، لہٰذا پرہیز اس سے بھی کرنا چاہئے۔

کذا فی رد المحتار ج: ۱ ص: ۴۳۵، باب ما یفسد الصلوٰۃ ویکرہ فیھا۔[1] واللہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۹۶/۲۷ و)

محاذات کی دو صورتوں کی تفصیل اور حکم

سوال:- مرسلہ فتویٰ نمبر ۳۵۱/۴۵ محرّرہ مفتی محمد صابر صاحب مدظلہم بتاریخ ۱۳۸۷/۱۲/۲۲ھ میں، آنجناب نے جواب نمبر ۲ میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر بیوی اتفاقیہ میاں کے ساتھ نماز پڑھے اور مرد کے ٹخنے اور پنڈلی سے اپنے یہ اعضاء ذرا پیچھے کر کے کھڑی ہو تو کسی کی نماز فاسد نہیں ہوگی، یعنی ہو جائے

(گزشتہ سے پیوستہ)..... اور بعض حضرات کے نزدیک یہ صورت بھی مکروہ ہے، کیونکہ ان حضرات کے نزدیک آستین چڑھا کر نماز پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے۔ وفی الشامیۃ وقید الکراھۃ فی الخلاصۃ والمنیۃ بأن یکون رافعا کمیہ الی المرفقین وظاھرہ أنہ لا یکرہ الی ما دونھما. قال فی البحر والظاھر الاطلاق لصدق کف الثوب علی الکل ونحوہ فی الحلیۃ وکذا قال فی شرح المنیۃ الکبیر ان التقیید بالمرفقین اتفاقی قال وھذا لو شمرھما خارج الصلوٰۃ ثم شرع فیھا کذلک وراجع أیضًا خلاصۃ الفتاویٰ ج: ۱ ص: ۵۸. نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج: ۳ ص: ۴۲۸ (طبع جدید دار الاشاعت) و امداد الاحکام ج: ۱ ص: ۵۶۱ و ۵۶۳، و امداد المفتین ص: ۳۴۱، ۳۴۲۔

لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ بلاضرورت آستین چڑھا کر نماز نہ پڑھی جائے اور اگر پہلے سے وضو وغیرہ کے لئے آستین چڑھائی ہوئی ہوں تو بہتر یہ ہے کہ عملِ قلیل سے نماز میں آستین نیچے کر لے، مثلاً کچھ رُکوع، کچھ قومہ میں اور کچھ سجدہ میں نیچے کر لے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	محمد زبیر حق نواز
بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ	بندہ محمود اشرف غفر اللہ لہٗ	بندہ عبد الرؤف سکھروی	دار الافتاء دار العلوم کراچی ۱۴
۱۴۲۳/۷/۲۵ھ	۱۴۲۳/۷/۲۴ھ	۱۴۲۳/۷/۲۶ھ	۱۴۲۳/۷/۲۳ھ

(۱) فی التنویر وشرحہ الدر المختار ج: ۱ ص: ۶۴۸ و (کرہ) أن یکون فوق رأسہ أو بین یدیہ أو بحذائہ یمنۃ أو یسرۃ أو محل سجودہ (تمثال) .... واختلف فیما اذا کان التمثال خلفہ، والأظھر الکراھۃ وفی الشامیۃ (الأظھر الکراھۃ) لکنھا فیہ أیسر، لأنہ لا تعظیم فیہ ولا تشبہ معراج. وفی الدر المختار أیضًا ج: ۱ ص: ۶۵۲ (لا یکرہ صلوٰۃ) علی بساط فیہ تماثیل أن لم یسجد علیھا) لما مرّ. وفی الشامیۃ تحتہ (قولہ لما مر) علۃ لعدم الکراھۃ وھو کونھا مھانۃ ح.

گی، لیکن بہشتی زیور میں یہ لکھا ہے کہ اگر بیوی میاں کے پیچھے نماز پڑھے تو بالکل پیچھے (ایک صف کے فاصلے پر) کھڑی ہو ورنہ اس کی نماز نہیں ہوگی اور مرد کی نماز بھی برباد ہوگی۔

دونوں صورتوں کی الگ الگ کیا نوعیت ہے کہ پہلی صورت میں عورت (ایک مقتدی کی طرح) صرف مرد کے ٹخنے اور پنڈلی سے ذرا پیچھے ہوکر نماز پڑھ سکتی ہے، اور بہشتی زیور کی رُو سے اسے کم از کم ایک صف کا فاصلہ چھوڑ کر کھڑا ہونا چاہئے؟

جواب:- محاذات کی صحیح تفسیر وہی ہے کہ عورت کا ٹخنہ اور پنڈلی مرد کے کسی عضو کے برابر ہو، لہٰذا اگر کوئی عورت مرد سے اتنے پیچھے کھڑی ہو کہ دونوں کے ٹخنے اور پنڈلی بالکل برابر میں نہیں رہتے، خواہ عورت کے پاؤں کا کوئی حصہ مرد کے پاؤں کے کسی حصے کے برابر میں ہو تو اصح قول کی بناء پر نماز فاسد نہیں ہوگی جس کی صورت یہ ہے:- ..... عورت ▭ ▭ مرد

یہ صورت اصح قول کی بناء پر مفسد نہیں ہے، البتہ بعض فقہاءؒ نے ٹخنے اور پنڈلی کے بجائے پورے قدم کی محاذات کا اعتبار کیا ہے، لہٰذا ان کے نزدیک مذکورہ صورت مفسد ہے، اور جواز کی صورت ان کے نزدیک یہ ہے:- ..... عورت ▭ ▭ مرد

بہشتی زیور میں احتیاطاً اس آخری قول کو اختیار کر کے بالکل پیچھے کھڑے ہونے کا کہا گیا ہے، جس کا مطلب ایک صف پیچھے کھڑا ہونا نہیں ہے بلکہ اتنے پیچھے کھڑا ہونا ہے کہ عورت کے قدم کا کوئی حصہ مرد کے قدم کے کسی حصے کے برابر نہ ہو۔

قال الشامی عن الزیلعی: المعتبر فی المحاذات الساق والکعب فی الأصح، وبعضهم اعتبر القدم اهـ. فعلٰی قول البعض لو تأخرت عن الرجل ببعض القدم تفسد وان کان ساقها وکعبها متأخرًا عن ساقه وکعبه، وعلی الأصح لا تفسد وان کان بعض قدمها محاذیًا لبعض قدمه بأن کان أصابع قدمهما عند کعبه مثلًا تأمل. (ثم قال بعد أسطر) .... المانع لیس محاذاة أی عضو منها لأی عضو منه، ولا محاذاة قدمه لأی عضو منها بل المانع محاذاة قدمها فقط لأی عضو منه.(۱)

احتیاط بہرحال بہشتی زیور کے قول پر عمل کرنے میں ہے تاکہ باتفاق نماز دُرست ہوجائے، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا بہشتی زیور کے قول پر عمل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت ایک صف پیچھے کھڑی ہو بلکہ اس کا مطلب اتنے پیچھے کھڑا ہونا ہے کہ اس کے قدم کا کوئی حصہ مرد کے کسی عضو کے مقابل میں نہ آئے۔ المرأة اذا صلت مع زوجها فی البیت ان کان قدمها بحذاء قدم الزوج لا

---

(۱) فتاوی شامیة ج: ۱ ص: ۵۷۲، وکذا فی التاتارخانیة ج: ۱ ص: ۶۲۲، ۶۲۳.

تجوز صلاتها بالجماعه، وان كان قدماها خلف قدم الزوج الا أنها طويلة تقع رأس المرأة فی السجود قبل رأس الزوج جازت صلاتهما لأن العبرة للقدم۔ (شامی ج:۱ ص:۵۳۵)۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۳۲۷ الف)

برآمدے میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں

سوال:- بیرونِ مسجد برقی پنکھا لگا ہوا ہے، یعنی برآمدے میں گرمی کے دنوں میں امام صاحب باہر نماز پڑھاتے ہیں سوائے جمعہ کے دن کے، جمعہ محراب میں اندرون مسجد میں پڑھاتے ہیں، کیا اس میں کوئی کراہت ہے یا نہیں؟

جواب:- کوئی کراہت نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۶ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۰۶ الف)

بغیر سترہ کے نمازی کے آگے سے گزرنے کی تفصیل

سوال:- نمازی کے سامنے سے گزرنے کی جیسا کہ حدیث شریف میں سخت ممانعت آئی ہے، حسبِ ذیل صورتوں میں گزرنے والے کے لئے کیا حکم ہے؟

الف:- اگر نمازی بحالتِ قیام یا قومہ سجدہ گاہ پر نظر کئے ہوئے ہے تو ضرورت مند کتنا فاصلہ چھوڑ کر گزرے؟

ب:- اگر اس کی نظر بحالتِ مذکورہ سجدہ گاہ سے آگے پڑ رہی ہو؟

ج:- اگر نمازی رُکوع یا سجدے میں ہے؟

د:- اس مسئلے میں چھوٹی اور بڑی مسجد کا الگ الگ کیا حکم ہے؟ اور کم از کم کتنی بڑی مسجد کو ''مسجدِ کبیر'' کہا جائے گا؟

جواب:- الف:- اگر مسجد چھوٹی سی ہے تو نمازی کے آگے سے بغیر سترہ کے بالکل نہیں

---

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۱ ص:۵۷۲ (طبع ایچ ایم سعید).

گزرنا چاہئے، اور اگر مسجد بڑی ہے یا

ب، ج:- کھلی جگہ میں نماز پڑھ رہا ہے تو اتنے آگے سے گزرنا جائز ہے کہ اگر نماز پڑھنے والا سجدے کی جگہ نظر رکھے تو اسے گزرنے والا نظر نہ آتا ہو، جو تقریباً سجدے کی جگہ سے دو گز کے فاصلے تک ہوتا ہے۔ رُکوع، سجدہ، قیام، قومہ سب کا ایک ہی حکم ہے۔ اور قیام کی حالت میں اگر نماز پڑھنے والا سجدے کی جگہ سے آگے دیکھ رہا ہو تب بھی گزرنے کے لئے فاصلہ اتنا ہی معتبر ہوگا جو اُوپر بیان کیا گیا۔ لما فی رد المحتار: ومقابله ما صححه التمرتاشی وصاحب البدائع واختاره فخر الاسلام ورجحه فی النهاية والفتح أنه قدر ما يقع بصره على المار لو صلّى بخشوع أی راميا ببصره الى موضع سجوده۔ (شامی)۔[1]

د:- تقریباً چالیس ہاتھ سے کم رقبے کی مسجد ''چھوٹی'' کہلائے گی، اور اس سے زائد بڑی۔

قال الشامیؒ: قوله ومسجد صغير هو أقل من ستين ذراعًا، وقيل: من أربعين، وهو المختار كما أشار اليه فی الجواهر. (قهستانی، شامی)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کندھوں تک بال بڑھا کر رکھنے والوں کی نماز ہوتی ہے یا نہیں؟

سوال:- جن لوگوں نے بال کندھوں تک بڑھا کر رکھے ہوئے ہیں تو کیا ان لوگوں کی نماز ہوجاتی ہے؟

جواب:- نماز تو ہوجاتی ہے، مگر ایسے بال رکھنا جس سے غیر مسلموں یا فساق سے مشابہت پیدا ہو، جائز نہیں۔[3]

واللہ اعلم
۱۳۹۷/۱/۱۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۸/ ۲۸ الف)

(۱، ۲) رد المحتار باب ما يفسد الصلوٰة .... الخ. ج: ۱ ص: ۶۳۴ (طبع سعيد).

(۳) وفی سنن أبی داوٗد، باب فی لبس الشهرة ج: ۲ ص: ۲۰۳ (طبع ايچ ايم سعيد) عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم. (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی القراءۃ ومسائل زلۃ القاری﴾

(نماز میں قراءت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)

سورۂ فاتحہ کے بعد "رَبّ اغفر لی" کہنا

سوال:- "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کے بعد "رَبِّ اغْفِرْ لِیْ" کہنا کیسا ہے؟

جواب:- "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کے بعد "امین"[1] کے سوا کوئی جملہ نصوص سے ثابت نہیں، اس لئے "امین" کے سوا کوئی جملہ نہ کہنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۴۲۷/ ۱۸ الف)

بیماری کی وجہ سے نماز میں الفاظ ادا نہ کرسکے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- اگر کسی شخص کو ایسی بیماری یا کمزوری کی حالت ہو کہ بیٹھ کر نماز تو ادا کرسکے لیکن زبان سے الفاظ ادا کرنے سے سینے میں درد ہوتا ہو تو ایسی حالت میں وہ کس طرح الفاظ ادا کرے؟

جواب:- نماز کے لئے تو یہ ضروری ہے کہ جب تک ہونٹوں اور زبان کو حرکت دینے پر قدرت ہے، ان سے الفاظ ادا کئے جائیں خواہ معذوری کی وجہ سے اتنے آہستہ ہوں کہ خود بھی نہ سن سکے[2] اور اتنے آہستہ پڑھنے سے اُمید ہے کہ کوئی معتد بہ تکلیف بھی نہیں ہوگی، معمولی درد کو برداشت کرنا

---

(۱) وفي الصحيح للامام مسلمؒ ج: ۱ ص: ۱۷۶ باب التسميع والتحميد والتأمين (طبع قديمی كتب خانه) عن أبی هريرةؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اذا أمّن الامام فأمنوا فانه من وافق تأمينه تأمين الملٰئكة غفر له ما تقدم من ذنبه. قال ابن شهاب كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: امين.

(۲) وفی مجمع الأنهر ج: ص: ۱۵۷ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) وأدنى المخافتة اسماع نفسه فقط وهو قول الهندوانی وعليه أكثر المشائخ (فی الصحيح) احتراز عما قيل: ان أدنى الجهر اسماع نفسه، وأدنى المخافتة تصحيح الحروف، وهو قول الكرخی، وصححه فی البدائع .... الخ. وفی الدر المختار ج: ۱ ص: ۵۳۴ وأدنى المخافتة اسماع نفسه، فی "الشامية" فشرط الهندوانی والفضلی لوجودها خروج صوت يصل الٰی أذنه وبه قال الشافعی، وشرط بشر المريسی وأحمد خروج الصوت من الفم وان لم يصل الى أذنه، لٰكن بشرط كونه مسموعا فی الجملة حتى لو أدنى أحد صماخه الٰی فيه يسمع، ولم يشترط الكرخی وأبوبكر البلخی السماع واكتفيا بتصحيح الحروف .... ثم انه اختار فی الفتح أن قول الهندوانی وبشر متحدان بناءً على أن الظاهر سماعه ..... (باقی اگلے صفحے پر)

چاہئے، البتہ عام ذکر واذکار دِل دِل میں بھی ادا کئے جاسکتے ہیں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱۲/۳۰ھ

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۳/۱۹ الف)

فاتحہ خلف الامام کا حکم

سوال:- کیا امام کے پیچھے الحمد للہ نہ پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی؟

جواب:- حنفی مسلک میں امام کے پیچھے کسی قسم کی قراءت کرنا خواہ وہ سورۂ فاتحہ ہو یا بعد کی سورت، جائز نہیں ہے، لیکن اگر غلطی سے کوئی شخص پڑھ لے تو اس کی نماز ہوجاتی ہے، فاسد نہیں ہوتی۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۶۳ الف)

ض کا مخرج

سوال:- حرفِ ضاد بعض لوگ مشابہ بدال پڑھتے ہیں، اور بعض مشابہ بظاء، اور بعض ڈال پڑھتے ہیں، صحیح کون سا ہے؟

جواب:- ضاد، ایک مستقل حرف ہے، اس کا مخرج دال، ذال یا ظاء سب سے علیحدہ ہے،

(گزشتہ سے پیوستہ)..... بعد وجود الصوت اذا لم یکن مانع .... وذکر أن کلا من قولی الهندوانی والکرخی مصححان وان ما قاله الهندوانی أصح وأرجح لاعتماد أکثر علمائنا علیه وفی البحر الرائق ج: ۱ ص: ۳۳۶ (طبع ایچ ایم سعید) فذهب الکرخی الی أن أدنی الجهر أن یسمع نفسه وأدنی المخافتة تصحیح الحروف وفی البدائع ما قاله الکرخی أقیس وأصح. نیز دیکھئے: منحة الخالق علی هامش البحر الرائق ج: ۱ ص: ۳۳۶ اور کوئی شخص امام کرخیؒ کے قول کے مطابق اگر صرف حروف کی صحیح ادائیگی کرے اگرچہ خود کو بھی سنائی نہ دے تب بھی اس کی نماز ہوجائے گی، تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۵۵۔

(۱) اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لئے درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:

۱:- امام الکلام فی القراءة خلف الامام، از علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ۔

۲:- الدلیل المحکم فی ترک القرائة للمؤتم، از حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ۔

۳:- هدیة المعتدی فی قرائة المقتدی (تالیفاتِ رشیدیہ، ادارۂ اسلامیات)، از حضرت گنگوہی رحمہ اللہ۔

۴:- الدلیل القوی علیٰ ترک القرائة للمقتدی، از محدث احمد علی سہارنپوری قدس اللہ سرہٗ۔

۵:- فاتحة الکلام فی القرائة خلف الامام، از حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ۔

۶:- أحسن الکلام فی ترک القرائة خلف الامام، از حضرت مولانا سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم۔ (محمد زبیر)

جوشخص ضاد کو اپنے اصلی مخرج سے ادا کرنے پر قادر ہو اس کے لئے اسے دال، ذال، یا ظاء پڑھنا جائز نہیں، اور جو شخص اس پر قادر نہ ہو اسے کسی ماہر قاری سے مشق کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اور جب تک اس کوشش میں کامیاب نہ ہو اسے ظاء کے مشابہ پڑھنا دال کے مشابہ پڑھنے سے بہتر ہے، لیکن نماز دونوں صورتوں میں ہوجائے گی۔ (۱)

واللہ سبحانہ اعلم

الجواب صحیح

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۳۹۰/۱۲/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۲۱ الف)

ضؔ کا مخرج

سوال: – ''وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' جس کا مخرج زبان کا کنارہ ہے، ڈاڑھوں کے ساتھ ہے، کیا ''ولا الظالین'' کے مشابہ پڑھ سکتے ہیں یا ''ولا الدالین'' موٹا کر کے پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: – ضاد کا مخرج، دال اور ظاء دونوں سے الگ ہے، اور وہ یہ کہ زبان کا کنارہ دائیں بائیں دونوں ڈاڑھوں کو چھولے، اس کی آواز بھی دال اور ظاء سے الگ ہے، لیکن ظاء کے ساتھ اس کی مشابہت دال کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ (۲)

واللہ اعلم

۱۳۹۹/۱۰/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۶۸۰ د)

''وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ'' کے بجائے ''وَالْمُشْرِكِيْنَ'' پڑھنے کا حکم

سوال: – زید نے نماز میں قراءت کی، اور قراءت میں آیت: ''مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ'' (پارہ نمبر۱، آیت نمبر۱۰۵، سورۂ بقرہ) میں زید نے ''وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ'' کی جگہ ''وَالْمُشْرِكِيْنَ'' پڑھا، کیا اس سے نماز ادا ہوگئی یا نہیں؟

جواب: – مذکورہ صورت میں نماز ہوگئی، (۳) دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۵۳ ب)

(۱، ۲) وفی الهندية ج: ۱ ص: ۷۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) وان كان لا يمكن الفصل بين الحرفين الا بمشقة كالظا مع الضاد .... اختلف المشائخ، قال أكثرهم لا تفسد صلاته، هكذا فی فتاوىٰ قاضی خان وكثير من المشائخ أفتوا به. نیز ضؔ کے مخرج سے متعلق تفصیل کے لئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا رسالہ ''رفع التضاد عن حكم الضاد'' جواہر الفقہ ج:۱ ص: ۳۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفی الهندية ج: ۱ ص: ۷۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) ومنها حذف حرف، ان كان الحذف على سبيل الايجاز والترخيم فان وجد شرائطه .... لا تفسد صلاته، وان لم يكن على وجه الايجاز والترخيم فان كان لا يغيّر المعنى لا تفسد صلاته .... الخ.

تین چھوٹی آیات کے برابر آدھی آیت پڑھنے سے نماز ہوجائے گی

سوال:- نماز میں قرآن کی ایسی بڑی آدھی آیت جو چھوٹی تین آیتوں کے برابر ہو، اسے پڑھنے سے نماز ہوگئی یا نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تو کیا اعادہ کرنا ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں نماز ہوگئی، اعادے کی ضرورت نہیں۔ لأن نصف الأية الطويلة اذا كان يزيد علىٰ ثلاث ايات قصار يصح علىٰ قولهما، فعلىٰ قول أبى حنيفةؒ المكتفى بالأية أولىٰ، كذا فى رد المحتار۔(۱)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۹۵ ج)

نماز میں مجہول قراءت کرنا

سوال ۱:- لورالائی کی جامع مسجد کا امام مجہول پڑھتا ہے، اس لئے کسی کی نماز نہیں ہوتی، شرعاً کیا حکم ہے؟ ۲:- ض کی جگہ ڈ پڑھتا ہے، اس کا حکم کیا ہے؟ ۳:- اور اس مسئلے میں اگر کسی امام صاحب نے غلط مسئلہ بتایا ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب ۱:- مجہول پڑھنا غلط ہے، اس کی اصلاح کی کوشش ضروری ہے، مگر اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اگر کوئی اور حافظ نہ ملتا ہو تو مجبوراً اسی کے پیچھے پڑھ لیں۔

۲:- ضاد کو صحیح مخرج سے نکالنے کی کوشش بھی واجب ہے، تاہم جس شخص سے کوشش کے باوجود صحیح مخرج سے نہ نکلے اس کی نماز صحیح قول کی بناء پر ہوجاتی ہے،(۲) جن امام صاحب نے اس کے خلاف مسئلہ بتایا انہوں نے غلط کہا، لیکن محض اس بناء پر ان کے پیچھے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۱/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۶۹ ج)

---

(۱) رد المحتار ج:۱ ص:۵۳۷ (طبع سعيد) وفى الشامية أيضًا ج:۱ ص:۵۳۸ لو قرأ اية طويلة فى الركعتين كاية الكرسى أو اية المداينة البعض فى ركعة والبعض فى ركعة اختلفوا فيه علىٰ قول أبى حنيفة قيل لا يجوز لأنه ما قرأ اية تامة فى كل ركعة وعامتهم علىٰ أنه يجوز. وكذا فى الهندية ج:۱ ص:۷۸ (طبع رشيديه كوئته).
نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۹۰۔

(۲) وفى غنية المتملى شرح المنية ص:۴۷۶ وان لم يكن الا بمشقة كالظاء مع الضاد، والصاد مع السين، والطاء مع التاء فقد اختلفوا، فأكثرهم علىٰ عدم الفساد لعموم البلوى. وكذا فى الهندية ج:۱ ص:۷۹. نیز دیکھئے: عزیز الفتاویٰ ص:۲۳۷، نیز ض کے مخرج سے متعلق تفصیل کے لئے جواہر الفقہ ج:۱ ص:۳۲۵ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

بیچ میں چھوٹی سورت چھوڑ کر قراءت کرنا

سوال:- امام صاحب وتروں میں رمضان المبارک کے اندر پہلی رکعت میں "قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ"، دُوسری میں "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ" اور تیسری میں سورۂ اِخلاص پڑھتے ہیں، اور "تَبَّتْ یَدَا" چھوڑ دیتے ہیں، یہ کہاں تک دُرست ہے؟

جواب:- اس طرح بیچ میں کوئی سورت چھوڑ کر قراءت کرنا مکروہ ہے، بشرطیکہ قصداً ایسا کیا گیا ہو، اور سہواً ہو تو کراہت بھی نہیں ہے، اور نماز ہر صورت میں ہوگئی، نہ سجدۂ سہو واجب ہے، نہ اعادہ۔

لما فی الدر المختار: ویکرہ الفصل بسورۃ قصیرۃ.(۱)

وفی رد المحتار: الفصل بالقصیرۃ انما یکرہ اذا کان عن قصد، فلو سھوًا فلا، کما فی شرح المنیۃ (شامی قبیل باب الامامۃ ج:۱ ص:۳۶۷)۔(۲)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۴۸ د)

۱:- فجر کی پہلی رکعت کو دُوسری رکعت سے طویل کرنا

۲:- قراءت میں متعدّد غلطیوں کا حکم

سوال ۱:- امامِ مسجد نے فجر کی جماعت میں پہلی رکعت میں سورۂ مزمل کی چھ آیات از: "یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ" الی "فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا" پڑھیں، دُوسری رکعت میں دُوسرا رُکوع سورۂ مذکور کا جو ایک لمبی آیت ہے پڑھ کر سجدہ کیا، کیا نماز ہوگئی؟ لوگ کہتے ہیں کہ پہلی رکعت سے دُوسری رکعت میں لمبی سورت نہیں پڑھنی چاہئے، اس کی کیا حقیقت ہے؟

۲:- امام صاحب نے پہلی رکعت میں سورۂ والعصر پڑھتے ہوئے: "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کی جگہ سہواً "فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ" پڑھا، جب خیال آیا تو "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" پڑھنا شروع کر دیا، پھر دُوسری رکعت میں سورۂ قریش کی تلاوت کی سجدۂ سہو کر کے تمام ختم کر لی، یہ نماز دُرست ہوئی یا نہیں؟

جواب ۱:- فجر کی نماز میں پہلی رکعت کو دُوسری رکعت سے زیادہ طویل کرنا مستحب ہے اور اس کے برعکس مکروہِ تنزیہی ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جو امام صاحب نے پہلی رکعت میں مختصر اور

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۱۴۶ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) شامیۃ ج:۱ ص:۵۴۷ (طبع سعید).

دُوسری رکعت میں اس کے مقابلے میں طویل قراءت کی اس سے مکروہِ تنزیہی کا ارتکاب ہوا، لیکن نماز صحیح ہوگئی۔

لما فی الدر المختار: (وتطال أولی الفجر علی ثانیتها) (واطالة الثانیة علی الأولیٰ یکره) تنزیها (اجماعًا ان بثلاث آیات) ان تقاربت طولا وقصرًا، والا اعتبر الحروف والکلمات، واعتبر الحلبی فحش الطول لا عدد الآیات۔ (شامی ج:۱ ص:۳۶۴)۔[1]

۲:- نماز تو صحیح ہوگئی، لیکن امام صاحب نے چند غلطیاں کیں، ایک تو جب انہیں یاد آیا تھا تو سورۂ عصر ہی کی تکمیل کرنی چاہئے تھی انہوں نے اس کو ادھورا چھوڑ دیا، دُوسرے سورۂ عصر کے بعد سورۂ فیل شروع کردی، اور اس طرح ایک سورت یعنی سورۂ ہمزہ کو بیچ میں چھوڑ کر قراءت کی، یہ بھی مکروہ ہے۔

أما فی رکعة فیکره الجمع بین سورتین بینهما سور أو سورة۔ (شامی ج:۱ ص:۳۶۷)۔[2]

تیسرے ان غلطیوں پر سجدۂ سہو کیا، حالانکہ ان صورتوں میں سجدۂ سہو نہیں ہے، بہرحال نماز ہوگئی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۷۲ ج)

---

(۱) الدر المختار ج:۱ ص:۵۴۱، ۵۴۲ (طبع ایچ ایم سعید). وفی ملتقی الأبحر مع مجمع الأنهر ج:۱ ص:۱۵۹ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) وتطال الأولیٰ علی الثانیة فی الفجر فقط، وعند محمد فی الکل، وفی مجمع الأنهر تحته: بیان للسنة، وهذا یعنی اطالة القراءة فی الرکعة الأولیٰ علی الثانیة فی الفجر متفق علیه للتوارث، ولما فیه من اعانة المؤمنین علیٰ ادراک فضیلة الجماعة، لأنه وقت نوم وغفلة. وفی الهندیة ج:۱ ص:۷۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) واطالة القراءة فی الرکعة الأولیٰ علی الثانیة من الفجر مسنونة بالاجماع.

(۲) شامیة ج:۱ ص:۵۴۶ (طبع ایچ ایم سعید) وفی مراقی الفلاح ج:۱ ص:۴۷۵ و ۴۷۷ (طبع مکتبة علم الحدیث دمشق) ویکره تکرار السورة فی رکعة واحدة من الفرض .... والجمع بین سورتین بینهما سور أو سورة. وفی حاشیة الطحطاوی علیٰ مراقی الفلاح (قوله والجمع بین سورتین .... الخ) أی فی رکعة واحدة لما فیه من شبهة التفضیل والهجر (قوله لا یکره هذا فی النوافل) یعنی القراءة منکوسا والفصل والجمع وهذا کله فی الفرائض. (ص:۲۱۲). وفی الهندیة ج:۱ ص:۷۸ (مکتبه رشیدیه، کوئٹه) واذا جمع بین سورتین بینهما سور أو سورة واحدة فی رکعة واحدة یکره .... الخ.

﴿فصل فی السنن والنوافل﴾
(سنن اور نوافل نمازوں کے بیان میں)

نمازِ اِشراق و چاشت دو، دو رکعت کر کے پڑھ سکتے ہیں

سوال:- نمازِ اِشراق و چاشت ۔۔، دو رکعت کر کے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- پڑھ سکتے ہیں، البتہ چاشت کی نماز چار رکعت پڑھنا بہتر ہے۔ واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۷۶۲ الف)

تحیۃ المسجد واجب ہے یا مستحب؟

سوال:- بخاری شریف کی ایک حدیث کا حوالہ دے کر تحیۃ المسجد کی دو رکعت نماز، بیٹھنے سے پہلے ادا کرنے کے لئے زور دے کر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ نہ ادا کرنے پر سخت گناہ کا مرتکب قرار پائے گا، یعنی تقریباً واجب کا درجہ دیا جاتا ہے، اہل السنّت والجماعت کا اس پر کیا عمل اور فتویٰ ہے؟

جواب:- ''تحیۃ المسجد'' پڑھنا مستحب ہے، اس کے چھوڑنے والے کو گنہگار نہیں کہا جاسکتا، حدیث کا مطلب صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے؟ اور صحابہ رضی اللہ عنہم تحیۃ المسجد کو واجب نہیں سمجھتے تھے۔ بخاری شریف کی حدیث میں اَمر اِستحباب کے لئے ہے۔ قال ابن بطال: اتفق أئمة الفتویٰ علیٰ أنه محمول علی الندب، والارشادِ مع استحبابهم الرکوع لکل من دخل المسجد لما روی أن کبار أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم یدخلون المسجد ثم یخرجون ولا یصلون۔ (حاشیہ بخاری ج:۱ ص:۶۳)۔[1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۹۵ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه)، وفی التنویر مع شرحه باب الوتر مطلب تحیة المسجد ج:۲ ص:۱۸ (طبع ایچ ایم سعید) (ویُسن تحیة) رب المسجد، وهی رکعتان .... الخ. وفی الشامیة .... والحاصل أن المطلوب من داخل المسجد أن یصلی فیه لیکون ذلک تحیة لربه تعالیٰ .... الخ.

سنتِ مؤکدہ کا ترک

سوال:- سنت نمازوں میں سنتِ مؤکدہ کے جان بوجھ کر نہ ادا کرنے پر عذاب وسزا سے متعلق احادیث یا ان کا حوالہ لکھ دیں۔

جواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر مداومت فرمانا، اس کے ترک کے ناجائز ہونے کی کافی دلیل ہے، اور ترکِ سنت پر جو وعیدیں حدیث میں آئی ہیں وہ سب اس کی دلیل ہیں۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۷ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۹۵ الف)

جمعہ کی سنتوں کی تعداد

سوال:- ظہر اور جمعہ کی کل کتنی رکعتیں ہیں؟ کیا ان کی تعداد میں ائمہ کا اختلاف ہے؟

جواب:- جہاں تک فرض نماز کی رکعتوں کا تعلق ہے، ان کی تعداد میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سب کے نزدیک ظہر کی چار رکعتیں اور جمعہ کی دو رکعتیں ہوتی ہیں۔ ظہر کی سنتوں کے بارے میں بھی حنفیہ کے نزدیک اتنی بات متفق علیہ ہے کہ ان کی تعداد چھ ہے، چار فرضوں سے پہلے اور دو فرضوں کے بعد۔

اب جمعہ کا معاملہ رہ جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کا مشہور مذہب اس معاملے میں یہ ہے کہ جمعہ میں چار رکعتیں فرض نماز سے پہلے اور چار رکعتیں فرض نماز کے بعد سنتِ مؤکدہ ہیں۔[2] ابنِ ماجہ وغیرہ کی

---

(۱) وفی جامع الترمذی باب ما جاء فیمن صلی فی یوم ولیلة ثنتی عشرة رکعة من السنة ج:۱ ص:۹۴ (طبع ایچ ایم سعید) عن عائشة رضی الله عنها قالت: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من ثابر علی ثنتی عشر رکعة من الفجر السنة بنی الله له بیتًا فی الجنة، أربع رکعات قبل الظهر ورکعتین بعدها ورکعتین بعد المغرب ورکعتین بعد العشاء ورکعتین قبل الفجر. وفی الشامیة کتاب الطهارة مطلب فی السنة وتعریفها ج:۱ ص:۱۰۴ (طبع ایچ ایم سعید) الذی یظهر من کلام أهل المذهب أن الاثم منوط بترک الواجب أو السنة المؤکدة علی الصحیح لتصریحهم بأن من ترک سنن الصلوات الخمس قیل لا یأثم والصحیح أنه یأثم. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) رجل ترک سنن الصلوات الخمس ان لم یر السنن حقا فقد کفر لأنه ترک استخفافًا وان رای حقا منهم من قال لا یأثم والصحیح انه یأثم لأنه جاء الوعید بالترک اهـ. نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۶۰۹۔

(۲) عن سهل عن أبیه عن أبی هریرةؓ قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذا صلّی أحدکم الجمعة فلیصل بعدها أربعا. رواه مسلم ج:۱ ص:۲۸۸. وفی الجامع للامام الترمذیؒ ورُوی عن عبدالله بن مسعودؓ انه کان یصلی قبل الجمعة أربعًا وبعدها أربعًا .... الخ. ج:۱ ص:۶۹. وفی الشرح الکبیر ص:۳۸۸ السنة قبل الجمعة أربع وبعدها أربع، اما الأربع بعدها فلما روی مسلم عن أبی هریرة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذا صلیتم بعد الجمعة فصلوا أربعا. وفی روایة للجماعة الا البخاری: اذا صلی أحدکم الجمعة فلیصل بعدها أربعا. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ باب النوافل والدلیل علی استنان الأربع قبل الجمعة ما رواه مسلم مرفوعًا ..... (باقی اگلے صفحے پر)

بعض احادیث اسی کی تائید کرتی ہیں (رد المحتار ج:۱ ص:۶۳۰، استنبول)۔[۱] لیکن حنفیہ ہی کے بعض مشائخ کا یہ کہنا ہے کہ فرضوں کے بعد ظہر کی طرح صرف دو رکعتیں مسنون ہیں (فتح القدیر ج:۱ ص:۳۱۶)۔[۲]

امام ابویوسفؒ جمعہ کے بعد چھ رکعتوں کو سنت قرار دیتے ہیں،[۳] حضرت علیؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔[۴] اسی وجہ سے متأخرین علماء نے اس پر فتویٰ دیا ہے کہ جمعہ کے بعد چھ رکعتیں پڑھنی چاہئیں، پہلے چار، پھر دو، تاکہ تمام فقہاء کے مذہب کے مطابق سنت ادا ہوجائے، شیخ ابراہیم حلبیؒ ''شرح منیہ'' میں فرماتے ہیں:''والأفضل أن یصلی أربعًا ثم رکعتین للخروج عن الخلاف.''

افضل یہ ہے کہ پہلے چار رکعتیں پڑھی جائیں، پھر دو رکعتیں، تاکہ اختلاف باقی نہ رہے۔

(غنیة المتملی ص:۳۷۳، مجتبائی ۱۳۳۳ھ)۔[۵]

واللہ سبحانہ اعلم

۲۵ ربیع الاوّل ۱۳۸۷ھ[۶]

(گزشتہ سے پیوستہ).....من کان مصلیاً قبل الجمعة فلیصل أربعًا، مع ما رواہ ابن ماجة عن ابن عباسؓ قال: کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یرکع من قبل الجمعة أربعًا لا یفصل فی شئ منهن. وعلی استنان الأربع بعدها ما فی صحیح مسلم عن أبی هریرة مرفوعًا: اذا صلّی أحدکم الجمعة فلیصل بعدها أربعًا، وفی روایة: اذا صلیتم بعد الجمعة فصلوا أربعًا. وفی بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۸۵ (الصلوٰة المسنونة) واما السنة قبل الجمعة وبعدها فقد ذکر فی الأصل وأربع قبل الجمعة وأربع بعدها.

(۱) فتاویٰ شامیة ج:۲ ص:۱۲، ۱۳ (طبع ایچ ایم سعید). (۲) فتح القدیر ج:۱ ص:۳۸۶ (مکتبه رشیدیه).

(۳) وفی غنیه المتملی ص:۳۸۹ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) وعند أبی یوسفؒ السنة بعد الجمعة ست رکعات وهو مروی عن علیؓ. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ باب النوافل وعن أبی یوسفؒ أنه ینبغی أن یصلی أربعًا ثم رکعتین، وفی منحة الخالق علی هامش البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (قوله وعن أبی یوسفؒ) قال فی الذخیرة وعن علی رضی الله عنه یصلی ستًا، رکعتین ثم أربعًا، وعنه روایة أخری انه یصلی بعدها ستًا أربعًا ثم رکعتین وبه أخذ أبویوسفؒ والطحاوی .... الخ.

وفی فتح القدیر ج:۲ ص:۳۹ قبیل باب صلاة العیدین .... أن السنة بعدها ست وهو قول أبی یوسف .... الخ.

(۴) عن أبی عبدالرحمٰن عن علی رضی الله عنه أنه قال: من کان مصلیًا بعد الجمعة فلیصل ستًا، أخرجه الطحاوی (کتاب الصلوٰة، باب التطوع بعد الجمعة ج:۲ ص:۲۳۳). وفیه أیضًا: وعن أبی عبدالرحمٰن قال: علّم أن یصلّوا بعد الجمعة أربعًا فلما جاء علی ابن أبی طالب رضی الله عنه علّمهم أن یصلّوا ستًا. اهـ. وفی الجامع للامام الترمذی ج:۱ ص:۶۹ وروی عن عبدالله بن مسعود أنه کان یصلی قبل الجمعة أربعًا وبعدها أربعًا، وروی عن علی بن أبی طالب أنه أمر أن یصلی بعد الجمعة رکعتین ثم أربعًا وعن أبی عبدالرحمٰن السلمی قال: قدم علینا عبدالله رضی الله عنه فکان یصلی بعد الجمعة أربعًا فقدم بعده علی رضی الله عنه فکان اذا صلی الجمعة صلی بعدها رکعتین وأربعًا فاعجبنا فعل علی رضی الله عنه فاخترناه، رواه الطحاوی باب التطوع، بعد الجمعة ج:۱ ص:۲۳۳، وفی آثار السنن اسناده صحیح ص:۳۰۳.

(۵) وفی غنیة المتملی ص:۳۸۹ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) والأفضل أن یصلی أربعًا ثم رکعتین للخروج عن الخلاف. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ باب النوافل، وفی الذخیرة والتجنیس وکثیر من مشائخنا علی قول أبی یوسف وفی منیة المصلی والأفضل عندنا أن یصلی أربعًا ثم رکعتین. وفی منحة الخالق علی هامش البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (قوله وعن أبی یوسف) قال فی الذخیرة وعن علیؓ أنه یصلی ستًا، رکعتین ثم أربعًا. وعنه روایة أخری أنه یصلی بعدها ستًا، أربعًا ثم رکعتین، وبه أخذ أبو یوسف والطحاوی وکثیر من المشائخ رحمهم الله تعالی، وعلی هذا قال شمس الأئمة الحلوانیؒ الأصل أن یصلی أربعًا ثم رکعتین فقد أشار الی أنه مخیر بین تقدیم الأربع وبین تقدیم المثنی، ولکن الأفضل تقدیم الأربع کیلا یصیر متطوعا بعد الفرض مثلها. وفی فتح القدیر ج:۲ ص:۳۹ قبیل باب صلوٰة العیدین .... فهذا البحث یفید أن السنة بعدها ست وهو قول أبی یوسف وقیل قولهما.

(۶) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (محمد زبیر حق نواز)

۱:- جمعہ کی سنتوں کی تعداد

۲:- سنتِ غیر مؤکدہ پڑھنے کا طریقہ

سوال ۱:- جمعہ کے بعد کتنی سنتیں پڑھنی چاہئیں؟

۲:- سنتِ غیر مؤکدہ کس طرح پڑھنی چاہئے؟ اور اس میں کیا پڑھیں؟

جواب ۱:- جمعہ کے بعد چھ رکعات مسنون ہیں،[1] پہلے چار، پھر دو پڑھیں تو بہتر ہے،[2] اور اس کے برعکس بھی جائز ہے۔

۲:- سنتِ غیر مؤکدہ کا کوئی الگ طریقہ نہیں، نہ کوئی خاص قراءت مقرر ہے، بلکہ اور نمازوں ہی کی طرح پڑھی جائے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۶/۲۸ الف)

صبحِ صادق اور فجر کے بعد نوافل پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک صاحب کہتے ہیں کہ صبحِ صادق کے بعد سے فجر کی سنتیں اور فرض پڑھنے تک وقفے میں کوئی نماز نفل وغیرہ نہیں پڑھی جاسکتی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد طلوعِ آفتاب تک اور عصر ومغرب کے درمیان یا سورج نکلتے وقت تک، اور نصف النہار کے وقت نماز جائز نہیں ہے، باقی اوقات میں جائز ہے۔

جواب:- ان صاحب نے دُرست کہا ہے، فجر کی نماز کے بعد تو نوافل پڑھنا ناجائز ہے، صبحِ صادق کے بعد بھی سوائے فجر کی دوسنتوں کے کوئی اور نفل پڑھنا جائز نہیں۔

کما فی الدر المختار: وکذا الحکم من کراھة نفل وواجب لغیرہ لا فرض وواجب لعینه بعد طلوع فجر سوی سنته لشغل الوقت به تقدیرا. (شامی ج:۱ ص:۲۵۱)۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲۱ھ

سنتِ مؤکدہ کو بلا عذر ترک کرنا

سوال:- عمر کہتا ہے کہ دن کی پانچ نمازوں کے فرائض پورے کرلئے جائیں تو یہی کافی

(۱، ۲) تفصیل کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) الدر المختار کتاب الصلوٰة ج:۱ ص:۳۷۵ (طبع ایچ ایم سعید). نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۳ ص:۳۲۴ (جدید ایڈیشن دار الاشاعت)۔ (مرتب عفی عنہ)

ہے، باقی سنتِ مؤکدہ وغیرہ ادا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیا عمر کا یہ خیال دُرست ہے؟

جواب: – عمر کا کہنا غلط ہے، سنتِ مؤکدہ کو مستقل طور پر چھوڑے رکھنا سخت گناہ ہے۔[1]

واللہ اعلم

۱۴۰۹/۱/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰/۲۲۴ الف)

زوال سے پہلے جمعہ کی سنتیں پڑھنا

سوال: – مسئلہ مسئولہ فتویٰ نمبر ۲۶۰ جلد ۲۸ الف سے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر حنفی مسلک والے انتہائے زوال سے قبل چار رکعت جمعہ پڑھ لیں کہ سبھی پڑھتے ہیں تو کیا ان کی سنتیں ادا ہو جائیں گی؟ دُوسری بات یہ بھی واضح کریں کہ اگر ان سنتوں کو بعد میں ادا کیا جائے تو فرضوں سے متصل ادا کیا جائے یا بقیہ نماز کی ترتیب قائم رکھتے ہوئے یہ بعد میں ادا کی جائیں؟

جواب: – زوال سے پہلے جمعہ کی سنتیں ادا نہ ہوں گی، فرض کے بعد ادا ہو جائیں گی،[2] اور اس میں بہتر یہ ہے کہ پہلے جمعہ کے بعد والی چھ سنتیں پڑھیں، اس کے بعد پہلے والی سنتیں ادا کی جائیں،[3] لیکن اگر برعکس کرلیا تو بھی جائز ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۱۶ھ

صلوٰۃ التسبیح کی جماعت کا حکم

سوال: – صلوٰۃ التسبیح شعبان کی پندرھویں کو باجماعت پڑھنے کا ہمارا ارادہ ہو رہا ہے، یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جواب: – صلوٰۃ التسبیح نفلی نماز ہے، اور اس کی جماعت حنفیہ کے مسلک میں مکروہِ تحریمی ہے،

---

(۱) فی الهندية ج:۱ ص:۱۱۲ رجل ترک سنن الصلاة ان لم یر السنن حقا فقد کفر، لأنه ترکها استخفافا، وان راها حقاً فالصحیح انه یأثم، لأنه جاء الوعید بالترک، کذا فی محیط السرخسی. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) رجل ترک سنن الصلوات الخمس ان لم یر السنن حقا فقد کفر، لأنه ترک استخفافا، وان رأی حقا منهم من قال لا یأثم والصحیح انه یأثم لأنه جاء الوعید بالترک. وکذا فی السامیة ج:۱ ص:۱۰۴ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) فی الدر المختار، باب ادراک الفریضة ج:۲ ص:۵۸ (طبع سعید) .... بخلاف سنة الظهر، وکذا الجمعة، فانه ان خاف فوت رکعة یترکها ویقتدی، ثم یأتی بها علی انها سنة فی وقته، أی الظهر قبل شفعه عند محمد، وبه یفتی.

(۳) وفی الشامیة، باب ادراک الفریضة ج:۲ ص:۵۹ (طبع سعید) أقول وعلیه المتون لکن رجح فی الفتح تقدیم الرکعتین، قال فی الامداد وفی فتاوی العتابی انه المختار وفی مبسوط شیخ الاسلام انه الأصح لحدیث عائشة أنه علیه الصلوٰة والسلام کان اذا فاتته الأربع قبل الظهر یصلیهن بعد الرکعتین، وهو قول أبی حنیفة وکذا فی جامع قاضی خان وکذا فی غنیة المستملی ص:۳۹۸ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

لہٰذا یہ نماز تنہا پڑھنی چاہئے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۲/۱۰/۱۳۹۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۷۰۸ د)

تہجد کی نیت کس طرح کریں؟

سوال:- تہجد کی نیت نفل کی ہوگی یا سنت کی؟

جواب:- نمازِ تہجد میں نفل کی نیت کی جائے گی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲/۷/۱۳۸۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۷۶۲ الف)

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲/۷/۱۳۸۸ھ

شبِ قدر کی نوافل کا طریقہ

سوال:- مؤدّبانہ گزارش ہے کہ ہم آپ سے ایک مسئلے کے بارے میں فتویٰ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس درخواست کے ساتھ جو پرچہ منسلک ہے اس میں لیلۃ القدر کے نوافل کے بارے میں ہماری مسجد (مسجد رحمانیہ) کے امام صاحب نے بتایا ہے کہ یہ طریقۂ نوافل غلط ہے، اور کہیں حدیث میں لیلۃ القدر کے نوافل کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہم آپ سے التماس کرتے ہیں کہ آپ ہم کو شریعت کی رُو سے صحیح طریقے سے آگاہ فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

جواب:- منسلکہ اشتہار[2] میں شبِ قدر کی نوافل کا جو طریقہ لکھا ہے وہ فقہ و حدیث کی مستند و معروف کتابوں میں کہیں نظر سے نہیں گزرا، اشتہار میں بھی کوئی حوالہ کسی مستند کتابِ حدیث کا نہیں دیا گیا کہ اس سے تحقیق کی جاسکتی۔ صحیح احادیث میں شبِ قدر کے مدِ مطلق نوافل کی فضیلت وارد ہے، کسی خاص طریقے کی نہیں۔[3]

واللہ اعلم

۲۶/۹/۱۴۰۰ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۲۷۸ د)

---

(۱) فی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ (قبیل باب ادراک الفریضة) ولا یصلی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان أی یکرہ ذلک علٰی سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد کما فی الدر .... الخ. وفی غنیة المتملی ص:۴۳۲ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) اعلم أن النفل بالجماعة علٰی سبیل التداعی مکروہ علٰی ما تقدم ما عدا التراویح. نیز دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۴۴۔

(۲) یہ اشتہار، ریکارڈ میں موجود نہیں ہے، بظاہر اس اشتہار میں جماعت کے ساتھ نوافل کا کوئی مخصوص طریقہ لکھا گیا تھا۔

(۳) وفی غنیة المتملی النوافل ج:۱ ص:۴۳۲ واعلم أن النفل بالجماعة علٰی سبیل التداعی مکروہ علٰی ما تقدم ما عدا التراویح وصلوٰة الکسوف والاستسقاء، فعلم أن کلا من صلوٰة الرغائب لیلة أول جمعة من رجب وصلوٰة البراءة لیلة النصف من شعبان وصلوٰة القدر لیلة السابع والعشرین من رمضان بالجماعة بدعة مکروهة. نیز دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۲۴. .....(باقی اگلے صفحے پر)

سنن ونوافل گھر میں پڑھنی چاہئیں یا مسجد میں؟

سوال:- ملفوظاتِ کمالاتِ اشرفیہ ص:۱۵۶ ملفوظ نمبر۶۵۹ میں ہے: ایک شخص نے دریافت کیا کہ نماز سنتِ فجر مکان میں پڑھ کر مسجد جاتا ہوں، اس وقت نماز تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟ فرمایا کہ: ''اس وقت نہ تحیۃ المسجد ہے، نہ تحیۃ الوضوء، نیز ان سنتوں کا مسجد میں پڑھنا افضل ہے، بلکہ جمیع سننِ مؤکدہ کا، تاکہ اتہام بالتشبہ باہلِ بدعت سے محفوظ رہے، جو کہ تارکینِ سنت ہیں۔'' اور ہم نے یہ سنا ہے کہ مکان میں فجر کی سنتیں پڑھنا مسنون ہے، اس کی تطبیق کیا ہے؟

جواب:- فی الدر المختار: والأفضل فی النفل غیر التراویح المنزل الا لخوف شغل عنها، والأصح أفضلیة ما کان أخشع وأخلص. وقال الشامی: وحیث کان هذا أفضل یراعی ما لم یلزم منه خوف شغل عنها لو ذهب لبیته، أو کان فی بیته ما یشغل باله ویقلل خشوعه فیصلیها حینئذ فی المسجد. (شامی ج:۱ ص:۴۵۸)۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ تمام سنن ونوافل کا گھر میں پڑھنا افضل ہے، لیکن کسی عارض کی بناء پر یہ افضلیت منتقل ہوسکتی ہے، اور عوارض مختلف ہوسکتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں چونکہ سنتوں کو گھر کے لئے چھوڑنے سے خطرہ یہ رہتا ہے کہ کہیں بالکل ہی رہ نہ جائیں، اس لئے متأخرین نے سننِ مؤکدہ کو مسجد میں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت تھانویؒ کا مذکورہ فتویٰ بھی اصلاً اسی عارض پر مبنی ہے، اور اس کے ساتھ اتہام بالتشبہ باہلِ بدعت کی علت مزید شامل کردی ہے، اور حضرت تھانویؒ کا یہ فتویٰ امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۲۸۸[2] میں بھی موجود ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۳۵۷ ب)

فجر کی سنتیں چھوٹ جائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- فجر کی سنتیں چھوٹ جانے کے بعد کیا کرنا چاہئے؟ کیا اس کی قضا کی جاسکتی ہے؟

جواب:- طلوعِ آفتاب کے بعد زوال سے پہلے امام محمدؒ کے نزدیک سنتوں کی قضا کی

(گزشتہ سے پیوستہ)..... وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۵، ۲۶ (طبع ایچ ایم سعید) ومن المندوبات .... احیاء لیلة العیدین، والنصف من شعبان، والعشر الأخیر من رمضان، والأول من ذی الحجة، وفی الشامیة تحته علی الصفحة:۲۶، وفی الامداد ویحصل القیام بالصلوٰة نفلا فرادی من غیر عدد مخصوص، وبقراءة القرآن والأحادیث .... (تتمة) أشار بقوله فرادی الی ما ذکره بعد فی متنه من قوله ویکره الاجتماع علی احیاء لیلة من هذه اللیالی فی المساجد .... وما روی من الصلوات فی هذه الأوقات یصلی فرادی غیر التراویح.

(۱) فتاویٰ شامیة باب الوتر والنوافل ج:۲ ص:۲۲ (طبع ایچ ایم سعید)

(۲) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۰۸ سوال نمبر۳۹۷ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)، نیز دیکھئے فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۲۶۔

جاسکتی ہے، البتہ شیخینؒ کے نزدیک تنہا سنتوں کی قضا نہیں، ہاں! اگر فرض نماز بھی قضا ہوگئی ہو تو زوال سے پہلے فرض اور سنت دونوں کی قضا کرنی چاہئے۔[1]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح
محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۴۰۰/۱۸ الف)

فجر کے فرض شروع ہونے کے بعد سنتیں کس وقت تک ادا کی جاسکتی ہیں؟

سوال:- فجر کے وقت جب مسجد میں داخل ہوا تو امام صاحب نماز پڑھا رہے تھے، میں سنتیں پڑھے بغیر جماعت میں شریک ہوا، بعد ازاں سورج نکلنے کے بعد سنتیں ادا کیں، تو میرا یہ عمل دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- فجر کی سنتوں کے بارے میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ گھر میں ادا کرکے مسجد جائیں۔[2] اور اگر گھر میں پڑھے بغیر مسجد پہنچ جائیں تو جب تک جماعت کی رکعت، بلکہ تشہد مل سکتا ہو، فجر کی سنتیں دُور ہٹ کر کسی مقام پر پڑھ لینا جائز ہے، خواہ جماعت شروع ہوچکی ہو، لیکن اگر کوئی شخص جماعت میں شریک ہوگیا تو پھر امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق تنہا سنتوں کی قضا نہیں ہے، آپ نے جو سورج نکلنے کے بعد دو رکعتیں پڑھیں وہ آپ کی طرف سے نفل ہوگئیں۔

فی الدر المختار باب ادراک الفریضة واذا خاف فوت رکعتی الفجر لاشتغاله بسنتها ترکها لکون الجماعة اکمل والا بأن رجا ادراک رکعة فی ظاهر المذهب وقیل التشهد واعتمده المصنف والشرنبلالی تبعًا للبحر لکن ضعفه فی النهر وقال الشامی تحته لأن المدار هنا علی ادراک فضل الجماعة وقد اتفقوا علی ادراکه بادراک التشهد فیأتی بالسنة اتفاقًا کما أوضحه فی الشرنبلالیة أیضًا وأقره فی شرح المنیة وشرح نظم الکنز[3] (شامی ج:۱ ص:۳۴۹)

وفی ردّ المحتار أیضًا قوله ولا یقضیها الا بطریق التبعیة أی لا یقضی سنة الفجر الا اذا فاتت

---

(۱) وفی رد المحتار ج:۲ ص:۵۷ (طبع سعید) اذا فاتت وحدها فلا تقضی قبل طلوع الشمس بالاجماع لکراهة النفل بعد الصبح، واما بعد طلوع الشمس فکذلک عندهما وقال محمد أحب الیّ ان یقضیها الی الزوال کما فی الدرر قیل هذا قریب من الاتفاق .... الخ.

(۲) وفی غنیة المتملی ص:۳۹۲ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) ثم السنة فی سنة الفجر .... (ان یأتی بها اما فی بیته) وهو الأفضل (أو عند باب المسجد) ان أمکنه ذلک .... الخ. نیز دیکھئے سابقہ فتویٰ ص:۴۴۰ اور اس کا حاشیہ نمبر۱۔

(۳) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۵۶ (طبع سعید).

مع الفجر فيقضيها تبعًا لقضائه لو قبل الزوال۔ (أيضًا ج: ۱ ص: ۷۵۰)۔[1] واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۹۳ الف)

سننِ مؤکدہ کو بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا

سوال: -سننِ مؤکدہ کا قیام فرض ہے یا سنت یا مستحب؟

جواب: -سننِ مؤکدہ کو کھڑے ہوکر پڑھنا افضل اور مستحب ہے، اور بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے، لما فی مراقی الفلاح (یجوز النفل) انما عبر به لیشمل السنن المؤکدة وغیرها فتصح اذا صلاها (قاعدًا مع القدرة علی القیام) وقد حکی فیه اجماع العلماء .... الخ. وقال الطحطاویؒ قوله (یجوز النفل قاعدًا) مطلقًا من غیر کراهة کما فی مجمع الأنهر. (طحطاوی علی مراقی الفلاح باب النوافل ص: ۲۲۰)۔[2]

البتہ فقہاءؒ کی ایک جماعت نے سنتِ فجر کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے، یعنی ان کے نزدیک ان کو بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے اور ان میں قیام فرض ہے (وخالفه الطحطاوی)۔[3] اور بعض حضرات نے تراویح کا بھی یہی حکم بتایا ہے، اگرچہ تراویح کے بارے میں قاضی خانؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ کا رُجحان اس طرف ہے کہ وہ سننِ فجر کے حکم میں نہیں، لیکن احتیاطاً حتی الامکان انہیں بھی کھڑے ہوکر پڑھنا چاہئے۔ لما فی الدر المختار ومنها (أی فرائض الصلوٰة) القیام فی فرض وملحق به کنذر وسنة فجر فی الأصح، وقال الشامیؒ ناقلًا عن الحلیة: وسنة الفجر لا تجوز قاعدًا من غیر عذر باجماعهم کما هو روایة الحسن عن أبی حنیفة کما صرح به الخلاصة فکذا التراویح وقیل یجوز .... قال قاضی خان وهو الصحیح. (شامی باب صفة الصلوٰة ج: ۱ ص: ۲۹۹)[4]، (ومثله فی شرح المنیة الکبیر ص: ۲۶۷)۔[5]

بہرحال! فجر اور تراویح کے علاوہ دُوسری سننِ مؤکدہ میں فقہائے حنفیہ کا اتفاق ہے کہ قیام

---

(۱) رد المحتار ج: ۲ ص: ۵۷ (طبع سعید).
(۲) (طبع قدیمی کتب خانه).
(۳) طحطاوی علی المراقی ص: ۲۲۰ (طبع مذکور).
(۴) الدر المختار مع رد المحتار ج: ۱ ص: ۴۴۴، ۴۴۵ (طبع سعید).
(۵) غنیة المتملی ص: ۲۷۰ و ص: ۲۱ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

فرض نہیں، مستحب ہے،[1] البتہ چونکہ سلف کا تعامل سننِ مؤکدہ کو کھڑے ہوکر ہی پڑھنے کا رہا ہے اس لئے حتی الوسع اس تعامل کو ترک نہ کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۶۹۲ ب)

توڑی ہوئی نفل نماز اور طواف ونذر کی نماز میں قیام کا حکم

سوال:- وہ نفل نماز جس کو شروع کرکے توڑ دیا ہو، اس کی قضا، نمازِ نذر اور نمازِ طواف میں قیام فرض ہے یا مستحب؟

جواب:- قیام یوں تو ہر فرض و واجب نماز میں فرض ہے، اور اس میں صلوٰۃ منذور اور صلوٰۃ بعد الطّواف بھی داخل ہے۔ کما مرّ فی عبارة الدر المختار فی الجواب الثانی۔[2] لیکن توڑی ہوئی نفل نماز کے بارے میں بالکل صریح جزئیہ تو نہیں ملا۔ علامہ شامیؒ نے طحطاویؒ اور رحمتیؒ کے بارے میں صرف اتنا نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس مسئلے میں توقف کیا ہے، (ج:۱ ص:۲۹۹ صفة الصلوٰة)[3]، اور طحطاویؒ نے مراقی کی عبارت سے وجوب مستنبط کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: قوله والواجبات ظاهره شمول قضاء النفل الذی أفسده (ص:۱۲۲، طبع قدیمی کتب خانہ)، لیکن اس کے مشابہ ایک مسئلے سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ توڑی ہوئی نفل نماز کی قضاء میں قیام، صاحبینؒ کے نزدیک واجب ہوگا اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب نہیں ہوگا۔

وذلک لما فی شرح المنية: اما القعود بغير عذر بعد الافتتاح قائمًا فيجوز عند أبی حنيفة لٰكن مع الكراهة علٰی ما اختاره صاحب الهداية وبلا كراهة علٰی ما اختاره فخر الاسلام

---

(۱) وفی فتح باب العناية بشرح النقاية ج:۱ ص:۳۳۷، ۳۳۸ (طبع بيروت) (ويتنفّل راكبًا .... وقاعدًا مع قدرة قيامه) وفيه تحته والسنن الرواتب نوافل .... وقال تحت قوله (مع قدرة قيامه) لما روى الجماعة الا مسلما عن عمران بن حصينؓ قال: سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صلوٰة الرجل قاعدًا فقال: من صلّٰى قائما فهو أفضل ومن صلّٰى قاعدًا فله نصف أجر القائم، ومن صلّٰى نائمًا أو مضطجعًا فله نصف أجر القاعد .... وهٰذا فی صلوٰة النافلة، لأن صلوٰة الفرض لا يجوز فيها القعود مع القدرة على القيام بالاجماع، وفی مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۰۰ (طبع دار الكتب العلمية بيروت) (وصح النفل قاعدًا مع القدرة على القيام) بلا كراهة لما روى أنه عليه السلام كان يصلّٰی ركعتين قاعدًا بغير عذر وفيه اشارة الٰی أنه لا تجوز المكتوبة والواجبة والمنذورة وسنة الفجر والتراويح بلا عذر والصحيح أن التراويح تجوز .... الخ. وفی المبسوط للسرخسیؒ ج:۲ ص:۱۴۷ (طبع دار المعرفة بيروت) (الفصل السابع فی أدائها (التراويح) قاعدًا من غير عذر) اختلفوا فيه قال بعضهم لا ينوب عن التراويح علٰی قياس ما روى الحسن عن أبی حنيفة رحمهما الله تعالٰی فی ركعتی الفجر انه لو أداهما قاعدًا من غير عذر لم يجزه عن السنة وعليه الاعتماد فكذا هٰذا لأنها مثله والصحيح انها تجوز والفرق ظاهر فان ركعتی الفجر آكد وأشهر وهٰذا الفرق ظاهر يوافق رواية أبی سليمان عن أبی حنيفة وأبی يوسفؒ ومحمدؒ ومع الفرق فانه لا يستحب لما فيه من مخالفة السنة والسلف.

(۲) اس سے سابقہ فتویٰ مراد ہے۔

(۳) رد المحتار ج:۱ ص:۴۴۴ (طبع سعيد).

.... وأما عندهما فلا يجوز اتمامها مع القعود بلا عذر بعد الافتتاح قائما أصلا لأن الشروع معتبر بالنذر ومن نذر صلوٰة ركعتين قائمًا لا يجوز له أن يصليهما قاعدًا من غير عذر فكذا اذا شرع فيهما ولأبى حنيفةؒ ان اللزوم بالشروع لضرورة صيانة المؤدى عن البطلان وصيانته عنه ليست موقوفة على القيام لصحته بدونه والضرورة تتقدر بقدرها .... ولذا اتفقوا علىٰ أنه لو نذر الحج ماشيًا لزمه بصفة المشى ولو شرع فيه ماشيًا لا يلزمه. (كبيرى شرح منية ص:۲۶۸ بعد فرائض الصلوٰة)۔[1]

اس میں امام ابوحنیفہؒ کی تعلیل صورتِ مسئولہ پر بھی پوری طرح منطبق ہے، لہٰذا امام صاحبؒ کے قول کے قیاس پر صورتِ مسئولہ میں قیام واجب نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۶۹۲ ب)

نوافل کی جماعت میں لوگوں کی شرکت کا اہتمام کرنا

سوال:- ایک آدمی چار، پانچ سال سے یکم محرّم سے ۱۰/محرّم تک نوافل بالجماعت کا اہتمام کرتا ہے، اور ان دس راتوں میں قرآنِ کریم ختم کرتا ہے، جس میں لاؤڈ اسپیکر کا انتظام ہوتا ہے۔ کیا یہ جائز ہے یا بدعت؟ ایسے شخص کی اقتداء میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:- لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کا اہتمام کرنا اور لوگوں کو شرکت کی دعوت دینا ''تداعی'' ہے، اور تداعی کے ساتھ نوافل کی جماعت مکروہِ تحریمی ہے[2]، جو شخص اسے باعثِ ثواب سمجھے وہ مرتکبِ بدعت ہے، اس کو امام بنانے سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی صحیح العقیدہ امام نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے، نماز ہوجائے گی۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۱/۵ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۱۹ الف)

---

(۱) الغنية المتملى ص: ۲۷۱ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور). وفى فتح باب العناية ج: ۱ ص: ۳۳۹ (طبع بيروت) (وكره التنفل قاعدًا بقاءً) بأن يحرم قائمًا ثم يقعد وقال أبو يوسفؒ ومحمدؒ لا يجوز، لأن الشروع ملزم لأن يأتى علىٰ صفة شرع فيها، أو بأكمل منها، فاشبه النذر قائمًا ولأبى حنيفةؒ أن البقاء أسهل من الابتداء وقد جاز ترك القيام فى ابتداء النفل فيجوز فى أثنائه .... الخ. وفى مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج: ۱ ص: ۲۰۱ (ولو قعد بعد ما افتتحه قائمًا جاز) عند الامام استحسانًا لأنه أسهل من الابتداء (ويكره لو بلا عذر) عنده (وقالا لا يجوز الا بعذر) قياسًا لأن الشروع ملزم كالنذر ولو نذر أن يصلّى قائمًا لم يجز أن يصلّى قاعدًا فكذا هٰذا .... الخ.

(۲) وفى الهندية ج: ۱ ص: ۸۳ (طبع مكتبه حقانيه) التطوع بالجماعة اذا كان علىٰ سبيل التداعى يكره.

رمضان میں نفل کی جماعت

(۱۹۵۹ء میں ایک صاحب ''محمود حسن'' نے رمضان المبارک میں نفل کی جماعت سے متعلق ایک استفتاء حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا، اور استفتاء کے ساتھ اسی مسئلے سے متعلق حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تحریر کردہ جواب بھی ارسال کیا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استفتاء جواب کے لئے اپنے فائق اور لائق صاحبزادے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے سپرد کیا، جو اس وقت دورۂ حدیث میں داخلہ لینے والے تھے، گویا کہ اس وقت ان کا ضابطے کا طالب علمانہ دور بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ حضرت مولانا مدظلہم نے اپنے والد محترم کے ایماء پر اس استفتاء کا تحقیقی جواب تحریر فرمایا، جو پیشِ خدمت ہے۔ یہ تفصیلی فتویٰ پہلے ''فقہی مقالات'' کی جلد دوم میں بھی شائع ہو چکا ہے، اب حضرتِ والا دامت برکاتہم کے فتاویٰ کے اس مجموعے میں دیگر فتاویٰ کے ساتھ یہ فتویٰ بھی متداول نسخوں کی تخریج کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ مرتب عفی عنہ)

استفتاء

درخدمت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سوال:- حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ ''الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر'' میں شائع ہوا ہے، جس میں رمضان میں تہجد کی نماز تداعی کے ساتھ بھی افضل ہونا درج ہے، اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ نے فتاویٰ رشیدیہ میں رمضان میں تہجد کی جماعت کو اگر بالتداعی ہو، مکروہِ تحریمی بتلایا ہے، اس کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے قولِ مرجوح پر مبنی قرار دیا ہے۔ میں نے بہت سارے حضرات کو لکھا، کسی کے یہاں سے فیصلہ کن جواب موصول نہیں ہوا، بجز حضرتِ والا کے اس وقت اس کے متعلق کہیں سے مجھے اس کی توقع بھی نہیں ہے، بڑے بڑے کام کے مفتی حضرات چل بسے۔ مسئلۂ زیرِ بحث بہت اہم ہے، اس کی وجہ سے ایک نیا باب بدعت کا کھل جانے کا اندیشہ ہے، خود مجھے بھی تردّد پیدا ہوگیا۔ یہاں گزشتہ رمضان میں پچاس، ساٹھ، کبھی کبھی سو سے زائد آدمی تہجد کی نماز جماعت سے ادا کرنے لگے، اس کا اہتمام ہونے لگا، میں نہ شریک ہوا، نہ کسی کو شریک ہونے کو کہا، نہ کسی کو منع کیا، البتہ اپنے احباب خود ہی دریافت کرتے تو ان سے کہہ دیتا تھا کہ فقہاء تو مطلق طور پر تداعی کو نوافل میں مکروہ ہی لکھتے ہیں۔ ہمارے اکابر میں سے کسی کا عمل بھی مجھے اس کے متعلق سننے میں نہیں آیا۔

حضرتِ والا ذرا مفصل طور پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل کے متعلق کچھ تحریر فرماویں۔ اگرچہ حضرتِ والا کو تکلیف ہوگی، لیکن کیا کیا جائے؟ کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب منسلک ہے۔ کمترین بندہ محمود حسن عفی عنہ، کراچی

جواب از حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

(منقول از ''شیخ الاسلام نمبر'' صفحہ:۵۴ روزنامہ الجمعیۃ، دہلی)

جواب سوال از جماعت نوافل در رمضان غیر تراویح۔ (منقول از مکتوباتِ مخطوطہ)

فتح القدیر ج:اوّل، باب الاستسقاء ص:۴۳۸ میں ہے[۱]: وقد صرح الحاکم أیضًا فی باب صلٰوۃ الکسوف من الکافی بقوله "ویکره صلٰوۃ التطوع جماعة ما خلا قیام رمضان وصلٰوۃ الکسوف، وهٰذا خلاف ما ذکر شیخ الاسلام"۔

اور رد المحتار ج:۱ ص:۵۲۳ پر ہے[۲]: قلت ویؤیده أیضًا ما فی البدائع من قوله أن الجماعة فی التطوع لیست بسنة الا فی قیام رمضان اهـ. وفیه والنفل بالجماعة غیر مستحب، لأنه لم تفعله الصحابة فی غیر رمضان اهـ۔

مذکورہ بالا نصوص میں قیامِ رمضان کی تصریح فرمائی گئی ہے، اس کی تخصیص تراویح کے ساتھ نہیں کی گئی، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تیسری شب تک اور صحابہ کرامؓ سے آخری شب تک نوافل باجماعت پڑھنا منقول ہے، جیسا کہ مؤطا امام مالک میں بکثرت مروی ہے، اس لئے تمام وہ نوافل جو رمضان کی راتوں میں پڑھے جائیں، خواہ تراویح ہوں یا تہجد، اوائلِ شب میں ہوں یا اَواخرِ شب میں، جماعت کی اجازت ہوگی۔

مؤطا امام مالک صفحہ:۱۱۱ میں ہے[۳]:-

قال محمد: وبهٰذا کله نأخذ لا بأس بالصلاة فی شهر رمضان أن یصلی الناس تطوعا بامام لأن المسلمین قد اجمعوا علٰی ذٰلک اهـ.

فتح الباری ج: رابع صفحہ:۲۱۵ باب "فضل من قام رمضان" میں ہے[۴]:-

أی قیام لیالیه مصلیا، والمراد من قیام اللیل ما یحصل به مطلق القیام، کما قدمناه فی التهجد سواء (کان قلیلا أو کثیرا)، وذکر النووی أن المراد بقیام رمضان صلٰوۃ التراویح،

---

(۱) فتح القدیر ج:۲ ص:۵۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۲) رد المحتار ج:۲ ص:۴۸، ۴۹ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) مؤطا امام مالک ص:۱۴۳ (طبع بیرون بوهڑ گیٹ ملتان).
(۴) فتح الباری ج:۴ ص:۲۵۱ (طبع دار نشر الکتب الاسلامیه لاهور).

یعنی أنه یحصل بها المطلوب من القیام، لا أن قیام رمضان لا یکون الا بها، واغرب الکرمانی فقال: اتفقوا علٰی أن المراد بقیام رمضان صلوٰۃ التراویح اھ. قلت: قال النووی: المراد بقیام رمضان صلوٰۃ التراویح، ولٰکن اتفاق من أین أخذہ بل المراد من قیام اللیل ما یحصل به مطلق القیام، سواء کان قلیلا أو کثیرا، اھ. وقال العینی فی الجزء الأول صفحة: ۲۸۱[1] من کتاب الایمان من عمدة القاری ما نصه، ومعنی من قام رمضان من قام بالطاعة فی لیالی رمضان ویقال یرید صلوٰۃ التراویح، وقال بعضهم: لا یختص ذٰلک بصلوٰۃ التراویح، بل فی أی وقت صلی تطوعا حصل له ذٰلک الفضل. اھ.

نصوصِ مذکورہ بالا سے مندرجہ ذیل اُمور معلوم ہوتے ہیں:-

۱:- ہر نفل نماز باجماعت مطلقاً مکروہ نہیں ہے، بلکہ اس سے کچھ مستثنیات بھی ہیں۔

۲:- مستثنیات میں لفظ قیامِ رمضان اور کسوف کو ذکر کیا ہے۔

۳:- امام محمد اور حاکم اور صاحبِ بدائع وغیرہ متقدمین (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے فقط قیامِ رمضان ذکر فرمایا ہے، جو کہ مخصوص بالتراویح نہیں ہے۔

۴:- قیامِ رمضان کو مخصوص بالتراویح کرنا قولِ مرجوح ہے، جو کہ علامہ کرمانی اور علامہ نووی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے، اس کے خلاف حافظ ابنِ حجر عسقلانی اور امام عینی رحمہما اللہ تعالیٰ قیامِ رمضان سے تمام نوافل مراد لے رہے ہیں، خواہ تراویح ہو یا تہجد ہو، یا دیگر نوافل۔ اور امام نوویؒ کے قول کو مؤوّل قرار دیتے ہوئے اپنے قول کی طرف لوٹاتے ہیں، اور کرمانی کے قول کو غریب اور مخدوش فرمادیتے ہیں، اور یہی اَمر مدلول مطابقی بھی ہے۔

بنابریں فتاویٰ رشیدیہ کی تصریح جلدِ ثانی صفحہ:۵۹ اور جلدِ اوّل صفحہ:۴۹ جس میں مستثنیات کو منحصر تراویح کے ساتھ کیا گیا ہے، قولِ مرجوح پر مبنی ہے۔ پس رمضان کی جملہ نوافل کی جماعت، خواہ بالتداعی ہو یا بلاتداعی، سب مأذون فیہ بلکہ مستحب ہوں گی، اور "من قام رمضان" کے تحت داخل ہوں گی، اس پر نکیر کرنا غیر صحیح ہوگا، بلکہ جملہ طاعات، طوافِ نفل یا عمرۂ نافلہ وغیرہ اسی میں محسوب اور مرغوب فیہ قرار دیئے جائیں گے، کما ذکر العینی رحمه الله تعالیٰ۔

ہم نے حضرت قطب العالم حاجی امداداللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا عمل بھی مکہ معظمہ

---

(۱) عمدة القاری باب تطوع قیام رمضان من الایمان ج: ۱ ص: ۲۳۳ (طبع دار الفکر).

میں اسی پر پایا ہے، اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا بھی یہی معمول تھا۔ اور حرمین شریفین میں قدیم سے عمل سنتِ عشریہ وغیرہ کا جو کہ بالخصوص شوافع، اور چالیس رکعت کا عمل جو کہ موالک کا معمول بہ تھا، اور اہلِ مکہ کا قدیمی عمل ہر ترویحہ پر اسبرع طواف کا اسی کا مؤید ہے۔

واللہ اعلم

ننگِ اسلاف

حسین احمد غفرلہٗ

دارالعلوم دیوبند

۱۹/ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ

خط کا جواب از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مکرم بندہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ معاملہ نفسِ مسئلہ کی حیثیت سے تو کچھ اہم نہ تھا، لیکن حضرت مولانا مدنیؒ کے فتویٰ پر تنقید کی حیثیت نے اس کو اتنا مہم بنادیا کہ اس میں کافی بحث وتحقیق کے بغیر قلم اُٹھانا مشکل تھا، رمضان میں مجھ سے بالکل یہ کام نہیں ہوتا، اس لئے اپنے چھوٹے لڑکے محمد تقی سلّمہٗ کو جو اس سال دورۂ حدیث میں شریک ہونے والا ہے، یہ مسئلہ حوالے کیا، خیال یہ تھا کہ اس کو مشق ہوگی اور کتابوں کے حوالے یہ نکال کر پیش کردے گا تو پھر میں کچھ لکھوں گا، مگر ماشاء اللہ یہ لڑکا ذہین ہے، اس لئے تمام کتابوں کے حوالے بھی بغیر میری کسی امداد کے نکالے، پھر ان کے اقتباسات لے کر خود ہی ایک تحریر لکھ دی، اب جو تحریر دیکھی تو میری نظر میں بالکل کافی وافی تھی، اس لئے اسی پر تصدیق لکھ دی، وہ بھیج رہا ہوں۔ والسلام

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۴/شوال ۱۳۷۸ھ

جواب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

تراویح، استسقاء اور کسوف کے علاوہ دُوسری نفلوں کی جماعت اگر بالتداعی ہو تو بہرصورت مکروہِ تحریمی ہے، خواہ وہ نفلیں رمضان میں پڑھی جائیں یا غیرِ رمضان میں، یہی مسلک عام فقہاء محدثین کا ہے، اور اسی پر سلف صالحین کا فتویٰ اور تعامل رہا ہے۔

۱:- بدائع الصنائع میں ہے:-

اذا صلّوا التراویح ثم أرادوا أن یصلّوها ثانیًا یصلّون فرادی لا بجماعة، لأن الثانیة

تطوع مطلق والتطوع المطلق بجماعة مکروه. (۱) (بدائع ج:۱ ص:۲۹۰)

علامہ ابنِ نجیمؒ فرماتے ہیں:-

ولو صلّو التراویح، ثم أرادوا أن یصلّوا ثانیًا یصلّون فرادی. اهـ.

(۲) (البحر الرائق ج:۲ ص:۷۴)

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:-

ولو صلّوا التراویح ثم أرادوا أن یصلّوا ثانیًا یصلّون فرادی. کذا فی التاتارخانیة.

(۳) (عالمگیریه ج:۱ ص:۱۲۳)

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:-

صلّوا بجماعة، ثم أرادوا اعادتها بالجماعة یکره، لأن النفل بجماعة علی التداعی یکره الا بالنص. اهـ. (۴) (بزازیة علی هامش الهندیة ج:۴ ص:۳۱)

مذکورۃ الصدر نصوص سے معلوم ہوا کہ تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ جائز نہیں، اور بدائع و فتاویٰ بزازیہ میں اس کی علت کی تصریح بھی فرمادی گئی کہ دُوسری مرتبہ پڑھی جانے والی تراویح نفل مطلق (یعنی وہ نفل جس کے اندر جماعت کی نص نہیں ملتی) ہوجائے گی، اور نفل مطلق جماعت کے ساتھ مکروہ (تحریمی) ہے، تو معلوم ہوا کہ حضراتِ فقہاءؒ کے نزدیک نفل کی جماعت (علی التداعی) بہرصورت مکروہ ہے۔ خواہ رمضان میں ہو یا غیر رمضان میں، کیونکہ اگر رمضان کی نفلیں علی الاطلاق اس حکم سے مستثنیٰ ہوتیں تو تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ ناجائز نہ ہوتا، کما هو ظاهر۔

۲:- علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاریؒ خلاصۃ الفتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:-

ولو زاد علی العشرین بالجماعة یکره عندنا بناء علی أن صلوٰة التطوع بالجماعة مکروه. (۵) (خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۶۳)

اگر رمضان کی نفلیں جماعت کے ساتھ علی الاطلاق جائز ہوتیں تو بیس سے زیادہ رکعتیں بالجماعۃ مکروہ نہ ہوتیں۔

۳:- درمختار میں ہے:-

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) البحر الرائق ج:۲ ص:۶۸ (طبع ایچ ایم سعید).
(۳) الفتاویٰ الهندیة فصل فی التراویح ج:۱ ص:۱۱۶ (طبع مکتبه حقانیه پشاور)
(۴) الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة (الباب الثالث فی التراویح) ج:۴ ص:۲۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۵) (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

ولا يصلى الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان أى يكره ذلك على سبيل التداعى بأن يقتدى أربعة بواحد، كما فى الدرر. (شامى ج:۱ ص:۶۶۳) (۱)

علامہ ابنِ عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

والنفل بالجماعة غير مستحب، لأنه لم تفعله الصحابة فى غير رمضان. (رد المحتار ج:۱ ص:۶۶۴) (۲)

علامہ کاسانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:-

الجماعة فى التطوع ليست بسنة الا فى قيام رمضان وفى الفرض واجبة أو سنة مؤكدة. (بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۹۸) (۳)

محقق ابنِ ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

وقد صرح الحاكم أيضًا فى باب صلوٰة الكسوف من الكافى بقوله "ويكره صلوٰة التطوع جماعة ما خلا قيام رمضان وصلوٰة الكسوف." (فتح القدير ج:۱ ص:۴۳۸) (۴)

نصوصِ مذکورہ بالا میں صلوٰۃ النفل بالجماعۃ کی کراہت کے حکم سے قیامِ رمضان کو مستثنیٰ کیا گیا، اور تراویح کے بجائے قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے عموم سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ حکم صرف غیرِ رمضان کے لئے مخصوص ہے، لیکن دراصل یہ قیامِ رمضان کا لفظ (عرفِ فقہاء کے اعتبار سے بالخصوص مسئلۂ جماعت میں) عام نہیں، بلکہ تراویح کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ اِن شاء اللہ ہم عنقریب بالتفصیل بیان کریں گے، واللہ الموفق۔

۴:- حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ شرحِ مؤطا میں فرماتے ہیں کہ:-

قال الزرقانى رحمه الله ظاهره (أى حديث أفضل الصلوٰة صلوٰتكم فى بيوتكم الا المكتوبة) يشمل كل نفل، لكنه محمول على ما لا يشرع له التجميع كالتراويح والعيدين. اهـ. (اوجز المسالک ج:۲ ص:۷) (۵)

حضرت الشیخ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ شرحِ ابوداؤد میں لکھتے ہیں:-

فان خير صلاة المرء وهٰذا عام لجميع النوافل والسنة الا النوافل التى من شعائر الاسلام كالعيد والكسوف والاستسقاء، قلت: وهٰذا يدل على أن صلوٰة التراويح فى البيت أفضل، والجواب عن الذين قالوا بأفضليتها فى المسجد جماعة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ذٰلك لخوف الافتراض، فاذا زال الخوف بوفاته عليه السلام ارتفع المانع، وصار

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۲۸ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۲) رد المحتار ج:۲ ص:۴۹ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۳) (طبع ايچ ايم سعيد).
(۴) فتح القدير باب الاستسقاء ج:۲ ص:۵۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه)
(۵) (طبع مكتبه حقانيه ملتان).

فعله فی المسجد أفضل ....، فاشبه صلاة العید. (۱) (بذل المجهود ج:۲ ص:۳۳۶)

ان نصوص میں لفظِ تراویح استعمال کیا گیا ہے، قیامِ رمضان نہیں کہ اس کے عموم سے عمومِ حکم کا شبہ ہو۔

۵:- عنایہ شرحِ ہدایہ میں ہے:-

(فصل فی قیام شهر رمضان) ذکر التراویح فی فصل علٰی حدة لاختصاصها بما لیس لمطلق النوافل. (۲) (عنایة علٰی هامش الفتح ج:۱ ص:۳۳۳)

البحر الرائق میں ہے:-

(تحت قول الکنز "وسن فی رمضان عشرون رکعة" .... الخ) بیان لصلوٰة التراویح، وانما لم یذکرها مع السنن المؤکدة قبل النوافل المطلقة لکثرة شعبها ولاختصاصها بحکم من بین سائر السنن والنوافل وهو الأداء بجماعة. (۳) (البحر الرائق ج:۲ ص:۷۱)

اس سے معلوم ہوا کہ تراویح کا جماعت سے ادا کیا جانا تمام سنن ونوافل کے مقابلے میں اسکی خصوصیت ہے۔

۶:- فتاویٰ قاضی خان میں ہے:-

ویستحب أداءها (أی التراویح) بالجماعة، وقال مالک والشافعی رحمهما الله تعالٰی فی القدیم: الانفراد أفضل کسائر السنن. انتهٰی. وفیه بعد ذٰلک: والصحیح ان اداءها بالجماعة فی المسجد أفضل، لأن فیه تکثیرا للجماعة، وکذٰلک فی المکتوبات. (۴) (خانیة علٰی هامش الهندیة ج:۱ ص:۲۱۳)

پہلی نص میں اشارہ فرمادیا گیا کہ تراویح اور چند اور منصوص سنن کے علاوہ تمام سنن میں ہم بھی شوافع وغیرہم کے قدیمی قول سے متفق ہیں کہ اس میں انفراد افضل ہے۔ دُوسری نص میں فرمایا گیا کہ تراویح اس حکم میں مکتوبات کی شریک ہے، اگر رمضان کی بقیہ نفلوں میں بھی جماعت جائز ہوتی تو تصریح کردی جاتی۔

۷:- حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں:-

"جماعت نوافل کی سوائے ان مواقع کے جو حدیث سے ثابت ہیں، مکروہِ تحریمی ہے، فقہ میں لکھا ہے کہ اگر تداعی ہو اور مراد تداعی سے چار آدمی کا ہونا ہے، پس جماعت صلوٰۃِ کسوف، استسقاء، تراویح کی دُرست اور باقی سب مکروہ ہیں، کذا فی کتب الفقه۔" (۵) (فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۸۹)

حضرت حکیم الاُمت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ شبینہ کے مفاسد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

---

(۱) (طبع معهد الخلیل الاسلامی کراچی).
(۲) عنایة علٰی هامش فتح القدیر ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۳) البحر الرائق ج:۲ ص:۶۶ (طبع ایچ ایم سعید).
(۴) الفتاویٰ الخانیة علٰی هامش الهندیة باب التراویح ج:۱ ص:۲۳۳ (طبع مکتبه حقانیه پشاور)
(۵) تالیفاتِ رشیدیہ مع فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۹۶ (ادارۂ اسلامیات لاہور)

''مثلاً اگر تراویح کے بعد یہ عمل ہو تو نفل کی جماعت مجمع کثیر کے ساتھ ہونا جو کہ مکروہ ہے۔''
(امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۰۰)[۱]

ان حضرات نے بالکل تصریح اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا کہ نفل کی جماعت (تراویح کے سوا) رمضان میں بھی اسی طرح ناجائز ہے جس طرح غیرِ رمضان میں۔

۸:- ان روایت کے علاوہ درایت بھی اسی کی مقتضی ہے کہ نفل باجماعت رمضان میں بھی جائز نہ ہو، اس لئے کہ تراویح کی جماعت خلافِ قیاس ہے، کیونکہ تراویح تطوّعات میں سے ہے اور تطوّعات میں اخفاء مطلوب ہے برخلاف فرائض کے، اسی لئے تطوّعات کو نہ صرف بلا جماعت، بلکہ گھر میں پڑھنا افضل ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:-

''صلوٰة المرء فی بیته أفضل من صلوٰته فی مسجدی هٰذا الا المکتوبة.''[۲]

تو ثابت ہوا کہ تراویح کی جماعت خلافِ قیاس ہے، اور یہ اُصولِ فقہ کا مُسلّمہ قاعدہ ہے کہ ''امر خلافِ قیاس اپنے مورد پر منحصر رہتا ہے'' اس پر قیاس کرکے کسی دُوسرے مسئلے کو اسی کے حکم میں کردینا جائز نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نوافل میں جماعت کا مورد کیا کیا ہیں؟ نوافل میں جماعت کا موردصلوٰۃ الکسوف، صلوٰۃ الاستسقاء اور صلوٰۃ العیدین (علٰی قول من عدهما من النوافل) اور صلوٰۃ التراویح ہیں، رمضان کی کسی اور نفل مثلاً تہجد وغیرہ میں کہیں کسی سے جماعت منقول نہیں۔ البتہ ایک دو روایتیں اس قسم کی ملتی ہیں، لیکن وہاں پر جماعت لاعلیٰ سبیل التداعی ہے، جو باتفاق بہرصورت جائز ہے، مثلاً حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا وہ مشہور واقعہ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں مشغول تھے، تو میں آپؐ کے بائیں پہلو میں جاکر کھڑا ہوگیا تو حضورؐ نے مجھے (ایک روایت کے مطابق ہاتھ سے) پکڑ کر دائیں جانب گھمادیا۔ اس میں مقتدی صرف حضرت ابنِ عباسؓ ہیں، چنانچہ حضرت شیخ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تقریر ترمذی میں ہے کہ:-

وبین التّراویح والتهجد فی عهده علیه السلام لم یکن فرق فی الرّکعات بل فی الوقت والصفة أی التراویح تکون بالجماعة فی المسجد بخلاف التّهجد. (العرف الشذی ج:۱ ص:۲۳۰)

اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

''اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو ہمیشہ منفرداً پڑھتے تھے، کبھی بہ تداعی جماعت نہیں فرمائی، اگر کوئی شخص آکھڑا ہوا تو مضائقہ نہیں جیسا کہ حضرت ابنِ عباسؓ خود ایک دفعہ آپؐ کے پیچھے جاکھڑے ہوئے تھے، بخلاف تراویح کے کہ اس کو چند بار تداعی کے ساتھ جماعت کرکے ادا کیا۔''
(فتاویٰ رشیدیہ ص:۳۰۷)

---

(۱) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۲۲ (طبع مکتبه دار العلوم کراچی)

(۲) سنن أبی داؤد باب صلوٰة الرجل التطوع فی بیته حدیث رقم:۱۰۴۴ ج:۱ ص:۲۷۴ (طبع دار الفکر).

جب یہ معلوم ہوگیا کہ نفل کی جماعت صرف تراویح، کسوف، استسقاء اور عیدین میں مشروع ہے تو بحکم مقدمہ ثانیہ دُوسری نوافل مثلاً تہجد وغیرہ میں اس حکم کو متعدی نہ کیا جائے گا کیونکہ اس میں جماعت منقول و مأثور نہیں، لہٰذا منصوصہ نوافل کے علاوہ تمام نوافل میں خواہ وہ رمضان میں ہوں یا غیر رمضان میں، جماعت بالتداعی مکروہِ تحریمی ہوگی۔

قیامِ رمضان کی تحقیق

حضرتِ شیخ مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استدلال میں وہ نصوص پیش فرمائی ہیں جو نمبر۳ میں اُوپر گزریں، اور اس کے علاوہ مؤطا امام مالک کی ایک عبارت پیش فرمائی ہے۔ ان سب میں مستثنیات میں ''قیامِ رمضان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ عینیؒ اور علامہ عسقلانیؒ کی عبارتیں پیش کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامِ رمضان سے مراد صرف تراویح نہیں، بلکہ ''ما یحصل به القیام'' مطلقاً مراد ہے، اور پھر نتیجہ دونوں کو ملا کر یہ نکالا ہے کہ فقہاء نے قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، اور عینی وعسقلانی کی عبارتوں سے اس کا عموم معلوم ہوتا ہے، لہٰذا رمضان کی ہر نفل میں جماعت جائز ہے۔ لیکن قیامِ رمضان کا لفظ لغوی اعتبار سے تو بے شک عام ہے، مگر عرف، عام فقہاء اور عام محدثین کا یہ ہے کہ اس کو صرف تراویح میں خاص کرتے ہیں، اور تراویح کے بعد قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ ہدایہ کی شرح میں علامہ بابرتیؒ نے یوں نقل کی ہے:-

وترجم بقیام رمضان اتباعا للفظ الحدیث قال صلی الله علیه وسلم: ان الله تعالٰی فرض علیکم صیامه وسننت لکم قیامه.(۱) (عنایة علی هامش الفتح ج:۱ ص:۳۳۳)

۱:- فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا مطلب (کہ قیامِ رمضان کے علاوہ دُوسری نوافل کی جماعت مکروہ ہے) عمدۃ القاری اور فتح الباری سے اخذ کرنے کے بجائے بہتر اور اَنسب یہ ہے کہ خود فقہاء کی عبارتوں سے اخذ کیا جائے، جو مسئلۂ زیرِ بحث میں نص کا درجہ رکھتی ہیں، بخلاف عمدۃ القاری اور فتح الباری کے، کہ ان کے پیشِ نظر اس مقام میں جماعت کی بحث نہیں، بلکہ حدیث ''من قام رمضان ایمانًا'' کی تشریح ہے، اس لئے ہم یہاں فقہاء کی وہ چند عبارتیں پیش کرتے ہیں جو مسئلۂ جماعت میں نص ہیں، اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مسئلۂ جماعت میں قیامِ رمضان سے مراد تراویح ہی ہے۔

الف:- علامہ مرغینانیؒ نے ہدایہ میں ''فصل فی التراویح'' کی جگہ ''فصل فی قیام رمضان'' کا عنوان لگا کر تراویح کے مسائل ذکر فرمائے ہیں، اور شارحینِ ہدایہ مثلاً محقق ابن الہمامؒ نے اس عنوان کے تحت قیامِ رمضان کی تشریح کرنے کے بجائے تراویح کی تفسیر شروع کردی:-

''(فصل فی قیام رمضان) التراویح جمع ترویحة''(۲) (فتح القدیر ج:۱ ص:۳۳۳)

---

(۱) عنایة علی هامش فتح القدیر فصل فی قیام شهر رمضان ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۲) فتح القدیر فصل فی قیام رمضان ج:۱ ص:۴۰۶ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

اور علامہ بابرتیؒ نے یہی عنوان لگا کر تراویح کو سنن ونوافل سے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ بیان کرنی شروع کردی (جیسا کہ اُوپر نمبر۵ میں گزرا)۔ (عنایہ بحوالہ مذکور)

ب:- ملک العلماء علامہ کاسانیؒ نے بدائع میں جہاں قیامِ رمضان کا لفظ استعمال کیا ہے، وہیں آگے چل کر دلالۃً اس کی تشریح فرمادی ہے، کہ مراد تراویح ہے، آپ نے فرائض ونوافل کے درمیان مابہ الفرق امتیازات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:-

ومنها ان الجماعة فی التطوع لیست بسنة الا فی قیام رمضان، وفی الفرض واجبة أو سنة مؤکدة.

پھر دو ہی سطروں کے بعد اس فرق کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

وانما عرفنا الجماعة سنة فی التراویح بفعل رسول الله صلی الله علیه وسلم واجماع الصحابة.(۱)

(بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۹۸)

اس کے علاوہ وہ مسئلہ کہ تراویح کا اعادہ جماعت کے ساتھ ناجائز ہے، اس سے بھی ثابت یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ بدائع نے قیامِ رمضان سے مراد تراویح لی ہے، اور وہ جماعتِ نفل کو رمضان و غیرِ رمضان دونوں میں ناجائز قرار دیتے ہیں، وھو ظاھر۔

ج:- علامہ شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:-

الفصل الخامس فی کیفیة النیة واختلفوا فیها، والصحیح أن ینوی التراویح أو السنة أو قیام اللیل.(۲)

(مبسوط للسرخسی ج:۲ ص:۱۴۵)

د:- فتاویٰ قاضی خان میں ہے:-

ان نوی التراویح أو سنة الوقت أو قیام اللیل فی رمضان جاز.(۳)

(خانیة علی هامش عالمگیریة ج:۱ ص:۲۱۶)

گویا ''قیام اللیل فی رمضان'' اور ''تراویح'' دونوں ہم معنی لفظ ہیں، تراویح کی نیت کرتے وقت ''تراویح'' کا لفظ استعمال کرلو یا ''قیامِ رمضان'' کا، برابر ہے۔

(جواب نمبر۲) احادیث وآثار میں بھی جہاں ''قیامِ رمضان'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں پر اس سے ''تراویح'' ہی مراد لیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ نہیں، مثلاً:-

الف:- عن سلمان الفارسی رضی الله عنه قال: خطبنا رسول الله صلی الله علیه وسلم

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید). (۲) (طبع دار المعرفة بیروت).

(۳) الفتاوی الخانیة علی هامش الهندیة فصل فی نیة التراویح ج:۱ ص:۲۳۶ (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

فی اٰخر یوم من شعبان، فقال: یا أیها الناس! قد أظلکم شهر عظیم، شهر مبارک، شهر فیه لیلة خیر من ألف شهر، جعل الله صیامه فریضة وقیامه تطوعا. (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی ص:۱۷۳)[1]

اور سننِ نسائی کی روایت میں ہے کہ: ''افترض الله علیکم صیامه سننت لکم قیامه'' یہاں پر ''قیام'' سے مراد ''تراویح'' کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ قیام سے اگر تہجد مراد لیا جائے گا تو ''قیامه تطوعا'' کا یہ جملہ بیکار ہوجائے گا، اس لئے کہ تہجد کے تطوّع ہونے میں رمضان کی کیا تخصیص ہے؟ وہ تو غیرِ رمضان میں بھی تطوّع ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں ''قیام'' سے مراد تراویح ہی ہے، اور اس ''قیام'' سے تراویح ہی مراد لینے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ اس حدیث کو تراویح کے اثبات میں نقل فرماتے ہیں:-

(کما فی الفتح ج:۱ ص:۳۳۳،[2] والبزازیة ص:۳۱،[3] ومراقی الفلاح علی هامش الطحطاوی علی المراقی ص:۲۳۴[4]).

ب:- عن السائب بن یزید الصحابی قال: کانوا یقومون علی عهد عمر رضی الله عنه بعشرین رکعة وعلی عهد عثمان وعلی رضی الله عنهما مثله.

(عمدة القاری بحواله بیهقی ج:۵ ص:۲۶۷)[5]

اس حدیث کا سیاق وسباق واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں قیام سے مراد تراویح ہے، اور حنفیہ رحمہم اللہ اس حدیث کو تراویح کی بیس رکعت ہونے پر استدلال میں پیش کرتے ہیں، کما فی العمدۃ۔

۳:- عام طور پر شراحِ حدیث بھی ''قیامِ رمضان'' سے مراد ''تراویح'' ہی لیتے ہیں، چنانچہ:-

الف:- صحیح مسلم میں اس طرح عنوان قائم فرمایا گیا ہے، (اگرچہ وہ تراجم، امام مسلمؒ کے قائم کردہ نہیں ہیں، تاہم یہ تراجم مستند محدثین نے لگائے ہیں)۔

باب الترغیب فی قیام رمضان وهو التراویح. (صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۵۹)[6]

ب:- حضرتِ شیخ مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز تقریر ترمذی میں لکھتے ہیں:-

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) فتح القدیر ج:۱ ص:۴۱۶ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۳) البزازیة علی هامش الهندیة ج:۴ ص:۲۹ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).
(۴) حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص:۲۲۴، ۲۲۵ (طبع نور محمد کتب خانه).
(۵) عمدة القاری (طبع دار الفکر).
(۶) (طبع قدیمی کتب خانه).

باب ما جاء فی قیام شهر رمضان أی التراویح. (العرف الشذی ج: ۱ ص: ۳۲۹)[۱]

ج:- حضرتِ شیخ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تقریر ترمذی میں نص فرماتے ہیں:-

باب فی قیام رمضان، هٰذا القیام کان عاما ثم اختص بالتراویح، فمطلقه یراد به التراویح. (الکوکب الدری ج: ۱ ص: ۲۶۷)[۲]

د:- مؤطا امام محمدؒ کی وہ عبارت جو حضرتِ شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں تحریر کی گئی ہے، اس کے سیاق وسباق سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر جو امام محمدؒ نے ''قیام شہر رمضان'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے مراد تراویح ہی ہے، عبارت یہ ہے:-

قال محمد: وبهٰذا کله نأخذ، لا بأس بالصلوٰة فی شهر رمضان أن یصلی الناس تطوعا بامام، لأن المسلمین قد اجمعوا علیٰ ذٰلک.[۳]

اس مسئلہ کی جو دلیل پیش کی گئی ہے (یعنی مسلمانوں کا اجماع) وہ صرف تراویح ہی پر صادق آتی ہے، غیرِ تراویح پر نہیں، کیونکہ غیرِ تراویح میں جماعت پر اجماع تو درکنار، اس کا نفسِ ثبوت ہی منقول نہیں، اس لئے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ادوارِ مبارکہ میں کہیں غیرِ تراویح میں بالتداعی جماعتِ نفل کا ثبوت نہیں ملتا۔

بہرکیف! ان تمام نصوص سے جو ہم نے اس سلسلے میں اب تک پیش کیں، کم از کم اتنی بات تو بہرصورت ثابت ہوجاتی ہے کہ جہاں فقہاء وغیرہ نے قیامِ رمضان کو کراہتِ جماعت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، وہاں پر تراویح ہی مراد لیا ہے۔ اگرچہ فی نفسہٖ ''قیام رمضان'' کا لفظ جو حدیث ''من قام رمضان .... الخ'' میں مذکور ہے، وہ ہر نماز اور فعلِ طاعت کو عام اور شامل ہے۔

مسئلہ زیر بحث اور علامہ عینیؒ

مندرجہ بالا عبارتیں وغیرہ تو اس بارے میں تھیں کہ ''قیام اللیل فی رمضان'' جس میں جماعت کو جائز قرار دیا گیا ہے، اس سے مراد تراویح ہی ہے، لیکن چند شراحِ حدیث نے قیامِ رمضان کو عام قرار دیا ہے، جیسا کہ شارحِ بخاری علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ جن کی عبارت کا حوالہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ ''قیام اللیل فی رمضان'' عام ہے تراویح وغیرِ تراویح سب کو، ''ما یحصل

---

(۱) العرف الشذی علی جامع الترمذی ص: ۳۰۸ (طبع قدیم، مکتبه رحیمیه سهارنپور).

(۲) (طبع ایچ ایم سعید).

(۳) المؤطا للامام محمد رحمه الله ص: ۱۴۳ (طبع قدیمی کتب خانه).

بہ القیام مطلقًا" کے تحت قیامِ رمضان میں داخل مانا جائے گا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو وضاحت کے ساتھ یہ بات سامنے آجائے گی کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول حدیث "من قام رمضان ایمانًا واحتسابًا غفر لہٗ" کی تشریح کے تحت آیا ہے، اس لئے اس کا حاصل یہ ہے کہ قیامِ رمضان پر جو ثواب اس حدیث میں موجود ہے، وہ صرف تراویح ہی پر نہیں، بلکہ مطلق ہر نماز پر جو رمضان کی رات میں ادا کی جائے، ثواب حاصل ہوگا۔ اس جگہ اس بحث سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ جماعت سے ادا کی جائے یا بلا جماعت، یہی وجہ ہے کہ یہاں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلۂ جماعت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، بلکہ اس مسئلہ کا ذکر علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے "باب صلوٰۃ اللیل" میں کیا ہے، اس میں ان کی عبارت یہ ہے:-

(حدیث: "صلوا أیها الناس فی بیوتکم، فان أفضل الصلوٰة صلوٰة المرء فی بیته" کے تحت فرماتے ہیں:)

واستثنی من عموم الحدیث عدة من النوافل ففعلها فی غیر البیت أکمل، وهی ما تشرع فیه الجماعة، کالعیدین، والاستسقاء والکسوف.

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں:-

قال الامام حمید الدین الضریر: نفس التراویح سنة، اما ادائها بالجماعة فمستحب.

پھر ایک سطر کے بعد ہے:-

وفی جوامع الفقه: التراویح سنة مؤکدة، والجماعة فیها واجبة، وفی الروضة لأصحابنا ان الجماعة فضیلة، وفی الذخیرة لأصحابنا عن أکثر المشائخ أن اقامتها بالجماعة سنة علی الکفایة. (۱) (عمدة القاری ج:۵ ص:۲۶۷)

خلاصہ یہ ہے کہ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں قیامِ رمضان کے عموم کو ذکر کیا ہے، وہاں مسئلۂ جماعت ذکر نہیں کیا، اور جہاں مسئلۂ جماعت بیان فرمایا ہے وہاں مستثنیات میں قیامِ رمضان کو ذکر نہیں کیا، بلکہ بلفظ "تراویح" ذکر فرمایا ہے، لہٰذا ان کے قول سے کہ یہ قیام شہر رمضان کا لفظ عام ہے، تراویح کے سوا دُوسری نوافلِ رمضان کی جماعت جائز ہونے پر استدلال غیر صحیح ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس بحث میں درحقیقت فقہاء علیہم الرحمۃ میں کوئی اختلاف نہیں، سب کے نزدیک جماعت صرف تراویح کی جائز ہے، البتہ کلام اس میں ہے کہ حدیث "من قام رمضان ایمانًا" میں جو فضیلت موجود ہے، وہ صرف تراویح کے لئے مخصوص ہے یا مطلق صلوٰۃ

(۱) مذکورہ تمام عبارات عمدة القاری (طبع داراحیاء التراث بیروت) کے اسی صفحہ (ج:۵ ص:۲۶۷) پر موجود ہیں۔

پر وہ فضیلت حاصل ہوگی؟ اس میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے عموم کا قول اختیار فرمایا ہے، اور علامہ نووی اور علامہ کرمانی رحمہما اللہ نے دُوسرا (علٰی ما ذکرہ العینیؒ)۔ اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو جماعتِ دیوبند میں ابوحنیفۂ عصر کا لقب رکھتے تھے، ان کا فتویٰ جمہور علماء وفقہاء کی تحقیق کے عین مطابق ہے، اس کو قولِ مرجوح پر عمل قرار دینا فہمِ عاجز سے بالاتر ہے۔

رہا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجرِ مکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہ العزیز کا عمل، تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عمل تو معلوم نہیں، البتہ حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اتنی بات یقین کے درجے میں معلوم ہے کہ آپؒ نے شروع میں تہجد کی جماعت لاعلیٰ سبیل التداعی ایک دو افراد کے ساتھ کی تھی، لیکن بعد میں جب لوگ زیادہ آنے لگے تو اسی کراہت کی وجہ سے آپؒ نے ساری رات تراویح کا معمول بنالیا تھا، عموماً آٹھ دس پارے تراویح میں جماعت سے پڑھے جاتے تھے اور تراویح ہی سحری کے وقت ختم کی جاتی تھی، جس کے شاہد دیوبند میں آج بھی سینکڑوں حضرات ہوں گے، واللہ أعلم بحقیقۃ الحال۔

ایک ضروری گزارش

آخر میں گزارش ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی عظمتِ شان، جلالتِ قدر اور علمی تبحر کے پیشِ نظر تو اس مسئلہ پر قلم اُٹھانے کی جرأت کسی بڑے عالم کو بھی نہیں ہونی چاہئے، چہ جائیکہ مجھ جیسا طفلِ مکتب اس پر کچھ لکھے۔ لیکن الحمدللہ جماعتِ دیوبند کی خصوصیت اور انہی بزرگوں کی تعلیم وتلقین نے ہمیں یہ صراطِ مستقیم دِکھائی کہ مسائلِ شرعیہ میں آزادانہ اظہارِ رائے ترکِ ادب نہیں، بلکہ شاگردوں کا اظہارِ خیال انہی بزرگوں کا معنوی فیض ہوتا ہے۔ اس لئے بنامِ خدا تعالیٰ جو کچھ اس میں تحقیق سے مجھے واضح ہوا وہ لکھ دیا، اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ بزرگوں کی شان میں ادنیٰ ترکِ ادب سے بھی مجھے محفوظ رکھیں، آمین۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ، وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ، وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین.

احقر العباد
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
متعلم دار العلوم کراچی نمبر ۱۴
۳ر شوال ۱۳۷۸ھ - ۱۳ر اپریل ۱۹۵۹ء

للہ در المجیب حیث أصاب فیما أجاب وأجاد فیما أفاد، مع ملاحظۃ ادب الأکابر، وفقہ اللہ تعالٰی لما یحب ویرضٰی.

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
صدر دار العلوم کراچی نمبر ۱۴
۸ر شوال ۱۳۷۸ھ

﴿فصل فی التراویح﴾
(تراویح اور شبینہ سے متعلق مسائل)

چار تراویح کے بعد وقفے میں کیا پڑھنا چاہئے؟

سوال:- تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد کیا آیت پڑھی جاتی ہے؟ یہ سنت ہے یا واجب یا مستحب؟ اور یہ آیات صرف امام صاحب پڑھیں یا مقتدی بھی؟ زبانی یاد نہ ہو تو دیکھ کر پڑھ سکتے ہیں؟

جواب:- تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد عام رکعتوں کی مقدار بیٹھنا مستحب ہے، اس وقفے میں کوئی خاص ذکر واجب یا مسنون نہیں ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اس میں چاہے کچھ تسبیحات پڑھ لے، چاہے الگ نفلیں پڑھے اور چاہے تو خاموش رہے۔[1] اور مشائخ کا معمول یہ ہے کہ اس میں یہ تسبیح پڑھتے ہیں: "سبحان ذی الملک والملکوت، سبحان ذی العزة والعظمة والقدرة والکبریاء والجبروت، سبحان الملک الحی الذی لا یموت، سبوح قدوس رب الملائکة والروح، لا الٰہ الّا اللہ نستغفر اللہ نسألک الجنة ونعوذ بک من النار" (کذا فی رد المحتار من القهستانی)۔[2] اور یہ تسبیح آہستہ پڑھنی چاہئے امام کو بھی اور مقتدی کو بھی۔ واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۱ھ

تراویح پر اُجرت کا مسئلہ

سوال:- میں زیادہ تر باہر رہتا ہوں اور پاکستان میں کبھی کبھی آتا ہوں، اس سال یہاں نمازِ تراویح پڑھنے کا اتفاق ہوا، سوال یہ ہے کہ ایک نوجوان حافظ جس کی عمر ۲۵ سال کے قریب ہے، مستند حافظ ہے، قراءت بھی قابلِ اعتراض نہیں ہے، خود اپنی تجارت کرتے ہیں بلکہ خود اکثر و بیشتر مسجد کی مدد کرتے ہیں، اور مسجد سے کسی قسم کی اُجرت نہیں لیتے، لیکن کچھ لوگ اس سے خوش نہیں ہیں، اور باہر سے رمضان کے لئے حافظ لانا چاہتے ہیں، اور ان کو ختمِ قرآن پر رقم بھی دینی پڑے گی، کیا یہ جائز ہے؟

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۶ یجلس ندبا بین کل أربعة بقدرها .... ویخیرون بین تسبیح وقراءة وسکوت وصلوٰة فرادی.

(۲) وفی الشامیة ج:۲ ص:۴۶ (طبع ایچ ایم سعید) (قوله بین تسبیح) قال القهستانی: فیقال ثلاث مرات: "سبحان ذی الملک ، الملکوت .... الخ".

جواب: – اُجرت پر تراویح پڑھانے کے لئے کسی حافظ سے معاملہ کرنا قطعاً ناجائز ہے،[1] اور جب مسجد کے حافظ صاحب بلا اُجرت نماز پڑھاتے ہیں اور لوگ بھی ان سے خوش ہیں تو خواہ مخواہ باہر سے اُجرت پر حافظ بلوانا بالکل نادُرست ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۸/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۷۸ ج)

تراویح پر اُجرت لینا

سوال: – رمضان میں حافظِ قرآن کے لئے لوگ چندہ جمع کرتے ہیں، اس کو کپڑے وغیرہ دیتے ہیں، یا پہلے سے پیسے مقرّر کرکے حافظ کو لاتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب: – تراویح پڑھانے کے لئے اُجرت مقرّر کرنا بالکل ناجائز ہے،[2] اگر بغیر اُجرت کے حافظ نہ ملتا ہوتو "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ .... الخ" سے تراویح پڑھی جائے۔ ہاں! اگر کسی اُجرت کے بغیر کسی حافظ نے تراویح پڑھائی اور کوئی شخص اپنی خوشی سے بطورِ ہدیہ اس کو کچھ پیش کرے تو اس کا لینا دینا جائز ہے، لیکن اوّل تو آج کل اس کا اتنا التزام کیا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک طرح سے طے شدہ اُجرت بن جاتی ہے، ایسے التزام سے پرہیز لازم ہے۔ دُوسرے اس غرض کے لئے چندہ کرنے میں بہت سے مفاسد ہیں، اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲۱/۱۰/۱۴۰۱ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۰۰ ج)

تراویح پر اُجرت لینے کا حکم

سوال ۱: – احقر قرآن مجید حفظ کرلینے کے بعد اپنے ملکی رواج کے مطابق تراویح میں قرآن مجید سنا کر رقم لیتا رہا، چند سالوں سے توبہ کی ہے اور رقم لینا چھوڑ دیا۔ لی ہوئی رقم حقوق العباد میں داخل تو نہیں؟ کیا صرف اللہ تعالیٰ سے توبہ کافی ہے؟ واضح رہے کہ احقر اس دوران میں صاحبِ نصاب نہ تھا، نیز ختم والی رات سے پہلے اشرافِ نفس بھی ہوتا تھا۔

۲: – امسال رمضان المبارک میں ختم والی رات رقم لینے سے انکار کردیا، لیکن اس کے بعد کچھ

---

(۱) وفی الشامیة ج:۶ ص:۵۶ ویمنع القاری للدنیا، والآخذ والمعطی اثمان. فالحاصل ان ما شاع فی زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا یجوز، لأن فیه الأمر بالقراءة واعطاء الثواب للآمر والقراءة لأجل المال، فاذا لم یکن للقاری ثواب لعدم النیة الصحیحة فأین یصل الثواب الی المستأجر، ولو الأجرة ما قرأ أحد لأحد فی هذا الزمان جعلوا القران العظیم مکسبا ووسیلة الی جمع الدنیا، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ. نیز دیکھئے: امداد المفتین ص:۳۶۵، و فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۶۲ و ۲۹۸، و امداد الاحکام ج:۱ ص:۶۵۴.

(۲) دیکھئے حوالہ سابقہ۔

آدمی مخفی طور پر احقر کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کی خدمت اس لئے نہیں کرتے کہ آپ نے قرآن مجید سنایا، بلکہ طالبِ علم جان کر بطورِ ہدیہ یا صدقہ کے دیتے ہیں، تو احقر نے ان کے اصرار پر کچھ رقم قبول کی، کیونکہ اس سے پہلے احقر کو کسی قسم کا اشراف وانتظار اس رقم کا نہ تھا۔

وہ رقم میرے لئے حرام تو نہیں تھی؟ اگر حرام تھی تو اس سے خلاصی کی کیا صورت ہے؟

جواب ۱:- تراویح سنانے پر اُجرت لینا ناجائز ہے،[1] لہٰذا یہ رقم اس کے اصل مالکوں کو واپس کرنا ضروری ہے، جن جن لوگوں تک پہنچانا وسعت میں ہو ان کو پہنچایا جائے یا ان سے معاف کرایا جائے، اور جہاں پہنچانا وسعت سے باہر ہو، اس کے لئے توبہ و اِستغفار کیا جائے۔

۲:- صورتِ مسئولہ میں جو رقم لے لی گئی وہ اُجرت نہیں، ہدیہ ہے جس کا وصول کرنا جائز ہے۔

واللہ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۱/۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۳۳۷/۱۸ الف)

شبینہ کا حکم

سوال:- ایک شخص شبینہ کا انتظام کرتا ہے، یعنی متعدّد حفاظِ قرآن کو دعوت دے کر ایک ہی رات میں قرآن ختم کیا جاتا ہے، بعض نوافل میں تلاوت کرتے ہیں اور دیگر اس کی اقتداء کرتے ہیں، اور بعض بلا اقتداء تلاوت کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- جس قسم کے شبینہ کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے اس کا اہتمام مکروہ ہے، کیونکہ وہ نوافل کی جماعت اور ایک رات میں قرآنِ کریم ختم کرنے پر مشتمل ہے، اور یہ دونوں مکروہ ہیں۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۹/۲/۵ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۲/۲۱۹ الف)

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص: ۴۶۰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۱۔

۱:- تراویح پر اُجرت کا مسئلہ

۲:- جماعت کے ساتھ فرض نہ پڑھنے والا تراویح میں امام بن سکتا ہے یا نہیں؟

سوال ۱:- تراویح کے لئے پیسے طے کرنا حرام ہے، مگر مولانا تھانویؒ و دیگر کچھ حضرات کہتے ہیں اگر طے نہ کیا جائے، لوگ خوشی سے دے دیں تب بھی جائز نہیں، جس کے بعض صحابہؓ سے دلائل دیتے ہیں، مگر وہ حافظ جو طے نہیں کرتے خوشی سے جو دیتے ہیں، لے لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وہ ہدیہ ہے جو لینا سنت ہے، تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آیا حافظ پیسے، جوڑا، جوتا خوشی سے دیا ہوا لے سکتا ہے یا ناجائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟

۲:- کوئی حافظ گھر سے دیر میں پہنچا، مسجد میں جماعت ہوچکی، اس نے انفرادی نماز پڑھی تو کیا تراویح یا وتر پڑھا سکتا ہے؟

جواب ۱:- تراویح پر اُجرت لینا طے کرکے بھی حرام ہے،(۱) اور اگر زبانی طور پر طے نہ کیا جائے لیکن عرف و رواج ایسا ہو کہ زبانی طے کئے بغیر بھی لینا دینا طے سمجھا جاتا ہو تو اس صورت میں بھی ناجائز ہے،(۲) البتہ اگر نہ زبانی طے کیا ہو، نہ عرفاً طے سمجھا جاتا ہو، نہ حافظ کے دِل میں تراویح پڑھانے کا محرک یہ ہو کہ کچھ ملے گا، اس کے بعد اگر مسجد والے اپنی خوشی سے کچھ دے دیں تو لینے کی گنجائش ہے۔

۲:- پڑھا سکتا ہے۔(۳)

واللہ اعلم

۱۰/۱۰/۱۳۹۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰/۱۶۸۰ د)

۲۳ویں رات میں سورۂ عنکبوت اور رُوم پڑھنا

سوال:- ہمارے دیار میں رمضان کی تیئیسویں رات کو تراویح کے بعد سورۂ عنکبوت اور سورۂ رُوم نمبر۲۰، نمبر۲۱ پڑھنے کا رواج ہے، کیا ان سوَر کے پڑھنے کا ثبوت ہے یا نہیں؟

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ۔

(۲) وفی الشامیة ج:۳ ص:۱۳۰ (طبع سعید) المعروف کالمشروط.

(۳) وفی الشامیة، مبحث التراویح ج:۲ ص:۴۸ (طبع سعید) لو صلیت بجماعة الفرض وکان رجل قد صلّی الفرض وحده، له أن یصلیها مع ذلک الامام، لأن جماعتهم مشروعة، فله الدخول فیها معهم لعدم المحذور.

وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۱۷ صلّی العشاء وحده، فله أن یصلی التراویح مع الامام .... الخ. وفی غنیة المتملی ص ۴۱۰ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) لو صلّی العشاء وحده، فله أن یصلّی التراویح مع الامام وهو الصحیح .... الخ.

نیز دیکھئے: کفایت المفتی ج:۳ ص:۳۹۳ (جدید ایڈیشن دارالاشاعت)۔

جواب:- ہمارے علم میں اس کا کوئی ثبوت نہیں، نہ اس کی پابندی کی کوئی شرعی بنیاد ہے۔

واللہ اعلم

۱۰/۱۲/۱۳۹۷ھ

شبینہ کا حکم

سوال:- رمضان المبارک میں شبینہ سننا یا سنانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- قرآن شریف جتنا زیادہ سے زیادہ تلاوت کیا جائے اتنا ہی موجبِ ثواب و خیر و برکت ہے، خواہ نماز میں ہو یا غیرِ نماز میں، نماز میں اور زیادہ ثواب ہے، لیکن نفلی نماز کی جماعت دو تین آدمیوں سے زیادہ کی مکروہ ہے،(۱) بغیر جماعت کے تنہا، یا دو تین آدمیوں کی جماعت میں پورا قرآن شریف تین یا زیادہ راتوں میں ختم کرنا بہت بڑا ثواب کا کام ہے، لیکن جس طرح کے شبینے اب رائج ہوگئے ہیں کہ نفلی جماعت کے لئے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے اور جماعت بھی تین سے زیادہ آدمیوں کی ہوتی ہے، جو لوگ نماز میں شامل نہیں ہوتے وہ باتیں کرتے رہتے ہیں، یا مٹھائی وغیرہ کے انتظام میں لگے رہتے ہیں، قرآن شریف سننے کی طرف دھیان نہیں کرتے، یہ ناجائز ہے۔ واللہ اعلم

۱۰/۱۲/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۴۹/ ۲۸ ج)

شبینہ کا حکم

سوال ۱:- شعبان کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ کو شبینہ کیا جاتا ہے، اس میں حفاظ پارے پڑھتے ہیں، ایسے شبینہ میں نیت باندھ کر امام کی اقتداء میں قرآن سننے کا کیا حکم ہے؟ کیا اس طرح قرآن سننا جائز ہے؟ ۲:- شبینہ میں قرآن پڑھنا اور اس میں حصہ لینا کیا حکم رکھتا ہے؟ ۳:- اس مسجد میں حاضر رہنا اور شبینہ کے کاموں میں تعاون و امداد کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب ۱ تا ۳:- حنفی مسلک میں نوافل کی جماعت مکروہِ تحریمی ہے۔(۲) لہٰذا مذکورہ شبینہ

---

(۱) وفی غنیة المتملی ج:۱ ص:۴۱۱ واعلم ان النفل بالجماعة علی سبیل التداعی مکروه علی ما تقدم ما عدا التراویح .... الخ. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ (قبیل باب ادارک الفریضة) ولا یصلّی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان أی یکره ذٰلک علی سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد کما فی الدرر، وکذا فی فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج:۴ ص:۲۲۴ و ص:۲۴۸.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ (طبع سعید) (قبیل باب ادارک الفریضة) ولا یصلّی الوتر ولا التطوع بجماعة خارج رمضان أی یکره ذٰلک علی سبیل التداعی بأن یقتدی أربعة بواحد. وفی غنیة المتملی ص:۴۳۲ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) واعلم ان النفل بالجماعة علی سبیل التداعی مکروه علی ما تقدم ما عدا التراویح .... الخ.

(محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

جائز نہیں۔ ایسے شبینہ کا انتظام و اہتمام، اس میں امامت یا اقتداء یا اس میں لوگوں کو دعوت دینا یہ تمام باتیں شرعاً جائز نہیں۔ واللہ اعلم

۲۹/۸/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۸۸۶/۲۸ ج)

شبینہ کا حکم، جائز شبینہ کس طرح ہوسکتا ہے؟

سوال ۱:- آج کل جو رمضان شریف میں شبینہ ہوتے ہیں، اکثر حفاظ نوافل میں پڑھتے ہیں اور بعض نابالغ بچوں سے پڑھواتے ہیں جبکہ مقتدی بالغ ہوتے ہیں، اور لاؤڈ اسپیکر بھی استعمال ہوتا ہے جس سے اہلِ محلّہ کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں، نیز سننے والے چند اشخاص ہوتے ہیں، اکثر چائے پانی میں مشغول ہوتے ہیں، اور شور وشغب کا بازار گرم رہتا ہے، نیز ان شبینوں کی سرپرستی علماء کو بھی کرتے دیکھا ہے، کیا مروّجہ شبینہ جائز ہے؟ ۲:- شبینہ کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ ۳:- کیا جہری نماز میں لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا زیادہ ثواب ہے جبکہ آواز دُور دُور تک جاتی ہے؟

جواب ۱:- جس قسم کے شبینے کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، وہ بلاشبہ مکروہِ تحریمی ہے اور اس میں ثواب کے بجائے اُلٹا گناہ ہے، اوّل تو نوافل کی جماعت مکروہِ تحریمی ہے،[1] پھر نابالغ کی اقتداء،[2] بلاضرورت لاؤڈ اسپیکر کا استعمال اور شور وشغب کے ذریعے قرآنِ کریم کی بے ادبی، یہ سب اُمور سخت منکرات ہیں اور ان سے پرہیز لازم ہے۔

۲:- جائز شبینہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ تراویح کی جماعت رات بھر جاری رہے، اس میں امام بالغ اور متشرّع ہو، تین دن سے کم میں قرآنِ کریم ختم نہ کیا جائے، تمام لوگ ذوق وشوق اور خشوع و خضوع کے ساتھ قرآنِ کریم سنتے ہوں، زائد روشنی اور چراغاں سے پرہیز کیا جائے، بلاضرورت لاؤڈ اسپیکر کا استعمال نہ ہو اور نام ونمود سے کلی اجتناب کیا جائے۔ واللہ اعلم

۹/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۹۲۲/۲۸ ج)

شبینہ کے جواز کی شرائط

سوال:- مساجد میں رمضان المبارک میں شبینہ ہوتا ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، بعض جائز۔ شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟ شبینہ کے جواز کی شرائط براہ کرم بتادیں۔

---

(۱) دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۲۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۷۷، ۵۷۸ ولا یصح اقتداء رجل بامرأة وخنثی وصبی مطلقا ولو فی جنازة ونفل علی الأصح، وفی الشامیة تحته والمختار أنه لا یجوز فی الصلوات کلها .... الخ.

جواب: – شبینہ تراویح میں ہو، نفلوں میں نہ ہو۔ فضول خرچی، شور وشغب اور نام ونمود سے احتراز کیا جائے، اور اس کی فرائض و واجبات کی طرح پابندی نہ کی جائے تو جائز ہے، اور ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو ناجائز ہے۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۸/۹/۲۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۲۰۰۱ ج)

تراویح میں تین بار سورۂ اِخلاص پڑھنا

سوال ۱: – کسی مسجد کے امام صاحب فرماتے ہیں کہ تراویح میں آخری پارہ میں سورۂ اِخلاص تین مرتبہ پڑھنا دُرست ہے، جبکہ زید کہتا ہے کہ سورۂ اِخلاص کا تین مرتبہ پڑھنا بدعت ہے۔ (سند بہشتی زیور جلد گیارہ)۔

۲: – امام نے تراویح کی دو رکعت کی نیت باندھی، لیکن دُوسری رکعت میں التحیات پڑھے بغیر کھڑا ہوگیا، تقریباً پانچ سیکنڈ کے بعد امام صاحب پھر بیٹھ گئے، اور حسبِ معمول دونوں رکعتیں پوری کرکے سلام پھیر دیا۔ زید کا یہ اعتراض ہے کہ امام صاحب کے گھٹنے اور کمر سیدھی ہوگئی، لہٰذا چار رکعت پوری کرکے سجدۂ سہو کرکے چار پوری کرنی چاہئے تھی۔ صحیح مسئلہ کیا ہے؟

جواب ۱: – جماعت کی نماز میں کسی آیت یا سورت کو بار بار پڑھنا فقہاء نے مکروہ لکھا ہے،[2] اور آج کل تراویح میں سورۂ اِخلاص کو تین بار پڑھنے کا جو التزام کرلیا گیا ہے کہ اسے سنت سمجھتے ہیں، اس سے اس کے بدعت ہونے کا بھی اندیشہ ہے، لہٰذا اس عمل سے پرہیز ہی کرنا چاہئے۔ بہشتی گوہر میں مسئلہ صحیح ہے اور امداد الفتاویٰ ج:اوّل ص:۳۰۴ میں بھی اسی پر فتویٰ ہے۔[3]

۲: – امام صاحب نے جو عمل کیا وہ دُرست ہے، دو رکعت کی فرض نماز میں اور سنن ونوافل میں پوری طرح کھڑے ہونے کے بعد بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ زید نے جو مسئلہ بیان کیا وہ چار رکعت کی فرض نماز کے قعدۂ اُولیٰ سے متعلق ہے، صورتِ مسئولہ سے اس کا تعلق نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۲۸ ج)

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۶۳ حاشیہ نمبر۱۔

(۲) وفی الهندية ج:۱ ص:۱۰۷ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) اذا كرّر اية واحدة مرارًا .... ان كان فى الصلوٰة المفروضة فهو مكروه فى حالة الاختيار وأما فى حالة العذر والنسيان فلا بأس. هكذا فى المحيط. وكذا فى غنية المتملى ص:۴۹۴ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور). نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۶۶۵ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

(۳) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۲۷، ۳۲۸ (طبع مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

تراویح میں قرآن پڑھے جانے کے باوجود الگ سے "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے تراویح پڑھنا

سوال:- ایک مسجد میں تراویح میں باقاعدہ ختمِ قرآن ہوتا ہے اور بلا اُجرت، لیکن اسی مسجد میں کچھ لوگ "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے تراویح پڑھتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جب مسجد میں ایک حافظ صاحب قاعدے میں تراویح میں قرآنِ کریم سنا رہے ہیں تو ان کی تراویح کی موجودگی میں "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ .... الخ" سے الگ تراویح بلا عذر نہ پڑھنی چاہئے، ہاں! اگر کوئی عذر ہو تو اسے بالتفصیل لکھ کر مسئلہ دوبارہ معلوم کرلیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

تراویح کو ضروری نہ سمجھنا اور بلا عذر تراویح ترک کرنا

سوال:- ایک صاحب کہتے ہیں کہ تراویح سنت ہے، پڑھے یا نہ پڑھے کوئی گناہ نہیں۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعتِ مطہرہ میں کیا حکم ہے؟

جواب:- تراویح سنتِ مؤکدہ ہے، اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ پڑھے یا نہ پڑھے کچھ گناہ نہیں، بالکل غلط ہے۔ جو صاحب ایسا کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔[1] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۱/۴ھ

تراویح میں ایک مرتبہ ختمِ قرآن سنت ہے

سوال:- ایک مسجد میں دو جگہ تراویح بیک وقت ہوتی ہے، ان دونوں کی قراءتیں مختلط ہوکر سہو کی وجہ بن جاتی ہیں۔ ان دو اماموں میں سے ایک امام الحی ہے جو "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" سے اختصار کے ساتھ پڑھتا ہے، قوم کی اکثریت امام الحی کے ساتھ ہے، اور دُوسرا حافظِ قرآن ہے، وہ ختم کرتا ہے، اپنے عزیز واقارب کو سمجھا کر شریک کرتا ہے، اور قوم کو یہ کہتا ہے کہ یہ مختصر تراویح نہیں ہوتی۔ امام الحی کہتا ہے کہ جب قوم پر ختمِ قرآن ثقیل ہو تو اس کا ترک افضل ہے۔ الأفضل فی زماننا قدر ما لا یثقل علی القوم۔ اور کہتا ہے کہ ختمِ قرآن ضرورتِ دین سے نہیں ہے، اور جب ضروریاتِ دین سے نہ ہو تو اس کو ترک کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) فی الهندية ج:۱ ص:۱۱۲ رجل ترک سنن الصلوٰة ان لم یر السنن حقا فقد کفر. لأنه ترکها استخفافا، وان راها حقا فالصحیح انه یأثم، لأنه جاء الوعید بالترک، وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۴۹ (طبع ایچ ایم سعید) رجل ترک سنن الصلوات الخمس ان لم یر السنن حقا فقد کفر لأنه ترک استخفافًا وان رای حقا منهم من قال لا یأثم والصحیح انه یأثم، لأنه جاء الوعید بالترک اهـ. وراجع أیضًا الشامیة ج:۱ ص:۱۰۴ (محمد زبیر)

جواب:- قال فی الدر: والختم مرة سُنّة ومرتين فضيلة وثلاثًا أفضل، ولا يترک الختم لكسل القوم لٰكن فی الاختيار الأفضل فی زماننا قدر ما لا يثقل عليهم، وأقره المصنف وغيره، وفی المجتبٰی عن الامام لو قرأ ثلاثًا قصارًا أو اٰية طويلة فی الفرض فقد أحسن ولم يسيئ فما ظنک بالتراويح؟ (الٰی) من لم يكن عالمًا بأهل زمانه فهو جاهل، وأقره الشامی (۱)
ج: ۱ ص: ۴۷۵۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ تراویح میں ایک مرتبہ قرآنِ کریم ختم کرنا سنت ہے، اور یہ جو فقہاء نے لکھا ہے کہ جب مقتدیوں پر طویل قراءت ثقیل ہو اس وقت چھوٹی سورتوں سے تراویح پڑھنی چاہئے، یہ بالکل مجبوری کی صورت میں ہے، یہ مجبوری ہمارے زمانے میں ایسی نہیں ہے کہ اس کی بناء پر مسجدوں میں اس سنت کو ترک کردیا جائے، بلکہ تمام مساجد میں قرآنِ کریم ختم ہوتا ہے اور مقتدی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، لہٰذا اس سنت کو مساجد میں بغیر مجبوری کے ترک نہ کرنا چاہئے، بالخصوص جبکہ قرآنِ کریم سنانے کے لئے حافظ موجود ہے تو امام الحی کو چاہئے کہ تراویح اس سے پڑھوائے اور خود "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ" سے پڑھنے پر اصرار نہ کرے، معاملہ دین کا ہے اس میں خواہ مخواہ انتشار پیدا کرنا دُرست نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۹/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹۹۷/ ۲۷ ہ)

تراویح سے متعلق متعدّد مسائل

۱:- پہلے سے طے کئے بغیر تراویح کے اختتام پر کچھ دینا

۲:- بچے کو سامع بنانا

۳:- حافظ صاحب کا لقمہ قبول نہ کرنا

۴:- اختتام پر پہلی رکعت میں سورۂ ناس اور دُوسری رکعت میں سورۂ بقرہ کا ابتدائی حصہ پڑھنا

سوال ۱:- رمضان میں تراویح جو حافظ پڑھاتے ہیں، وہ رقم مقرّر کرکے پڑھتے ہیں تو کیا نماز جائز ہوگی؟ اگر رقم مقرّر نہ کی گئی ہو اور تراویح کے خاتمے پر کچھ رقم دے دی جائے تو وہ نماز جائز ہوگی یا نہیں؟

---

(۱) الدر المختار ج: ۲ ص: ۴۷ (طبع ایچ ایم سعید).

۲:- حافظ صاحب اپنا سامع ساتھ لائیں جو ایک بچہ ہو، اور تراویح میں سوجائے یا ایسی حرکتیں کرے جس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور لقمہ بھی نہ دے، تو ان حافظ صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟

۳:- اگر حافظ صاحب لقمہ قبول نہ کریں اور متکبرانہ الفاظ استعمال کریں کہ میں ٹھیک پڑھتا ہوں، اگر وہ غلط بھی پڑھیں تو لقمہ نہ لیں، تو کیا یہ نماز جائز ہوگی؟

۴:- اگر سورۂ ناس پہلی رکعت میں پڑھی جائے اور سورۂ بقرہ دُوسری رکعت میں تو اس سے نماز ٹھیک ہوگی یا نہیں؟

۵:- اگر پیش امام، نماز میں لقمہ قبول نہ کرے تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے؟ جبکہ وہ بار بار غلطیاں کرتا ہو۔

جواب ۱:- اُجرت طے کر کے تراویح سنانا بالکل ناجائز ہے،[1] اس سے بہتر ہے کہ لوگ عام امام کے پیچھے "اَلَمْ تَرَ کَیفَ" سے تراویح پڑھ لیں۔ جو حافظ اُجرت لے کر تراویح سناتا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، البتہ جو نماز اس کے پیچھے پڑھ لی وہ ہوگئی، اعادہ واجب نہیں۔

پہلے سے طے کئے بغیر تراویح کے اختتام پر کچھ دے دینا جائز ہے، بشرطیکہ یہ بات اتنی معروف ومشہور نہ ہوگئی ہو کہ طے کئے بغیر بھی طے سمجھی جاتی ہو۔

۲:- بچے کو سامع بنا کر پہلی صف میں کھڑا کرنے کی ضرورۃً گنجائش ہے، اس بچے سے اگر کبھی غلطی ہوجائے تو درگزر کرنا اور فہمائش کرنا چاہئے، محض اس بناء پر امام یا حافظ کے خلاف فتنہ کھڑا کرنا دُرست نہیں۔

۳:- حافظ صاحب کو صحیح لقمہ قبول کرنا چاہئے اور اس کو ذاتی عزّت و وقار کا مسئلہ نہیں بنانا چاہئے، البتہ اس سے نماز میں خلل نہیں آتا، تاوقتیکہ حافظ صاحب نے کوئی مفسدِ صلوٰۃ غلطی نہ کی ہو۔

۴:- ٹھیک ہوگی، اس میں کوئی گناہ نہیں، البتہ ختمِ قرآن کے علاوہ دُوسری نمازوں میں بہتر یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ ناس نہ پڑھے۔[2]

۵:- نماز کا صحیح ہونا یا نہ ہونا غلطیوں کی نوعیت پر منحصر ہے، بعض غلطیوں سے نماز فاسد ہوجاتی

---

(۱) دیکھئے حوالہ سابقہ ص:۴۶۰ حاشیہ نمبر۱۔

(۲) وفی غنیة المتملی شرح المنیة ص:۴۹۴ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) وفی الولوالجیة: من یختم القران فی الصلاة اذا فرغ من المعوذتین فی الرکعة الأولیٰ یرکع ثم یقوم فی الرکعة الثانیة ویقرأ بفاتحة الکتاب وشیٔ من سورة البقرة، لأن النبی صلی الله علیه وسلم قال: خیر الناس الحال المرتحل، أی الخاتم المفتتح.

ہے اور بعض سے نہیں ہوتی، لہٰذا ہر غلطی کا حکم الگ پوچھنا چاہئے، اور جو حافظ صاحب کثرت سے غلطیاں کرتے ہوں اور صحیح لقمہ بھی قبول نہ کرتے ہوں ان کے بجائے کوئی اچھے حافظ صاحب تلاش کرنے چاہئیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بعض غلطیاں مفسدِ نماز کر جائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۱۹/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۶۷ ج)

داڑھی منڈانے والے کی اقتداء میں تراویح پڑھنا

سوال:- رمضان میں اکثر حافظ جو مساجد میں قرآن شریف سناتے ہیں، داڑھی نہیں رکھتے یا ان کی شرعی داڑھی نہیں ہوتی، تو کیا اس قسم کے حفاظ کے پیچھے نماز ہوسکتی ہے؟ فرض نماز اور نمازِ تراویح دونوں کے لئے از رُوئے فقہِ حنفی کیا حکم ہے؟

جواب:- جو شخص داڑھی منڈاتا ہو یا شرعی مقدار سے کم داڑھی رکھتا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔[1] تراویح اور فرض نمازوں کا ایک ہی حکم ہے، البتہ جو نماز ایسے شخص کے پیچھے پڑھ لی گئی وہ ادا ہوگئی۔[2] واللہ سبحانہ اعلم

۱۳/۱۰/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۳۹/۱۲۳۸ ہ)

کھڑے ہوکر تراویح پڑھنے کے بعد عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھنا

سوال:- سنا ہے چاہے کوئی بوڑھا ہو یا جوان اگر وہ نمازِ تراویح شروع ہی سے کھڑے ہوکر پڑھنی شروع کردے تو تمام نمازِ تراویح کھڑے کھڑے ہی ادا کرنا ہوگا، کسی بھی حالت میں بیٹھ کر پوری کرنا جائز نہیں، جبکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں، اگر عذر ہو تو بیٹھ سکتا ہے۔

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۵۹، ۵۶۰ (طبع ایچ ایم سعید) ویکرہ امامة عبد .... وفاسق، وفی الشامیة (قوله وفاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من یرتکب الکبائر. وکذا فی البحر الرائق ج:۱ ص:۳۴۸. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۴۸ واما الأخذ منها وهی دون ذلک کما یفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم یبحه أحد، وأخذ کلها فعل یهود الهنود ومجوس الأعاجم .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۲ (طبع ایچ ایم سعید) صلّی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة .... الخ.

جواب: - آپ نے ٹھیک سمجھا ہے، اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تراویح کھڑے ہوکر شروع کرنے کے بعد کسی بھی حالت میں بیٹھ کر پوری کرنا جائز نہیں، وہ دُرست نہیں کہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت عذر پر موقوف ہے، اگر عذر شروع ہی سے ہو تو شروع ہی سے بیٹھ کر نماز پڑھے، اور اگر بیچ میں پیش آئے تو بیچ میں بیٹھ جانا بھی جائز ہے۔[1]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۷۱ ج)

تراویح کی رکعتوں کی تعداد

سوال: - حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ تراویح پڑھی ہیں یا بیس؟ اور بیس تراویح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تراویح کے بارے میں مختلف روایات ہیں، صحابہ کرامؓ کا اس پر اتفاق ہے کہ تراویح بیس رکعتیں پڑھی جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو جاننے والا صحابہؓ سے زیادہ کوئی نہیں ہوسکتا، اس لئے بیس رکعات تراویح پڑھنا چاہئے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفی مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج: ۱ ص: ۲۲۹ (ولو مرض فی أثناء الصلوٰة بنی بما قدر) یعنی لو شرع فی الصلوٰة صحیحًا قائمًا فحدث به مرض یمنعه عن القیام صلّی ما بقی قاعدًا یرکع ویسجد، ولو افتتحها قاعدًا للعجز یرکع ویسجد فقدر علی القیام بنی قائمًا عند الشیخینؒ. وفیه أیضًا ج: ۱ ص: ۲۰۱ ولو قعد بعد ما افتتحه قائمًا جاز عند الامام استحسانًا لأنه أسهل من الابتداء ویکره لو بلا عذر عنده .... الخ.

(۲) وفی مصنف ابن أبی شیبة ج: ۲ ص: ۳۹۴ عن ابن عباسؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یصلّی فی رمضان عشرین رکعة. وکذا فی التعلیق الحسن ص: ۵۲. وفی تلخیص الحبیر فی أحادیث الرافعی الکبیر ج: ۲ ص: ۵۰۹ (حدیث) أنه صلی الله علیه وسلم صلّی بالناس عشرین رکعة لیلتین، فلما کان فی اللیلة الثالثة اجتمع الناس فلم یخرج الیهم ثم قال من الغد: خشیت أن تفرض علیکم فلا تطیقوها. وفی کنز العمال: فصلّی بهم عشرین رکعة. ص: ۲۸۴. وفی السنن للبیهقی ج: ۲ ص: ۴۹۶ عن یزید بن خصیفة عن سائب ابن یزید قال: کانوا یقومون علی عهد عمر بن الخطاب فی شهر رمضان بعشرین رکعة. وفی آثار السنن ج: ۲ ص: ۵۵ عن عبدالعزیز بن رفیع وفی مؤطا امام مالک ص: ۴۰ عن یزید بن رومان أنه قال: کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب بثلاث وعشرین رکعة. وفی عمدة القاری ج: ۱۱ ص: ۳۷ ان عبدالله بن مسعود کان یصلّی عشرین رکعة. وراجع أیضًا فتح الباری ج: ۴ ص: ۲۱۹، وآثار السنن ج: ۱ ص: ۵۵، والشامیة ج: ۲ ص: ۴۵ وغنیة المتملی ص: ۴۰۶ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور) وغنیة الطالبین ص: ۴۶۴ و الجوهر النقی ج: ۲ ص: ۴۹۶ والمفاتیح لأبواب التراویح، امداد الأحکام ج: ۱ ص: ۶۳۷. (محمد زبیر)

تراویح میں شرکت کے لئے عورتوں کا مسجد جانا

سوال:- یہاں رمضان میں عورتوں کا خیال ہے کہ مسجد میں جاکر حافظ صاحب کا تراویح میں قرآن سنیں، وہاں پردے کا انتظام ہوگا، مردوں کی صفوں کے بعد عورتوں کے لئے پردے کا انتظام ہوگا، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- عورتوں کا مسجد میں جاکر جماعت میں شریک ہونا مکروہِ تحریمی ہے، اور اس سے کوئی نماز مستثنیٰ نہیں، خاص طور سے مردوں کی تلاوتِ قرآن سننے کا مقصد موجودہ حالات میں زیادہ تر حسنِ صوت ہوتا ہے، جو اور زیادہ موجبِ فتنہ ہے، وکرہ لهن حضور الجماعة الا للعجوز فی الفجر والمغرب والعشاء، والفتویٰ الیوم علی الکراهة فی کل الصلوٰة لظهور الفساد، کذا فی الکافی عالمگیریة ج:۱ ص:۹۳۔[1]

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۱/۲/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۴۲ الف)

---

(۱) الهندیة ج:۱ ص:۸۹ (طبع مکتبه حقانیه پشاور) وکذا فی الدر المختار ج:۱ ص:۵۶۵، ۵۶۶.

﴿فصل فی الوتر﴾
(وتر سے متعلق مسائل)

وتر کا وقت اور طریقہ

سوال: – وتر کس طرح اور کب پڑھتے ہیں؟ اس کی کتنی رکعتیں ہیں اور ان تمام باتوں کے دلائل کیا ہیں؟

جواب: – وتر کا وقت عشاء کی نماز کے فوراً بعد شروع ہوجاتا ہے، اور فجر سے پہلے کسی بھی وقت پڑھ سکتے ہیں۔[1] اس کی تین رکعتیں ہیں، دو رکعتوں پر قعدہ کرکے التحیات پڑھیں اور کھڑے ہوجائیں، پھر تیسری رکعت میں بھی سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت ملائیں،[2] اس کے بعد کانوں تک ہاتھ اُٹھاکر دُعائے قنوت پڑھیں۔[3]

اور وتر سے پہلے عشاء کی دو رکعتیں سنتِ مؤکدہ ہیں،[4] اور بعد میں دو رکعات نفل ہیں، اور جو شخص تہجد میں اُٹھنے کا عادی ہو، اس کے لئے افضل یہ ہے کہ وتر تہجد کے وقت پڑھے،[5] اور ان تمام باتوں کے دلائل مفصل کتابوں میں موجود ہیں، یہ فتویٰ میں پوچھنے کی بات نہیں۔ واللہ اعلم

(فتویٰ نمبر ۱۵۶/ ۲۸ الف)

---

(۱) وفی الدر المختار کتاب الصلوٰۃ ج:۱ ص:۳۶۱ (طبع سعید) (و) وقت (العشاء والوتر منه الی الصبح ولکن لا یصح ان (یقدم علیها الوتر).

(۲) وفی التنویر مع شرحه ج:۲ ص:۵ (طبع سعید) وهو ثلاث رکعات بتسلیمة ویقرأ فی کل رکعة منه فاتحة الکتاب وسورة .... الخ.

(۳) وفی اثار السنن باب رفع الیدین عند قنوت الوتر ص:۱۲۹ (مکتبه امدادیه ملتان) عن عبدالله أنه کان یقرأ فی اٰخر رکعة من الوتر قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ثم یرفع یدیه فیقنت قبل الرکعة. رواه البخاری. وفی الدر المحتار ج:۲ ص:۲ باب الوتر والنوافل (طبع ایچ ایم سعید) ویکبّر قبل رکوع ثالثة رافعًا یدیه کما مرّ .... وقنت فیه.

(۴) وفی الدر المختار باب الوتر والنوافل ج:۲ ص:۱۲، ۱۳ (طبع سعید) (وسن) مؤکدًا أربع قبل الشهر .... ورکعتان .... بعد العشاء.

(۵) (والمستحب) .... تأخیر الی اٰخر اللیل لواثق بالانتباه، والا فقبل النوم. الدر المختار کتاب الصلوٰۃ ج:۱ ص:۳۶۹ (طبع سعید). وفی الشامیة تحته أی یستحب تأخیره، لقوله صلی الله علیه وسلم من خاف أن لا یوتر من اٰخر اللیل فلیوتر أوله، ومن طمع أن یقوم اٰخره فلیوتر اٰخر اللیل فان صلوٰۃ اٰخر اللیل مشهودة وذلک أفضل رواه مسلم والترمذی وغیرهما، وتمامه فی الحلیة وفی الصحیحین "اجعلوا اٰخر صلاتکم وترا" والأمر للندب بدلیل ما قبله بحر.

شافعی امام کے پیچھے حنفی کے وتر پڑھنے کا حکم

سوال:- شافعی امام کے پیچھے وتر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جائز ہے تو کن شرائط کے تحت؟ براہِ کرم تفصیلی طور پر آگاہ فرمائیں۔

جواب:- شافعی کے پیچھے حنفی کی اقتداء چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

۱:- حنفی کے مذہب کے مطابق شافعی کی نماز میں کوئی مفسدِ نماز فعل نہ ہو۔

۲:- حنفی مقتدی کو یقین ہو کہ شافعی امام جائز و ناجائز کے اہم مختلف فیہ مسائل میں احتیاط سے کام لیتا ہے، مثلاً بہتے ہوئے خون کے نکلنے سے وضو کر لیتا ہے، اور اگر اسے اس کا یقین ہو کہ امام احتیاط نہیں کرتا تو نماز صحیح نہ ہوگی، اور اگر اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں کہ احتیاط کرتا ہے یا نہیں، تو نماز مکروہ ہوگی۔

۳:- وتر میں اقتداء کرنے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ تین رکعتوں کو دو سلاموں کے ساتھ نہ پڑھے (جیسا کہ ان کا مذہب ہے)، اور اس میں مقتدی کو اپنا قنوت "اللّٰھم انا نستعینک .... الخ" رُکوع کے بعد پڑھنا چاہئے، پہلے نہیں، کیونکہ شافعی امام بھی رُکوع کے بعد پڑھے گا، اور اس مسئلے میں اس کی متابعت کرنا ضروری ہے۔

ان تمام مسائل کے دلائل کتبِ فقہ سے حسبِ ذیل ہیں:-

۱:- درمختار میں ہے: ومخالف كشافعي (يعني يكره الاقتداء به) لكن في وتر البحر ان تيقن المراعاة لم يكره، أو عدمها لم يصح وان شك كره. اور علامہ شامیؒ اس کے تحت فرماتے ہیں: هذا هو المعتمد، لأن المحققين جنحوا اليه، وقواعد المذهب شاهدة عليه، وقال كثير من المشائخ: ان كان عادته مراعاة مواضع الخلاف جاز والا فلا، ذكره السندي.
(شامی ج:۱ ص:۵۲۶)[1]

(ومثله في شرح الكنز للعيني ج:اوّل ص:۴۶)[2]۔

۲:- درمختار میں ہے: (وصح الاقتداء فيه) (يعني الوتر) ففي غيره أولى ان لم يتحقق منه ما يفسدها في اعتقاده في الأصح كما بسطه في البحر (بشافعي) مثلًا (لم يفصله بسلام) لا ان فصله (على الأصح) فيهما للاتحاد وان اختلف الاعتقاد. (رد المحتار ج:اوّل ص:۶۲۵)[3]

---

(۱) شامي ج:۱ ص:۵۶۲، ۵۶۳ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۲) رمز الحقائق، شرح العيني على كنز الدقائق، باب الوتر والنوافل ج:۱ ص:۴۵ (طبع ادارة القرآن كراچی)
(۳) الدر المختار باب الوتر والنوافل ج:۱ ص:۷، ۸ (طبع سعيد).

۳:- فی الدر المختار: ویأتی المأموم بقنوت الوتر ولو بشافعی یقنت بعد الرکوع، لأنه مجتهد فیه، وقال الشامیؒ تحت قوله: (ولو بشافعی .... الخ) أی ویقنت بدعاء الاستعانة لا دعاء الهدایة. وقال تحت قوله (لأنه مجتهد فیه .... الخ) والظاهر أن المراد من وجوب المتابعة فی قنوت الوتر بعد الرکوع المتابعة فی القیام فیه لا فی الدعاء. (شامی ج:اوّل ص:۶۲۶)(۱)

تنبیہ:- جوشرط ہمارے یہاں شافعی کے پیچھے اقتداء میں ہے کہ کوئی مفسدِ نماز لازم نہ آئے، وہی شرط شافعی حضرات کے یہاں حنفی کے پیچھے نماز پڑھنے میں ہے، جیسا کہ علامہ عینیؒ نے شرحِ کنز میں لکھا ہے: الشافعی أیضًا یقول بمثله فی حق الحنفی فیقول: لا یجوز اقتداء الشافعی الحنفی الا اذا کان یحتاط فی موضع الخلاف۔

پھر چند سطروں کے بعد ہے: یجوز اقتداء الحنفی بالشافعی والشافعی بالحنفی وکذا بالمالکی والحنبلی ما لم یتحقق من امامه ما یفسد صلوٰته فی اعتقاده. (عینی ج:۱ ص:۴۶)۔(۲)

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۲۰/۱۲/۱۳۷۹ھ

الجواب صحیح

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۳)

۱۴/جون ۱۹۶۰ء

شافعی کے پیچھے حنفی کا وتر پڑھنا

سوال:- جناب مولانا تقی صاحب! ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے، افریقہ میں اکثر شافعی مسجدیں ہیں، وہاں حنفی مسلک کے لوگ بھی نماز پڑھتے ہیں، جب وتر کا مسئلہ آتا ہے تو حنفی اگر شافعی مسلک کے امام کے پیچھے تراویح کے بغیر وتر پڑھیں تو صحیح ہے یا علیحدہ جماعت کرنا ضروری ہے؟ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کا جواب مندرجہ ذیل پتے پر دیں۔ ٹکٹ کے پیسے لفافے کے اندر نہیں بھیجے کیونکہ یہ قانوناً جرم ہے۔

احمد رحمت اللہ

(دار السلام، تنزانیہ)

جواب:- شافعی حضرات چونکہ وتر دو سلاموں کے ساتھ پڑھتے ہیں اور حنفی مسلک میں اس

---

(۱) شامی ج:۲ ص:۸، ۹ (طبع سعید).

(۲) شرح العینی علی الکنز المسمّٰی برمز الحقائق باب الوتر والنوافل ج:۱ ص:۴۵ (طبع ادارة القرآن کراچی).

(۳) یہ فتویٰ حضرتِ والا دامت برکاتہم کی تمرینِ افتاء (درجۂ تخصص) کی کاپی سے لیا گیا ہے۔

طرح نماز نہیں ہوتی،[1] اس لئے حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ وتر میں ان کے ساتھ شامل نہ ہوں، بلکہ اپنی نماز علیحدہ ادا کریں، تراویح ان ہی کے ساتھ ادا کرلیا کریں اور وتر کے وقت علیحدہ ہوجائیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۹/۹/۱۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۱/۱۶۰۹ ج)

مسجد میں دو جگہ تراویح ہونے کی بناء پر وتر کی دو جماعتوں کا حکم

سوال:- مسجد میں دو جگہ تراویح، اندر اور چھت پر ہوتی ہیں، سب نمازی اندر والے امام کی اقتداء میں فرض پڑھتے ہیں، البتہ وتر کی جماعتیں اندر اور چھت پر علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں، کیونکہ تراویح کی دونوں جماعتیں الگ الگ وقت پر ختم ہوتی ہیں، کیا اس طرح وتر کی دو جماعتیں کرانا جائز ہے؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں الگ الگ وتر کی جماعتیں جائز ہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۱۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۴۷ ج)

وتر میں دُعائے قنوت بھول جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- وتر میں دُعائے قنوت بھول جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب:- دُعائے قنوت واجب ہے،[2] اگر وہ بھولے سے چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۷/۱۲/۴ھ

الجواب صحیح

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۸/۱۴۰۰ الف)

---

(۱) فی البحر الرائق ج:۲ ص:۳۹، ۴۰ وظهر بهذا أن المذهب الصحيح صحة الاقتداء بالشافعيؒ فی الوتر ان لم يسلم علىٰ رأس الركعتين وعدمها ان سلم. والله الموفق للصواب. وفی الدر المختار ج:۲ ص:۷، ۸ وصح الاقتداء فيه بشافعی مثلًا (لم يفصله بسلام) لا أن فصله (على الأصح فيهما) للاتحاد وان اختلف الاعتقاد. وفی رد المحتار (قوله: على الأصح فيهما) أی فی جواز أصل الاقتداء فيه بشافعی، وفی اشتراط عدم فصله خلافًا لما فی الارشاد من أنه لا يجوز أصلا باجماع أصحابنا .... الخ.

(۲) وفی الدر المختار باب الوتر والنوافل ج:۲ ص:۹ (ولو نسيه) أی القنوت .... (سجد للسهو).

﴿فصل فی قضاء الفوائت﴾
(قضا نمازوں سے متعلق مسائل کا بیان)

حیض کی مخصوص صورت کی بناء پر نمازوں کی قضاء

سوال: – ایک عورت کو حیض کا خون ڈھائی دن مسلسل آتا ہے، اس کے بعد معمولی سا آنے لگتا ہے، تین دن کے بعد بالکل بند ہوجاتا ہے، پھر چوتھے دن بالکل خون نظر نہیں آتا، پانچویں دن دوپہر کو تھوڑا سا آکر بند ہوجاتا ہے۔ عورت نماز، روزہ کس طرح ادا کرے؟

جواب: – صورتِ مسئولہ میں یہ پانچوں دن حیض شمار ہوں گے، ان کی نمازیں معاف ہیں اور روزوں کی قضا فرض ہے، اور اگر اس کی ہمیشہ عادت ایسی ہی ہے، تب تو وقتِ موقوف میں اسے نہ نماز پڑھنی چاہئے، نہ روزہ رکھنا چاہئے، اور اگر ہمیشہ عادت ایسی نہیں، پہلی بار ایسا ہوا ہے تو چونکہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ پاکی کے بعد پھر خون آئے گا، اس لئے اگر وہ غسل کرکے روزہ رکھے گی تو گناہ نہ ہوگا، البتہ یہ روزے معتبر نہ ہوں گے، ان کی قضا لازم ہوگی۔ واللہ اعلم

۱۶/۱۰/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۶۱/ ۲۸ ج)

فوت شدہ نمازوں کی قضا لازم ہے

سوال: – جوانی کے عالم میں، میں دین کی طرف سے غافل رہا اور بہت ساری نمازیں قضا ہوتی رہیں، میں ہر ادا نماز کے ساتھ اسی وقت کی ''قضائے عمری'' کی نیت سے فرض (اور وتر بھی) ادا کرتا رہا ہوں کہ شاید اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں گردن بچ جائے۔

میں حال ہی میں ایک کتاب ''مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت'' جو چار جلدوں پر مشتمل ہے، منگوا کر پڑھ رہا ہوں۔ مرحوم علامہ حبیب الرحمٰن کاندھلوی اس کے مؤلف ہیں، پہلی جلد کے مقدمے میں ''موضوع احادیث کی معرفت کے اُصول'' میں تحریر کیا گیا ہے کہ جس حدیث میں ''قضائے عمری'' کے بارے میں تذکرہ ہو وہ حدیث جھوٹی ہوگی، علامہ حبیب الرحمٰن صاحب نے یہ بات شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی کتاب ''عجالۂ نافعہ'' سے نقل کی ہے۔ میں پہلی جلد کے مقدمے کے کچھ حصے کی

فوٹو اسٹیٹ کاپی ارسالِ خدمت کر رہا ہوں (صفحہ:۳۱، پیراگراف:۵) یہ کتاب پڑھنے کے بعد میں نے قضائے عمری پڑھنا موقوف کر دیا ہے کہ کہیں یہ بدعت کے زُمرے میں نہ آجائے۔ آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

جواب:- محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، میں سفر پر ہونے کی وجہ سے جواب قدرے تأخیر سے دے رہا ہوں، اس لئے معذرت خواہ ہوں۔

مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی صاحب مرحوم اب دُنیا میں نہیں ہیں، لہٰذا ان کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے، لیکن دینی ضرورت کی وجہ سے اتنا کہے بغیر چارہ نہیں کہ وہ غیر متوازن، انتہاپسند ذہن کے حامل تھے، جس کی بناء پر انہیں اپنے انفرادی نظریات پر اتنا اصرار تھا کہ وہ ساری اُمت کے علماء، فقہاء اور محدثین میں سے کسی کو خاطر میں لانے کے لئے تیار نہ تھے، چنانچہ انہوں نے متعدّد مسائل میں جمہور اُمت سے الگ راستہ اختیار کیا۔

قضائے عمری کے بارے میں جو بات انہوں نے لکھی ہے، وہ بھی ایسی ہی ہے، اُمت کے جمہور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جو نمازیں قضا ہوگئی ہوں حتی المقدور ان کی ادائیگی لازم ہے، حدیث میں فوت شدہ نمازوں کے قضا کرنے کا حکم ہے، اور اس میں کم یا زیادہ کی کوئی تفصیل نہیں، یہ بات بھی واضح ہے کہ پچھلے گناہوں سے توبہ کا لازمی حصہ یہ ہے کہ جن غلطیوں کی تلافی ممکن ہو، ان کی تلافی کی جائے، لہٰذا آپ جو قضائے عمری پڑھتے تھے، وہ دُرست تھی، اور اسے بدعت سمجھ کر چھوڑنا دُرست نہیں ہے، آپ یہ عمل جاری رکھیں۔[1]

والسلام

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۱/۵/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۴۳۴/۷۷)

قضائے عمری کی شرعی حیثیت

سوال:- ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ درسِ قرآن دیتے ہوئے اس بات پر بہت زور دیتی ہیں کہ ''قضائے عمری'' کا جو مسئلہ لوگوں میں مشہور ہے کہ اگر کسی شخص نے بہت عرصے تک نمازیں نہ پڑھی ہوں، پھر وہ نماز شروع کرے تو اسے قضائے عمری کے طور پر وہ نمازیں قضا کرنی چاہئیں، قرآن وسنت میں اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے، بلکہ پچھلی زندگی میں جو نمازیں قضا ہوئی ہوں، ان کی تلافی صرف توبہ سے

(۱) قضائے عمری سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ اس کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

ہوجاتی ہے، اتنی ساری نمازیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ براہِ کرم یہ واضح فرمائیں کہ کیا شریعت میں پچھلی نمازوں کی قضا واقعی ضروری نہیں ہے؟ اور کیا ائمۂ اربعہ یا فقہائے کرام میں سے کسی کا مذہب یہ ہے کہ نمازیں زیادہ قضا ہوجائیں تو ان کی تلافی صرف توبہ سے ہوجاتی ہے، اور قضائے عمری پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر ان صاحبہ کا بتایا ہوا یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے تو کیا ان کے درس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ نیز اگر قضائے عمری ضروری ہے تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: - صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے:-

من نسی صلاة فليصل اذا ذكرها، لا كفارة لها الا ذٰلك.

جو شخص کوئی نماز پڑھنا بھول جائے تو اس پر لازم ہے کہ جب بھی اسے یاد آئے، وہ نماز پڑھے، اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب المواقیت باب نمبر ۳۷ حدیث نمبر: ۵۹۷)[1]

صحیح مسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان الفاظ میں مروی ہے:-

اذا رقد أحدكم عن الصلاة أو غفل عنها فليصلها اذا ذكرها فان الله عزّ وجلّ يقول: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ.

جب تم میں سے کوئی شخص نماز سے سوجائے یا غفلت کی وجہ سے چھوڑ دے تو جب بھی اسے یاد آئے وہ نماز پڑھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: "اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ" (میری یاد آنے پر نماز قائم کرو)۔ (صحیح مسلم، آخر کتاب المساجد، حدیث نمبر: ۱۵۶۹)[2]

اور سننِ نسائیؒ میں مروی ہے:-

سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الرجل يرقد عن الصلاة أو يغفل عنها، قال: كفارتها أن يصلّيها اذا ذكرها. (سنن النسائی، کتاب المواقیت، باب فیمن نام عن صلاۃ ص: ۱۷۱)[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نماز کے وقت سوجائے یا غفلت کی وجہ سے چھوڑ دے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب بھی اسے نماز یاد آئے وہ نماز پڑھے۔

ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اُصول بیان فرمادیا کہ جب کبھی انسان کوئی نماز وقت پر نہ پڑھے تو اس کے ذمے لازم ہے کہ تنبہ ہونے پر اس کی قضا کرے، خواہ یہ نماز

---

(۱) ج: ۱ ص: ۸۴ (طبع قدیمی کتب خانه).
(۲) ج: ۱ ص: ۲۴۱ (ایضاً).
(۳) ج: ۱ ص: ۱۰۰ (ایضاً).

بھول سے چھوٹی ہو، سوجانے کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے۔ صحیح مسلم اور سننِ نسائی کی روایتوں میں اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ قرآن "وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ"[1] کا حوالہ دے کر یہ بھی واضح فرمادیا کہ یہ آیتِ قرآنی نماز کی قضا پڑھنے کے حکم کو بھی شامل ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کا یہ فریضہ ادا کرنے پر تنبہ ہو، اسے نماز ادا کرنی چاہئے۔

یہ اُصول بیان کرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں فرمائی کہ اتنی تعداد میں نمازوں کی قضا واجب ہے، بلکہ ایک عام حکم بیان فرمادیا کہ جو نماز بھی چھوٹ جائے اس کی قضا واجب ہے۔ چنانچہ جب غزوۂ خندق کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی نمازیں چھوٹیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کی قضا فرمائی، جس کا واقعہ حدیث کی تمام کتابوں میں تفصیل سے آیا ہے، اس موقع پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر اس سے زیادہ نمازیں چھوٹ جائیں تو ان کی قضا واجب نہیں، یہ ایک مُسلَّم اُصول ہے کہ قرآن وسنت کی طرف سے جب کوئی عام حکم آجاتا ہے تو اس کے ہر ہر جزیئے کے لئے الگ حکم نہ دیا جاسکتا ہے، نہ اس کی ضرورت ہے، مثلاً قرآنِ کریم نے رمضان کے روزوں کی فرضیت کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمادیا ہے کہ:-

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ.[2]

تم میں سے جو شخص مریض ہو یا سفر پر ہو تو دُوسرے دنوں میں اتنی ہی گنتی پوری کرے۔

اس آیتِ کریمہ میں یہ عام حکم دے دیا گیا ہے کہ جب روزے بیماری یا سفر کی وجہ سے نہ رکھے جاسکے ہوں تو بعد میں ان کی قضا کرلی جائے، اس میں یہ نہیں بتایا گیا، نہ اس کے بتانے کی ضرورت تھی کہ ایک ماہ کے روزے چھوٹنے کا یہ حکم ہے یا دو رمضانوں کے روزے چھوٹنے کا، بلکہ ایک عام حکم دے دیا گیا ہے جو روزے چھوٹنے کی تمام صورتوں کو شامل ہے۔ اب اگر کسی شخص کے دو رمضان کے روزے چھوٹ گئے ہوں اور وہ اس دلیل کا مطالبہ کرے کہ دو رمضان کے روزے چھوٹنے کے لئے کوئی الگ حکم ہونا چاہئے، تو جس طرح اس کا مطالبہ غلط اور جاہلانہ مطالبہ ہوگا، اسی طرح زیادہ نمازوں کی قضا کے لئے الگ دلیل کا مطالبہ بھی اتنا ہی غلط مطالبہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عام حکم سے استثناء کا دعویٰ کرے تو دلیل اس کے ذمے ہے کہ وہ قرآن وسنت کی کسی دلیل سے مستثنیٰ ہونا ثابت کرے، ورنہ جب تک قرآن وسنت میں کوئی استثناء مذکور نہ ہو، عام حکم اپنی جگہ قائم رہے گا۔

چنانچہ نمازیں قضا پڑھنے کا جو حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا احادیث میں دیا

---

(۱) سورۃ طٰہٰ آیت: ۱۴.
(۲) سورۃ البقرۃ آیت: ۱۸۴.

ہے اس کی بنیاد پر تمام فقہائے اُمت نے تصریح فرمائی ہے کہ چھوٹی ہوئی نمازیں کتنی زیادہ ہوں، ان کی قضا ضروری ہے، مشہور حنفی عالم علامہ ابنِ نجیمؒ فقہِ حنفی کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

فالأصل فيه ان كل صلاة فاتت عن الوقت بعد ثبوت وجوبها فيه فانه يلزم قضاؤها، سواء تركها عمدًا أو سهوًا أو بسبب نوم، وسواء كانت الفوائت كثيرة أو قليلة.

(البحر الرائق ج:۲ ص: ۱۴۱ طبع مكة المكرمة)[1]

اس سلسلے میں اُصول یہ ہے کہ ہر وہ نماز جو کسی وقت میں واجب ہونے کے بعد چھوٹ گئی ہو، اس کی قضا لازم ہے، چاہے انسان نے وہ جان بوجھ کر چھوڑی ہو یا بھول کر، یا نیند کی وجہ سے، اور چاہے چھوٹی ہوئی نمازیں کم ہوں یا زیادہ ہوں۔

یہ موقف صرف حنفی علماء کا نہیں ہے، بلکہ شافعی، مالکی، حنبلی تمام مکاتبِ فکر اس پر متفق ہیں، امام مالکؒ فرماتے ہیں:-

من نسى صلوات كثيرة أو ترك صلوات كثيرة فليصل على قدر طاقته، وليذهب الى حوائجه، فاذا فرغ من حوائجه صلّى أيضًا ما بقى عليه حتّى يأتى على جميع ما نسى أو ترك. (المدونة الكبرى للامام مالك ج: ۱ ص: ۲۱۵ طبع دار الكتب العلمية بيروت)

جو شخص بہت سی نمازیں پڑھنا بھول گیا ہو، یا اس نے بہت سی نمازیں چھوڑ دی ہوں، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق وہ چھوڑی ہوئی نمازیں پڑھے، اور اپنی ضروریات کے لئے چلا جائے، لیکن جب ضروریات سے فارغ ہو تو پھر باقی نمازیں پڑھتا رہے، یہاں تک کہ وہ تمام نمازیں پوری کرلے جو وہ بھول گیا تھا یا اس نے چھوڑ دی تھیں۔

امام مالکؒ کے اس قول کی تشریح اور مزید تفصیل کرتے ہوئے مالکی عالم علامہ دسوقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

فيكفى أن يقضى فى اليوم الواحد صلاة يومين فأكثر، ولا يكفى قضاء صلاة يوم فى يوم الا اذا خشى ضياع عياله ان قضى أكثر من يوم فى يوم، وفى أجوبة ابن رشد انه انما أمر بتعجيل قضاء الفوائت خوف معاجلة الموت، وحينئذ فيجوز التأخير لمدة بحيث يغلب على الظن وفاؤه بها فيها. (حاشية الدسوقى على الشرح الكبير ج: ۱ ص: ۲۶۳ طبع دار الفكر بيروت)

اتنا کافی ہے کہ ایک دن میں دو دن یا زیادہ کی نمازیں قضا کرلے، اور یہ کافی نہیں ہے کہ ایک دن میں صرف ایک دن کی نمازیں قضا کرے، اِلّا یہ کہ اسے ایک دن سے زیادہ نمازیں قضا کرنے

---

(۱) باب قضاء الفوائت ج:۲ ص: ۷۹ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

کی صورت میں اپنے عیال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو، اور علامہ ابنِ رشدؒ کے جوابات میں یہ مذکور ہے کہ قضا پڑھنے میں جلدی کرنے کا حکم اس خطرے کی بناء پر دیا گیا ہے کہ موت نہ آجائے، لہٰذا اتنی مدّت تک مؤخر کرنا جائز ہے جس میں غالب گمان یہ ہو کہ اس میں نمازیں پوری ہوجائیں گی۔

امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں بھی قریب قریب یہی بات کہی گئی ہے، علامہ مرداویؒ جو امام احمدؒ کے مذہب کے قابلِ اعتماد ترین ناقل ہیں، فرماتے ہیں:-

(ومن فاتته صلوات لزمه قضاؤها على الفور) هذا المذهب نص عليه وعليه جماهير الأصحاب وقطع به كثير منهم: قوله "لزمه قضاؤها على الفور" مقيد بما اذا لم يتضرر فى بدنه أو معيشته يحتاجها، فان تضرر بسبب ذٰلک سقطت الفورية.

(الانصاف للمرداویؒ ج:۱ ص:۴۴۲ طبع احياء التراث العربى بيروت)

اور جس شخص کی بہت سی نمازیں چھوٹ گئی ہوں، اس پر ان کی فی الفور قضا کرنا واجب ہے، یہی مذہب ہے جس کی تصریح کی گئی ہے، اور حنبلی اصحاب کی بھاری اکثریت کا یہی کہنا ہے (قضا نمازیں فوراً ادا کرنی ضروری ہے)۔ اور بہت سوں نے قطعی طور پر یہی کہا ہے .... البتہ فوری ادائیگی کا لازم ہونا اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ اس کے نتیجے میں اس کو جسم یا ضروری معیشت میں نقصان نہ ہو، اگر نقصان ہو تو فوری ادائیگی کا حکم ساقط ہوجائے گا (بلکہ تأخیر سے ادا کرنا جائز ہوگا)۔

امام شافعیؒ کے یہاں یہ تفصیل ہے کہ اگر نمازیں کسی عذر سے چھوٹی تھیں تو فوری ادائیگی کے بجائے تأخیر سے ادا کرنا جائز ہے، لیکن کسی عذر کے بغیر چھوٹی تھیں تو فوراً ادا کرنا ضروری ہے:-

(من فاتته) .... (مكتوبة) فأكثر (قضى) ما فاته بعذر أو غيره، نعم غير المعذور يلزمه القضاء فورًا، ويظهر أنه يلزمه صرف جميع زمنه القضاء ما عدا ما يحتاج لصرفة فيما لا بد منه.

(فتح الجواد ج:۱ ص:۲۲۳ طبع شركة مصطفىٰ البابى مصر)

جس شخص کی ایک یا زیادہ فرض نمازیں چھوٹ گئی ہوں، اس پر ضروری ہے کہ جو نمازیں چھوٹی ہیں ان کی قضا کرے، چاہے نمازیں کسی عذر سے چھوٹی ہوں یا بغیر عذر کے، ہاں! جس شخص نے بغیر کسی عذر کے نمازیں چھوڑی ہوں اس پر قضا فوری طور سے واجب ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ اس کو اپنا پورا وقت قضا پڑھنے میں صرف کرنا چاہئے، سوائے اتنے وقت کہ جو اُسے اپنی لازمی ضروریات کے لئے درکار ہو۔

علامہ ابنِ تیمیہؒ نے بھی فقہائے کرامؒ کے یہ مذاہب نقل کرکے ان سے اتفاق کیا ہے، فرماتے ہیں:-

ومن عليه فائتة فعليه أن يبادر الى قضا ءها على الفور سواء فاتته عمدًا أو سهوًا عند جمهور العلماء كمالک وأحمد وأبى حنيفة وغيرهم، وكذٰلک الراجح فى مذهب الشافعى أنها اذا فاتت عمدًا كان قضاؤها واجبًا على الفور.

(فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیة ج:۲۳ ص:۲۵۹ مطابع الریاض)

جس شخص کے ذمے کوئی چھوٹی ہوئی نماز ہو، اس پر واجب ہے کہ وہ اسے ادا کرنے میں فوری طور سے جلدی کرے، چاہے وہ نماز جان بوجھ کر چھوڑی ہو یا بھول سے، یہی جمہور علماء مثلاً امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا موقف ہے، اور امام شافعیؒ کے مذہب میں بھی راجح یہی ہے کہ اگر جان بوجھ کر نماز چھوڑی ہے تو اس کو فوراً ادا کرنا واجب ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہؒ سے پوچھا گیا کہ:-

رجل عليه صلوات كثيرة فاتته، هل يصلّيها بسننها؟ أم الفريضة وحدها؟

جس شخص کے ذمے بہت سی نمازیں قضا ہوں، وہ انہیں ادا کرتے ہوئے سنتیں بھی پڑھے؟ یا صرف فرض پڑھے؟

علامہ ابنِ تیمیہؒ نے جواب دیا:-

المسارعة الى قضاء الفوائت الكثيرة أوْلٰى من الاشتغال عنها بالنوافل، وأما مع قلة الفوائت فقضاء السنن معها حسن. (فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیة ج:۲۲ ص:۱۰۴)

جب چھوٹی ہوئی نمازیں بہت ساری ہوں تو ان کو قضا کرنا نفلوں میں مشغول ہونے سے بہتر ہے، البتہ اگر چھوٹی ہوئی نمازیں کم ہوں تو ان کے ساتھ سنتوں کو قضا کرنا اچھا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فقہائے کرامؒ کے درمیان یہ مسئلہ تو زیرِ بحث آیا ہے کہ چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا تنبہ ہوتے ہی فوراً واجب ہوجاتی ہے یا اس میں تأخیر کرسکتے ہیں؟ اور تأخیر کی صورت میں کتنی نمازیں روزانہ قضا کرنی ضروری ہیں؟ نیز یہ کہ صرف فرض نمازیں قضا کی جائیں یا سنتیں بھی؟ اور قضا کرتے ہوئے نمازوں میں ترتیب کا لحاظ ضروری ہے یا نہیں؟ لیکن اس مسئلے میں معروف فقہائے کرامؒ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نمازیں خواہ کتنی زیادہ ہوں، ان کی قضا انسان کے ذمے واجب ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق قرآنِ کریم کی آیت: "وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ" کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ تنبہ ہونے پر انسان چھوٹی ہوئی نمازیں قضا کرنے کی فکر کرے، اور قرآن وسنت کی کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو زیادہ نمازوں کو قضا کرنے کی ضرورت نہ ہونے پر دلالت کرتی ہو، یوں بھی یہ عجیب وغریب موقف ہے کہ جو شخص کم نمازیں قضا

کرے اس پر تو ادائیگی واجب ہو، لیکن زیادہ نمازیں چھوڑنے والے پر کچھ واجب نہ ہو؟ پھر کون ہے جو کم نمازوں اور زیادہ نمازوں کی تعداد مقرّر کر کے یہ کہے کہ اتنی نمازوں کے بعد قضا واجب نہیں ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہر انسان پر بالغ ہونے کے بعد نماز پڑھنا فرض ہوجاتا ہے، اور یہ فریضہ تمام شرعی فرائض میں سب سے زیادہ مؤکد اور اہم ہے، اور یہ بھی ایک مُسلَّم اُصول ہے کہ اگر کوئی فریضہ قطعی دلائل سے ثابت ہو تو اسے انسان کے ذمے سے ساقط کرنے کے لئے کم از کم اتنے ہی مضبوط دلائل کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہاں قطعی دلائل تو درکنار، کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ جو نمازیں انسان کے ذمے فرض ہوئی تھیں، اس کی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے ان کی فرضیت ختم ہوگئی ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اگر فوت شدہ نمازیں بہت زیادہ ہوگئی ہوں تو ان کی قضا لازم نہیں، قرآن وسنت کے واضح دلائل اور ان پر مبنی فقہائے اُمت کے اتفاق کے بالکل خلاف ایک گمراہانہ بات ہے، اور نماز جیسے اہم فریضے کو محض اپنی رائے کی بنیاد پر ختم کردینے کے مرادف ہے، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ فوت شدہ نمازوں کے لئے بس توبہ کرلینا کافی ہے، اس لئے کہ توبہ کی قبولیت کی لازمی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی غلطی کی جتنی تلافی بس میں ہو، وہ تلافی بھی ساتھ ساتھ کرے۔

قضائے عمری کی موضوع احادیث

یہاں یہ واضح کردینا بھی مناسب ہے کہ اُصولِ حدیث کی بعض کتابوں میں موضوع احادیث کی علامتیں بیان کرتے ہوئے قضائے عمری کی حدیث کی مثال دی گئی، مثلاً حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موضوع احادیث کی پانچویں علامت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

پنجم آنکہ مخالف مقتضیٰ عقل وشرع باشد وقواعد شرعیہ آں را تکذیب نمایند، مثل قضائے عمری۔

یعنی: پانچویں علامت یہ ہے کہ وہ حدیث عقل وشریعت کے تقاضوں کے خلاف ہو اور قواعدِ شرعیہ اس کی تکذیب کرتے ہوں، مثلاً قضائے عمری کی حدیث۔

(عجالۂ نافعہ ص:۲۴ خاتمہ، طبع نور محمد کتب خانہ کراچی)

ہوسکتا ہے کہ کسی ناواقف یا جاہل آدمی کو اس سے یہ مغالطہ ہو کہ پچھلی عمر کی نمازیں قضا کرنا بے اصل ہے، اور اس بارے میں جو احادیث آئی ہیں وہ موضوع ہیں۔ اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض غیر مستند وظائف وغیرہ کی کتابوں میں کچھ ایسی موضوع حدیثیں آگئی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی خاص دن میں صرف ایک نماز قضا پڑھ لی جائے تو اس سے ستر سال کی نمازیں ادا ہوجاتی

ہیں، محدثین اس قسم کی روایات کو ''قضائے عمری'' کا نام دیتے ہیں، اور ان احادیث کو انہوں نے موضوع قرار دیا ہے، مُلّا علی قاریؒ ''موضوعات'' پر اپنی مشہور کتاب میں لکھتے ہیں:-

حدیث: ''من قضی صلاة من الفرائض فی اٰخر جمعة من شهر رمضان کان ذٰلک جابرًا لکل صلاة فائتة فی عمره الٰی سبعین سنة'' باطل قطعًا، لأنه مناقض للاجماع علٰی أن شیئا من العبادات لا یقوم مقام فائتة سنوات.

یہ روایت کہ ''جو شخص رمضان کے آخری جمعے میں ایک فرض نماز قضا پڑھ لے تو ستر سال تک اس کی عمر میں جتنی نمازیں چھوٹی ہوں، ان سب کی تلافی ہوجاتی ہے'' یہ روایت قطعی طور پر باطل ہے، اس لئے کہ یہ حدیث اِجماع کے خلاف ہے، اِجماع اس پر ہے کہ کوئی بھی عبادت سالہا سال کی چھوٹی ہوئی نمازوں کے قائم مقام نہیں ہوسکتی ہے۔ (الموضوعات الکبریٰ ص:۳۵۶، طبع مکتبہ اثریہ شیخوپورہ)

اور علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں:-

حدیث ''من صلّی فی اٰخر جمعة من رمضان الخمس الصلوات المفروضة فی الیوم واللیلة قضت عنه ما أخل به من صلاة سنته'' هٰذا موضوع لا اشکال فیه.

یہ حدیث کہ ''جو شخص رمضان کے آخری جمعے میں دن رات کی پانچ فرض نمازیں پڑھ لے، ان سے اس کے سال بھر کی جتنی نمازوں میں خلل رہا ہو، ان سب کی قضا ہوجاتی ہے'' کسی شک کے بغیر موضوع ہے۔ (الفوائد المجموعة للشوکانی ج:۱ ص:۵۴ نمبر۱۱۵، مطبع السنة المحمدیة قاهرة)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی مذکورہ بالا عبارت میں قضائے عمری کی جن روایات کو موضوع قرار دیا گیا ہے، ان سے مراد ''قضائے عمری'' کے بارے میں اس قسم کی روایات ہیں، جو ایک نماز یا چند نمازوں کو عمر بھر کی نمازوں کے قائم مقام قرار دیتی ہیں، اور علاوہ اس کے کہ اس قسم کی روایات کی کوئی سند نہیں ہے، ان کے موضوع ہونے کی وجہ مُلّا علی قاریؒ نے یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ ایک یا چند نمازیں سالہا سال کی فوت شدہ نمازوں کی تلافی نہیں کرسکتیں، اور اس پر اُمت کا اجماع ہے، لہٰذا اگر کسی کو ان احادیث کو موضوع قرار دینے سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ ''قضائے عمری'' کا تصوّر ہی بے بنیاد ہے اور پچھلی نمازوں کی قضا لازم نہیں تو اس کا منشأ جہالت کے سوا کچھ نہیں۔

قضائے عمری کا صحیح طریقہ

قرآن وسنت اور فقہائے کرامؒ کے اتفاق کی روشنی میں یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ جس مسلمان نے اپنی عمر کی ابتداء میں نمازیں اپنی غفلت یا لاپرواہی کی وجہ سے نہ پڑھی ہوں اور بعد

میں اسے تنبہ اور توبہ کی توفیق ہو، اس کے ذمے یہ ضروری ہے کہ اپنی چھوٹی ہوئی نمازوں کا محتاط حساب لگا کر انہیں ادا کرنے کی فکر کرے۔ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ تینوں بزرگ تو اس بات پر متفق ہیں کہ اگر نمازیں کسی عذر کے بغیر چھوڑی ہیں تو تنبہ ہونے کے بعد اس کا فرض ہے کہ وہ ان نمازوں کی ادائیگی فوراً کرے، اور صرف ضروری حاجتوں کا وقت اس سے مستثنیٰ ہوگا، لیکن فقہائے حنفیہ نے کہا ہے کہ چونکہ انسان اپنی وسعت کی حد تک ہی کا مکلّف ہے اس لئے قضا نماز پڑھنے میں اتنی تأخیر جائز ہے جو انسان کی معاشی اور دُوسری حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے درکار ہو، درمختار میں ہے:-

(أو يجوز تأخير الفوائت) وان وجبت على الفور (لعذر السعى على العيال وفى الحوائج على الأصح). (ابنِ عابدین ج:۱ ص:۵۴۳)(۱)

چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا پڑھنے میں تأخیر جائز ہے، اگرچہ ان کا وجوب علی الفور ہوتا ہے، مگر عیال کے لئے معاش کے انتظام اور دُوسری حاجتوں کے عذر کی وجہ سے تأخیر کی جاسکتی ہے۔

چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:-

فيسعى ويقضى ما قدر بعد فراغه ثم وثم الى أن تتم.(۲)

لہٰذا ایسا شخص اپنے کام کرتا رہے اور فارغ ہونے کے بعد جتنی نمازیں پڑھ سکے، قضا کرتا رہے، یہاں تک کہ تمام نمازیں پوری ہوجائیں۔ (ایضاً)

بعض علماء نے مزید آسانی کے لئے یہ طریقہ بتایا ہے کہ انسان روزانہ ہر فرض نماز کے ساتھ اسی وقت کی ایک قضا نماز پڑھ لیا کرے، اس طرح ایک دن میں پانچ نمازیں ادا ہوجائیں گی، البتہ جب موقع ملے اس سے زیادہ بھی پڑھتا رہے، فرماتے ہیں:-

وفوره مع كل فرض فرض، اذ لم يجب فى اليوم أداء أكثر من خمس، فكذا القضاء، فان زاد أو جمع الخمس فحسن. (البحر الزخار لأحمد ابن المرتضى ج:۱ ص:۱۷۳ طبع صنعاء)

اور قضا نمازوں کی فوری ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فرض کے ساتھ ایک فرض پڑھا جائے، کیونکہ ایک دن میں پانچ سے زیادہ نمازیں اداء میں ضروری نہیں تو قضاء کو بھی اس پر قیاس کرلیا جائے، لیکن اگر کوئی زیادہ نمازیں پڑھے یا پانچ نمازیں اکٹھی پڑھ لے تو اچھا ہے۔

البتہ قضا پڑھنے میں نیت کا خیال رکھا جائے، یعنی واضح طور پر قضا کی نیت کی جائے، مثلاً فجر کی قضا پڑھ رہے ہیں تو یہ نیت کرے کہ میرے ذمے فجر کی جو سب سے پہلی نماز واجب ہے اس کی قضا پڑھ رہا ہوں۔

(۱، ۲) الدر المختار مع رد المحتار باب قضاء الفوائت ج:۲ ص:۷۴.

نمازوں کا فدیہ

قرآنِ کریم میں روزوں کا فدیہ بیان فرمایا گیا ہے، یعنی جو لوگ روزے رکھنے کی بالکل طاقت نہ رکھتے ہوں، نہ آئندہ ایسی طاقت پیدا ہونے کی اُمید ہو، ان کے لئے قرآنِ کریم نے حکم دیا ہے کہ وہ ایک روزے کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائیں، لیکن نماز کے لئے قرآنِ کریم یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ایسا کوئی حکم مذکور نہیں ہے، البتہ امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کی نمازیں قضا ہوگئی ہوں اور وہ انہیں ادا نہ کر رہا ہو، اسے چاہئے کہ وہ یہ وصیت کردے کہ اگر میں یہ نمازیں ادا نہ کر پایا اور اسی حالت میں میرا انتقال ہوگیا تو میرے ترکہ سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کردیا جائے، اور وہ فدیہ بھی روزے کے فدیہ کے حساب سے، یعنی ایک نماز کا فدیہ ایک مسکین کا کھانا (یا پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت کا صدقہ) ادا کیا جائے، امام محمدؒ نے یہ حکم احتیاط کے طور پر دیا ہے، اور کہا ہے کہ اگرچہ نمازوں کے فدیہ کا ذکر قرآن وسنت میں نہیں ہے مگر روزے پر قیاس کرکے یہ حکم نکالا گیا ہے، لہٰذا اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ اس طرح انسان کی ذمہ داری پوری ہوجائے گی، (دیکھئے رد المحتار ج:۱ ص:۵۴۱)۔[1]

لیکن یاد رہے کہ یہ وصیت ترکہ کے ایک تہائی حصے تک نافذ ہوگی، یعنی اگر روزوں یا نماز کا کل فدیہ اس کے کل مال کا ایک تہائی یا اس سے کم ہو تب تو ورثاء کے ذمے واجب ہوگا کہ وہ فدیہ ادا کریں، اگر فدیہ کی مقدار ایک تہائی سے بڑھ گئی تو زائد مقدار میں وصیت پر عمل کرنا ورثاء کے ذمے لازم نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے روزے یا نماز کے فدیہ کی وصیت نہ کی تو ورثاء کے ذمے ضروری نہیں ہے کہ وہ یہ فدیہ ادا کریں، البتہ عاقل و بالغ ورثاء اپنے حصے میں سے رضا کارانہ طور پر فدیہ ادا کریں تو یہ ان کا احسان ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ مرحوم کو معاف فرمادیں گے۔

خلاصہ

یہ ہے کہ انسان سے جو نمازیں چھوٹ گئی ہوں، ان کی قضا اس کے ذمے لازم ہے، صرف توبہ کرلینے سے وہ معاف نہیں ہوتیں، خواہ کتنی زیادہ ہوں، البتہ وہ اگر روزانہ پانچ نمازوں کی قضا کرنا شروع کردے اور جب زیادہ پڑھنے کا موقع ملے، زیادہ بھی پڑھے، اور ساتھ ہی یہ وصیت بھی کردے کہ جو نمازیں میں اپنی زندگی میں ادا نہ کرسکوں ان کا فدیہ میرے ترکہ سے ادا کیا جائے، تو اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ قبول فرماکر اس کی کوتاہی کو معاف فرمادیں گے، قضائے عمری کا صحیح

---

(۱) ج:۱ ص:۷۲، ۷۳۔

طریقہ یہی ہے۔ اور یہ کہنا کہ قضائے عمری پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں، صرف توبہ کافی ہے، گمراہی کی بات ہے، اور جو شخص نماز جیسے بنیادی فریضے میں محض اپنی رائے سے کسی دلیل کے بغیر اس قسم کی گمراہانہ بات کی تلقین اور اس پر اصرار کرے، اس کے درس پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳/رجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر ۵۵/۵۰۰)

ایام حیض کی نمازوں کی قضا لازم نہیں

سوال:- عورت حیض ونفاس کی حالت میں نماز نہیں پڑھ سکتی، تو کیا از رُوئے حدیث یا فقہ بعد غسلِ طہارت از حیض ونفاس اس عورت پر نماز کی قضا واجب ہے یا معاف ہے؟

جواب:- حیض ونفاس کی حالت میں عورت جو نمازیں چھوڑتی ہے اس کی قضا اس پر واجب نہیں بلکہ وہ نمازیں معاف ہیں، البتہ اس حالت میں جو روزے چھوٹے ہوں ان کی قضا واجب ہے۔[1]

واللہ اعلم
۸/۵/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۴۵۱/۲۸ ب)

قضا نمازوں کی ادائیگی ضروری ہے

سوال:- زید نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور جب سے بالغ ہوا ہے اس کے بعد اب اس کی عمر تقریباً چالیس پینتالیس سال ہے، اس دوران فرائض، واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی رہی، اس طرح کچھ حقوق العباد بھی اس کے ذمے ہیں، اب زید تلافی کرنا چاہتا ہے، کیا صورت ہے؟

جواب:- حقوق العباد کی کوتاہی کی تلافی تو صرف اس طرح ہوسکتی ہے کہ جن جن لوگوں کے حقوق تلف کئے ہیں ان کے مالی حقوق یا تو ان کو ادا کرے یا ان سے معاف کروائے، اور غیر مالی حقوق بھی معاف کروائے، اور نماز روزوں کا طریقہ یہ ہے کہ جتنے نماز روزے رہ گئے ہیں ان کا ٹھیک ٹھیک حساب کرے، اور اگر ٹھیک ٹھیک حساب ممکن نہ ہو تو محتاط اندازہ لگائے، اور اس کی قضا شروع کردے اور ساتھ ہی یہ وصیت کردے کہ اگر میں ان کی قضا نہ کرسکوں تو ان کا فدیہ میرے ترکہ سے ادا کیا جائے، پھر اگر زندگی میں ادائیگی مکمل ہوجائے تو یہ وصیت کاٹ دے،[2] زکوٰۃ کا بھی اسی طرح حساب لگا کر اس کی ادائیگی کردے۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳/۱۰/۱۳۹۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۰۴۸/۲۸ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۲۹۱ (ویمنع صلوٰۃ) مطلقًا ولو سجدۃ شکر (وصوما) وجماعًا (وتقضیہ لزوما دونہا للحرج) وفی الشامیۃ قولہ صلوٰۃ .... تسقط للحرج وقولہ وتقضیہ أی الصوم علی التراخی فی الأصح.

(۲) مکمل تفصیل سابقہ فتویٰ ص:۴۷۷ تا ۴۸۷ میں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿فصل فی سجود السھو﴾
(سجدۂ سہو کے مسائل کا بیان)

سورۂ فاتحہ، سورۃ اور رکعتوں میں شک کی دوصورتوں کا حکم

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ ہے، طویل عرصے سے مختلف امراض وعوارض میں مبتلا ہے، حرکت کرنے اور چلنے پھرنے سے معذور ہے، بیٹھ کر نماز ادا کرتا ہے، اور غیر معمولی ضعف و نقاہت کی بناء پر قویٰ بہت کمزور ہوگئے ہیں، حافظہ اور یادداشت کی قوّت بھی کمزور ہوگئی، نماز میں بہت سہو ہوتا ہے اور اکثر ہوتا ہے، کبھی رکعتوں کی تعداد میں شبہ ہوتا ہے کہ ایک ہوئی یا دو یا تین ہوئی یا چار، کبھی یہ شبہ ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھی ہے یا نہیں؟ اور پھر سورت ملائی ہے یا نہیں؟ رُکوع کیا ہے یا نہیں؟ سجدہ ایک کیا ہے یا دو؟ سجدۂ سہو کیا ہے یا نہیں؟ غرض اس قسم کی مختلف صورتیں پیش آتی ہیں، امکانی سعی اور احتیاط کے باوجود حدیث النفس میں ابتلا اور سہو کی صورت پیش آجاتی ہے، اس پر نہ تو وہ یہ قسم کھاسکتا ہے کہ اس قسم کی غلطی ہوئی، اور نہ یہ قسم کھاسکتا ہے کہ نہیں ہوئی، نہ یقین اور ظنِ غالب ہوتا ہے، البتہ شبہ اور احتمال ترک کا ضرور ہوتا ہے۔

دریافت طلب یہ ہے کہ کیا شبہ اور احتمال کی طرف سے صَرفِ نظر کرلی جائے اور مطلق التفات ہی نہ کیا جائے؟ مثلاً ظہر کی چار سنتوں میں پہلی رکعت میں شبہ ہوا کہ پہلی رکعت ہے یا دُوسری، تو پہلی رکعت میں دُوسری کے احتمال پر اور دُوسری رکعت میں دُوسری ہی کے شبہ پر اور تیسری رکعت میں چوتھی رکعت کے احتمال پر اور چوتھی رکعت میں چوتھی کے شبہ پر التحیات پڑھے؟ غرض یہ ہے کہ احتیاطاً التحیات پڑھے اور آخر میں سجدۂ سہو کرے۔ اور یہی شبہ ہونے پر کہ سورۂ فاتحہ پڑھی اور سورت ملائی ہے یا نہیں؟ احتیاطاً سورۂ فاتحہ پڑھ لے اور سورت ملالے؟ اور سجدۂ سہو کرنے کے بعد نہ کرنے کا شبہ ہو تو احتیاطاً سجدۂ سہو کرلے وغیرہ وغیرہ کیا کیا جائے؟

۲:- کیا اس قسم کی تمام صورتوں میں اقل کا اعتبار کرکے احتیاطاً دوبارہ سورۂ فاتحہ پڑھ لے اور سورۃ ملانے سے اور سجدۂ سہو کرلینے سے نماز صحیح ہوجاتی ہے؟ اور فاسد اور واجب الاداء تو نہیں ہوجاتی؟

جواب ۱:- اگر شبہ ایسا ہوتا ہے کہ دونوں احتمال ذہن میں برابر معلوم ہوتے ہیں تو ہر جگہ اقل کا اعتبار کریں[۱]، اور ہر اس رکعت پر قعدہ کریں جس کے آخری رکعت ہونے کا احتمال ہو[۲]، اور جس رکعت میں قعدۂ اُولیٰ ہونے کا محض احتمال ہو، اس پر بیٹھنا ضروری نہیں، مثلاً ظہر کی پہلی رکعت ہی میں شک ہوگیا کہ پہلی ہے یا دُوسری؟ تو پہلی سمجھ کر نماز جاری رکھیں، اور اس رکعت پر نہ بیٹھیں، تیسری پر بھی اس لئے بیٹھیں کہ اس کے آخری رکعت ہونے کا احتمال ہے[۳]، پھر آخر میں سجدۂ سہو کریں۔

۲:- احتیاطاً دوبارہ فاتحہ پڑھنے اور سورۃ ملانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ سجدۂ سہو میں یہ تفصیل ہے کہ اگر آخر کی دو رکعتوں میں ایسا کیا تو سجدۂ سہو بھی واجب نہیں، اسی طرح اگر پہلی دو رکعتوں میں سورت کے بعد سورۂ فاتحہ مکرّر پڑھی تو بھی سجدۂ سہو واجب نہیں، ہاں! اگر سورت سے پہلے سورۂ فاتحہ مکرّر پڑھی تو سجدۂ سہو واجب ہوگا، اور سجدۂ سہو کے بعد نماز دُرست ہوجائے گی۔ کذا فی رد المحتار[۴] والعالمگیریة (ج:۱ ص:۱۲۶)[۵]۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۶/۱۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۸۰/ ۳۷ ہ)

قراءت میں عدم ترتیب سے سجدۂ سہو لازم نہیں

سوال:- نماز میں قراءت کے اندر ترتیب قائم نہ رہے تو کیا سجدۂ سہو لازم ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں سجدۂ سہو واجب نہیں۔[۶]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۰/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰۵۱/ ۲۸ ج)

(۱ تا ۳) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۹۳ (طبع سعید) (وان کثر) شکه (عمل بغالب ظنه ان کان) له ظن للحرج (والا أخذ بالأقل) لتیقنه وقعد فی کل موضع توهمه موضع قعوده) ولو واجبا لئلا یصیر تارکًا فرض القعود أو واجبه وفی الشامیة (قوله والا) أی وان لم یغلب علیٰ ظنه شئ، فلو شک انها أولی الظهر أو ثانیته یجعلها الأولیٰ ثم یقعد لاحتمال انها الثانیة ثم یصلّی رکعة ثم یقعد لما قلنا ثم یصلّی رکعة ویقعد لاحتمال انها الرابعة ثم یصلّی أخریٰ ویقعد لما قلنا .... الخ. وفی الهدایة ج:۱ ص:۴۵۲ وان لم یکن له رأی بنی علی الیقین لقوله علیه السلام من شک فی صلوٰته فلم یدر أثلاثا صلّی أم أربعا بنی علی الأقل .... الخ.

(۴) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۴۶۰، ۴۶۱ وکذا ترک تکریرها قبل سورة الأولیین، وفی الشامیة فلو قرأها فی رکعة من الأولیین مرتین وجب سجود السهو لتأخیر الواجب وهو السورة .... قال فی شرح المنیة قید بالأولیین لأن الاقتصار علیٰ مرة فی الأخریین لیس بواجب حتّی لا یلزمه سجود السهو بتکرار الفاتحة فیهما سهوا، ولو تعمده لا یکره.

(۵) وفی الهندیة ج:۱ ص:۱۲۶ ولو کرّرها فی الأولیین یجب علیه سجود السهو بخلاف ما لو اعادها بعد السورة أو کرّرها فی الأخریین. وفی البحر الرائق ج:۲ ص:۹۴ (طبع سعید) وذکر قاضی خان وجماعة انها ان قرأها مرتین علی الولاء وجب السجود وان فصل بینهما بالسورة لا یجب وصححه الزاهدی للزوم تأخیر السورة فی الأول لا فی الثانی .... الخ. نیز دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۶۷، ۳۶۸.

(۶) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۸۰ (طبع سعید) (ویجب) .... بترک واجب. وفی الشامیة قوله بترک واجب أی من واجبات الصلوٰة الأصلیة لا کل واجب اذ لو ترک ترتیب السور لا یلزمه شئ مع کونه واجبًا .... الخ.
وکذا فی الهندیة ج:۱ ص:۱۲۶. (محمد زبیر حق نواز)

تسمیہ کے ترک سے سجدۂ سہو لازم نہیں

سوال:- سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد شک ہوجاتا ہے کہ پوری فاتحہ پڑھی ہے یا کچھ رہ گیا ہے جس کے باعث دوبارہ پڑھا کرتا ہوں جو دیر کا باعث ہوتی ہے، کیا حکم ہے؟

جواب:- ایک مرتبہ فاتحہ دھیان کے ساتھ دُہرایا کریں، بعد میں شک پیدا ہوتو اس کی پرواہ نہ کریں تاوقتیکہ غلطی کا یقینِ کامل نہ ہو، نماز ہوجائے گی۔

سوال:- نماز کی پہلی رکعت میں اکثر شبہ ہوتا ہے کہ بسم اللہ شریف الحمد سے پہلے پڑھی یا نہیں؟ کیا بسم اللہ نہ پڑھنے سے نماز فاسد ہوگی؟ اور بسم اللہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ سجدۂ سہو تو واجب نہ ہوگا؟

جواب:- اگر بسم اللہ سہواً چھوٹ جائے تو نماز ہوجاتی ہے، سجدۂ سہو بھی واجب نہیں ہوتا۔[1]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۳ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

تأخیرِ رکن کی وہ مقدار جس سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے

سوال:- ''البلاغ'' کے شمارے میں زیرِ عنوان ''اپنی نماز دُرست کیجئے'' میں ہے: مسئلہ نمبر۳:- ''اگر آپ غلطی سے پہلی یا تیسری رکعت میں بیٹھ گئے تو فوراً کھڑے ہوجائیں، اگر بیٹھ کر اتنی دیر گزر گئی کہ جس میں تین مرتبہ سبحان اللہ کہا جاسکے تو سجدۂ سہو کرنا ضروری ہے، ورنہ نہیں۔'' بحوالہ کتب محقق فرمائیں تاکہ تسلی ہو، کیونکہ کبیری میں اس کے خلاف کی تصریح ہے، یعنی تین مرتبہ سبحان اللہ کی مقدار کی تأخیر کی قید نہیں ہے۔

عبارت یہ ہے: ولو قام فی الصلوٰۃ الرباعیۃ الی الرکعۃ الخامسۃ أو قعد بعد رفع رأسہ من السجود فی الرکعۃ الثالثۃ أو قام الی الرابعۃ فی المغرب، أو الثالثۃ فیہ أو فی الفجر أو قعد بعد رفعہ من الرکعۃ الأولیٰ فی جمیع الصلوات یجب علیہ سجود السھو بمجرد القیام فی صورۃ وبمجرد القعود فی صورۃ لتأخیر الواجب وھو التشھد أو السلام فی صورۃ القیام وتأخیر الرکن وھو القیام فی صورۃ القعود، اھـ[2]

---

(۱) وفی الدر مع الرد ویجب .... بترک واجب سھوًا. وفی الشامیۃ ج:۲ ص:۸۰ واحترز بالواجب عن السنۃ کالثناء والتعوذ ونحوھما. وکذا فی الھندیۃ ج:۱ ص:۱۲۶.

(۲) غنیۃ المتملی ص:۴۵۸ (طبع سھیل اکیڈمی لاھور).

جواب:- اس مسئلے میں احقر کو بھی شک تھا، اس لئے ایک مرتبہ اس کی تحقیق لکھ کر والد ماجد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی کو دِکھادیا تھا، موصوف نے اس کی تصدیق فرماکر اسے امداد الفتاویٰ جلد اوّل (صفحہ:۳۵۲ طبع جدید کراچی) کا جزو بنادیا تھا۔[1] اس تحقیق کا حاصل یہی ہے کہ مجرد قعود سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا بلکہ مقدارِ رکن تأخیر سے واجب ہوتا ہے، جس کی تعیین تین تسبیحات سے کی گئی ہے۔

علامہ طحطاویؒ مراقی الفلاح کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں: وهو مقدر بثلاث تسبيحات۔ (ج:۱ ص:۲۵۸، طبع نور محمد کتب خانہ) ''اس کی مقدار تین بار سبحان اللہ کہنے کو مقرّر کیا گیا ہے۔'' تفصیل کے لئے تو امداد الفتاویٰ کے مذکورہ حاشیہ کی طرف رُجوع فرمائیں،[2] یہاں علامہ شامیؒ کی ایک تصریح ذکر کردیتا ہوں، درمختار میں ہے کہ:-

''ويكبر للنهوض على صدور قدميه بلا اعتماد وقعود استراحة ولو فعل لا بأس''

اس کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: قال شمس الأئمة الحلوانی الخلاف فی الأفضل حتّی لو فعل كما هو مذهبنا لا بأس به عند الشافعیؒ ولو فعل كما هو مذهبه لا بأس به عندنا .... ولا ينافي هذا ما قدمه الشارح فی الواجبات حيث ذكر منها ترك قعود قبل ثانية ورابعة لأن ذاك محمول على القعود الطويل۔ (رد المحتار ص:۴۷۳، مطبوعہ استنبول)۔[3] لہٰذا جتنی مقدار شوافع کے یہاں بطور جلسۂ استراحت مستحب ہے، اس سے ہمارے نزدیک سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا۔

والسلام

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۲/۱۹ھ

تأخیرِ رکن کی کتنی مقدار سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے؟

(ایک رکن کی مقدار تأخیر سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے یا ایک تسبیح کی مقدار تأخیر سے؟ مفصل تحقیق)

عباراتِ ذیل زیرِ بحث مسئلے میں قابلِ غور ہیں:-

۱:- قال فی ملتقى الأبحر ويجب ان قرأ فی ركوع أو قعود أو قدم ركنا أو أخّره أو كرّره أو غيّر واجبًا أو تركه كركوع قبل القراءة وتأخير القيام الى الثالثة بزيادة على التشهد، وقال شارحه العلامة شيخ زادهؒ واختلفوا فی قدر الزيادة فقال بعضهم بزيادة حرف وكلام

(۱، ۲) سجدۂ سہو سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کی یہ تحقیق اسی فتویٰ کے بعد آگے ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۵۰۶ (طبع سعيد).

المصنف يشير الى هذا وقال بعضهم بقدر ركن وهو الصحيح كما في أكثر الكتب.
(۱)
(مجمع الأنهر ج:۱ ص:۱۴۸)

۲:- وقال تحته شارحه العلامة ابن عابدينؒ بقدر ركن. (۲) (بالحوالة المسطورة)

۳:- قال الامام ظهير الدين المرغينانيؒ لا يجب بقوله اللّٰهم صل على محمد وانما المعتبر مقدار ما يؤدى فيه ركنا كذا في الظهيرية. (۳) (برجندی شرح وقایة ج:۱ ص:۱۴۹)

۴:- قال ابن البزاز الكردريؒ سها في صلوٰته انها الظهر أو العصر أو غير ذٰلك ان تفكر قدر ما يؤدى فيه ركن كالركوع لزم وان قليلًا فان شك في صلوٰة صلّاها .... الخ.
(۴)
(الجامع الوجيز على هامش الهندية ج:۴ ص:۷۰)

ان تمام عبارات سے مشترکہ طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تأخیرِ واجب کی مقدار اکثر فقہاءؒ نے یہ قرار دی ہے کہ اتنی دیر تأخیر ہوجائے جس میں کوئی رکنِ نماز مثلاً رُکوع یا سجدہ وغیرہ ادا ہوسکے، اور وہ تین مرتبہ ''سبحان ربی العظیم'' کہنے کے وقفے میں ہوتا ہے، به صرح الطحطاويؒ في حاشيته على المراقي حيث قال ولم يبينوا قدر الركن وعلى قياس ما تقدم ان يعتبر الركن مع سنته وهو مقدر بثلاث تسبيحات۔ (۵) (طحطاوی ج:۱ ص:۲۵۸)

اس قول کے علاوہ بھی بہت سے اقوال ذکر کئے گئے ہیں جن میں سے یا تو مرجوح ہیں، یا وہ کہ جن کا مآل یہی نکلتا ہے، صاحبِ تنویر الابصار نے اس مسئلے کو دو جگہ ذکر کیا ہے اور بظاہر دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، باب صفة الصلوٰة میں ان کی عبارت یہ ہے: (فان زاد عامدًا كره) فتجب الاعادة (أو ساهيا وجب عليه سجود السهو اذا قال اللّٰهم صلّ على محمد) فقط (على المذهب المفتى به لا لخصوص الصلوٰة بل لتأخير القيام. (شامی ج:۱ ص:۴۷۷)۔ (۶) اس کے تحت علامہ شامیؒ نے کئی اقوال نقل کرکے بحر، زیلعی، شرح منیہ کبیری، وغیرہ سے اسی کو صحیح قرار دیا ہے، اور علامہ رملیؒ اور شرح منیہ صغیری سے ''وعلیٰ ال محمد'' کی زیادتی کا مرجح ہونا ذکر کیا ہے۔

اور باب سجود السهو میں صاحبِ تنویر فرماتے ہیں: وتأخير قيام الى الثالثة بزيادة على التشهد بقدر ركن ۔ صاحبِ درمختار نے لکھا: وقيل بحرف وفي الزيلعي الأصح وجوبه باللّٰهم

(۱، ۲) مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۲۰ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).
(۳) راجع شرح الوقاية ج:۱ ص:۱۸۵ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۴) الجامع الوجيز على هامش الهندية ج:۴ ص:۶۳ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).
(۵) (طبع نور محمد كتب خانه).
(۶) الدر المختار ج:۱ ص:۵۱۰ (طبع ايچ ايم سعيد).

صل علیٰ محمد ۔ علامہ ابنِ عابدینؒ نے اس تعارض کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: (قوله وفی الزيلعی .... الخ) جزم به المصنف فی متنه فی فصل اذا أراد الشروع وقال انه المذهب واختاره فی البحر تبعًا للخلاصة والخانية والظاهر انه لا ينافی قول المصنف هنا بقدر ركن تأمل. (شامی ج:۱ ص:۶۹۴)۔[۱] جس سے معلوم ہوا کہ "اللّٰهم صل علیٰ محمد" اور بقدرِ رکن، دونوں اقوال کا حاصل اور مآل ایک ہی نکلتا ہے، تو گویا جس جس نے "اللّٰهم صل علیٰ محمد" کو مقدارِ تأخیر قرار دیا ہے اس نے بقدرِ رکن کے قول کے منافی کوئی بات نہیں کہی، وبالعکس۔

رہی وہ عبارت جو منية المصلی میں ہے کہ اگر کوئی شخص پہلی یا تیسری رکعت کے آخر میں بیٹھ جائے تو مطلق بیٹھ جانے ہی سے سجدۂ سہو واجب ہوجائے گا، خواہ مقدارِ رکن بیٹھا ہو یا نہیں، اسی طرح اس میں یہ بھی ہے کہ جلسۂ استراحت سے سجدۂ سہو لازم آجائے گا (کبیری ص:۴۳۲)، سو اس بارے میں تحقیق وہ ہے جو درمختار اور رد المحتار میں لکھی گئی ہے، وهو هٰذا:-

۱:- قال العلامة الحصكفیؒ فی واجبات الصلوٰة: وترک قعود قبل ثانية أو رابعة وكل زيادة تتخلل بين الفرضين[۲] وقال الشامیؒ وكذا القعدة فی اٰخر الركعة الأولیٰ أو الثالثة فيجب تركها ويلزم من فعلها أيضًا تأخير القيام الى الثانية أو الرابعة عن محله وهٰذا اذا كانت القعدة طويلة اما الجلسة الخفيفة التی استحبها الشافعیؒ فتركها غير واجب عندنا بل هو الأفضل.[۳] (شامی ج:۱ ص:۴۳۸)

۲:- قال فی الدر المختار ويكبر للنهوض علیٰ صدور قدميه بلا اعتماد وقعود استراحة ولو فعل لا بأس، وقال الشامیؒ تحته، قال شمس الأئمة الحلوانیؒ الخلاف فی الأفضل حتّی لو فعل كما هو مذهبنا لا بأس به عند الشافعیؒ ولو فعل كما هو مذهبه لا بأس به عندنا كذا فی المحيط اهـ. قال فی الحلية والأشبه أنه سنة أو مستحب عند عدم العذر ويكره فعله تنزيها لمن ليس به عذر اهـ وتبعه فی البحر .... أقول ولا ينافی هٰذا ما قدمه الشارح فی الواجبات حيث ذكر منها ترک قعود قبل ثانية ورابعة لأن ذاک محمول علی القعود الطويل.[۴] (رد المحتار ج:۱ ص:۴۷۳)

اس لئے ان عبارات سے معلوم ہوا کہ دو رکعتوں کے درمیان جلسۂ خفیفہ عمداً جائز ہے اور

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۸۱ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۲) الدر المختار ج:۱ ص:۴۷۰ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۳) رد المحتار ج:۱ ص:۴۶۹ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۴) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۵۰۲ (طبع ايچ ايم سعيد).

شامیؒ کی تصریح کے مطابق ترکِ قعود جو واجب ہے، وہ قعودِ طویل ہے، قصیر نہیں، درایت کا مقتضا بھی یہی ہے کیونکہ یہ فعل عمداً جائز ہے تو سہواً بدرجہ اَوْلیٰ ہونا چاہئے، نیز چونکہ یہ قول ''بقدرِ رکن'' کی تقدیر کے مطابق ہے اس لئے اسی کو ترجیح ہونا چاہئے، اور جب اس درایت کے ساتھ شامیؒ کی یہ روایت مل گئی تو اس دعویٰ میں مزید قوت پیدا ہوگئی، اور خود علامہ ابراہیم حلبیؒ کی تصریح علامہ شامیؒ نے نقل فرمائی ہے کہ: عن شرح المنية انه لا ينبغى أن يعدل عن الدراية أى الدليل اذا وافقتها رواية۔

خلاصہ یہ کہ جو مقدار جلسۂ استراحت کی شوافع کے یہاں مسنون ہے، اس مقدار تک بیٹھنے سے سجدۂ سہو لازم نہ آنا چاہئے، ھٰذا ما بدا لی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
یکم محرّم الحرام ۱۳۸۰ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ
۱۳۸۰/۱/۱ھ

الجواب صحیح
بندہ رشید احمد عفی عنہ
۱۳۸۰/۱/۴ھ

(از حاشیہ امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۵۲)

بھولے سے سلام پھیر لینے کے بعد سجدۂ سہو کب تک کر سکتے ہیں؟

سوال:- نماز میں معمولی غلطی ہوئی، اور سجدۂ سہو کرنا بھول گئے، تو بعد میں نماز کس طرح ادا کریں گے؟ اور نماز کے بعد سجدۂ سہو کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:- اگر غلطی ایسی تھی کہ اس کی وجہ سے سجدۂ سہو کرنا واجب تھا تو سلام پھیرنے کے بعد جب تک کوئی مفسد فعل نہ کیا ہو، سجدۂ سہو کر سکتے ہیں، اس کے بعد نماز پوری کر سکتے ہیں، اور اگر کوئی مفسدِ نماز فعل کرلیا، مثلاً کوئی بات کرلی یا سینے کا رُخ قبلے سے پھیر دیا، تو نماز کا ازسرِنو اعادہ کیا جائے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۷/۲ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۷۶۲ الف)

چار رکعت والی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیرنے کی صورت میں سجدۂ سہو کے وجوب سے متعلق فقہاء کی عبارات میں تضاد کی تحقیق

سوال:- حضرت تھانویؒ نے بہشتی زیور میں لکھا ہے ''چار رکعت والی نماز میں بھولے سے دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو اب اُٹھ کر اس نماز کو پورا کرے، اخیر میں سجدۂ سہو کر لینے سے نماز ہوجائے گی'' اور بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر دونوں طرف سلام پھیر دیا تو سجدۂ سہو نہ کرے بلکہ نماز کا اعادہ کرے،

کیونکہ پہلا سلام دو چیزوں یعنی نماز سے باہر ہونے اور قوم کی تحیت کے لئے ہے، اور دُوسرا سلام صرف باقی نمازیوں کی تحیت کے لئے، اس لئے یہ دُوسرا سلام کلام کی مانند ہوگا اور کلام منافیٔ نماز ہے، اس لئے سجدۂ سہو کو ساقط کرتا ہے، پس اعادہ لازم ہے۔ ان دونوں قولوں میں شدید اختلاف ہے، مفتیٰ بہ قول کون سا ہے؟

جواب:- بہشتی زیور[1] کا قول ہی مفتیٰ بہ ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۴ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۶۹۲ ب)

---

(۱) بہشتی زیور حصہ دوم ص:۱۴۱ (طبع ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ)۔

(۲) وفی البحر الرائق آخر سجود السهو قبيل باب صلوٰة المريض ج:۲ ص:۱۱۱ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) وان توهم مصلى الظهر أنه أتمها فسلم ثم علم أنه صلّى ركعتين أتمها وسجد للسهو لأنه عليه السلام فعل كذٰلك فى حديث ذى اليدين ولأن السلام ساهيًا لا يبطل الصلوٰة .... وحكمه أنه ان كان فى المسجد ولم يتكلم وجب عليه أن يأتى به وان انصرف عن القبلة لأن سلامه لم يخرجه عن الصلوٰة. وفى الدر المختار (باب ما يفسد الصلوٰة وما يكره فيها) ج:۱ ص:۶۱۵ (طبع سعيد) الا السلام ساهيًا للتحليل أى للخروج من الصلوٰة قبل اتمامها علىٰ ظن اكمالها فلا يفسد. وكذا فى فتاوىٰ دار العلوم ديوبند ج:۴ ص:۴۱۲، و كفايت المفتى ج:۳ ص:۳۷۳. (محمد زبیر حق نواز)

﴿فصل فی سجود التلاوۃ﴾
(سجدۂ تلاوت کے مسائل کا بیان)

امام کے سجدۂ تلاوت کا پتہ نہ چلنے کی بناء پر مقتدی رُکوع میں رہ کر اُٹھ گیا تو کیا حکم ہے؟

سوال:- فجر کی نماز میں امام صاحب نے پہلی رکعت میں سجدۂ تلاوت کی آیت پڑھی اور سیدھے سجدہ میں چلے گئے، میں مسجد کی چھٹی صف میں تھا جو کہ مین ہال اور برآمدہ کے باہر چھت دار صحن میں ہے، ادھر کچھ اندھیرا سا بھی تھا، میں اور میرے برابر والے کچھ نمازی رُکوع میں چلے گئے، جب امام صاحب سجدے سے فارغ ہوکر قیام میں تکبیر کہتے ہوئے آئے، اس وقت پتہ چلا کہ امام صاحب نے رُکوع نہیں کیا بلکہ سجدۂ تلاوت کیا ہے، میں بھی رُکوع سے اُٹھ گیا اور امام صاحب کی قراءت سننے لگا، سجدۂ تلاوت کے فوت ہوجانے سے نماز ہوگئی یا اعادہ کرنا ہوگا؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں آپ کی نماز ہوگئی۔

لما فی الخانیة: اذا قرأ الامام اٰیة السجدة وبعض القوم کان فی الرحبة فکبّر الامام للسجدة وحسب من کان فی الرحبة أنه کبّر للرکوع فرکعوا ثم قام الامام من السجدة وکبّر فظن القوم أنه رفع رأسه من الرکوع فکبّروا ورفعوا رؤوسهم ان لم یزیدوا علٰی ذٰلک لم تفسد صلٰوتهم لأنهم ما زادوا الا رکوعا وبزیادة الرکوع لم تفسد الصلٰوة. فتاویٰ قاضی خان علٰی هامش الهندیة ج:۱ ص:۱۲۰[۱]، ومثله فی خلاصة الفتاویٰ ج:۱ ص:۱۸۷[۲]، والهندیة ج:۱ ص:۱۳۴[۳].

البتہ اگر رُکوع میں علم ہوجاتا کہ امام سجدے میں گیا ہے تو رُکوع چھوڑ کر سجدے میں چلے جانا چاہئے تھا، لما فی البحر ولو قرأ الامام السجدة فسجد فظن القوم أنه رکع فبعضهم رکع وبعضهم رکع وسجد سجدة وبعضهم رکع وسجد سجدتین فمن رکع ولم یسجد یرفض

(۱ تا ۳) (طبع مکتبه حقانیه پشاور).

رکوعه ویسجد للتلاوة. البحر الرائق ج:۲ ص:۱۲۲[۱]، ومثله فی الدر المختار مع الشامی[۲]۔

یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ صورتِ مسئولہ میں مقتدی کا سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوا کیونکہ رُکوع میں نیت کے بغیر سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر امام نے سجدۂ تلاوت کے بعد تین آیات پڑھنے سے پہلے رُکوع کردیا ہو تب تو مقتدی کا سجدۂ تلاوت سجدۂ نماز میں بلانیت بھی ادا ہوجائے گا، اور اگر تین آیات یا اس سے زیادہ قراءت کرکے رُکوع کیا ہو تو غایت ما فی الباب مقتدی کا سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوا، لیکن اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

لما فی الدر المختار ولو تلاها فی الصلوٰة سجدها فیها لا خارجها لما مرّ، وفی البدائع واذا لم یسجد اثم فتلزمه التوبة.[۳]

اور صورتِ مسئولہ میں چونکہ سجدۂ تلاوت عذر کی بناء پر چھوٹا ہے، اس لئے اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ گناہ بھی نہ ہوگا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۴۷ ج)

لاؤڈ اسپیکر پر آیتِ سجدہ سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوگا

سوال:- تیز آواز والی مجلس کے مائیکروفون میں سجدے کی آیات تلاوت کرنے سے مجلس سے باہر یا گھر کے لوگوں کے سننے سے ان پر سجدہ کرنا واجب ہوگا یا نہیں؟ برتقدیر اوّل وہ لوگ اگر سجدہ نہ کریں تو تیز تلاوت کرنے والے یا بانیٔ مجلس پر گناہ عائد ہوگا یا نہیں؟

جواب:- واجب ہوگا۔ اور اگر انہوں نے سجدہ نہ کیا تو اس کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر تیز آواز میں لگانے والے بھی گناہ سے خالی نہ ہوں گے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۱۹ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) البحر الرائق باب سجود التلاوة ج:۲ ص:۱۲۱ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) الدر المختار ج:۲ ص:۱۱۲ (طبع ایچ ایم سعید).

(۳) الدر المختار ج:۲ ص:۱۱۰ (طبع ایچ ایم سعید).

﴿باب صلوٰۃ المریض والمسافر﴾
(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)

نمازِ قصر کہاں سے شروع کرے؟
کیا اپنے شہر میں قصر کرسکتا ہے یا نہیں؟

سوال ۱:- زید کراچی سے حیدرآباد، سکھر جانے کے لئے سفر کو نکلتا ہے، زید اپنے محلے اور بلاک کی حدود سے نکل کر قصر کرے یا کراچی شہر کی ساری حدود سے نکل کر قصر کرے؟

۲:- زید کسی ایسے بڑے شہر میں رہتا ہے جس شہر کی لمبائی تقریباً ۵۰ پچاس، ۵۵ پچپن میل ہے، زید اس شہر کے کونے میں رہتا ہے، زید کو اس شہر کے دُوسرے کونے میں جانا ہے جو کہ تین دن کی مسافت پر ہے پیدل جانے کی صورت میں، لہٰذا زید قصر کرے یا پوری چار رکعت پڑھے؟

جواب ۱:- کراچی شہر کی حدود سے نکل کر قصر کرے۔[1]

۲:- صورتِ مسئولہ میں قصر جائز نہیں، اپنا شہر خواہ کتنا ہی طویل وعریض ہو اس میں قصر جائز نہیں۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۰۲/۲/۳ھ

(فتویٰ نمبر ۳۳/۳۰۴ الف)

زوجہ اور عقار کو وطنیت کا معیار بنانے پر فتح القدیر اور البحر الرائق کی عبارات کی تحقیق

سوال:- زید ایک عالمِ دین ہے، اس کے دو دینی مدارس ہیں، ۱:- ایک قدیمی دیہات میں،

(۱، ۲) وفی الدر المختار باب صلوٰة المسافر ج:۲ ص:۱۲۱ (من خرج من عمارة موضع اقامته) من جانب خروجه وان لم يجاوز من الجانب الآخر. وفی الشامية تحته (قوله من خرج من عمارة موضع اقامته) أراد بالعمارة ما يشمل بيوت الأخبية لأن بها عمارة موضعها قال فی الامداد، فيشترط مفارقتها ولو متفرقة .... وأشار الی أنه يشترط مفارقة ما كان من توابع موضع الاقامة كربض المصر وهو ما حول المدينة من بيوت ومساكن فانه فی حكم المصر وكذا القری المتصلة بالربض فی الصحيح. وكذا فی البحر الرائق باب المسافر، الموضع الذی يبتدأ فيه القصر ج:۲ ص:۱۲۸ (طبع سعيد). وغنية المتملی فصل فی صلوٰة المسافر ص:۵۳۶ (طبع سهيل اكيڈمی لاهور).

جہاں بیس تیس سال سے قیام پذیر ہے، اس کے اہل وعیال بھی وہیں ہیں، اس کے نجی مکانات بھی ہیں، اور مدرسہ مع مالہا وما علیہا ہے۔

۲:- عرصہ تین سال سے شہر میں بھی ایک مدرسہ قائم کر رکھا ہے جس میں سلسلۂ تعلیم جاری ہے اور زید کے زیرِ اہتمام وسرپرستی چل رہا ہے، زید کا شہر میں بھی اپنا نجی مکان ہے جس میں وہ رہتا ہے اور اس کے عیال کے بعض افراد مثلاً بیٹے، بہو وغیرہ بھی یہاں پر ہیں، خود زید حسبِ ضرورت دونوں جگہ قیام کرتا ہے، مدارس کے کام کے سلسلے میں جتنے دن شہر میں رہنے کی ضرورت پڑتی ہے وہاں رہتا ہے، پھر دُوسرے مدرسہ میں جتنا نجی یا مدرسہ کا کام ہو، رہتا ہے، مگر اکثر و بیشتر سابقہ دیہاتی مکان میں قیام ہوتا ہے، یاد رہے کہ زید کی دونوں ولادت گاہیں نہیں ہیں، کیا یہ دونوں جگہیں وطنِ اصلی شمار ہوں گی؟

اور جب بھی وہاں پہنچ جائے تو مقیم شمار ہوگا۔ ا:- لأن بعضا من عياله هنا وبعضا منه هنا، ۲:- ولأن له عقارًا ودورًا في كليهما، ۳:- ولأن له توطنا بلا ترجيح وامتياز حسب الضرورة بكليهما، یا ان میں سے ایک وطنِ اصلی شمار ہوگا بخلاف الآخر؟ مکانات وزمین پر وطنِ اصلی کا مدار معتبر ہے یا زوجہ کی رہائش کی جگہ کو ترجیح ہے؟

فقہاء کی بعض عبارات تنقیح طلب ہیں، مثلاً شامی نے وطنِ اصلی کی تعریف میں لکھا ہے: هو موطن ولادته أو تاهله أو توطنه (يبطل بمثله) پھر تاہلہ کی تشرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

فان ماتت زوجته في أحدهما وبقي له فيها دور وعقار قيل لا يبقى وطنًا له اذا المعتبر الأهل دون الدار ۔ مگر آگے لکھتے ہیں: وقيل تبقى، پھر آگے لکھتے ہیں: قال في النهر ولو نقل أهله ومتاعه وله دور في البلاد لا تبقى وطنا له، جس سے یوں مترشح ہوتا ہے کہ اعتبار اہل وعیال کا ہے، لیکن پھر لکھ رہے ہیں: وقيل تبقى كذا في المحيط، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دور وعقار کو بھی وطنیتِ اصلی میں دخل ہے۔

بہرحال مسئلہ منقح نہیں ہو رہا ہے، سوال کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد جو جواب ہو، مدلل اور باحوالہ ارشاد فرمائیں۔ (مولانا) حسین احمد شرودی، کوئٹہ، بلوچستان

جواب:- آپ نے ردالمحتار سے دُوَرُ اور عقار کے مسئلے میں جو عبارت نقل کی ہے، اس کے مطابق اس کے بارے میں دو قول ہیں، اور یہی دو قول عالمگیریہ[1] اور بحر[2] میں بھی نقل کئے ہیں، اور کوئی ترجیح یا تطبیق نہیں دی، البتہ امداد الفتاویٰ میں حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے اس مسئلے پر جو

---

(۱) فتاوىٰ عالمگيرية ج:۱ ص:۱۴۲ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه).

(۲) البحر الرائق باب المسافر ج:۲ ص:۱۳۶ (طبع سعيد). نيز ديكھئے: غنية المتملى ص:۵۴۴ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور).

گفتگو فرمائی ہے اس سے حقیقتِ مسئلہ واضح ہوجاتی ہے، ان کی عبارت یہ ہے:-

''صورتِ مذکورہ میں دونوں قول ہیں، اور یہی دونوں قول فتح القدیر اور البحر الرائق میں بھی نقل کئے ہیں، اور بحر میں دونوں قول کی دلیلیں بھی نقل کی ہیں، اور فتح القدیر میں دونوں کی تطبیق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اور میرے نزدیک تطبیق ہی مختار ہے، چنانچہ اس صورت میں امام محمدؒ کا قول: هٰذا حالی وأنا أری القصر ان نوی ترک وطنه، نقل کرکے لکھا ہے: الا ان أبا یوسف کان یتم بها لٰکنه یحمل علٰی أنه لم ینو ترک وطنه اهـ۔ (۱)

خلاصہ تطبیق کا یہ ہوا کہ اگر اس دُوسرے شہر میں پھر بطور وطن رہنے کا ارادہ نہیں ہے جس طرح پہلے رہتا تھا تب تو وطن نہ رہا، وہاں جاکر قصر کرے گا جب مسافتِ سفر طے کرکے آئے، اور اگر اب بھی اسی طرح رہنے کا ارادہ ہے تو وہ بھی وطن ہے، پس اس شخص کے دو وطن ہوجاویں گے۔ (۲)

(امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۶۴، ۳۹۴)

اور اس مجموعہ سے احقر کی سمجھ میں جو بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں اصل مدار مبتلیٰ بہ کی نیت کا ہے اور زوجہ کا ہونا یا ''دور وعقار'' کا ہونا اس نیت کی علامات ہیں، اصل مدارِ مسئلہ نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر آپ نے دیہات کے توطن کو چھوڑے بغیر شہر میں بھی بطور وطن رہنے کا اس طرح ارادہ کیا ہے کہ کبھی یہاں تو وطن رہے گا اور کبھی وہاں تو یہ دونوں مقامات آپ کے لئے وطنِ اصلی ہیں، اور بحر کی ایک عبارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: هٰذا جواب واقعة ابتلینا بها وکثیر من المسلمین المتوطنین فی البلاد ولهم دور وعقار فی القری البعیدة، منها یصیفون بها بأهلهم ومتاعهم، فلا بد من حفظها أنهما وطنان له لا یبطل أحدهما بالآخر. (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۴۷)۔ (۳)

ہاں! اگر نیت شہر کے گھر کو وطن بنانے کی نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ کام کی غرض سے وہاں جانا ہوگا اور کام ختم ہوتے ہی اپنی اصلی جگہ واپس آجایا کریں گے، تو پھر دیہات وطنِ اصلی اور شہر وطنِ اقامت ہوگا، هٰذا ما ظهر لی والعلم عند الله العلیم الخبیر۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۱۴/۱۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۵۳۵/۲۷ ہ)

---

(۱) فتح القدیر باب صلوٰة المسافر ج:۲ ص:۱۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

(۲) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۹۳.

(۳) البحر الرائق باب المسافر ج:۲ ص:۱۳۶ (طبع ایچ ایم سعید) وکذا فی فتح القدیر ج:۲ ص:۱۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه).

وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت کا معیار (فارسی)

سوال:- چہ می گویند اندرایں مسئلہ کی درایں دیار بوقت فصل خرما خوری اہالیان شہر (الف) کہ وطن اصلی ایشاں است با اہل وعیال نقل مکانی کردہ بشہر (ب) میروند و خاص غرض ومقصد ایشاں خرما خوری است وعزم ایشاں بعد از انقطاع فصل خرما کہ مدت سہ چار ماہ باشد ارتحال وکوچیدن باز بسوئی وطن اصلی خود کہ شہر (الف) ہست میباشد ولی حالا برائے خرما خوری اہل وعیال خود را درشہر (ب) میگزارند، وخود درشہر (ب) ارادہ سکونت کمتر از پانزدہ روز دارند پس اکنون قابل دریافت چند اُمور است اوّل آنکہ ایں جا شہر (ب) ہست وطن اقامت صورت بندد یا نہ؟ دوم اینکہ ایں جا درشہر (ب) نماز ہائے چارگانی قصر کنند یا اتمام؟ بینوا توجروا.

جواب:- جواب صورتِ مسئولہ نزد ایں حقیر آنست کہ اہل وعیال درشہر (ب) بحکم مقیم ہستند واتمام صلاۃ برایشان واجب، زیرا کہ نیت قیام زائد از پانزدہ روز کردہ اند، اما سرپرست آنہا کہ نیت قیام کمتر از پانزدہ روز کردہ است دراں شہر قصر خواہد کرد، پس شہر (ب) درحق اہل وعیال وطن اقامت ہست ودرحق سرپرست وطن السفر واگر سرپرست ہم نیت قیام پانزدہ روز کند او ہم اتمام خواہد کرد، وجوابے کہ منسلک بہ سوال است، اگر مراد او این است کہ ہر شہرے کہ دران اہل باشند، خواہ بہ نیت قیام عارضی، آن وطن اقامت نمی تواند شد، این جواب درست نیست کہ از ولازم می آید کہ ہر سفرے کہ دراں اہل وعیال ہمراہ باشند دراں نیت اقامت درست نہ شود، وهٰذا لم يقل به أحد وفقہاء بصراحت ایں مسئلہ نوشتہ اند کہ "والمعتبر نية المتبوع لأنه الأصل لا التابع كامرأة .... مع زوج." (درمختار مع الشامی ج:۱ ص:۵۳۳، ۵۳۴)[1]۔

پس معلوم شد کہ اگر شخصے درشہرے ہمراہ زوجہ خود اقامت کند او وطن اقامت می گردد، اما قول فقہاءؒ کہ ووطن الاقامة ما ينوى فيه الاقامة خمسة عشر يوما فصاعدا ولم يكن مولده له لا له به أهل كما في الكبيرى ص:۵۰۶[2]۔ پس مراد او مجرد وجود اہل نیست، بلکہ توطن اہل است، واز اینجا است کہ بعض فقہاءؒ درتعریف وطن اقامت "ولا له به اهل" ذکر نمی کردہ اند چنانکہ علامہ شامیؒ گویند:

وهو ما خرج اليه بنية اقامة نصف شهر سواء كان بينه وبين الأصلى مسيرة السفر أو لا۔ (شامی ج:۱ ص:۵۳۲)[3]۔

---

(۱) الدر المختار باب صلوة المسافر ج:۲ ص:۱۳۳ (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) غنية المتملى ص:۵۴۴ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور).
(۳) رد المحتار باب صلوة المسافر ج:۲ ص:۱۳۲ (طبع سعيد).

پس خلاصہ ایں است کہ شہر (ب) درحق اہل وعیال وطن اقامت ہست و درحق مرد اگر نیت اقامت کمتر از پانزدہ روز است منزل سفر ہست وبیش ازاں وطن اقامت، ھٰذا ما عندی۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۷۱۲ ب)

وطنِ اصلی سے مکمل طور پر منتقل ہوجانے کے بعد دوبارہ وطن آنے کی صورت میں قصر کا حکم

سوال ۱:- زید علاقہ کالاباغ بستی کوٹ چاندنہ کا رہنے والا ہے اور وہ اس کا آبائی وطن ہے، کسی وجہ سے زید اپنے آبائی وطن سے نقل مکانی کرکے ریاست بھاولپور ضلع رحیم یار خان میں اپنا تاھل بنالیتا ہے، جو اس کے آبائی وطن سے تقریباً چار سو میل کے فاصلے پر واقع ہے، حسبِ ارشادِ گرامی حضور صلی اللہ علیہ وسلم: من تأهل في بلد فليصل صلوٰة المقيم، نماز کی قصر نہ کرے گا، لیکن اگر کبھی اپنے آبائی وطن میں اس کا آنا ہو اور وہاں چودہ دن سے کم رہنے کا ارادہ ہو تو وہاں صلوٰۃِ مقیم ادا کرے گا یا قصر؟

۲:- اگر زید اپنے آبائی وطن میں آیا اور اس نے پندرہ دن وہاں قیام کرنے کا اردہ بھی کرلیا، تو اب وہ وہاں قصر نہیں کرے گا، بلکہ صلوٰۃِ مقیم ادا کرے گا، پندرہ دن کے بعد وہ قریب دو تین میل یا بارہ، تیرہ میل یعنی اَڑتالیس میل کے اندر دو تین دن کے لئے سفر کا ارادہ کرکے سفر بھی کرتا ہے اور ایک دو رات کے لئے پھر وہ اپنی قیام گاہ یعنی آبائی وطن میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ راستے کی نمازیں اور قیام گاہ کی نمازیں قصر کرے گا؟

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کا ارادہ اپنے آبائی وطن (کوٹ چاندنہ) میں بطور وطن رہنے کا نہیں ہے تو اب یہ بستی آپ کی وطنِ اصلی نہیں رہی، لہٰذا آپ جب مسافتِ سفر طے کرکے یہاں آئیں تو قصر کریں گے، محض جائیداد اور مکانات ہونے کی بنا پر اس صورت میں اسے وطنِ اصلی نہیں کہا جائے گا، لما في رد المحتار ولو نقل أهله ومتاعه وله دور في البلد لا تبقى وطنًا له وقيل تبقى[1] ووجه القول الثاني في فتح القدير بأنه محمول على ما اذا عزم على ابقائه وطنًا، وهٰذا التوجيه اختاره الشيخ في امداد الفتاوىٰ ج: ۱ ص: ۳۶۴۔[2]

---

(۱) رد المحتار باب صلوٰة المسافر ج: ۲ ص: ۱۳۲ (طبع ايچ ايم سعيد).

(۲) امداد الفتاوىٰ ج: ۱ ص: ۳۹۲، ۳۹۳ (طبع مكتبه دار العلوم كراچی). وفي الهداية ج: ۱ ص: ۱۶۷ (طبع مكتبه شركت علميه ملتان) ومن كان له وطن فانتقل منه واستوطن غيره ثم سافر فدخل وطنه الأول قصر لأنه لم يبق وطنًا له الا يرى أنه عليه السلام بعد الهجرة عد نفسه بمكة من المسافرين وهٰذا لأن الأصل أن الوطن الأصلي تبطل بمثله دون السفر ووطن الاقامة تبطل بمثله وبالسفر وبالأصلي .... الخ.

۲:- جب کوٹ چاندنہ آپ کا وطنِ اصلی نہیں ہے تو آپ صرف اس وقت وہاں اتمام کریں گے جب چودہ دن سے زائد قیام کی نیت کی ہو، اس کے بعد اگر آپ کہیں دُوسری بستی میں جائیں تو اگر یہ بستی وہاں سے اَڑتالیس میل دُور ہو تو آپ وہاں بھی قصر کریں گے، اور واپس کوٹ چاندنہ ایک دو رات کے لئے آئیں گے تو وہاں بھی قصر کریں گے، لیکن جس بستی میں آپ گئے ہیں اگر وہ کوٹ چاندنہ سے اَڑتالیس میل سے کم ہے تو بدستور اتمام کرتے رہیں، لأن وطن الاقامة يبطل بالسفر وقال فی رد المحتار: والحاصل أن انشاء السفر يبطل وطن الاقامة اذا كان منه، أما لو أنشأه من غيره فان لم يكن فيه مرور علىٰ وطن الاقامة أو كان ولٰكن بعد سير ثلاثة أيام فكذٰلك ولو قبله لم يبطل الوطن .... الخ. ج:۱ ص:۵۳۳۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۰/۹/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۳۷ ج)

فوج کی پوسٹنگ کی تبدیلی کی بناء پر نمازِ قصر سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال ۱:- شہر کے قریب فوجیوں کا کیمپ ہے، جب شہر میں اذانِ جمعہ ہوجاتی ہے تو وہاں اس کیمپ میں آواز سنائی دیتی ہے، مگر افسرانِ بالا کی طرف سے حکم ہے کہ کوئی فوجی شہر میں جمعہ کے لئے نہ جائے، اس صورت میں اس کیمپ میں نمازِ جمعہ دُرست ہوگی؟ یہ بات ہے کہ اس کیمپ میں مستقل کوئی مسجد نہیں ہے، پانچوں نمازیں ایک کمرے میں پڑھتے ہیں جو بوقتِ ضرورت خالی بھی کرنا پڑتا ہے، کیا ایسے کمرے میں دیگر نمازیں جمعہ کے علاوہ پڑھنا جائز ہے؟

جواب ۱:- یہ کیمپ شہر سے کتنی دُور ہے؟ کیا شہر کی عمارتوں اور اس کے کیمپ کے درمیان کچھ غیر آباد علاقہ ہے، جو شہر کا حصہ شمار نہ کیا جاتا ہو، اس کا جواب آنے پر اصل مسئلے کا جواب دیا جاسکے گا۔

سوال ۲:- جو آفیسر اپنے ماتحت یونٹوں کی دیکھ بھال کے لئے دُور جاتے ہیں، یعنی تقریباً اَٹھائیس میل کی مسافت طے کرتے ہیں تو کیا یہ لوگ قصر کریں گے؟

جواب ۲:- اگر پوسٹ جس کی چیکنگ کے لئے جارہا ہے شہر کی آخری حدود سے اَڑتالیس میل دُور ہے تو قصر کرسکتا ہے۔

سوال ۳:- ایک آفیسر فوجیوں کو لے کر جب دُور دراز کے علاقوں میں جاتے ہیں، وہاں قیام کا کوئی پتہ نہیں ہوتا، جب کسی آفیسر سے دریافت کیا جاتا ہے تو بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ

---

(۱) رد المحتار باب صلوة المسافر ج:۲ ص:۱۳۲ (طبع ایچ ایم سعید).

فوج میں قانون ہے کہ قیام کی حد کا کسی کو نہیں بتایا جاتا، تو اس صورت میں قصر کیا جائے گا یا نہیں؟

جواب۳:- مذکورہ صورت میں فوجیوں کو قصر کرنا چاہئے، جب تک پندرہ دن قیام کرنے کا عزم نہ ہو قصر ہی کیا جائے گا، خواہ اس غیر یقینی حالت میں کئی مہینے گزر جائیں۔[1]

سوال۴:- اگر یہ چھوٹے چھوٹے یونٹوں والے سپاہی اور نوکر وغیرہ ہیڈکوارٹر کو پندرہ دن سے کم مدّت کے لئے گئے تو کیا یہ سپاہی قصر کریں گے یا اتمام؟

جواب۴:- اگر یونٹ سے ہیڈکوارٹر کے شہر کا فاصلہ اَڑتالیس میل ہے تو قصر کریں گے۔

سوال۵:- اگر ایک امام مسافر ہو اور کسی جگہ یہ جماعت پڑھاتا ہے تو مقتدی کی نیت اور امام کی نیت میں کچھ فرق ہوگا یا نہیں؟ اگر امام ہیڈکوارٹر کو جائے تو اس کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ میں وہاں کتنا قیام کروں گا؟ اگر وہ امام وہاں نماز پڑھائے گا تو کیسے پڑھائے گا؟

جواب۵:- مسافر امام دو رکعتوں کی نیت کرے گا، اور مقتدی چار رکعتوں کی، پھر امام جب دو رکعتوں پر سلام پھیر دے تو مقتدی کھڑے ہوکر اپنی نماز پوری کریں[2]، مگر اس میں قراءت نہ کریں، بلکہ جتنی دیر میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے اتنی دیر خاموش کھڑے رہ کر رُکوع میں چلے جائیں، قصر کا مسئلہ وہی ہے جو نمبر۴، نمبر۲ میں گزر گیا ہے۔

فقط واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

شرعی معذور کی نماز کا حکم

سوال:- ہماری مسجد میں ایک صاحب نماز پڑھتے ہیں، وضو کرکے نماز میں شریک ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رُکوع میں جب جاتا ہوں تو ہوا خارج ہوجاتی ہے، ہر نماز میں یہی حالت ہوتی ہے، کیا نماز پڑھنا چھوڑ دیں یا کیا صورت اختیار کی جائے؟

جواب:- اگر ان صاحب کو چار رکعتیں بھی بغیر وضو ٹوٹے پڑھنے پر قدرت نہیں ہے، تو شرعاً وہ معذور ہیں، اور ان کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ ہر نماز کا وقت شروع ہونے پر وضو کرلیا کریں اور

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۳۴ (طبع سعید) (ولا بد من علم التابع بنیة المتبوع فلو نوی المتبوع الاقامة ولم یعلم التابع فهو مسافر حتی یعلم علی الأصح) وفی الفیض وبه یفتی کما فی المحیط وغیره دفعا للضرر عنه.

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۲۹، ۱۳۰ وصح اقتداء المقیم بالمسافر فی الوقت وبعده فاذا قام المقیم الی الإتمام لا یقرأ ولا یسجد للسهو فی الأصح، لأنه کاللاحق والقعدتان فرض علیه وقیل لا، قنیة وندب للإمام .... وفی شرح الارشاد ینبغی أن یخبرهم قبل شروعه والا فبعد سلامه (أن یقول) بعد التسلیمتین فی الأصح: أتموا صلوتکم فانی مسافر .... الخ.

اس وضو سے نماز پڑھتے رہیں، جب تک اس نماز کا وقت باقی رہے گا اس وقت تک وضو ریح خارج ہونے سے نہیں ٹوٹے گا، ہاں! جب وہ وقت ختم ہوگا اور اگلا وقت شروع ہوگا تو نیا وضو کرلیں اور اس سے نماز پڑھتے رہیں،[1] جب تک یہ عذر باقی رہے اس وقت تک ایسا کرتے رہیں، جب عذر ختم ہوجائے تو حسبِ معمول وضو کیا کریں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۲/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۶ الف)

معذور کی نماز کا حکم

سوال:- کبھی کبھی ثقیل یا بادی چیز کھانے کی وجہ سے مرض کا زور ہوتا ہے، تو رفعِ حاجت کے بعد مسے زیادہ متورّم اور سخت ہوجاتے ہیں، اور چند نَفَس بیٹھنے اور دبانے کے باوجود داخل نہیں ہوتے، اس صورت میں مرہم مسوں پر لگا کر اور پھایہ مرہم کے نیچے گدی کپڑے کی رکھ کر لنگر باندھنا پڑتا ہے، رطوبت اور بعض دفعہ خون بھی جو مسوں سے خارج ہوتا ہے گدی میں جذب ہوتا رہتا ہے، بعض مرتبہ صرف ایک یا دو روز کے بعد اور بعض مرتبہ ہفتے عشرے کے بعد سابقہ حالت بحال ہوتی ہے، مجبوراً ان حالات میں نماز ادا کرنی پڑتی ہے، کیا ان حالات میں نماز کی ادائیگی میں کوئی نقص واقع ہوتا ہے؟ اگر ہے تو اس کے ازالے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ خصوصاً اگر یہ حالت حج کے موقع پر یا امام کو پیش آجائے تو مناسکِ حج کی ادائیگی کے لئے کیا اَحکام ہیں؟ اور کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟

جواب:- اگر خون یا رطوبت کا اخراج اتنے تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے کہ باوضو چار رکعت نماز کی ادائیگی اس اخراج کے بغیر نہیں ہوسکتی تب تو حکم یہ ہے کہ ہر وقت کی ابتداء میں وضو کرلیا جائے اور اس سے فرض ونفل وغیرہ ادا کرلئے جائیں، یہ وضو مذکورہ اخراج سے نہیں ٹوٹے گا، پھر جب دُوسرا وقت آئے تو نیا وضو کرلے۔[2] کپڑے کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اس پر لگنے والی نجاست ایک گلٹ کے روپیہ کے برابر نہ ہو بلکہ اس سے کم ہو تو اس حالت میں نماز ہوجاتی ہے، اور اگر نجاست اس سے زائد ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ اگر کپڑے کو پھر دھویا گیا تو نماز سے فارغ ہونے سے پہلے کپڑے کو پھر روپیہ سے زائد نجاست لگ جائے گی تو دھونا واجب نہیں، اس حالت میں نماز ہوجائے گی، اور اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو

(۱، ۲) وفی التنویر وشرحه ج: ۱ ص: ۳۰۵، ۳۰۶ وصاحب عذر من به سلس بول لا یمکنه امساکه أو استطلاق بطن أو انفلات ریح أو استحاضة .... ان استوعب عذره تمام وقت صلوٰة مفروضة بأن لا یجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیا عن الحدث ولو حکما .... وحکمه الوضوء لکل فرض .... ثم یصلّی به فیه فرضًا أو نفلًا فاذا خرج الوقت بطل.

دھونا واجب ہے، اور اگر رطوبت یا خون کا اخراج اتنے تسلسل کے ساتھ نہیں ہوتا جس کا ذکر پہلے فقروں میں کیا گیا ہے تو ہر اخراج کے بعد نماز کے لئے وضو کرنا بھی ضروری ہے اور کپڑے دھونا بھی۔

مناسکِ حج میں طواف کے لئے وضو ضروری ہے،[1] اس لئے اس کا حکم نماز کا سا ہے، باقی ارکان بلا وضو ادا کرنے سے ادا ہو جاتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ یہ مسائل آپ کسی عالم سے زبانی بھی سمجھ لیں۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۷/۱۲/۳۰ھ

(فتویٰ نمبر ۴۰/۱۹ الف)

معذور کے لئے وضو کا حکم

سوال:- زید کو کافی عرصے قبض کی شکایت رہی جس کی بناء پر ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور قضائے حاجت کے قدرتی راستے کو بند کر کے دُوسری جگہ سے قضائے حاجت کا راستہ بنا دیا، اس بناء پر زید کو ریح اور قضائے حاجت پر قابو نہیں ہے، ایک کامل نماز کے دوران کم از کم تین چار بار بے اختیاری طور پر ریح خارج ہو جاتی ہے، اور زید کو بار بار وضو کے لئے تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، اس بناء پر زید معذورین میں شمار ہے یا نہیں؟

جواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر واقعۃً ایک کامل نماز بھی بغیر خروجِ ریح کے ادا نہیں ہو سکتی تو زید شرعاً معذور ہے، اور وہ ایک وقت کے شروع میں وضو کر کے اس سے جتنی چاہے نماز پڑھ سکتا ہے، اور وقت کے دوران خروجِ ریح سے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا۔[2]

واللہ اعلم

۱۴۰۵/۱۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۳۶/۱۹۲۶ ہ)

شرعی معذور کی تعریف اور عذر کا معیار

سوال:- میری عمر ۴۹ سال ہے، ۲۰ سال کی عمر میں میں نے نماز شروع کی، جن دنوں میں نے نماز شروع کی وہ میری گوناگوں امراض و بیماری کا زمانہ تھا، اس وقت مجھ کو ایک تکلیف یہ بھی تھی کہ میری ریح نہیں ٹھہرتی تھی، یعنی تکلیف کم و بیش لگی رہتی تھی، جس کے متعلق علماء حضرات سے دریافت کیا

(۱، ۲) دیکھئے سابقہ ص: ۵۰۵ کا حاشیہ نمبر ۱، ۲۔

ہوگا، میرے ذہن میں ہے کہ انہوں نے فرمایا ہوگا کہ تم ریح کے معذور ہو، تم ہر وقت وضو کرو، لہٰذا میں اس طرح کرتا رہا۔

اب سے ایک ماہ پیشتر ایسے ہی کرتا رہا ہوں، اور جو میرے ذمہ چھ سالوں کی قضا نمازیں تھیں وہ بھی اس طرح ادا کرتا رہا ہوں، اور سردیوں میں موزے بھی وقت کے اندر پہن لیا کرتا تھا، ایک دن بہشتی زیور میری نظر سے گزری، تو وہاں مولانا صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ معذور آدمی اس وقت موزہ پہنے جب کہ طہارت کامل میں ہو تو پہنے تو پھر وہ مسح کرسکتا ہے، اور میں تو یہ سمجھتا رہا ہوں کہ وقت کے اندر میں پاک ہوں اس طرح مجھ سے غلطی ہوچکی ہے اور متواتر کئی سالوں سے ہو رہی ہے، پھر میں نے اپنے عذر ریاح کی تحقیق کی تو اس میں یہ معلوم ہوا کہ میں بہ تکلیف طہارت سے نماز ادا کرسکتا ہوں، یعنی پریشانی تو ہوتی ہے مگر جان روکنے سے نماز ادا ہوجاتی ہے، کیونکہ تقریباً ایک ماہ میں صرف دو تین دفعہ نمازوں میں دو، دو وضو کرنے پڑے، اب کتاب نور الایضاح وغیرہ جب دیکھی تو اس میں معذور کے متعلق جو حکم ہے کہ پہلی مرتبہ اس کو اتنا وقت نہ ملے کہ وہ نماز پڑھ سکے، مگر میری یہ حالت نہ تھی، تکلیف تو تھی مگر اتنی شدید نہ تھی، بہ جبر و تکلیف میں نماز ادا کرسکتا تھا..... میں معذور ہوں یا نہیں؟

جواب: - ''معذور'' ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ابتداء میں عذر کی کیفیت یہ ہو کہ ایک نماز بھی طہارت کے ساتھ نہ پڑھی جاسکے اور جتنی دیر میں وضو کرکے ایک فرض نماز پڑھی جائے اتنی دیر تک ریح نہ رُک سکے،[1] چونکہ آپ کی یہ کیفیت نہ تھی جیسا کہ آپ نے بیان فرمایا ہے، اس لئے آپ پر معذور کے اَحکام جاری نہیں ہوسکتے، اب آپ کو چاہئے کہ گزشتہ سالوں کی نمازیں جس حد تک آپ کو قدرت ہو قضا کرتے رہیں، باقی کے لئے توبہ و اِستغفار بھی کریں، اور وصیت بھی لکھ دیں کہ آپ کے بعد آپ کے ترکہ سے چھوٹی ہوئی نمازوں کا فدیہ ادا کردیا جائے، تاکہ جو نمازیں بوجہ عذر قضا نہ کی جاسکیں ان کی تلافی فدیہ کے ذریعہ ہوجائے۔[2]

موزوں پر مسح کے بارے میں یہ مسئلہ یاد رکھئے کہ آپ اگر معذور ہوتے تب بھی ایک دن ایک رات تک مسح کرنا آپ کے لئے اس وقت تک جائز ہوتا جبکہ آپ نے حقیقی وضو کرکے واقعۃً باوضو ہونے کی حالت میں پہنا ہوتا، اور اگر کوئی معذور ریح خارج ہونے کے بعد موزے پہنے تو وہ صرف وقت ختم ہونے تک مسح کرسکتا ہے اس کے بعد نہیں۔ فی الدر المختار ومعذور فانه يمسح فی

---

(۱) حوالہ کے لئے سابقہ ص: ۵۰۵ کا حاشیہ نمبر ۱، ۲۔

(۲) نماز کے فدیہ سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ سابقہ ص: ۴۸۶ میں ملاحظہ فرمائیں۔

الوقت فقط، الا اذا توضأ ولبس على الانقطاع الصحيح. (شامی ص: ۲۵۰، والتفصيل فی رد المحتار)۔[1]

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۲۵ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۶۴ الف)

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

قطرے کا مریض کپڑا دیکھے بغیر نماز پڑھے تو کیا حکم ہے؟

سوال: – زید قطرے کا مریض ہے، شبہ پر جب دیکھا تو بعض مرتبہ قطرہ آیا اور بعض مرتبہ نہیں آیا، ایسا مریض بغیر کپڑا دیکھے سابقہ وضو سے نماز پڑھے تو جائز ہے؟ یا تجدید وضو کرے؟

جواب: – اگر قطرہ نکلنے کا گمان غالب ہو تو چاہے قطرہ نظر آئے یا نہ آئے وضو کرنا واجب ہے، اور اگر محض شبہ یعنی کسی طرف گمان غالب نہ ہوتا ہو تو دیکھ کر اطمینان کر لینا چاہئے، اور اگر اس صورت میں قطرہ نظر نہ آئے تو نیا وضو کئے بغیر نماز پڑھنا جائز ہے، شبہ کی صورت میں اگر کسی عذر کی وجہ سے دیکھنے کا موقع نہ ملے تو بغیر دیکھے اور بغیر تجدید وضو کئے نماز پڑھ لینے سے نماز ہو جائے گی۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۱ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۴ الف)

الجواب صحیح
محمد شفیع

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار باب المسح على الخفين ج: ۱ ص: ۲۷۱ (طبع سعيد)

﴿فصل فی الجمعة﴾
(جمعہ کے متعلق مسائل کا بیان)

حنفیہ کے نزدیک نمازِ جمعہ کے لئے شہر کا وجود ضروری ہے

سوال:- جمعہ کی نماز کے لئے احناف کے نزدیک شہر کا وجود ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- حنفیہ کے نزدیک جمعہ صرف شہر، قصبے یا ایسے بڑے گاؤں میں ہوسکتا ہے جہاں ضروریاتِ زندگی عام ملتی ہوں، بازار ہو، سڑکیں ہوں، اور وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شہر کے ساتھ مشابہ ہو، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۱/۱۴ھ

دورانِ خطبہ تشہد کی ہیئت پر بیٹھ کر ہاتھ باندھنا

سوال:- ہمارے ہاں ملک بھر میں رواج ہے کہ جمعہ کی نماز کے خطبے میں، تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھ کر ہاتھ باندھ لیتے ہیں اور جب خطیب درمیان خطبہ کے بیٹھتا ہے تو آخری خطبے میں ہاتھ رانوں پر رکھ لیتے ہیں، کیا ایسا کرنا فرض، واجب یا سنت ہے؟ جو ایسا نہ کرے کیا وہ گنہگار ہے؟

جواب:- خطبۂ جمعہ میں اصل یہ ہے کہ اس کو دھیان سے سننا واجب ہے، اور خطبے کے دوران کوئی بات چیت یا ایسا عمل ممنوع ہے جس سے سننے میں خلل واقع ہو،[2] لیکن تشہد کی ہیئت میں بیٹھنا، ہاتھ باندھنا اور خاص وقت پر ہاتھ چھوڑ دینا سنت نہیں، ادب کے خیال سے دوزانو بیٹھنے میں کچھ

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۳۷ ویشترط لصحتها سبعة أشياء الأول المصر .... وظاهر المذهب انه كل موضع له أمير وقاض يقدر على اقامة الحدود. وفی الشامية عن أبی حنيفةؒ انه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الأصح .... الخ. وكذا فی البحر الرائق ج:۲ ص:۱۵۱. نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۵۶۔

(۲) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۵۹ (طبع ایچ ایم سعید) وكل ما حرم فی الصلوٰة حرم فيها، أی فی الخطبة، خلاصة وغيرها. فيحرم أكل وشرب وكلام ولو تسبيحًا أو ردّ سلام أو أمرًا بمعروف بل يجب عليه أن يستمع ويسكت.

حرج نہیں، بلکہ بہتر ہے،[1] لیکن مذکورہ التزامات اگر واجب یا سنت سمجھ کر کئے جائیں تو بدعت ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۰/۱۱/۱۳۹۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۵۱۳ ہ)

خطبے کے دوران نفل نماز پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک شخص دورانِ خطبہ آیا اور بیٹھ گیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: کیا تم نے دو رکعت نماز پڑھ لی؟ اس نے کہا: نہیں! فرمایا: اُٹھ اور پہلے دو رکعت نماز پڑھ۔ یہ شاید بخاری کی حدیث ہے، اہلِ سنت والجماعت کا خطبے کے دوران عمل اس سے مختلف ہے؟

جواب:- بخاری شریف ہی کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ جمعہ کے دوران کلام کرنے سے یہاں تک کہ دُوسرے کو خاموش کرنے سے بھی منع فرمایا، (بخاری ج:۱ ص:۱۲۷، ۱۲۸)۔[2] نیز معجم طبرانی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ امام کے خطبہ دیتے وقت جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو نہ نماز جائز ہے نہ بات کرنا، (بحوالہ اعلاء السنن ج:۲ ص:۵۷)۔[3] نیز حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز پڑھنے سے روکتے تھے، (عمدۃ القاری ج:۶ ص:۲۳۲)۔[4] لہٰذا بخاری شریف میں جو واقعہ حضرت سلیک عطفانی رضی اللہ عنہ کا آیا ہے، وہ حضرت سلیکؓ کی خصوصیت تھی، چنانچہ سننِ دارقطنیؒ اور ابوبکر بن ابی شیبہؒ نے اسی واقعے میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیکؓ کو نماز کا حکم فرما کر خود خاموش ہوگئے تھے اور جب تک وہ نماز سے فارغ ہوگئے آپ رُکے رہے، امسک عن الخطبة حتّی فرغ من رکعتیه ثم عاد الی خطبته. (عمدۃ القاری ج:۶ ص:۲۳۲)۔[5] یہاں تفصیل کا موقع نہیں، بعض دُوسرے دلائل کی روشنی میں بھی یہ حضرت سلیکؓ کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۷/۲/۱۳۸۸ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۲۹۵ الف)

---

(۱) وفی الهندية ج:۱ ص:۱۴۸ (طبع مكتبه رشيديه كوئٹه) اذا شهد الرجل عند الخطبة ان شاء جلس محتبيًا أو متربعًا أو كما تيسر لأنه ليس بصلوٰة عملًا وحقيقةً، كذا فی المضمرات ويستحب أن يقعد فيها كما يقعد فی الصلوٰة كذا فی معراج الدراية. (۲) (طبع قديمی كتب خانه).

(۳) اعلاء السنن باب كراهة الصلوٰة والكلام اذا خرج الامام للخطبة يوم الجمعة لا سيما اذا شرع فيها ج:۲ ص:۶۷ (طبع ادارة القرآن كراچی).

(۴) باب اذا رأى الامام رجلًا جاء وهو يخطب أمره أن يصلّی ركعتين. (طبع دار الفكر).

(۵) دیکھئے حوالہ مذکورہ حاشیہ نمبر۴۔ (محمد زبیر حق نواز)

خطبے کے دوران خاموش رہنا واجب ہے

سوال:- خطیب صاحب دورانِ خطبہ یہ آیتِ کریمہ تلاوت کردیں: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ" الآیۃ، تو دُرود شریف بآوازِ بلند پڑھنا چاہئے یا نہیں؟

جواب:- خطبے کے دوران بالکل خاموش رہنا واجب ہے،(۱) اور یہ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص بول رہا ہو تو اسے چپ کرانے کے لئے بولنا بھی ناجائز ہے،(۲) لہٰذا جب امام آیتِ کریمہ: "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ" الآیۃ(۳) پڑھے تو مقتدیوں کو دِل دِل میں دُرود شریف پڑھنا چاہئے، زبان سے پڑھنا دُرست نہیں، خطبے کے دوران نماز پڑھنا بھی ناجائز ہوجاتا ہے تو دُرود پڑھنا بدرجۂ اَوْلیٰ نادُرست ہوگا۔

واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عاشق الٰہی عفی عنہ

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۲/۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۷۴ الف)

جمعہ کی اذانِ ثانی امام اور منبر کے سامنے دینی چاہئے

سوال:- جمعہ کے خطبے کے لئے : وز جمعہ امام صاحب منبرِ رسول پر بیٹھتے ہیں تو مؤذّن صاحب کو ان کے بالکل سامنے لاؤڈ اسپیکر رکھ کر اذان دینی چاہئے؟ اور کیا یہ طریقہ بدعت ہے؟ یا دائیں بائیں ہٹ کر اذان دینی چاہئے؟

جواب:- خطبے کے وقت اذان امام اور منبر کے بالکل سامنے ہونی چاہئے، دائیں یا بائیں ہٹ کر نہیں، اور اذان کے اس طریقے کو بدعت قرار دینا دُرست نہیں، کما صرح به الفقهاء(۴) وتمام دلیله فی امداد الفتاویٰ۔(۵)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۸۴ ج)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۵۹ (طبع سعید) وکل ما حرم فی الصلوٰۃ حرم فیها أی فی الخطبة خلاصة وغیرها فیحرم أکل وشرب وکلام ولو تسبیحًا أو ردّ سلام أو أمرًا بمعروف بل یجب علیه أن یستمع ویسکت.
وکذا فی امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۵۷، ۴۵۸ (طبع دار العلوم کراچی).

(۲) وفی صحیح البخاری ج:۱ ص:۱۲۷، ۱۲۸ (طبع قدیمی کتب خانه) ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: اذا قلت لصاحبک یوم الجمعة أنصت والامام یخطب فقد لغوت.

(۳) سورة الأحزاب: ۵۶.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۱ ویؤذن ثانیًا (بین یدیه) أی الخطیب، وفی الشامیة تحته (قوله ویؤذّن ثانیًا بین یدیه) أی علی سبیل السنیة کما یظهر من کلامهم، رملی .... الخ. وکذا فی فتح القدیر ج:۲ ص:۳۸ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه) وفتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۱۵۸.

(۵) دیکھئے: امداد الفتاویٰ ص:۴۷۴ تا ۴۸۱ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

جمعہ کے دن نماز سے قبل تقریر کرنے کا حکم

سوال:- جمعہ کے دن نماز سے قبل تقریر کرنی چاہئے یا بعد نماز؟ سنت طریقہ کون سا ہے؟ اور کیا خطبے سے پہلے وعظ کہنا بدعت ہے؟

جواب:- خطبے سے پہلے اور جمعہ کے بعد دونوں وقت وعظ کہنا جائز ہے، جس صورت میں مسلمانوں کا زیادہ فائدہ اور سہولت ہو اسے اختیار کیا جاسکتا ہے، اور خطبے سے پہلے وعظ کہنے کو بدعت قرار دینا غلط ہے، ہاں! وہ مباح ہے، خاص اس وقت کے لحاظ سے اسے مسنون یا واجب قرار دینے سے بدعت ہوجائے گا۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۱ھ

جمعہ کا خطبہ اور نماز الگ الگ اشخاص پڑھائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال:- ہمارے محلّہ کی مسجد کے امام صاحب حافظ نہیں ہیں، تراویح ایک دُوسرے حافظ صاحب پڑھاتے ہیں جو قاری بھی ہیں، آخری جمعۃ الوداع کو میں نے امام صاحب سے کہا کہ آپ خطبہ پڑھادیں حافظ صاحب جمعہ پڑھادیں گے، امام صاحب نے انکار کردیا اور کہا کہ خطبہ اور جمعہ ایک ہی شخص پڑھاسکتا ہے۔ اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب:- امام صاحب نے ٹھیک کہا، جمعہ کا خطبہ اور نماز ایک ہی شخص کو پڑھانا چاہئے، افضل طریقہ یہی ہے اور اس کے خلاف کرنا مناسب نہیں، اِلّا یہ کہ کوئی عذر ہو، بغیر عذر کے ایسا کرنا خلافِ اَوْلیٰ ہے۔

لما فی الدر المختار لا ینبغی أن یصلّی غیر الخطیب لأنهما کشئ واحد فان فعل بأن خطب صبی باذن السلطان وصلّی بالغ جاز. (شامی ص: ۵۵۲)[2] ومثله فی امداد الفتاویٰ ج: ۱ ص: ۴۴۰۔[3]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۴۸ ہ)

---

(۱) وکذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۶۷ (سوال:۲۳۸۵) و امداد الأحکام ج:۱ ص:۷۷۲. نیز دیکھئے امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۳۸ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

(۲) الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۲ (طبع سعید).

(۳) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۲۶ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔ نیز دیکھئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۳۵ (طبع مکتبہ دار العلوم)۔

بستی میں جمعہ فرض نہ سمجھنے والے امام کے لئے کسی دُوسرے شخص سے نمازِ جمعہ پڑھوانا

سوال:- زید ایک مسجد کا خطیب ہے، بسبب عدمِ جواز جمعہ فی القریٰ نماز نہیں پڑھاتے، خود جمعہ کو تقریر کرتے ہیں اور بکر کو کہہ دیتے ہیں کہ تم نمازِ جمعہ پڑھادو، زید نفل کی نیت باندھ کر بکر کے پیچھے نماز پڑھتا ہے جمعہ نہیں پڑھتا، کیا زید کا یہ رویہ از رُوئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- اگر وہ موضع فی الواقعہ ایسا قریہ ہے جو شہر کی تعریف میں نہیں آتا تو زید کے لئے نہ خود جمعہ کی امامت جائز ہے اور نہ کسی دُوسرے سے جمعہ کی نماز پڑھوانا دُرست ہے، شرعی حکم سب کے لئے ہوتا ہے۔[1]

فقط واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۶/۶ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۶۵۷ الف)

قریۂ کبیرہ میں نمازِ جمعہ

سوال:- ہمارے گاؤں میں ڈاک خانہ اور یونین کونسل کا دفتر موجود ہے، اور ہمارا علاقہ ملیرسٹی سے چودہ میل دُور ہے، سرکاری اعداد مردم شماری چار ہزار ہے، روز مرّہ کی زندگی کے ساز و سامان بھی مل رہے ہیں ....الخ۔ کیا جمعہ ایسی جگہ جائز ہے؟

جواب:- سوال میں بستی کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان کے پیشِ نظر اس بستی میں نمازِ جمعہ دُرست ہے۔[2]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۳ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۱۹/۳۰۲ الف)

قریۂ صغیرہ میں جمعہ کا حکم (فارسی)

سوال:- یک قریہ ہست کہ تقریباً ۷۰۰ ہفت صد نفوس مشتمل ست قاضی رسمی دارد وضروری

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۷ صلوٰۃ العید فی القریٰ تکرہ تحریمًا أی لأنه اشتغال بما لا یصح لأن المصر شرط الصحة. وفی الشامیة تحته (قوله صلوٰة العید) ومثله الجمعة ح. وکذا فی فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۳۷.

(۲) تفصیل اور دلائل کے لئے دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۵۶۷ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

اَحکامِ شرع نکاح، طلاق، تقسیمِ میراث وغیرہ را فیصلہ کند وضروریاتِ زندگی مہیا نمی شوند تقریباً ۳ عدد دوکان دارد کہ قبل از دوسال یکمی ہم بنود و یک مسجد داد کہ پنج وقت نماز باجماعت گزاشتہ شود و دیگر یک مسجد دوموضع نخلہا و باغات موجود است کہ بقاعدہ نماز باجماعت نمی شود اکثر آدمیاں فرادیٰ نماز میخوانند، نہ امام دارد نہ مؤذّن، جامع مسجد ہم مؤذّن ندارد وتقریباً از ۲۵ سال جمعہ وعیدین قائم کردند بغیر از اذن سلطان اہلِ محلّہ قبل از ۲۵ سال جمعہ نبود۴ رکعات احتیاطی ہم میخوانند، و دیگر در اطراف دہ جانب قبلہ فاصلہ یک میل انگریزی یک قریہ واقع است مشتمل بر۱۵۰ ایک صد و پنجاہ نفوس و جانب مشرق فاصلہ دو میل یک قریہ مشتمل بر ۲۲۰ نفوس و یک قریہ در جانب مشتمل بر ۴۰۰ چہار صد نفوس ہم موجود۔ دریں صورت جمعہ وعیدین جائز است یا نہ؟

جواب:- احوال قریہ کہ درسوال مذکورہ شدہ اند، دلالت می کنند کہ او بحکم مصر نیست و جمعہ دران جائز نیست زیرا کہ تعریف مصر یا قریہ بحکم مصر آنست، بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم .... الخ.[1] كما حققه في امداد الفتاوىٰ ج:۱ ص:۳۸۸۔[2] و درقریہ مسئول عنہا اسواق موجود نیستند وموجودگی سہ دوکانہا قریہ را عرفاً بحکم مصر نمی گرداند و باید دانست کہ در جمعہ عدد سکان مقرر نیست واصل اینست کہ اگر آں قریہ را در عرف شہر یا قصبہ می فہمیند او بحکم مصر است ورنہ بحکم قریہ ونماز جمعہ دراں جائز نیست۔

واللہ سبحانہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۵۹۹ الف)

خطبۂ جمعہ کے دوران ہاتھ میں عصا لینے کی شرعی حیثیت

سوال:- اگر کوئی امام خطبے میں عصا نہ لے اور خطبہ پڑھے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر عصا یا کمان ہاتھ میں لے کر خطبہ دیتے تھے، اس لئے اگر کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں ایسا کرے تو سنت ہے، لیکن یہ خطبے کی کوئی لازمی شرط نہیں ہے، عصا لئے بغیر بھی خطبہ بلاکراہت دُرست ہے، اور اس کو خطبے کی لازمی شرط قرار دینا التزام مالا یلزم کی بنا پر بدعت ہے، بعض لوگ چونکہ اس کو خطبے کا لازمی جزء سمجھنے لگے تھے اس لئے بعض علماء نے اس کو ترک کرنے کا اہتمام کیا، بلکہ بعض نے اسے بدعت تک کہا ہے، لیکن حقیقت وہی ہے جو

---

(۱) رد المحتار باب الجمعة ج:۲ ص:۱۳۷ (طبع سعيد).

(۲) دیکھئے امداد الفتاویٰ ص:۴۱۵، ۴۱۶۔

اُوپر عرض کی گئی کہ یہ عمل اصلاً سنت ہے، بشرطیکہ اسے واجب نہ سمجھا جائے، واجب سمجھ کر کرنا بدعت ہوجائے گا۔

قال فی الدر المختار وفی الخلاصة ویکرہ أن یتکئ علی قوس أو عصاء وقال الشامیؒ استشکله فی الحلیة بأنه فی روایة أبی داؤد أنه صلی الله علیه وسلم قام أی فی الخطبة متوکئًا علی عصاء أو قوس اهـ. ونقل القهستانی عن عبدالمحیط ان اخذ العصاء سنة کالقیام.

(شامی ج: ۱ ص: ۵۵۳ باب الجمعة)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۲/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸۳۹/ ۲۷ و)

امروٹ شریف میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:- پاکستان کے دیہات میں اکثر علماء خواہ دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہوں یا بریلوی سے، قریۂ صغیرہ میں نمازِ جمعہ بلا جھجک پڑھاتے ہیں، حالانکہ حنفی مسلک میں دیہات میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی، مندرجہ بالا حضرات یہ جواب دیتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک قریۂ صغیرہ میں نمازِ جمعہ جائز ہے اور ان کا مسلک قوی ہے۔

سندھ کے بڑے اکابر میں سے حضرت مولانا تاج محمود صاحب امروٹی، امروٹ شریف میں جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے جبکہ جمعہ کی اکثر شرائط پوری نہیں ہوتیں، ان کے جانشین کا بھی یہی عمل ہے، دُوسرے حضرت مولانا حماداللہ رحمۃ اللہ علیہ ہالیجی شریف ہیں۔ اس لئے جو علماء حنفی مسلک پر کاربند ہیں وہ دیہات میں درس و تدریس اور خطابت بغیر جمعہ کے، فرائض سرانجام نہیں دے سکتے، عوام تو صرف یہ کہتے ہیں کہ یا تو اکابر کو یہ کہو کہ ناحق پر ہیں، اگر حق پر ہیں تو ان کی طرح نمازِ جمعہ تم بھی پڑھاؤ، ایک سال سے تدریسی خدمات انجام دے رہا ہوں لیکن چونکہ ہمارا گاؤں ستر، اسّی (۷۰، ۸۰) گھروں پر مشتمل ہے، چھ سات دُکانیں بھی ہیں، ڈاکٹری اور دیگر ضروریات کافی حد تک پوری ہوجاتی ہیں، شہر سے تقریباً سات آٹھ میل دُور ہے، جس بستی میں رہائش پذیر ہوں وہ ہماری برادری کی بستی ہے، اس کے اردگرد اور بھی کئی بستیاں ہیں جو مختلف مقامات سے آکر یہاں آباد ہوئی ہیں۔

اور ہماری بستی کے چیئرمین کی زیرِ نگرانی اکٹھے کئی ہزار ایکڑ زمین خریدی گئی تھی، اگر ایک جگہ گاؤں بناتے تھے تو بہت سے آدمی اپنی زمین سے بہت دُور ہوجاتے تھے، اس لئے ہر ایک نے اپنی

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج: ۲ ص: ۱۶۳ (طبع سعید). نیز دیکھئے امداد الاحکام ج: ۱ ص: ۷۳۶ و ۷۵۲ (طبع مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

سہولت کے لئے اپنی اپنی زمینوں سے قریب گھر بنالئے اور ان میں جو سرکردہ لوگ تھے ان کے نام سے وہ گاؤں مشہور ہوگیا، جبکہ چیئرمین سب کا ایک ہی ہے۔ حنفی مسلک کی شرائط کیا ہیں؟ اور ان کا مأخذ قرآن وسنت سے کیا ہے؟ اور حنفی مسلک کی مالکی مسلک پر وجہ ترجیح کیا ہے؟ ہماری اس بستی میں نمازِ جمعہ ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: - عزیز محترم سلمہ اللہ تعالیٰ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا سوال غور سے پڑھا اور تمام حالات پر غور کیا، لیکن آپ نے اپنی بستی کا جو حال لکھا ہے اس کے پیشِ نظر اسے قصبہ، قریۂ کبیرہ یا شہر کہنا مشکل ہے، اور حنفیہ کی تمام کتابیں متون وشروح و فتاویٰ جمعہ کے لئے مصر یا قریۂ کبیرہ کی شرط کو ضروری قرار دیتی ہیں۔ مالکیہ اور شافعیہ کے یہاں بلاشبہ گاؤں میں بھی جمعہ ہوجاتا ہے، لیکن کسی ایک مسئلے میں مالکیہ یا شافعیہ کے قول کو لینا اور باقی نماز حنفیہ کے طریقے پر پڑھنے میں ''تلفیق'' کا اندیشہ ہے، جو باجماعِ فقہاء باطل ہے، اور اس سے کسی کے نزدیک نماز صحیح نہیں ہوتی، لہٰذا مالکیہ یا شافعیہ کے مسلک پر عمل کرکے جمعہ ادا کرلینا کسی طرح دُرست نہیں، حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ کے جواز کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ امام مسلمین وہاں جمعہ پڑھنے کا حکم دیدے، یہ صورت بھی ہمارے ملک میں مفقود ہے۔

اور یہ جو احقر نے عرض کیا کہ آپ کی بستی میں قریۂ کبیرہ کی تعریف صادق نہیں آتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ قریۂ کبیرہ وہ چیز ہے جسے ہمارے عرف میں قصبہ کہتے ہیں، اس کی تعریف جامع و مانع فقہاء نے نہیں کی، بلکہ اس کا مدار عرف پر رکھا ہے کہ جس بستی کو عرفاً قصبہ کہا جاتا ہو اس میں جمعہ جائز ہے۔ اس کی علامات یہ ہیں کہ اس میں ایسا بازار ہو جس میں روز مرّہ کی ضروریات مل جاتی ہوں، آبادی اتنی ہو کہ اسے قصبہ کہا جاسکے یا جس میں سڑکیں وغیرہ ہوں اور حکومت کی طرف سے عدالت، تحصیل یا تھانہ وغیرہ ہو، آپ کی بستی میں کل ستر، اسّی (۷۰، ۸۰) گھر ہیں جن کی آبادی بہت سے بہت آٹھ سو کے قریب ہوگی، دُکانیں چھ سات ہیں، جسے بازار کہنا مشکل ہے، ڈاک خانہ، تحصیل وغیرہ نہیں ہے، اس لئے اس کو قصبہ نہیں کہہ سکتے، ہاں! اردگرد کی جن دُوسری بستیوں کا تذکرہ آپ نے کیا ہے اگر وہ ایسی ہوں کہ دیکھنے والا ان سب کو ایک سمجھتا ہو اور ان کا مجموعی نام بھی ایک ہو تو اس کی مزید تفصیل لکھ کر سوال دوبارہ پوچھ لیجئے۔ فی الحال تو وہاں جوازِ جمعہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اوّل تو آپ، لوگوں کو امداد الفتاویٰ، فتاویٰ دارالعلوم وغیرہ فتاویٰ کی کتابیں نیز موجودہ مفتیوں کے فتاویٰ دِکھا کر مسئلہ نرمی سے سمجھائیں، اگر اس طرح بات بن جائے فبہا، ورنہ اگر فتنے کا اندیشہ ہو تو کسی اور سے جمعہ پڑھوا کر خود مقتدی بن کر نماز بہ نیت نفل پڑھ لیجئے، پھر تنہا ظہر کی نماز ادا کرلیجئے۔ رہا

یہ مسئلہ کہ حنفیہ کے اس مسلک کے قرآن وسنت سے کیا دلائل ہیں؟ سو یہ ایک طویل الذیل موضوع ہے، اوّل تو یہ بات مجتہدین کے سوچنے کی ہے، ہم مقلدوں کے سوچنے کی نہیں۔ دُوسرے اس پر مفصل رسائل حنفیہ نے لکھ دیئے ہیں، جن میں علامہ نیموی، حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند رحمہم اللہ وغیرہ کے رسائل معروف ومشہور ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کا رسالہ "اوثق العریٰ فی تحقیق الجمعة فی القریٰ" سب سے زیادہ مفصل ہے۔

تیسری مختصر بات یہ ہے کہ بخاری اور ابوداؤد وغیرہ کی معروف حدیث کے مطابق مدینہ طیبہ کے بعد سب سے پہلا جمعہ "جواثی" نامی قلعے میں پڑھا گیا ہے،[1] جو بحرین کی تجارتی منڈی تھی، حالانکہ بحرین کی فتح سے پہلے بیشمار دیہات مسلمان ہوچکے تھے، وہاں کہیں بھی جمعہ پڑھنا ثابت نہیں بلکہ جمعہ نہ پڑھنا ثابت ہے۔

نیز صحیح بخاری میں مروی ہے کہ عوالی بستیوں کے صحابہ کرامؓ باری باری جمعہ پڑھنے کے لئے مدینہ طیبہ آیا کرتے تھے،[2] اگر وہاں جمعہ جائز ہوتا تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں جمعہ کے دن ظہر کی نماز پڑھائی ہے، جس پر تمام روایات متفق ہیں، یہ تمام دلائل اس قدر قوی ہیں کہ حنفیہ کے مسلک کو ضعفِ دلیل کی بنیاد پر چھوڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔[3]

جہاں تک امروٹ شریف اور ہالیجی شریف کا تعلق ہے، مجھے وہاں کے حالات کا علم نہیں ہے کہ وہ کیسی بستیاں ہیں؟ بہتر ہوگا کہ آپ وہاں کے بزرگوں سے بھی اس مسئلے میں رُجوع کرکے معلوم کرلیں کہ ان کے جمعہ پڑھنے کی وجہ کیا ہے؟

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۸۶ ج)

صحتِ جمعہ کے لئے شہر یا قریۂ کبیرہ ہونا ضروری ہے

سوال:- جمعہ کی نماز کے لئے احناف کے نزدیک شہر کا وجود ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- حنفیہ کے نزدیک جمعہ صرف شہر، قصبے یا ایسے بڑے گاؤں میں ہوسکتا ہے جہاں ضروریاتِ زندگی عام ملتی ہوں، بازار ہوں، سڑکیں ہوں اور وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شہر کے

---

(۱) دیکھئے صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۲۲ (طبع قدیمی کتب خانہ) وابوداؤد ج:۱ ص:۱۶۰ (طبع مکتبہ حقانیہ ملتان)۔

(۲) ایضاً ص:۱۲۳۔

(۳) دلائل کی تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۲۶ تا ۷۳۰ و ۷۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔

ساتھ مشابہ ہو، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۸/۱/۱۴ھ
(فتویٰ نمبر ۲۹/۴۶ الف)

گھر میں نمازِ جمعہ پڑھانے کا حکم

سوال:- ایک عالم صاحب کسی مسجد میں عرصے سے خطیب تھے، مسجد کی انتظامیہ سے اختلاف کی بدولت الگ ہوگئے، اب انہوں نے مسجد کے مقابلے میں اپنے گھر میں جمعہ کی نماز پڑھانی شروع کردی ہے، جبکہ اس گاؤں میں بھی بہت سی مسجدیں ہیں، کیا ایسی صورت میں جمعہ گھر پر جائز ہے؟

جواب:- جس جگہ لوگوں کو جمعہ کے لئے آنے کی عام اجازت ہو وہاں جمعہ ادا تو ہوجاتا ہے، لیکن مسجد کو چھوڑ کر گھر میں جمعہ قائم کرنا مکروہ اور نہایت ناپسندیدہ اقدام ہے۔ اس سے مسجد کی فضیلت بھی حاصل نہیں ہوتی اور یہ مساجد میں تقلیلِ جماعت کا سبب بھی ہے، چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں بھی جمعہ کرنے کو علماء نے پسند نہیں کیا، گھروں میں تو بطریقۂ اَوْلیٰ ناپسندیدہ ہے۔

وفی الدر المختار فلو دخل امیر حصنًا أو قصره وأغلق بابه وصلّى بأصحابه لم تنعقد ولو فتحه وأذن للناس بالدخول جاز وكره وقال الشامیؒ لأنه لم يقض حق المسجد الجامع. (شامی)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم
۱۳۹۷/۱۰/۱۲ھ
(فتویٰ نمبر ۲۸/۱۰۶۳ ج)

کراچی سے اٹھائیس میل دُور قصبہ ''کاٹھور آباد'' میں جمعہ کا حکم

سوال:- کراچی سے ۲۸ میل پر ایک قصبہ بنام ''کاٹھور آباد'' ہے، جس میں ملیر کی طرح باغات ہیں اور ملحقہ قریہ جات کی بھی آبادی تقریباً چھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے، بازار اور دُکانیں بھی ہیں، جس میں ضروریاتِ زندگی کی مکمل اشیاء میسر ہیں، اسکول، ہسپتال، بینک، پوسٹ آفس اور بجلی اور ٹیلیفون کی لائن بھی ہے، بس سروس بھی جاری ہے، صرف تھانہ موجود نہیں ہے۔

تفصیلات قریہ جات اور دُکانات حسبِ ذیل ہیں:-

	نام قریہ	تعداد مکانات	تعداد دُکانات
۱:-	سراج احمد گوٹھ	ایک سو پچیّس	۳

---

(۱) تفصیل کے لئے امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۲۶ تا ۷۳۰ اور ص:۷۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۱ ص:۱۵۲ (طبع سعید).

۲:-	کمال گوٹھ	۸۰ مکان	ا
۳:-	ابراہیم گوٹھ	۵۰	×
۴:-	موریا گوٹھ	۵۰	ا
۵:-	کھوسہ گوٹھ	۵۰	×
۶:-	سوفن گوٹھ	۵۰	ا
۷:-	دین محمد گوٹھ	۲۰	ا
۸:-	دریاخان گوٹھ	۲۵	ا
۹:-	ماچھی گوٹھ	۵۰	ا
۱۰:-	کاچیلو گوٹھ	۲۰	ا
۱۱:-	میانداد گوٹھ	۵	×
۱۲:-	رند گوٹھ	۶	×
۱۳:-	علو گوٹھ	۱۵	×
۱۴:-	نوازعلی گوٹھ	۲۰	×
۱۵:-	حسن لشکری گوٹھ	۲۰	×
۱۶:-	روزی گوٹھ	۲۰	×
۱۷:-	مراد گوٹھ	۲۰	×
۱۸:-	نیک محمد گوٹھ	۱۰	×
۱۹:-	فقیر گوٹھ	۱۵	×
۲۰:-	ہاشم گوٹھ	۱۰	×
۲۱:-	گبول گوٹھ	۱۰	×

دُکانوں میں راشن ہے اور حجام کی دُکان، لوہار کی دُکان اور ہوٹلیں بھی ہیں، جن کی تعداد تقریباً ۲۵ ہوتی ہے، ہسپتال تین ہیں، اور اسکول ۱۷ ہیں، کیا مذکورہ قصبے میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

جوابات اثبات میں ہوں یا نفی میں، دونوں صورتوں میں حوالہ کتب ضرور دیا جائے۔

۱:- کالونی پچاس دُکانیں، مکانات کچھ نہیں۔ ۲:- سراج احمد گوٹھ اور پہلوان گوٹھ چار فرلانگ درمیانی فاصلہ۔

(جواب از حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ)

جواب:- سوال میں کاٹھور کے جن دیہات کا ذکر ہے، ان کی صحیح صورتِ حال سمجھنے کے لئے ہم نے ان مقامات کا مفصل معائنہ کیا، اس معائنے کے نتیجے میں جو بات سامنے آئی وہ یہ ہے کہ کاٹھور کسی ایک قصبے یا بستی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ چھوٹی چھوٹی مختلف بستیوں پر مشتمل ایک قصبہ ہے، اور سوال میں قصبے کے نام سے اس کے جو اوصاف ذکر کئے گئے، وہ کسی ایک بستی کے اوصاف نہیں ہیں، بلکہ پورے علاقے کاٹھور کے مجموعے کے اوصاف ہیں، اور صورتِ حال یہ ہے کہ:-

۱:- مختلف لوگوں نے اپنی اپنی سہولت کے مطابق چھوٹی چھوٹی بہت سی بستیاں آباد کر رکھی ہیں جو الگ الگ گوٹھوں کے نام سے موسوم ہیں، اور ہر گوٹھ سے دُوسرے گوٹھ تک آبادی متصل نہیں ہے بلکہ دونوں کے درمیان کہیں کھیتوں کا، کہیں جنگلوں کا فاصلہ ہے۔ چند گوٹھ ایسے بھی ہیں جن کے ایک سرے پر کھڑے ہوکر دُوسرے گوٹھ کا سرا نظر آتا ہے، لیکن بیشتر ایسے ہیں کہ ایک گوٹھ سے دُوسرا گوٹھ نظر نہیں آتا، اور بیچ میں دو میل سے لے کر ایک فرلانگ تک کے فاصلے پائے جاتے ہیں جو زرعی زمینوں یا جنگلوں پر مشتمل ہیں۔

۲:- ان گوٹھوں میں سے کوئی گوٹھ بھی ایسا نہیں ہے جس پر مصر یا قریۂ کبیرہ کا اطلاق دُرست ہو یا جس میں اس کی علامت پائی جائے، عام طور سے آبادیاں، جھونپڑیوں یا کچھ مکانات پر مشتمل ہیں، کچھ مکانات پکے بھی ہیں، ان گوٹھوں میں سب سے بڑا گوٹھ ''سراج احمد گوٹھ'' ہے، جو تقریباً سوا سو مکانات پر مشتمل ہے، لیکن اس میں بھی گلی، کوچے، بازار وغیرہ نہیں ہیں، البتہ تین متفرق دُکانیں اور دو ہوٹل ہیں، اور نہ مصریت کی کوئی اور علامت پائی جاتی ہے، جب سب سے بڑے گوٹھ کی حالت یہ ہے تو دُوسرے چھوٹے گوٹھوں کا معاملہ اور زیادہ واضح ہے۔

۳:- البتہ ان تمام گوٹھوں کے تقریباً وسط میں ایک بازار واقع ہے، جو کسی بھی گوٹھ کا جزو نہیں ہے، بلکہ ایک مستقل علاقہ ہے، اس کو ''کاٹھور کالونی بازار'' کہتے ہیں، اس میں سلک وسوق موجود ہیں اور ضروریاتِ زندگی ملتی ہیں، اس میں بینک، مڈل کے اسکول، ہسپتال، ڈاک خانہ وغیرہ ہے، لیکن یہاں رہائشی مکان صرف ایک ہے، مختلف گوٹھوں کے لوگ بھی یہاں دن میں دُکان داری کرتے ہیں اور رات کو اپنے اپنے گوٹھ میں چلے جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا تنقیحات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ تمام بستیاں مستقل الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں، اور ان میں سے کسی میں بھی جمعہ کے جواز کی شرائط موجود نہیں ہیں، اور ان کے مجموعے کا نام کاٹھور ہونے سے اس مجموعے کا مصر یا قریۂ کبیرہ ہونا لازم نہیں آتا

کیونکہ ان بستیوں کے درمیان انفصال کافی ہے، اور جس طرح متعدّد بستیوں کے مجموعے پر ضلع کے نام کا اطلاق کیا جاتا ہے، اس طرح ان بستیوں کے مجموعے کو کاٹھور کہتے ہیں۔

لہٰذا مذکورہ بستیوں میں سے کسی بستی میں بشمول ''سراج احمد گوٹھ'' جمعہ جائز نہیں، البتہ کاٹھور بازار میں جمعہ کا مسئلہ زیرِ غور ہے، اور چونکہ وہ خالص بازار ہے، رہائشی بستی نہیں ہے، اس لئے اس کی مصریت بھی محلِ نظر ہے، البتہ اگر علاقے کے حاکم یا ڈپٹی کمشنر سے جمعہ قائم کرنے کی اجازت لے لی جائے تو پھر سراج گوٹھ اور کاٹھور کالونی بازار میں جمعہ پڑھنا دُرست ہوجائے گا، اور جن بستیوں میں چالیس یا اس سے زائد مکان ہیں ان میں بھی جمعہ جائز ہوگا، لأن هٰذا مجتهد فيه۔

لما فی رد المحتار واذا اتصل به الحكم صار مجمعًا عليه. (شامی ج:۱ ص:۵۳۷)۔[1]

رشید احمد
دار الافتاء اشرف المدارس
ناظم آباد کراچی
۱۳۹۹/۱/۸ھ

(جواب از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

ويشترط لصحتها سبعة أشياء الأول المصر .... وظاهر المذهب أنه كل موضع له أمير وقاض يقدر علىٰ اقامة الحدود. (الدر المختار مع الشامی ج:۱ ص:۵۳۶)۔[2]

وفی رد المحتار عن أبی حنيفة أنه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر علىٰ انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهٰذا هو الأصح. (شامی ج:۱ ص:۵۳۶)۔[3]

وفی البحر الرائق فقال المصر فی ظاهر الرواية أن يكون فيه مفت وقاض يقيم الحدود وينفذ الأحكام وبلغت أبنيته أبنية منی. (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۵۱)۔[4]

مندرجہ بالا حوالوں کی روشنی میں مذکورہ بالا جواب دُرست ہے۔ واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۹/۱/۱۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۰/۹۴ الف)

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۳۹۹/۱/۱۱ھ

الجواب صحیح
ولی حسن
جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی

---

(۱) ج:۲ ص:۱۳۸ (طبع سعيد).
(۲، ۳) الدر المختار مع رد المحتار باب الجمعة ج:۲ ص:۱۳۷، ۱۳۸.
(۴) البحر الرائق باب صلوٰة الجمعة ج:۲ ص:۱۴۰ (طبع سعيد).

کیا صحراء میں جمعہ فرض ہے؟

سوال: -محترم المقام حضرت مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

باعثِ تحریر یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں ایک شخص ہے، اس کا مسئلۂ جمعہ میں مندرجہ ذیل نظریہ ہے:-

۱:- نمازِ جمعہ ہر جگہ حتیٰ کہ صحراء میں بھی فرض ہے۔

۲:- بغیر جماعت کے اکیلے بھی اس کو پڑھنا جائز ہے۔

۳:- ائمۂ اربعہ کی شروط قرآن کے خلاف ہیں، کیونکہ قرآن میں جمعہ مطلق اور عام ہے، اس کا کوئی مقید اور مختص موجود نہیں ہے۔

۴:- جو علماء نمازِ جمعہ کو چھوٹے گاؤں اور صحراؤں میں منع کرتے ہیں وہ خطا کار اور مکروہ وحرام کے مرتکب ہیں۔

۵:- یہ شخص لوگوں کو ایسے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں جمعہ جاری کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے جہاں چاروں مذاہب میں جمعہ ناجائز ہے، چنانچہ بعض جگہوں میں جاری ہو بھی گیا ہے۔

الغرض الف:- از رُوئے شرعِ محمدی اس شخص کا کیا حکم ہے؟

ب:- مسئلۂ جمعہ میں صحیح مسلکِ حنفی کیا ہے؟

ج:- علاقے کے علماء کو شخصِ مذکور کے گاؤں کے جمعوں کے متعلق کیا موقف اختیار کرنا چاہئے؟

جواب: - الف:- مذکورہ شخص کا نظریہ ائمۂ اربعہ کے خلاف ہے، چاروں ائمہ میں سے کسی کا بھی وہ مسلک نہیں ہے جو وہ بیان کرتا ہے، بالخصوص ائمۂ اربعہ اور ان کے مقلدین کو اس بارے میں مکروہ یا حرام کا مرتکب بتانا سخت گمراہی کی بات ہے، اس کی بات قابلِ شنوائی نہیں۔

ب:- حنفی مسلک میں جمعہ صرف اس بستی میں جائز ہے جسے عرفاً یا تو شہر کہا اور سمجھا جاتا ہو یا ایسا بڑا گاؤں یا قصبہ ہو جس میں گلی، کوچے اور بازار وغیرہ ہوں اور ضروریاتِ زندگی عام طور پر ملتی ہوں، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں۔[1]

---

(۱) وفی الشامیة ج:۲ ص:۱۳۷ ویشترط لصحتها سبعة أشياء الأول المصر .... وظاهر المذهب انه كل موضع له أمير وقاض يقدر على اقامة الحدود. وفی الشامیة عن أبی حنيفةؒ انه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظالم من الظالم بحشمته وعلمه أو علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الأصح .... الخ. وكذا فی البحر الرائق ج:۲ ص:۱۵۱. نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۵۶۔

لوگوں کو حنفی مسلک پر عمل کرنا چاہئے، اور مذکورہ شخص کی بات پر عمل کرنا ہرگز جائز نہیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۰/۹/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۲۸۰/۳۱ د)

ایک قصبے میں نمازِ جمعہ کا حکم

سوال:- قصبہ شاریاں جس کو اپنے قرب و جوار میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، تجارتی مرکز جبرنی سڑک پر واقع ہے، یونین کونسل کا سینٹر بھی ہے، جس میں ماہوار ایک دو اجلاس ہوتے ہیں، ایک مڈل اسکول، ایک ڈسپنسری، گرلز پرائمری اسکول، ڈاک خانہ وغیرہ ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی شہرت اور رونق ہے۔ عرصہ دراز سے یہاں جمعہ ہوتا ہے، اب کچھ لوگ منع کرتے ہیں کہ یہاں جمعہ نہیں ہوتا، نمازِ جمعہ میں اچھی خاصی تعداد لوگوں کی جمع ہوجاتی ہے، اگر لوگوں کو منع نہ کیا جائے تو اچھی خاصی تعداد میں لوگ جمع ہوجائیں۔ اس میں جمعہ دُرست ہے یا نہیں؟

جواب:- جو حالات سوال میں بیان کئے گئے ہیں اگر وہ دُرست ہیں تو اس قصبے میں نمازِ جمعہ دُرست ہے،[1] ڈاک خانہ، تجارتی مرکز اور پھر یونین کونسل کا دفتر ہونا اسے قریہ کی تعریف سے نکال کر مصر کی تعریف میں داخل کرنے کے لئے کافی ہے جو لوگ منع کرتے ہیں ان کی وجہ معلوم ہوتی تو اس پر کچھ کہا جاتا۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۸۸/۱/۲۳ھ

جیلوں، چھاؤنیوں اور ایئرپورٹ پر نمازِ جمعہ

(اہم وضاحت از حضرتِ والا دامت برکاتہم)

(میں نے اپنے یمن کے سفرنامے میں جو ''البلاغ'' کے ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ شمارے میں شائع ہوا ہے، برسبیلِ تذکرہ دبئی ایئرپورٹ پر نمازِ جمعہ ادا کرنے کا ذکر کیا تھا، اور ساتھ ہی یہ لکھا تھا کہ ''اذنِ عام'' کی جو شرط فقہائے کرامؒ نے صحتِ جمعہ کے لئے ضروری قرار دی ہے، اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس بڑے علاقے میں نماز ادا کی جارہی ہے وہاں کے لوگوں کو جمعہ میں شرکت کی عام اجازت ہو، خواہ اس بڑے علاقے میں باہر کے لوگوں کو انتظامی یا دفاعی اسباب کی بناء پر داخلے کی عام اجازت نہ ہو۔

اس سفرنامے کے شائع ہونے کے بعد بعض حضرات نے مجھے خط میں لکھا کہ اس مسئلے کی تفصیلی وضاحت شائع ہونی چاہئے، میں نے کئی سال پہلے ایک فتویٰ اس موضوع پر لکھا تھا جو ابھی تک شائع نہیں ہوا، اس موقع پر مناسب معلوم ہوا کہ اسے شائع کردیا جائے کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ، چنانچہ ذیل میں وہ فتویٰ

---

(۱) دیکھئے ص:۵۲۲ کا حاشیہ۔

شائع کیا جارہا ہے۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اس فتوے کا اطلاق صرف ایسے ایئرپورٹ پر ہوسکتا ہے جو شہر کے اندر واقع ہو اور اتنا بڑا ایئرپورٹ ہو جس میں افراد کی ایک بڑی جماعت ہر وقت موجود رہتی ہو، دبئی کا ایئرپورٹ ایسا ہی ہے۔)

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ جیل خانوں میں قیدی نمازِ جمعہ ادا کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اس مسئلے میں متضاد باتیں سامنے آئی ہیں، اس لئے مسئلے کی تفصیلی وضاحت مطلوب ہے، بینوا توجروا۔

جواب:- جیل میں جمعہ کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں فقہائے متقدمین کی کتابوں میں کوئی صریح جزئیہ مذکور نہیں، اسی بناء پر اس مسئلے میں علمائے عصر کے فتوے بھی مختلف رہے، اصل اِشکال کی وجہ یہ ہے کہ فقہائے حنفیہ نے جمعہ کے جواز کی شرائط میں اذنِ عام کو بھی ذکر فرمایا ہے، اور چونکہ جیل میں داخلے کا اذنِ عام نہیں ہوتا اس لئے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جمعہ جائز نہیں، ہمارے زمانے میں یہ مسئلہ صرف جیل کا نہیں بلکہ ان تمام فوجی چھاؤنیوں، صنعتی آبادیوں اور ایئرپورٹوں کا بھی ہے جہاں عام لوگوں کو داخلے کی اجازت نہیں ہوتی، اس لئے یہ تحقیق ضروری ہے کہ ''اذنِ عام'' کی شرط کس درجے کی ہے؟ اور اس کا مفہوم کیا ہے؟

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ ''اذنِ عام'' کی شرط اس وقت تھی جب پورے شہر میں جمعہ ایک ہی جگہ ہوتا تھا، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ کسی کا جمعہ فوت نہ ہو، لیکن جب ایک شہر میں کئی جگہ جمعہ پڑھنے کا جواز ثابت ہوا اور عملاً متعدّد جگہوں پر جمعہ ہونے لگا تو اَب چونکہ اس بات کا اندیشہ نہیں رہا کہ ''اذنِ عام'' کی عدم موجودگی کی وجہ سے کسی کا جمعہ فوت ہوجائے گا، اس لئے اب یہ شرط باقی نہیں رہی، یہ حضرات دلیل میں علامہ شامیؒ کی مندرجہ ذیل عبارت پیش کرتے ہیں:-

وكذا السلطان اذا أراد أن يصلّى بحشمه فى داره فان فتح بابها وأذن للناس اذنًا عامًا جازت صلاته شهدتها العامة أولا وان لم يفتح أبواب الدار وأغلق الأبواب وأجلس البوابين ليمنعوا عن الدخول لم تجز لأن اشتراط السلطان للتحرز عن تفويتها على الناس وذا لا يحصل الا بالاذن العام اهـ. قلت وينبغى أن يكون محل النزاع ما اذا كانت لا تقام الا فى محل واحد، اما لو تعددت فلا لأنه لا يتحقق التفويت كما أفاده التعليل تأمل.

(شامی ج:۲ ص:۱۵۲، طبع سعید)

لیکن اس پر یہ اِشکال ہوتا ہے کہ اگر ''اذنِ عام'' کی شرط کی وجہ سے صرف تفویتِ جمعہ کا خوف ہو تو جس شہر میں متعدّد مقامات پر جمعہ ہوتا ہو وہاں اگر کوئی شخص اپنے ذاتی گھر میں دروازہ بند

کرکے جمعہ کی جماعت کرلے تو وہ بھی جائز ہونا چاہئے، اور یہ کہ جب سے تعدّدِ جمعہ کا رواج ہوا ہے اس وقت سے ''اذنِ عام'' کی شرط کو کتبِ فقہ سے بالکل خارج ہوجانا چاہئے تھا، یا اگر یہ شرط مذکور ہوتی تو ساتھ یہ تصریح بھی ذکر کرنی چاہئے تھی کہ اب یہ شرط واجب العمل نہیں، حالانکہ فقہاء تعدّدِ جمعہ کے رواج کے باوجود اس شرط کو ذکر کرتے چلے آرہے ہیں، یہ اِشکال خاصا قوی ہے لیکن کتبِ فقہ کی مراجعت کے بعد جو صورتِ حال نظر آتی ہے، وہ مندرجہ ذیل ہے:-

ا:- اذنِ عام کی شرط ظاہر الروایۃ میں موجود نہیں، چنانچہ علامہ کاسانیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وذكر فى النوادر شرطًا اخر لم يذكره فى ظاهر الرواية وهو أداء الجمعة بطريق الاشتهار حتى ان أميرًا لو جمع جيشه فى الحصن وأغلق الأبواب وصلّى بهم الجمعة لا تجزئهم. (بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۶۹، طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

چنانچہ صاحبِ ہدایہ نے بھی اذنِ عام کو ''شرط'' کے طور پر ذکر نہیں فرمایا، اسی طرح متعدّد فقہاء نے اس شرط کو ذکر نہیں کیا، جن میں شمس الائمہ سرخسیؒ کے اُستاذ علامہ سغدیؒ بھی داخل ہیں، (ملاحظہ ہو: النتف فى الفتاوىٰ ج:۱ ص:۹۰ مطبعة الارشاد بغداد)۔

۲:- نوادر کی اس روایت کے مطابق فقہائے متأخرین نے یہ شرط اپنی کتابوں میں ذکر فرمائی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اذنِ عام کے مفہوم میں فقہائے کرام کا کچھ اختلاف رہا ہے، بعض حضرات نے تو اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ہر وہ شخص جس پر جمعہ فرض ہوا سے اس مقام پر آنے کی اجازت ضروری ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ برجندی وغیرہ سے نقل کرتے ہیں: أى أن يأذن للناس اذنًا عامًا بأن لا يمنع أحدًا ممن تصح من الجمعة عن دخول الموضع الذى تصلّى فيه وهٰذا مراد من فسر الاذن العام بالاشتهار۔ (شامی ج:۲ ص:۱۵۱ طبع سعید)

دُوسری طرف بعض حضراتِ فقہاء کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''اذنِ عام'' کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جس آبادی میں جمعہ پڑھا جارہا ہے اس آبادی کے لوگوں کو وہاں آنے کی پوری اجازت ہو، خواہ باہر کے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو، چنانچہ علامہ بحر العلومؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وفى فتح القدير ان أغلق باب المدينة لم يجز وفيه تأمل فانه لا ينافى الاذن العام لمن فى البلد وأما من فى خارج البلد فالظاهر أنهم لا يجيئون لاقامة الجمعة بل ربما يجيئون للشر والفساد. (رسائل الارکان ص:۱۱۵ طبع قدیم، مطبع یوسفی فرنگی محل لکھنؤ)

نیز درمختار میں کہا گیا ہے کہ:-

فلا يضر غلق باب القلعة لعدو أو لعادة قديمة لأن الاذن العام مقرر لأهله وغلقه لمنع

العدو لا المصلّی نعم لو لم یغلق لکان أحسن کما فی مجمع الأنهر.

(الدر المختار ج:۲ ص:۱۵۲ طبع سعید)

مجمع الانہر میں ہے:-

وما یقع فی بعض القلاع من غلق أبوابه خوفًا من الأعداء أو کانت له عادة قدیمة عند حضور الوقت فلا بأس به لأن الاذن العام مقرر لأهله ولٰکن لو لم یکن لکان أحسن کما فی شرح عیون المذهب وفی البحر والمنح خلافه لٰکن ما قرّرناه أولٰی لأن الاذن العام یحصل بفتح باب الجامع وعدم المنع ولا مدخل فی غلق باب القلعة وفتحه ولأن غلق بابها لمنع العدو لا لمنع غیره تدبر. (مجمع الانہر ج:۱ ص:۲۴۶ طبع بیروت)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن حضراتِ فقہائے کرامؒ نے ''اذنِ عام'' کی شرط کو تفویتِ جمعہ کے خوف پر مبنی قرار دیا ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ ''اذنِ عام'' کا پہلا عام مفہوم اس علت کے ساتھ معلول تھا جو تعدّدِ جمعہ کی صورت میں باقی نہیں رہا، لیکن دُوسرا مفہوم اب بھی کافی ہے کیونکہ وہ اس علت پر مبنی نہیں تھا، بلکہ بقول صاحبِ بدائع ''اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ .... الخ'' کے اشارۃ النص پر مبنی تھا، چنانچہ علامہ شرنبلالیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

قلت أطلعت علٰی رسالة للعلامة ابن الشحنة وقد قال فیها بعدم صحة الجمعة فی قلعة القاهرة لأنها تقفل وقت صلاة الجمعة ولیست مصرًا علٰی حدتها وأقول فی المنع نظر ظاهر لأن وجه القول بعدم صحة صلاة الامام بقفله قصره اختصاصه بها دون العامة والعلة مفقودة فی هٰذه القضیة فان القلعة وان قفلت لم یختص الحاکم فیها بالجمعة لأن عند باب القلعة عدة جوامع فی کل منها خطبة لا یفوت من منع من دخول القلعة الجمعة بل لو بقیت القلعة مفتوحة لا یرغب فی طلوعها للجمعة لوجودها فیما هو أسهل من التکلف بالصعود لها وفی کل محلة من المصر عدة من الخطب فلا وجه لمنع صحة الجمعة بالقلعة عند قفلها.

(مراقی الفلاح مع الطحطاوی ص:۲۷۸ قدیمی کتب خانہ)

اگرچہ علامہ طحطاویؒ نے اس کے تحت علامہ شرنبلالیؒ کی اس بات پر اعتراض فرمایا ہے، لیکن علامہ شرنبلالیؒ کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعدّدِ جمعہ کی صورت میں ''اذنِ عام'' کا وہ عام مفہوم لینے کی ضرورت نہیں جس کے تحت ہر وہ شخص جس پر جمعہ واجب ہو اس کو وہاں آنے کی اجازت ہو، بلکہ اگر کوئی ایسی آبادی موجود ہو جس میں گھروں کی یا رہنے والوں کی قابلِ لحاظ تعداد موجود ہو اور اس آبادی کے تمام لوگوں کو وہاں جمعہ کے لئے آنے کی اجازت ہو تو یہ بات ''اذنِ عام'' کے تحقق کے لئے کافی

ہے، بشرطیکہ اس آبادی کے باہر کے لوگوں کو آنے سے ممانعت کرنے کی وجہ نماز سے روکنا نہ ہو، بلکہ کسی دفاعی یا انتظامی وجہ سے مجرّد داخلے سے روکنا ہو۔

اگر علامہ شرنبلالیؒ کی مذکورہ بالا عبارت کا یہ مفہوم لیا جائے تو اس پر وہ اعتراض وارد نہیں ہوگا جو علامہ طحطاویؒ نے وارد فرمایا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تعدّدِ جمعہ کی صورت میں ''اذنِ عام'' کی شرط فقہائے حنفیہ کے نزدیک بالکلیہ ختم تو نہیں ہوئی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جس آبادی میں (نہ کہ کسی انفرادی گھر میں) جمعہ پڑھا جارہا ہے اس آبادی کے لوگوں کو وہاں آنے کی اجازت ہو، اگر آبادی سے باہر کے لوگوں کو دفاع یا انتظام کے پیشِ نظر اس آبادی سے داخلے سے روکا گیا ہو تو یہ ''اذنِ عام'' کے منافی نہیں بشرطیکہ روکنے کا اصل محرک نماز سے روکنا نہ ہو بلکہ کوئی دفاعی یا انتظامی ضرورت ہو اور اس آبادی سے باہر کے لوگ اس پابندی کی بنا پر جمعہ سے محروم نہ ہوتے ہوں۔

اس پر صرف یہ اِشکال باقی رہتا ہے وہ یہ کہ فقہائے کرامؒ نے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ مسجونین کے لئے جمعہ کے دن اپنی علیحدہ ظہر کی جماعت کرنا مکروہ ہے (ہدایہ مع فتح القدیر ج:۲ ص:۳۵ طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجونین کے لئے جمعہ جائز نہیں، ورنہ ان کو ظہر کی جماعت کی حاجت ہی نہ ہوتی۔

لیکن اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ علامہ شامی اور علامہ شرنبلالی رحمہما اللہ کی عبارتوں کی روشنی میں یہ حکم اس دور کا ہے جب جمعہ ایک ہی جگہ سلطان کی قیادت میں ہوتا تھا اور سلطان کی طرف سے دُوسری جگہ اقامتِ جمعہ کی اجازت نہیں ہوتی تھی، اس کے علاوہ قیدخانے بھی مختلف نوعیّتوں کے ہوتے تھے، ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ قیدخانہ ہو جو کسی ایک ہی گھر یا ایک ہی احاطے پر مشتمل ہو اور اس پر کسی مستقل آبادی کا اطلاق نہ ہوسکتا ہو۔ ایک اور اِشکال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''بدائع'' میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ:-

السلطان اذا صلّی فی فهندرة والقوم مع أمراء السلطان فی المسجد الجامع قال: ان فتح باب داره وأذن للعامة بالدخول فی فهندرة جاز وتكون الصلوٰة فی موضعين ولو لم يأذن للعامة وصلّی مع جيشه لا تجوز صلوٰة السلطان وتجوز صلوٰة العامة.

(بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۶۹ طبع رشیدیہ کوئٹہ)

یہ مسئلہ تعدّدِ جمعہ کی صورت میں مفروض ہے اس کے باوجود سلطان کے ''اذنِ عام'' نہ دینے کی صورت میں نمازِ جمعہ کو غیر منعقد قرار دیا گیا ہے۔

لیکن بظاہر اس صورت سے مراد یہ ہے کہ سلطان اپنے محل میں صرف اپنے لشکروں اور سپاہیوں کے ساتھ نماز پڑھ لے، اور باقی لوگوں کو وہاں آنے کی اجازت نہ ہو، چنانچہ مذکورہ عبارت میں ''ان فتح باب دارہ .... الخ'' کا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے لہٰذا یہاں ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ سلطان کا محل اس کی اپنی انفرادی جگہ ہے، اور پیچھے گزر چکا ہے کہ انفرادی مقامات پر اس وقت تک جمعہ جائز نہیں ہوتا جب تک اسے عام لوگوں کے لئے کھول نہ دیا گیا ہو، لیکن اگر کوئی ایسی آبادی ہے جس میں معتد بہ لوگ رہتے ہیں تو اس کو اس جزئیہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:-

۱:- اگر کسی شہر میں جمعہ کی اجازت حاکم کی طرف سے صرف ایک جگہ پڑھنے کی ہو تو جمعہ کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ ہر وہ شخص جس پر جمعہ ہے اس کو وہاں آکر جمعہ پڑھنے کی عام اجازت ہو، ایسی عام اجازت کے بغیر جمعہ صحیح نہیں ہوگا۔

۲:- اسی طرح اگر کسی کا کوئی انفرادی گھر، محل یا دُکان ہو تو اس میں بھی جمعہ پڑھنا اس وقت تک جائز نہ ہوگا جب تک اس گھر، محل یا دُکان میں عام لوگوں کو آنے کی اجازت نہ دے دی گئی ہو، خواہ شہر میں دُوسری جگہ بھی جمعہ ہوتا ہو۔

۳:- اگر کوئی آبادی ایسی ہے جس میں معتد بہ لوگ رہتے ہیں اور وہ شہر کے اندر بھی ہے لیکن دفاعی، انتظامی یا حفاظتی وجوہ سے اس آبادی میں ہر شخص کو آنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ وہاں کا داخلہ ان وجوہ کی بنا پر کچھ خاص قواعد کا پابند ہے تو اس آبادی کے کسی حصے میں ایسی جگہ جمعہ پڑھنا جائز ہے جہاں اس آبادی کے افراد کو آکر جمعہ پڑھنے کی اجازت ہو، مثلاً بڑی جیل، فوجی چھاؤنی، بڑی فیکٹریاں، ایسے بڑے ایئرپورٹ جو شہر کے اندر ہوں اور ان میں سینکڑوں لوگ ہر وقت موجود رہتے ہیں، لیکن ان میں داخلے کی اجازت مخصوص قواعد کی پابند ہے، تو ان تمام جگہوں پر جمعہ جائز ہوگا بشرطیکہ وہ شہر میں داخل ہوں اور اس جیل، چھاؤنی، بڑی فیکٹری، ایئرپورٹ یا ریلوے اسٹیشن کے تمام افراد کو نماز کی جگہ آکر نمازِ جمعہ پڑھنے کی کھلی اجازت ہو۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۲۲/۵/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۴۹۲/۱۷ ھ)

ائمۂ حرمین کی اقتداء میں کھلے میدانوں میں پڑھی جانے والی جمعہ کی نمازوں کا حکم

سوال:- مسجدِ نبوی کے امام کے پیچھے پاکستان میں کئی لوگوں نے جمعۃ المبارک کی نماز پڑھی ہے، ان کی نماز ہوئی یا نہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔

جواب:- حرمین شریفین کے اماموں کے پیچھے کھلے میدانوں میں جمعہ کی جو نمازیں پڑھی گئیں وہ بلاشبہ ہوگئیں، جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان کے پیچھے نمازیں نہیں ہوئیں، وہ بالکل غلط کہتے ہیں، اللہ انہیں ہدایت دے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۲۳ ہ)

خطبۂ جمعہ میں کسی بزرگ کا مقولہ شامل کرنا

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ سکھر شہر کے ایک بزرگ کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، ان کے انتقال کے بعد ان کی مسجد کے امام صاحب نے خطبۂ جمعہ میں یہ طرز اختیار کیا ہے کہ پہلے خطبے میں تحمید، تسبیح اور چند احادیث پڑھنے کے بعد ان بزرگ کے چند ملفوظات عربی میں ترجمہ کرکے "قال شفیق الأمة" کے عنوان سے پڑھتے ہیں، اس میں خلجان یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہمارے اکابرؒ کا انتقال ہوا ہے، مگر کوئی صورت، مذکورہ صورتِ حال کی طرح منظور و مسموع نہیں ہوئی۔ شاید جواز کی کوئی صورت نکل آئے، لیکن فی نفسہٖ مذکورہ طرزِ عمل پر قلب مضطرب ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ فعل آئندہ چل کر غلو فی الدین کا ذریعہ نہ بن جائے اور کہیں یہ طریقہ سلف سے ہٹ کر کسی بدعت کا ذریعہ نہ بن جائے، اس لئے برائے کرم اس کی قابلِ اطمینان حیثیت مدلل طور پر متعین فرما کر ممنون فرمائیں، نیز یہ بھی وضاحت فرمادیں کہ یہ طرزِ عمل لائقِ اتباع و عمل ہے یا نہیں؟

جواب:- اگرچہ خطبۂ جمعہ میں کسی بزرگ کا کوئی مفید مقولہ بیان کرنا شرعاً جائز ہے، لیکن ہر خطبے میں کسی ایک ہی شخص کے ملفوظات بیان کرنے کا التزام کرنے سے یقیناً غلوّ کا اندیشہ ہے، لہٰذا اسے حکمت اور نرمی سے روکنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۱/۴/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۶/۴۲۸)

پنج وقتہ نماز کے لئے بنائی گئی جگہ میں جمعہ کا حکم

سوال: – جن مقتدیوں کی نمازِ میّت، امام نہیں پڑھتا، ان لوگوں نے ایک الگ جگہ بنائی ہے جس میں پانچ وقتی نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ دُوسری جگہ جاکر پڑھتے ہیں، کیا اس مسجد میں نمازِ جمعہ ان کے لئے جائز ہوگی یا نہیں؟

جواب: – ہر وہ مسجد جہاں جمعہ کی نماز شرعی شرائط کے مطابق ہوتی ہو، وہاں جمعہ کی نماز پڑھی جاسکتی ہے، لہٰذا ان حضرات کا دُوسری مسجد میں جمعہ پڑھنا دُرست ہے۔ واللہ اعلم

۱۳۸۸/۱/۲۹ھ

(فتویٰ نمبر ۱۶۰/۱۹ الف)

ترکِ سعی کے گناہ سے بچنے کے لئے
اذانِ اوّل کو تقریر سے مؤخر کرنے کا حکم

(سب سے پہلے اس موضوع سے متعلق حافظ صغیر احمد صاحب کے ایک سوال کے جواب میں دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے درج ذیل فتویٰ جاری کیا گیا۔)

جمعہ کی اذانِ اوّل کے متعلق ایک استفتاء اور اس کا جواب

سوال: – کیا فرماتے ہیں حضراتِ علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ:–

۱:– جمعہ کے دن اذانِ اوّل کے بعد فقہائے کرام کے نزدیک "سعی الی الجمعة" واجب ہے، جس کا مطلب سب کے نزدیک یہ ہے کہ نمازی مسجد کی طرف چل پڑے اور مسجد کی طرف چلنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہئے، اِلّا یہ کہ جمعہ کی تیاری میں مشغول ہو، یعنی غسل کر رہا ہو، کپڑے تبدیل کر رہا ہو، تیل، سرمہ یا عطر لگا رہا ہو اور پھر اس سے فارغ ہوتے ہی مسجد کی طرف چل پڑے۔

نیز اگر کبھی اذانِ اوّل سے قبل جمعہ کی مذکورہ تیاری سے فارغ نہ ہوسکا ہو یا تیاری شروع نہ کرسکا ہو تو اذانِ اوّل پر فوراً تیاری میں مشغول ہوجائے بشرطیکہ خطبے کی اذان سے اتنا قبل فارغ ہوکر مسجد میں پہنچ سکے کہ بہ سہولت سنتیں ادا کرسکے، اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر جمعہ کی تیاری (غسل وغیرہ) کی سنتوں کو موقوف کرکے واجب (مسجد) کی طرف چل پڑے۔

نیز مصلّی کے لئے ضروری ہے کہ وہ جمعہ کی مذکورہ تیاری، اذانِ اوّل کے ساتھ شروع کرنے کو عادت نہ بنائے اور یہ جانے کہ تیاری کی صرف اذانِ اوّل کے بعد اجازت ہے، اور اصل یہی ہے

کہ اذانِ اوّل کے بعد سعی الی الجمعہ کے تحت فوراً مسجد کی طرف چل پڑے کہ یہ عمل واجب ہے اور تأخیر سے واجب کی ادائیگی میں تأخیر کا گناہ ہوگا۔

۲:- یہ بات بھی سب فقہائے کرام کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اذانِ اوّل سے قبل یا اذانِ اوّل کے ساتھ کوئی مصلّی تیاری سے فارغ ہوکر بجائے مسجد میں آنے کے گھر میں ہی صلوٰۃ التسبیح، نوافل ادا کرتا ہے یا تلاوت میں مشغول ہوتا ہے یا دُرود شریف یا دیگر اوراد و وظائف میں یا مطالعے میں مشغول ہوتا ہے یا گھر کے کام میں مشغول ہوتا ہے تو یہ مشغولی ناجائز ہے۔

اب جواب طلب اَمر یہ ہے کہ اکثر مساجد میں اذانِ اوّل اور اذانِ خطبہ کے درمیان نصف گھنٹہ تا زائد از ایک گھنٹہ بھی وقفہ ہوتا ہے، جس کے دوران ہمارے بلاد اپنے اندر سننے والوں کے لئے پسند و ناپسند کی بہت سی وجوہ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے تقاریر کے سننے اور نہ سننے میں نمازیوں کا ذوق و مزاج مختلف ہوتا ہے، اس لئے اکثر نمازی اس تقریر کئے جانے والے وقت کو دیگر اعمال میں گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں اور بہت سے اس وقت کو خرید وفروخت کے علاوہ دیگر اپنے نجی کاموں کو پورا کرنے میں صَرف کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

آیا صورتِ مذکورہ میں اس بات کی گنجائش ہے کہ نمازی، جمعہ کی تیاری سے فارغ ہوکر گھر میں ہی تلاوت، صلوٰۃ التسبیح وغیرہ میں مشغول رہیں؟ ب:- گھر کے یا نجی کاموں میں شامل رہے اور سنتیں بھی گھر ہی میں ادا کرے اور خطبے کی اذان سے قبل یا خطبے کی اذان کے ساتھ ساتھ مسجد میں پہنچ جائے؟ اگر اس کی گنجائش نہیں تو ایسا کرنے والا کس درجے کا گناہگار ہوتا ہے؟ جواب سے جلد مطلع فرماکر ممنون فرمائیں۔

المستفتی صغیر احمد

احسان منزل امیر معاویہ روڈ راج گڑھ
چوبرجی، لاہور ۵۴۰۰۰
۱۹ ربیع الاوّل ۱۴۱۰ھ

(اس استفتاء کا دار الافتاء دار العلوم کراچی کی جانب سے یہ جواب دیا گیا جو ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی کے شوال ۱۴۱۵ھ کے شمارے میں بھی شائع ہوا۔)

جواب:- جن لوگوں پر جمعہ کی نماز فرض ہے ان کے لئے جمعہ کے دن جمعہ کی پہلی اذان سے لے کر نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے تک مفتیٰ بہ قول کے مطابق خرید وفروخت کرنا، سونا، کسی سے باتوں میں مشغول ہونا، یہاں تک کہ بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور کسی کتاب وغیرہ کا مطالعہ کرنا وغیر ذالک، غرض وہ سارے کام اور مشاغل جو جمعہ کی طرف جانے کے اہتمام میں مخل ہوں سب کے

سب مکروہِ تحریمی یعنی ناجائز ہیں۔ صرف کھانے کے مسئلے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کھانے کی طرف رغبت اتنی غالب ہو کہ نماز کے دوران دِل اس میں لگا رہنے کا اندیشہ ہو اور نماز سے فراغت تک کھانا بے لذّت ہوجانے کا خطرہ ہو تو کھانا کھایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ خطبۂ جمعہ کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اس کے علاوہ جمعہ کی تیاری کے متعلق جو کام ہیں وہ کئے جاسکتے ہیں، جیسے غسل کرنا، وضو کرنا، لباس پہننا وغیرہ، لیکن قصداً ان کاموں کو اذانِ اوّل تک مؤخر نہ کرنا چاہئے۔

البتہ ایک اہم بات جو توجہ طلب ہے وہ یہ کہ احادیثِ مبارکہ میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زوالِ شمس کے جلد بعد نمازِ جمعہ پڑھ لیتے تھے اور ایسا ہی حضراتِ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں بشمول خلفائے راشدینؓ نمازِ جمعہ زوال کے بعد جلد پڑھی جاتی تھی، لہٰذا جب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اذانِ اوّل شروع ہوئی تو اس اذانِ اوّل اور خطبے کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں ہوتا تھا، لیکن آج کل نمازِ جمعہ عموماً زوال کے بعد تأخیر سے ادا کی جاتی ہے اور پھر خطبۂ جمعہ سے قبل تقریر کا دستور ہوجانے کی وجہ سے خطبہ ونمازِ جمعہ میں مزید تأخیر ہوجاتی ہے اور اذانِ اوّل اور خطبے کے درمیان بہت وقفہ ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر یہ غفلت پائی جاتی ہے کہ لوگ اذانِ اوّل کے بعد سعی الی الجمعہ کا اہتمام نہیں کرتے کہ ابھی خطبے میں بہت وقت ہے، لوگوں کے اس گناہ میں مبتلا ہونے کا ایک سبب ان کی اپنی کوتاہی اور سستی کے علاوہ مساجد کے منتظمین بھی ہیں، اس لئے منتظمین کو چاہئے کہ وہ اذانِ اوّل کے بعد جلدی جمعہ ادا کرنے کا اہتمام کریں، کیونکہ اگرچہ نمازِ جمعہ کا اصل وقت (یعنی ابتداء اور انتہاء کے اعتبار سے) ظہر والا ہی ہے، لیکن ظہر کی نماز کی طرح جمعہ میں اِبراد کرنا اَولیٰ نہیں ہے، بلکہ جمعہ میں تعجیل افضل ہے، چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ میں ہے کہ:-

جمعہ وظہر کا وقت ایک ہے، مگر جمعہ کو ذرا پہلے پڑھنا کہ لوگ سویرے سے آئے ہیں ان کو جلد فراغت ہوجائے تو بہتر ہے، فقط۔ (فتاویٰ رشیدیہ ص:۲۵۳)

اسی طرح مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب قدس اللہ سرہٗ اپنے فتاویٰ عزیز الفتاویٰ میں اس سوال کے جواب میں کہ جمعہ کو سوا بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں یا ڈھائی بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں؟ لکھتے ہیں کہ:-

جمعہ میں تعجیل افضل ہے، ایک بجے، سوا بجے پڑھنے والے افضلیت پر ہیں۔

(عزیز الفتاویٰ ص:۲۷۴)

اور دُوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

حنفیہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ جمعہ میں تعجیل مستحب ہے، اِبراد یعنی تأخیر جو کہ ظہر کی نماز میں

موسمِ گرما میں مستحب ہے وہ جمعہ میں نہیں ہے، بلکہ جمعہ کو جلد ادا کرنا مستحب ہے، اور احادیث سے بھی جمعہ کی تعجیل ہی ثابت ہوتی ہے، پس زوال کے بعد مثلاً ساڑھے بارہ بجے اذانِ جمعہ ہونی چاہئے، پھر دس پندرہ منٹ بعد خطبہ اور اس کے بعد نماز ہونی چاہئے مثلاً ایک بجے تک یہ سب کام ہوجائیں یا کسی قدر کم وبیش ہو۔ (عزیز الفتاویٰ ص:۲۹۸)

لہٰذا منتظمین کو چاہئے کہ وہ زوال کے بعد جلدی جمعہ ادا کیا کریں اور نیز اذانِ اوّل اور خطبے کے درمیان زیادہ وقفہ نہ کیا کریں، اور اس کی صورت یہ ہے کہ اذانِ اوّل کے کافی دیر بعد تقریر شروع کرنے کے بجائے اذانِ اوّل کے فوراً بعد تقریر شروع ہوجائے اور مختصر تقریر کے بعد خطبے کے لئے اذان دی جائے، اور پھر خطبہ اور نماز پڑھ لی جائے یا اذانِ اوّل، تقریر کے فوراً بعد ہو، اور اس کے بعد صرف اتنا وقت ہو کہ جو لوگ ابھی مسجد میں نہیں آئے وہ مسجد میں آکر سنتیں پڑھ سکیں اور اس کے بعد اذانِ ثانی اور خطبہ ونماز ہو۔

لیکن چونکہ یہ طریقہ آج کل معروف نہیں ہے، اس لئے اس کو شروع کرنے سے پہلے لوگوں کو مسئلہ بتا کر ذہنی طور پر تیار کرلیا جائے تاکہ وقت پر لوگوں کو تشویش نہ ہو، لیکن بہرحال اذانِ اوّل کے بعد گھر کے کام کاج یا گھر میں رہ کر تلاوت یا صلوٰۃ التسبیح وغیرہ میں مشغول ہونا، جائز نہیں ہے، اور ایسا کرنے والا مکروہِ تحریمی کا مرتکب ہوگا۔

قال اللہ تعالیٰ: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ"۔ (۱)

وفی تنویر الأبصار ج:۲ ص:۱۶۱ (طبع سعید) ووجب سعی الیها وترک البیع بالأذان الأوّل وفی الشامیة تحت (قوله وترک البیع) أراد به کل عمل ینافی السعی وخصه اتباعًا للآیة نهر.

وفی بدائع الصنائع ج:۱ ص:۲۶۵ (طبع ایچ ایم سعید) لما روی عن عمرؓ أنه کان یخطب یوم الجمعة فدخل علیه عثمان فقال له أیة ساعة هٰذه؟ فقال: ما زدت حین سمعت النداء یا أمیر المؤمنین! علٰی أن توضأت، فقال: والوضوء أیضًا وقد علمت أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم أمر بالاغتسال.

وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۶۳ (طبع سعید) سمع النداء وهو یأکل ترکه ان خاف فوت جمعة أو مکتوبة لا جماعة رستاقی. وفی الشامیة والأکل أی الذی تمیل الیه

(۱) سورة الجمعة:۹.

نفسه ويخاف ذهاب لذته عذر فى ترک الجماعة كما مرّ فى بابها لٰكن يشكل ما مرّ من وجوب السعى الى الجمعة بالأذان الأوّل وترک البيع ولو ماشيا والمراد به كل عمل ينافى السعى فتأمل.

وفى تقريرات الرافعى بتقييد ما مرّ بما هنا يندفع الإشكال وذٰلک لأن حضور الأكل المذكور حيث كان عذرا فى سقوط واجب الجماعة لشغل بال المصلّى يكون عذرا فى سقوط واجب السعى اذ لا فرق بين واجب وواجب بخلاف ما اذا خاف فوت الجمعة أو الوقت لفوات الفرض لا لواجب، انتهٰى.

وفى صحيح البخارى ج: ۱ ص: ۱۲۳ (طبع قديمى كتب خانه) عن أنس بن مالكؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلّى الجمعة حين تميل الشمس، وعنه أيضًا قال: كنا نبكر بالجمعة ونقيل بعد الجمعة.

وفى مصنف لعبد الرزاق (ج:۳ ص:۱۸۵ رقم الحديث:۵۲۱۲)[1] عن عطاء قال: بلغنى أن عثمان كان يجمع ثم يقيل الناس بعد الصلوٰة.

وفى مصنف لابن أبى شيبة (۲: ۶: ۱)[2] أخبرنا محمد بن سعد الأنصارى عن أبيه قال: كنا نجمع مع عثمان بن عفانؓ ثم نرجع فنقيل.

وفيه أيضًا (۲: ۸: ۱)[3] عن أبى رزين قال: كنا نصلّى مع علىؓ الجمعة فأحيانا نجد فيئًا وأحيانا لا نجده.

وفى الدر المختار (ج: ۱ ص:۳۶۷)[4] (وجمعة كظهر أصلا واستحبابا) فى الزمانين لأنها خلفه.

وفى الشامية (قوله أصلا) أى من جهة أصل وقت الجواز وما وقع فى اٰخره من الخلاف (وقوله استحبابا فى الزمانين) أى الشتاء والصيف ح، لٰكن جزم فى الشباه من فن الأحكام انه لا يسن لها الابراد وفى جامع الفتاوىٰ لقارئ الهداية: قيل انه مشروع لأنها تؤدى فى وقت الظهر وتقوم مقامه وقال الجمهور: ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها

---

(۱) مصنف عبدالرزاق باب وقت الجمعة ج:۳ ص:۱۷۵ (طبع المكتب الاسلامى بيروت).

(۲) مصنف ابن أبى شيبة باب من كان يقيل بعد الجمعة ويقول هى أول النهار رقم الحديث:۵۱۲۳ ج: ۱ ص:۴۴۴ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۳) مصنف ابن أبى شيبة باب من كان يقول وقتها زوال الشمس وقت الظهر رقم الحديث: ۵۱۴۴ ج: ۱ ص:۴۴۵ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۴) (طبع ايچ ايم سعيد).

مفض الی الحرج ولا کذٰلک الظهر وموافقة الخلف لأصله من کل وجه لیس بشرط اهـ.

واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	عبیداللہ انور میرپوری
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ	احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ	سبحان محمود	دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴
			۱۴۱۵/۶/۲۳ھ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
بندہ محمود اشرف غفر اللہ لہٗ	بندہ عبدالرؤف سکھروی	محمد عبدالمنان عفی عنہ	اصغر علی ربانی

(ان ہی دنوں میں اس مسئلے سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں جناب مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب نے ایک فتویٰ تحریر فرمایا جو رجب ۱۴۱۵ھ کے رسالہ ''انوارِ مدینہ'' میں شائع ہوا، یہ فتویٰ درج ذیل ہے۔)

جمعہ کی اذانِ اوّل کے بعد بیع وشراء وغیرہ ممنوع کاموں کے ارتکاب سے لوگوں کو بچانے کے لئے کیا اذانِ اوّل کو مؤخر کرنا جائز ہے؟

سوال:- جمعہ کی اذانِ اوّل کے بعد خرید وفروخت اور نماز کے منافی ہر کام کو چھوڑ کر مسجد میں آنا واجب ہے، لیکن چونکہ لوگوں میں اس کا اہتمام بہت کم ہے کہ اذانِ اوّل کے وقت مسجد میں آجائیں اس لئے ترکِ واجب کے مرتکب ہوتے ہیں، لوگ اس معصیت سے بچ جائیں اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ اذانِ اوّل کو تأخیر سے کہا جائے اور دونوں اذانوں کے مابین فقط اتنا وقفہ کیا جائے کہ لوگ سنتیں پڑھ لیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ مثلاً دُوسری اذان سوا ایک بجے ہو اور پہلی اذان ایک بجے یا ایک بج کر پانچ منٹ پر کہی جائے جبکہ زوال کا وقت سوا بارہ بجے ہو، اُردو میں تقریر اذانِ اوّل سے پہلے ہی ہوجائے اس طرح بہت زیادہ لوگ اذانِ اوّل کے وقت مسجد میں موجود ہوں گے، بعض مساجد میں اس طریقے پر عمل ہورہا ہے۔

جواب:- جمعہ کی اذانِ اوّل کا وقت زوال کے متصل بعد ہے، اسی پر عملی توارث چلا آرہا ہے، کتبِ حدیثیہ وفقہیہ میں بھی اس کی تصریح ہے۔

۱:- المغنی لابن قدامہؒ میں ہے:-

ویبدأ وجوب السعی الیها .... وعند الحنفیة بالأذان الأول عند الزوال. (بحوالہ الفقه الاسلامی وأدلته ج:۲ ص:۲۶۲)۔[1]

(۱) (طبع دار الفکر).

(ترجمہ:- حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے سعی کا وجوب زوال کے وقت اذانِ اوّل سے شروع ہوتا ہے۔)

۲:- معارف السنن میں مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وبالجملة فهٰذا الأذان كان قبل التأذين بين يدى الخطيب وكان فى أول وقت الظهر متصلًا بالزوال. (ج:۳ ص:۳۹۶)۔[1]

(ترجمہ:- اذانِ اوّل خطیب کے سامنے اذان سے پیشتر ہوتی تھی اور ظہر کے اوّل وقت میں زوال کے ساتھ متصل ہوتی تھی۔)

۳:- مجمع الأنهر فى شرح ملتقى الأبحر میں ہے:-

(ويجب السعى وترك البيع بالأذان الأول) عقيب الزوال. (ج:۱ ص:۱۷۱)۔[2]

(ترجمہ:- جمعہ کے لئے سعی اور ترکِ بیع، زوال کے بعد اذانِ اوّل سے واجب ہوتی ہے۔)

۴:- عمدۃ القاری میں علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

قوله زاد النداء الثالث انما سمى ثالثًا باعتبار كونه مزيدًا لأن الأول هو الأذان عند جلوس الامام على المنبر والثانى هو الاقامة للصلوٰة عند نزوله والثالث عند دخول وقت الظهر. (ج:۶ ص:۲۱۱)۔[3]

(ترجمہ:- پہلی اذان کو جو تیسری اذان کہا گیا تو اس اعتبار سے کہ اس کو زیادہ کیا گیا تھا، کیونکہ پہلی اذان وہ ہے جو امام کے سامنے ہوتی ہے جب وہ منبر پر بیٹھا ہوتا ہے، اور دُوسری سے مراد نماز کے لئے اقامت ہے جو امام کے منبر سے اُترنے پر ہوتی ہے، اور تیسری اذان وہ ہے جو ظہر کا وقت شروع ہونے پر ہوتی ہے۔)

۵:- فتح الباری میں علامہ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

وتبين بما مضٰى ان عثمان أحدثه لاعلام الناس بدخول وقت الصلوٰة .... الخ. (ج:۲ ص:۳۹۴)۔[4]

(ترجمہ:- سابقہ کلام سے ظاہر ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے۔)

---

(۱) (طبع ایچ ایم سعید).
(۲) مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۵۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).
(۳) (طبع دار الفكر).
(۴) (طبع دار نشر الكتب الاسلاميه لاهور).

۶:- تبیین الحقائق میں علامہ زیلعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وقال بعض العلماء يجب السعي وترک البيع بدخول الوقت لأن التوجه الى الجمعة يجب بدخول الوقت وان لم يؤذن لها أحد ولهٰذا لا يعتبر الأذان قبل الوقت. (ج:۱ ص:۲۲۳)۔[1]

(ترجمہ:- بعض علماء نے کہا ہے کہ سعی اور ترکِ بیع کا وجوب، جمعہ کا وقت شروع ہونے سے ہوتا ہے، کیونکہ جمعہ کی طرف توجہ کا وجوب، وقت شروع ہونے سے ہوتا ہے، اگرچہ کسی نے بھی اس کے لئے اذان نہ کہی ہو، اسی لئے وقت سے پیشتر اذان کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔)

۷:- تفسیراتِ احمدیہ میں حضرت مُلّا جیون رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

وقال الامام الزاهد المراد بالنداء دخول الوقت اذ به يحرم البيع دون الأذان نفسه. (ص:۴۷۵ج)۔[2]

(ترجمہ:- امام زاہد نے کہا کہ ''نداء'' سے مراد وقت کا شروع ہونا ہے کہ اس سے بیع حرام ہوتی ہے اور عین اذان مراد نہیں ہے۔)

۸:- احکام القرآن میں مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:-

قوله تعالىٰ وَذَرُوا الْبَيْعَ اختلف السلف فى وقت النهى عن البيع فروى عن مسروق والضحاک ومسلم بن يسار أن البيع يحرم بزوال الشمس، وقال مجاهد والزهرى يحرم بالنداء وقد قيل ان اعتبار الوقت فى ذٰلک أولىٰ اذا كان عليهم الحضور عند دخول الوقت فلا يسقط ذٰلک عنهم تأخير النداء ولما يكن للنداء قبل الزوال معنى دل ذٰلک علىٰ أن النداء الذى بعد الزوال انما هو بعد ما قد وجب اتيان الصلوٰة. (ج:۵ ص:۶۳)۔[3]

(ترجمہ:- ارشادِ باری تعالیٰ: ''وَذَرُوا الْبَيْعَ'' بیع سے ممانعت کے وقت کے بارے میں سلف میں اختلاف ہوا ہے، مسروق، ضحاک اور مسلم بن یسار رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ زوالِ آفتاب سے ہی بیع حرام ہوجاتی ہے، مجاہد اور زہری رحمہما اللہ کا قول ہے کہ اذان سے حرام ہوتی ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس بارے میں وقت کا اعتبار کرنا اَوْلیٰ ہے کیونکہ وقت شروع ہونے پر لوگوں کے ذمے جمعہ کے لئے حاضری واجب ہوتی ہے، لہٰذا اذان کو مؤخر کرنا ان سے اس واجب کو ساقط نہیں کرے گا.... الخ۔)

اس عبارت سے درج ذیل باتیں سامنے آئیں:-

---

(۱) (طبع مكتبه امداديه ملتان).

(۲) تفسيرات احمدية سورة الجمعة ص:۴۰۵، ۴۰۶ (مطبع الكريمى، بمبئى).

(۳) (طبع ادارة القرآن كراچى).

الف:- جمعہ کی اذانِ اوّل کا وقت زوال سے متصل بعد کا ہے۔

ب:- بعض علماء کے نزدیک بیع وشراء وغیرہ کی حرمت کا تعلق وقتِ زوال سے ہے، تنہا اذان سے نہیں، اگر زوال کے وقت ہی اذان ہوتب تو وقت اور اذان دونوں کے ساتھ حکمِ ممانعت کا تعلق ہوا، اور اگر اذانِ اوّل کو تأخیر سے کہا گیا تو حکمِ ممانعت کا تعلق وقتِ زوال کے ساتھ ثابت ہوگا، اذان کہے جانے تک مؤخر نہیں ہوگا، ان دونوں باتوں کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ سمجھنا دُشوار نہیں ہوگا کہ اصلاحِ احوال کے لئے جس صورت کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے انتہائی غیر مناسب ہے کہ اس میں ترکِ واجب کے ارتکاب سے بچاؤ تو کیا ہوتا اُلٹا عملی توارث اور ایک حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، یعنی اذانِ اوّل کی اس کے اصل وقت سے تأخیر۔

جن مساجد میں اذانِ اوّل کو مؤخر کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، ضروری ہے کہ وہاں اس طریقے کو ختم کر دیا جائے۔

اصلاحِ احوال کی متبادل صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اذانِ اوّل کو اپنے وقت پر رکھتے ہوئے اذانِ ثانی کو جہاں تک ہوسکے مقدم کرلیا جائے، لیکن اس میں بھی اتنا وقفہ ضرور رکھا جائے کہ لوگ اذانِ اوّل کو سن کر مسجد میں جمع ہوجائیں اور فرضوں سے پہلے سنتیں پڑھ سکیں، کیونکہ ایک روایت میں ہے:-

فأحدث عثمان التأذينة الثالثة على الزوراء ليجتمع الناس. (عمدة القاری ج:٦ ص:٢١١)۔[1]

(حضرت عثمانؓ نے زوراء پر تیسری اذان شروع کرائی تاکہ لوگ اکٹھے ہوجائیں۔)

اور ایک اور روایت میں ہے: فأذن بالزوراء قبل خروجه ليعلم الناس ان الجمعة قد حضرت. (فتح الباری ج:٢ ص:٣٩٤)۔[2]

(اپنے نکلنے سے پیشتر زوراء پر اذان دِلوائی تاکہ لوگوں کو علم ہوجائے کہ جمعہ کا وقت ہوگیا ہے۔)

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہماری رائے میں یہ وقفہ آدھ گھنٹہ کا تو ضرور ہونا چاہئے، یعنی اذانِ اوّل تو زوال ہوتے ہی کہہ دی جائے اور آدھ گھنٹے بعد اذانِ ثانی کہہ دی جائے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	عبدالواحد غفرلہٗ
محمد قاسم	عبدالحمید	جامعہ مدنیہ لاہور

(۱) (طبع دار الفکر). (۲) (طبع دار نشر الکتب الاسلامیہ لاهور).

(اس فتویٰ کی اشاعت کے بعد حافظ صغیر احمد صاحب کی طرف سے جناب ڈاکٹر عبدالواحد صاحب کو درج ذیل تحریر بھیجی گئی۔)

محترم ومکرم حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب زید مجدہٗ! سلامِ مسنون

عرض یہ ہے کہ جناب کے علم میں ہے کہ بندہ ایک کوشش میں مشغول ہے کہ نمازِ جمعہ ادا کرنے والے مسلمان (بالعموم) اذانِ اوّل اور اذانِ ثانی کے درمیانی وقفے پر سعی الی الجمعہ کے منافی اُمور میں مشغول رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ترکِ واجب کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اسی سلسلے میں ایک استفتاء مرتب کرکے پاکستان کے اہم اہم مدارس سے جواب بھی منگایا، اور جناب کے ہاں سے بھی جواب موصول ہوا تھا، مگر ''انوارِ مدینہ'' کے جلد:۳ شمارہ:۳۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۵ (دسمبر ۱۹۹۴ء) میں اسی ذیل میں ایک مضمون (استفتاء اور اس کا جواب) دیکھا جسے دیکھ کر خیال ہوا کہ حضراتِ مفتیانِ کرام کی خدمت میں اس کو روانہ کرکے رہنمائی چاہوں اور اس کی تیاری بھی کرلی (تیاری کا ایک صفحہ بھی لف ہے) مگر ایک مشفق ومحبّ عالم نے یہ رہنمائی فرمائی کہ اپنے اِشکال کے حل کے لئے جناب کی خدمت میں پہلے عرض کردوں، خدا کرے جناب ہی توجہ فرما کر حل فرماویں، اِشکال یہ ہے کہ:-

یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ زوال سے نمازِ جمعہ کا وقت شروع ہوجاتا ہے، اور فضیلت بھی اسی میں ہے کہ اس سے یعنی زوال سے بھی قبل یا زوال پر تیاری شروع کرے، مگر فتویٰ کس پر ہے کہ وجوب سعی الی الجمعہ کا اطلاق زوال کے فوراً بعد ہوگا یا جہاں (جس مسجد میں) جس نمازی نے نماز پڑھی ہے وجوب کا اطلاق اس نمازی پر اس مسجد کی پہلی اذان سے ہوگا؟ اگر وجوب کا اطلاق زوال سے ہوگا تو پھر سارے عالم کے مسلمانوں کو اس گناہِ کبیرہ سے بچانے کی سعی کیا ہو؟

اُمید ہے جنابِ والا مفتیٰ بہ قول کی روشنی میں رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں گے، جزاکم اللہ تعالیٰ۔ (صغیر احمد)

جواب:- (از مفتی عبدالواحد صاحب)

جناب کی جانب سے پہلے جو سوال نامہ آیا تھا اس کا اور جواب کا حاصل یہ تھا کہ اذانِ اوّل کے بعد سعی الی الجمعہ واجب اور دُنیوی کاموں میں لگنا یا ایسے شغل میں مشغول ہونا جس سے سعی الی الجمعہ میں خلل آتا ہو، ناجائز ہے۔

لیکن ایک بات قابلِ غور تھی، اور وہ یہ کہ اذانِ اوّل کا وقت کیا ہے؟ کیا زوال ہوتے ہی کہی جائے یا جب مناسب خیال کیا جائے کہی جائے؟ خواہ زوال کے پندرہ منٹ بعد یا ایک گھنٹے بعد یا اس سے بھی زیادہ تأخیر سے۔

اس بات سے نہ تو جناب کے سوال نامے میں کچھ تعرض تھا اور نہ ہی اس کے جواب میں اس سے کچھ بحث کی گئی تھی، ''انوارِ مدینہ'' میں اسی بات کے بارے میں تحقیق پیش کی گئی تھی۔

حوالہ جات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اذانِ اوّل کا وقت زوال ہوتے ہی ہے (لہٰذا اذانِ اوّل کے وقت کے بارے میں یہی مفتیٰ بہ قول ہے) فتح الباری کے حوالے سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی تا کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے، معارف السنن کے حوالے سے معلوم ہوا کہ دورِ سلف میں اسی وقت اذان ہوتی تھی اور اسی پر توارثِ عملی چلا آرہا ہے۔

ایک متوارث عمل کو تبدیل کرنا جبکہ:-

۱:- اذانِ اوّل اس لئے شروع ہوئی کہ لوگوں کو جمعہ کے وقت کے شروع ہونے کا علم ہوجائے۔

۲:- اذانِ اوّل کا وقت زوال ہوتے ہی ہے۔

۳:- بعض حضرات کے نزدیک بیع وغیرہ کی حرمت زوالِ شمس سے ہے (اور اس قول کے قوی ہونے کا علم اس سے ہوتا ہے کہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے تبیین[1] میں اور مولانا ادریس کاندھلویؒ نے اَحکام القرآن[2] میں یہ قول نقل کر کے نہ تو اس کی تضعیف کی اور نہ ہی اس کے خلاف کیا)۔

۴:- جو مصلحت جناب کے پیشِ نظر ہے، اس کی تفصیل کا متبادل طریقہ موجود ہے، جو کہ ''انوارِ مدینہ'' ہی میں ذکر کیا گیا ہے۔

ایک غیر مناسب اور قابلِ ترک بلکہ واجب الترک اور واجب الاحتراز طریقہ ہے۔

یہ تو ایک اتفاقیہ بات (Accidental) ہوگی کہ اذانِ اوّل زوال ہوتے ہی نہ کہی گئی بلکہ کچھ تأخیر سے کہی گئی ہو اس وقت یہ اختلاف سامنے آتا ہے کہ وجوبِ سعی زوال سے ہو یا اذان سے، لیکن اس اتفاقیہ بات کو ہم عملی معمول نہیں بنا سکتے، عملی معمول وہی ہوگا جو حوالہ جات سے ثابت ہوا کہ زوال ہوتے ہی اذانِ اوّل کہی جائے اور اس طرح عملاً (Practically) وجوبِ سعی، زوال اور اذانِ اوّل دونوں ہی کے ساتھ مقترن ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

عبدالواحد غفرلہٗ

۲۰ رشعبان ۱۴۱۵ھ

---

(۱) تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق ج: ۱ ص: ۲۲۳ (طبع مكتبه امداديه ملتان).

(۲) احكام القرآن، المسئلة السابعة ج: ۵ ص: ۶۳ (طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه كراچی).

(اس کے بعد ماہنامہ ''البلاغ'' اور ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' میں شائع ہونے والی تحریرات ایک سوال کے ساتھ حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحبؒ کی خدمت میں پیش کی گئیں تو حضرتِ موصوفؒ نے اس کا درج ذیل جواب تحریر فرمایا۔)

جواب:- (از حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی رحمہ اللہ)

جمعہ کے خطبے سے پہلے تقریر کا متعدّد صحابہ کرامؓ سے ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ جمعہ کے دن خطبے سے پہلے اپنی تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کیا کرتے تھے، جب امام خطبے کے لئے آتے تو وہ اپنی تقریر موقوف کردیا کرتے تھے۔ (مستدرک حاکم ج:۱ ص:۱۰۸ و ج:۳ ص:۵۱۲)۔[1]

قال الحاکم والذهبی صحیح.[2] (از راہِ سنت مولانا محمد سرفراز خان صاحب)۔[3]

اسی طرح اس مستدرک میں حضرت عبداللہ بن بسرؓ کا جمعہ کے دن خطبے سے قبل وعظ کہنا منقول ہے،[4] اور اصابہ فی تذکرۃ الصحابہ ج:۱ ص:۱۸۴[5] میں ہے کہ حضرت تمیم داریؓ کے اصرار پر حضرت عمرؓ نے ان کو اجازت دے دی تھی کہ جمعہ کے دن اس سے قبل کہ میں خطبہ کے لئے آؤں، تقریر کرسکتے ہو۔

مستدرک حاکم اور اصابہ میں ذکر کردہ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ کا معمول خطبۂ جمعہ سے پہلے تقریر و وعظ کہنے کا تھا۔

اور یہ بھی صحیح احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زوالِ شمس کے بعد جلد نمازِ جمعہ ادا کرلیتے تھے اور یہی طریقہ خلفائے راشدینؓ کا تھا کہ نمازِ جمعہ زوال کے بعد جلد پڑھی جاتی تھی۔

صحیح بخاری میں ہے: عن أنس بن مالکؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یصلی

---

(۱) وفی المستدرک علی الصحیحین، کتاب معرفة الصحابة ج:۳ ص:۵۸۶ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت) عن عاصم بن محمد عن أبیه قال: رأیت أبا هریرةؓ یخرج یوم الجمعة فیقبض علی رمانتی المنبر قائمًا ویقول: حدثنا أبوالقاسم رسول الله الصادق المصدوق صلی الله علیه وسلم فلا یزال یحدّث حتّی اذا سمع فتح باب المقصورة لخروج الامام للصلوٰة جلس، هٰذا حدیث صحیح الاسناد .... الخ.

(۲) دیکھئے حاشیہ نمبر۱۔

(۳) راہِ سنت ص:۳۰۱ (طبع نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)۔

(۴) دیکھئے مستدرک حاکم، کتاب الجمعة ج:۱ ص:۴۲۴، ۴۲۵ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت).

(۵) ان روایات کے حوالہ وتفصیل کے لئے راہِ سنت ص:۳۰۱ (طبع نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) مؤلفہ حضرت مولانا سرفراز صفدر صاحب دامت برکاتہم ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر)

الجمعة حين الشمس وعنه أيضًا قال: نبكر بالجمعة ونقيل بعد الجمعة. (ج:۱ ص:۱۲۳)[۱] وفی مصنف لعبد الرزاق (ج:۳ ص:۱۸۵)[۲] عن عطاء قال: بلغنی أن عثمان كان يجمع ثم يقيل الناس بعد الصلوٰة. وفی مصنف لابن أبی شيبة (ج:۲ ص:۱۰۶)[۳] أخبرنا محمد بن سعد الأنصاری عن أبيه قال: كنا نجمع مع عثمان بن عفان ثم نرجع فنقيل. وفيه أيضًا (ج:۲ ص:۱۰۸)[۴] عن أبی رزين قال: كنا نصلی مع علیؓ الجمعة فأحيانًا نجد فيئًا وأحيانًا لا نجده.

اور فقہائے کرام کی عبارات سے بھی راجح یہی معلوم ہوتا ہے۔

وفی الشامية لكن جزم فی الاشباه من فن الأحكام أنه لا يسن لها الابراد وفی جامع الفتاوىٰ لقارئ الهداية قيل انه مشروع لأنها تؤدی فی وقت الظهر وتقوم مقامه وقال الجمهور ليس بمشروع لأنها تقام بجمع عظيم فتأخيرها مفض الی الحرج ولا كذٰلک الظهر وموافقة الخلف لأصله من كل وجه ليس بشرط. (ج:۱ ص:۳۶۷)۔[۵]

اب یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک اذانِ اوّل جس کی ابتداء حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی ہے، اس وقت تک تو یہ تقریر اور وعظ یقیناً اذان اور خطبے سے پہلے ہی ہوتی تھی کیونکہ اذانِ ثانی اور خطبے کے درمیان تقریر و وعظ کی نفی صراحۃً اُوپر کی روایات سے ہو رہی ہے، ان میں تصریح ہے کہ جب امام خطبے کے لئے آتا تھا تو یہ تقریر و وعظ موقوف کردیا جاتا تھا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جمعہ میں تبکیر کا لحاظ بھی بہت تھا، اکثر لوگ جمعہ میں تبکیر کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے صبح سے ہی مسجد میں آجاتے تھے، تو ان کے لئے وعظ وتقریر اذان سے پہلے ہی مناسب تھی، لیکن جب لوگوں میں سستی ہوئی تو اذانِ اوّل، زوال کے وقت لوگوں کو وقتِ جمعہ بتلانے کے لئے شروع کی گئی تو اَب کہ جب زوال کے وقت اذانِ اوّل کی ابتداء زوراء پر ہوئی اور اذانِ ثانی عند المنبر خطبے سے قبل ہونے لگی تو معلوم نہیں اس وقت یہ تقریر و وعظ اذان علی الزوراء سے پہلے ہوتی تھی یا بعد میں؟

لوگوں کے تکاسل اور سستی پر نظر کرتے ہوئے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریر و وعظ اذان علی الزوراء کے بعد ہوتی ہوگی کہ اب تبکیر کی فضیلت کی تحصیل پر لوگ اتنے حریص نہیں رہے تھے

---

(۱) (طبع قديمی كتب خانه).

(۲) مصنف عبدالرزاق باب وقت الجمعة ج:۳ ص:۱۷۵ (طبع المكتب الاسلامی بيروت)

(۳) مصنف ابن أبی شيبة باب من كان يقيل بعد الجمعة ويقول هی أول النهار رقم الحديث:۵۱۲۳ ج:۱ ص:۴۴۴ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۴) مصنف ابن أبي شيبة باب من كان يقول وقتها زوال الشمس وقت الظهر رقم الحديث:۵۱۴۴ ج:۱ ص:۴۴۵ (طبع مكتبة الرشد، رياض).

(۵) (طبع ايچ ايم سعيد).

کہ اذان سے پہلے خود بخود جمع ہوجاتے ہوں، اس لئے ان کو جمع کرنے اور وقتِ جمعہ کے ایذان کے لئے ہی تو یہ اذان علی الزوراء مشروع ہوئی۔

جب لوگوں کا اجتماع اذان کے بعد ہی ہوتا ہوتو پھر اجتماع سے پہلے تقریر و وعظ کا کوئی فائدہ متصوّر نہیں ہے اور اذان سے پہلے اجتماع کا معمول جب زمان خیر القرون میں کم ہوگیا تھا تو اَب اس کے لئے لوگوں کو تیار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔

اس لئے ''البلاغ'' کی یہی تجویز متعین اور سلف کے عمل کے موافق ہے کہ ''اذانِ اوّل کے فوراً بعد تقریر شروع ہوجائے اور مختصر تقریر کے بعد خطبے کے لئے اذان دی جائے اور پھر خطبہ اور نماز پڑھ لی جائے۔'' (۵۳)

دُوسری تجویز کہ ''اذانِ اوّل تقریر کے فوراً بعد ہو اور اس کے بعد صرف اتنا وقت ہو کہ جو لوگ ابھی مسجد میں نہیں آئے وہ مسجد میں آکر سنتیں پڑھ سکیں، اور اس کے بعد اذانِ ثانی اور خطبہ ونماز ہو''، یہ طریقہ علاوہ اس کے کہ معروف نہیں اور اس پر ہر جگہ اور ہر مسجد کے لوگوں کو جمع کیا جانا مشکل ہے، اذانِ اوّل سے پہلے لوگوں کا مسجد میں آنا اس حرص اور دُنیا میں انہماک کے زمانے میں ازبس دُشوار ہے، سلف کے معمول کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے، اور اذانِ اوّل کی مشروعیت سے جو ایذان اور جمعہ کی دعوت تھی اس کے بھی خلاف ہے۔

جمعہ کے لئے اصل داعی اذان ہی ہے، اور ''اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ'' پر ہی ''فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ'' مرتب ہے، اس تجویز ثانی میں اصل داعی وعظ وتقریر ہوگی، لوگ اس کے لئے جمع ہوں گے پھر اس صورت میں تقریر و وعظ کا اذانِ اوّل کے ساتھ اتصال ہوگا، جو معمولِ سلف کے خلاف ہے، ان کا معمول تقریر و وعظ کا اذانِ خطبہ سے پہلے اور اس کے ساتھ اتصال کا تھا، پھر اس صورت میں اذان کا اپنے اصل وقت سے مؤخر کرنا ہے کیونکہ اس کا اصل وقت ''عند الزوال'' ہے، اس تجویز میں پہلے تقریر ہوگی اس کے بعد اذانِ اوّل ہوگی، اذانِ اوّل کو اپنے وقت زوال پر ہی کہنا چاہئے، اس کو اپنی جگہ سے ہٹانا نہیں چاہئے، جمعہ کی اذانِ اوّل کا وقت زوال سے متصل بعد ہے، اسی پر عملی توارث چلا آرہا ہے، کتبِ حدیثیہ وفقہیہ میں بھی اس کی صریح موجود ہے۔

المغنی لابن قدامہ میں ہے:-

ا:-ویبدأ وجوب السعی الیها .... عند الحنفیة بالأذان الأوّل عند الزوال. (بحوالہ الفقه الاسلامی وأدلّته ج:۲ ص:۲۶۲)۔[1]

---

(۱) (طبع دار الفکر).

حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے سعی کا وجوب زوال کے وقت اذانِ اوّل سے شروع ہوتا ہے۔

۲:- مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر میں ہے: (ويجب السعى وترک البيع بالأذان الأوّل) عقيب الزوال. (ج:۱ ص:۱۷۱)۔[۱]

جمعہ کے لئے سعی اور ترکِ بیع، زوال کے بعد اذانِ اوّل سے واجب ہوتی ہے۔

۳:- فتح الباری میں علامہ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں:-

وتبين بما مضىٰ أن عثمان أحدثه لاعلام الناس بدخول وقت الصلوٰة. (ج:۲ ص:۳۹۴)۔[۲]

سابقہ کلام سے ظاہر ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے پہلی اذان اس لئے شروع کی کہ لوگوں کو نماز کے وقت کے شروع ہونے کی اطلاع ہوجائے۔

۴:- معارف السنن میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:-

وبالجملة فهٰذا الأذان كان قبل التأذين بين يدى الخطيب وكان فى أول وقت الظهر متصلًا بالزوال. (ج:۴ ص:۳۹۶)۔[۳]

اذانِ اوّل خطیب کے سامنے اذان سے پیشتر اور ظہر کے اوّل وقت میں زوال کے ساتھ متصل ہوتی تھی۔ (از ''انوارِ مدینہ'' لاہور)

مذکورہ بالا حوالہ جات میں فتح الباری کی عبارت سے واضح ہے کہ اذانِ اوّل کی مشروعیت کی غرض ہی یہ بتلائی گئی ہے کہ لوگوں کو نمازِ جمعہ کے داخل ہونے کی اطلاع ہوجائے، اور دُوسرے حوالوں میں بھی اس اذان کو ''عند الزوال''، ''عقب الزوال'' کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، جس سے واضح ہورہا ہے کہ اس اذان کا اصل وقت زوال کے فوراً بعد متصل ہی ہے، کیونکہ عرف میں ''عند'' اور ''عقب'' کو گھنٹے کے بعد کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا، اور علامہ بنوریؒ نے تو ''فى أوّل وقت الظهر متصلًا بالزوال'' لکھ کر کسی دُوسرے احتمال کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

اس لئے جن مساجد میں اذانِ اوّل کو اس کے اصل وقت سے مؤخر کرکے کہنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کو ختم کردینا ضروری ہے، کیونکہ یہ عمل توارث اور تصریحاتِ سلف کے خلاف ہونے کے ساتھ اس اذانِ کی غرضِ مشروعیت کے بھی خلاف ہے، کما مرّ۔

اس لئے پہلی تجویز پر عمل کرنا چاہئے، اذانِ اوّل ظہر کے وقت شروع ہوتے ہی کہہ دی جایا

---

(۱) مجمع الأنهر ج:۱ ص:۱۵۳ (طبع دار الكتب العلمية بيروت).

(۲) (طبع دار نشر الكتب الاسلاميه لاهور).

(۳) (طبع ايچ ايم سعيد).

کرے اور پندرہ بیس منٹ کا وقفہ نمازیوں کے مسجد میں آنے اور وضو وغیرہ کے لئے مختص کردینے کا اعلان کردیا جائے، اس کے بعد آدھا گھنٹہ مختصر ضروری وقتی مسائل پر مشتمل وعظ ہوجایا کرے، پھر اذانِ ثانی، خطبہ اور نماز ہوجایا کرے، لمبی چوڑی تقریروں اور بے ضرورت مضامین بیان کرنے کا جو رواج ہوگیا ہے اس کی اصلاح کرنے کی طرف توجہ کرنے اور توجہ دِلانے کی ضرورت ہے، نہ یہ کہ اصل وعظ و تقریر ہی کو بند کردیا جائے یا عملِ توارثِ سلف سے ہٹ کر نیا طریقہ جاری کیا جائے۔

آج کل تعلیم یافتہ طبقہ اور مغربی تہذیب کا دِلدادہ گروہ چاہتا ہے کہ ہر ہفتے جو کلمۂ خیر تمام مسلمانوں کے کانوں میں خطبۂ جمعہ سے پہلے پڑ جاتا ہے اس کا موقع نہ رہے، حالانکہ ان مواعظ سے بہت بڑے طبقے کی اصلاح ہو رہی ہے اور بکثرت مسلمان اس سے استفادہ کرکے اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کرتے ہیں اور یہ بھی ہفتہ وار تبلیغ عام اور عوامی اصلاح کا پروگرام ہے، مگر ہر چیز میں حدودِ شریعت کی پابندی اور اعتدال کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور غلوّ سے احتیاط کرنا لازم ہے، خطباء اور مبلغین و واعظین کو اپنے منصب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اگر حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے ہمارے خطباء اس پر عمل کریں تو یہ "یتخولنا بالموعظة" پر امتثال کا ذریعہ ہوسکتا ہے، آزاد طبقہ اس کو ختم کرنا چاہتا ہے اور کئی قسم کے اعتراضات سے اس عملِ خیر پر قدغن لگانا چاہتا ہے، اصل یہ ہے کہ وہ علمائے کرام اور خطبائے عظام کی بات سننا گوارا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ فہمِ سلیم عطا فرمائیں اور ہمیں اپنی اور اصلاح کی توفیق نصیب فرمائیں۔ واللہ اعلم

سیّد عبدالشکور ترمذی عفی عنہ
جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا
۱۶ر شوال ۱۴۱۵ھ

(یہ تمام تحریرات حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کی گئیں، حضرت دامت برکاتہم نے ان سب تحریرات کے مطالعے کے بعد درج ذیل جواب تحریر فرمایا جس پر شیخ الحدیث حضرت مولانا سبحان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بھی تائیدی دستخط فرمائے۔)

جواب:- (از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم)

الحمدللہ و کفٰی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد:

احقر نے اس موضوع پر مرسلہ تمام تحریروں کا مطالعہ کیا، ان تمام تحریروں میں احقر اس تحریر سے حرف بہ حرف متفق ہے جو دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے جاری ہوئی اور "البلاغ" میں شائع ہوئی۔

خرابی یہاں سے پیدا ہوئی ہے کہ جمعہ کو اس کے وقتِ مستحب (تعجیل) سے بہت مؤخر کردیا گیا ہے، اوّلاً اس بات کی ترغیب کی ضرورت ہے کہ تعجیلِ جمعہ کی سنت کو زندہ کیا جائے۔

دُوسرے اذانِ اوّل اور اذانِ ثانی کے درمیان طویل فصل نہ ہو، جس کی صورت یا تو یہ ہے کہ تقریر زوال سے پہلے کی جائے اور زوال کے متصل بعد اذانِ اوّل اور دس پندرہ منٹ کے بعد اذانِ ثانی ہو، یا پھر تقریر اذانین کے درمیان ہو تو وہ پندرہ، بیس منٹ سے زائد نہ ہو، اور مفصل تقریر جمعہ کے بعد یا زوال سے پہلے ہو، اذانِ اوّل سے پہلے اُردو تقریر کے بارے میں یہ اندیشہ کہ لوگ تقریر سننے نہیں آئیں گے، تجربے سے دُرست ثابت نہیں ہوا۔

جو لوگ تقریر سننا چاہتے ہیں وہ پہلے بھی آجاتے ہیں، اور جو سننا نہیں چاہتے وہ محض اذانِ اوّل کی وجہ سے عموماً نہیں آتے بلکہ اذانِ ثانی کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور گنہگار ہوتے ہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۵/۱۲/۱۶ھ

(فتویٰ نمبر ۱۷۸/۳۳)

مذکورہ بالا تحریر ناچیز کی رائے میں دُرست ہے اور دار العلوم کراچی کے دار الافتاء سے جو فتویٰ جاری ہوا اور ''البلاغ'' میں شائع ہوا ہے وہ بھی دُرست ہے، البتہ احقر کے نزدیک اذانین کے درمیان وقفہ اگر نصف گھنٹے کا بھی ہوجائے تو مضائقہ نہیں، جس میں بیس پچیّس منٹ تقریر اور ۵ منٹ سنتوں کے لئے مل سکتے ہیں، اور لوگوں کے لئے اس میں اِن شاء اللہ دُشواری بھی نہیں ہوگی، اور جو گناہ سے بچنا چاہے گا وہ دُشواری کے بغیر بچ سکے گا۔

واللہ اعلم

سبحان محمود

ناچیز محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۴۱۵/۱۲/۲۳ھ

﴿فصل فی العیدین﴾
(عیدین کے متعلق مسائل کا بیان)

نمازِ عید کے بعد دُعا مانگی جائے یا خطبے کے بعد؟

سوال:- نمازِ عید کے متصل اگر دُعا نہ مانگی جائے تاکہ ایک ہی دُعا تاخیر سے خطبے کے بعد مانگی جائے تو کیا یہ جائز ہے؟ بعد خطبے کے کچھ وعظ کر کے بعد میں دُعا مانگی جائے تو کوئی قباحت تو نہ ہوگی؟

جواب:- دُعا، نماز کے متصل بعد ہی مسنون ہے، خطبے کے بعد اجتماعی طور سے دُعا مانگنا کہیں سے ثابت نہیں۔[1]

فقط واللہ سبحانہ اعلم
۱۴/۱۲/۱۳۸۷ھ
(فتویٰ نمبر ۱۴۵۷/۱۸ الف)

تکبیراتِ تشریق کے بارے میں امامِ اعظمؒ اور صاحبینؒ میں اختلاف کی تحقیق

سوال:- مسئلہ یہ ہے کہ سوال تکبیراتِ تشریق کے بارے میں امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اختلاف ہے، اس مسئلے میں مفتیٰ بہ قول امام صاحبؒ کا ہے یا صاحبینؒ کا؟

جواب:- دراصل تکبیرِ تشریق کے سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان دو مسئلوں میں اختلاف ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ تکبیرِ تشریق کب تک جاری رہے گی؟ اس میں امام صاحبؒ کا مسلک یہ ہے کہ یومِ عرفہ کی فجر سے یوم النحر کی عصر تک جاری رہے گی۔ اور صاحبینؒ ایامِ تشریق کے آخری دن (یعنی ۱۳/ذی الحجہ) کی عصر تک واجب کہتے ہیں۔ اس مسئلے میں تو فقہائے حنفیہ

---

(۱) دلائل اور تفصیل کے لئے اسی فصل میں صفحہ نمبر ۵۵۲ کا فتویٰ اور اس کا حاشیہ نمبر ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

کی بھاری اکثریت نے صاحبینؒ ہی کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔[۱] اور شاید علامہ ابنِ ہمامؒ[۲] اور صاحبِ بدائع[۳] کے سوا معروف فقہائے حنفیہ میں سے کسی نے بھی اس مسئلے میں امام صاحبؒ کے قول پر فتویٰ نہیں دیا۔ اور خود حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مسئلے میں جمہور فقہائے حنفیہ کے مطابق اسی کے قائل ہیں کہ اس مسئلے میں فتویٰ صاحبینؒ کے قول پر ہے۔[۴] اور چونکہ اُمت کا متوارث عمل بھی اسی پر چلا آتا ہے، اور ائمۂ ثلاثہ بھی اسی کے قائل ہیں اس لئے اس مسئلے میں عمل صاحبینؒ ہی کے قول پر کرنا چاہئے۔

البتہ دُوسرا مسئلہ یہ ہے کہ تکبیرِ تشریق کن لوگوں پر واجب ہوتی ہے؟ اس میں صاحبینؒ کا قول یہ ہے کہ تکبیر ہر اس شخص پر واجب ہے جس پر نماز فرض ہے، لہٰذا منفرد، مرد، عورت، مسافر اور گاؤں والوں سب پر تکبیر واجب ہے۔ لیکن امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ صرف مقیم اہلِ شہر پر جماعتِ مستحبہ میں واجب ہے، لہٰذا منفرد، مرد عورت پر، عورتوں کی جماعت پر، مسافروں پر (جبکہ ان کے ساتھ کوئی مقیم نہ ہو) اور گاؤں والوں پر تکبیر واجب نہیں ہے۔ اس مسئلے میں فقہائے حنفیہ کی ترجیحات مختلف ہیں، بعض فقہاء مثلاً صاحبِ بحر، صاحبِ سراج وہاج اور صاحبِ جوہرہ نے اس مسئلے میں بھی صاحبینؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔ (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۶۶) اور بعض نے اس مسئلے میں امام صاحبؒ کے قول کو اختیار کیا ہے، اور بعض فقہاء کی عبارتیں دونوں کو محتمل ہیں۔ اس معاملے میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے،[۵] کیونکہ وہ روایۃً و درایۃً اَقویٰ ہے، بہشتی گوہر میں بھی اس کو اختیار کیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اگر مسافر اور عورت بھی کہہ لے تو بہتر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا عثمانیؒ کے دلائل قوی ہیں بالخصوص حضرت علیؓ کی حدیث: "لا جمعة ولا تشريق ولا صلوة الفطر والأضحى الا فى مصر جامع"[۶] سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ دُوسری جانب بھی دلائل ہیں، اور بعض فقہاء نے اس کو ترجیح دی ہے، اس لئے اگر کوئی اس پر عمل کرے

---

(۱) وفى الدر المختار قبيل باب الكسوف ج:۲ ص:۱۸۰ .... الى عصر اليوم الخامس اخر أيام التشريق وعليه الاعتماد. وفى الشامية (قوله وعليه الاعتماد) هذا بناء على أنه اذا اختلف الامام وصاحباه فالعبرة لقوة الدليل وهو الأصح .... وبه اندفع ما فى الفتح من ترجيح قوله هنا ورد فتوى المشائخ بقولهما بحر.

(۲) دیکھئے: فتح القدیر ج:۲ ص:۴۸، ۴۹۔

(۳) دیکھئے: بدائع الصنائع ج:۱ ص:۱۹۵، ۱۹۶ (طبع ایچ ایم سعید)۔

(۴) دیکھئے: اعلاء السنن ج:۸ ص:۱۲۴، ۱۲۵ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔

(۵) راجع اعلاء السنن أبواب العيدين، باب تكبيرات التشريق وانها لا تجب الا على أهل المصر ج:۸ ص:۱۲۸، ۱۲۹ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔

(۶) اعلاء السنن ج:۸ ص:۱۲۷ (طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔ (محمد زبیر حق نواز)

تو اس پر بھی نکیر دُرست نہیں، بالخصوص جبکہ بہشتی گوہر نے عدمِ وجوب کی تقدیر پر بھی اسے بہتر کہا ہے۔

واللہ اعلم

۳۰/۱۱/۱۴۰۶ھ

(فتویٰ نمبر ۳۷/۱۷۲۲ ہ)

۱:- عرب امارات میں عید پڑھ کر آنے والے کے لئے پاکستان میں دوبارہ نمازِ عید پڑھنے کا حکم

۲:- اور ایسا شخص شوال کے نفلی روزے کب سے شروع کرے؟

سوال:- جناب گرامی قدر.....السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مشکور ہوں گا اگر مندرجہ ذیل سوالات کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب دیں، جوابی لفافہ شامل ہذا ہے۔

۱:- سائل، ماہِ رمضان میں عرب امارات گیا تھا، وہاں عید کا چاند ایک دن پہلے نظر آیا (یا عید ایک دن پہلے کی گئی)، عید کی نماز پڑھ کر رات کو کراچی (بذریعہ ہوائی جہاز) پہنچا، کراچی میں اگلے دن عید تھی۔ پوچھنا یہ ہے کہ آیا سائل کو یہاں بھی عید کی نماز پڑھنی ضروری تھی یا نہیں؟

۲:- دُوسری بات یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ رمضان ختم ہونے کے بعد چھ روزے رکھے جائیں تو اس کا بہت ثواب ہے، اور پورے سال روزے رکھنے کا ثواب ملتا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ سائل نے عید کی نماز امارات میں ادا کی تھی، اب کراچی میں اسے یہ چھ دن کے روزے کراچی میں عید کے دن سے رکھنے چاہئیں یا کراچی میں عید کا دن گزار کر ابتداء کرے؟ کہا جاتا ہے کہ عید کے دن صرف شیطان روزہ سے ہوتا ہے۔

جواب ۱:- صورتِ مسئولہ میں سائل کو کراچی پہنچ کر بھی عید کی نماز میں شامل ہونا چاہئے، اور نمازِ عید ہی کی نیت کرنی چاہئے، کیونکہ اس صورت کا کوئی صریح حکم تو فقہ کی کتب میں نہیں ملا، لیکن اُصول یہ ہے کہ آدمی جس ملک یا شہر میں ہو اسی کے اَحکام کا اعتبار ہوتا ہے۔ لہٰذا کراچی پہنچنے کے بعد اس کے لئے یہ عید ہی کا دن ہے، اس بات کا لحاظ کیا جائے تو عید کی نماز اس کے لئے ضروری ہے۔ لیکن دُوسری طرف وہ ایک مرتبہ عید کی نماز پڑھ چکا ہے، اس کا لحاظ کیا جائے تو ضروری نہیں۔ دونوں احتمالات پر عمل کی محتاط شکل یہی ہے کہ وہ عید کی نماز میں بہ نیتِ عید شامل ہوجائے، تاکہ واجب ہونے کی صورت میں واجب ادا ہوجائے، ورنہ وہ نفل بن جائے گی۔

۲:- شش عید کے روزوں کا متصل ہونا ضروری نہیں[1]، لہٰذا وہ روزے کراچی کے لحاظ سے ۲رشوال سے شروع کرے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۴/۴/۱۴۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۴۸۳/۷۲)

حنفیوں کا غیر مقلد کی اقتداء میں نمازِ عید پڑھنے کا حکم

سوال:- ایک میدان میں پہلے سے مغربی جانب اہلِ حدیث نمازِ عید پڑھتے ہیں، اب حنفی بھی ایک مشرقی جانب پڑھنے لگے ہیں، اب حنفی کہتے ہیں کہ ہمارے پیچھے پڑھو، اور وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارے ہاں بارہ تکبیریں پڑھی جاتی ہیں اور تمہارے ہاں چھ تکبیریں ہوتی ہیں، لہٰذا تمہارے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ کیا حنفی ان کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں؟ جبکہ باہمی جھگڑے ختم بھی نہ ہوسکیں۔

جواب:- نمازِ عید میں جس تعارض کا ذکر کیا گیا ہے وہ واقعۃً مناسب نہیں، چونکہ اہلِ حدیث حضرات عرصے سے وہاں نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں اس لئے حنفی حضرات کو چاہئے کہ وہ کسی دُوسری جگہ نماز پڑھیں یا کچھ وقفہ دے کر اسی میدان کے کسی دُوسرے حصے میں نماز ادا کرلیں، اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو باہمی نزاع سے بچنے کے لئے بارہ تکبیروں کے ساتھ نمازِ عید ادا کریں، اگرچہ حنفیہ کے نزدیک خلافِ اَولیٰ ہے۔

ولو زاد تابعه الى ستة عشر لأنه مأثور، وقال الشامي في آخر "مطلب تجب طاعة الامام فيما ليس بمعصية" وذكر في البحر ان الخلاف في الأولولية ونحوه في الحلية. (الدر المختار)۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۷/۱۲/۱۳۸۷ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۴۳۳/۱۸ الف)

ایک ہی مقام پر عید کی دو جماعتیں کرانے کی دوصورتوں کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں کہ ہم لوگ پاکستان

---

(۱) وفي البحر الرائق كتاب الصوم ج:۲ ص:۲۵۸ (طبع سعيد) ومنه أيضًا صوم ستة من شوال عند أبي حنيفة متفرقًا كان أو متتابعًا وعن أبي يوسف كراهته متتابعًا لا متفرقًا، لكن عامة المتأخرين لم يروا به بأسًا .... الخ.

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۱۷۲، ۱۷۳ (طبع سعيد) وفي الهندية الباب السابع عشر في صلوٰة العيدين ج:۱ ص:۱۵۱ (طبع رشيديه كوئٹه) قال محمد رحمه الله في الجامع اذا دخل الرجل مع الامام في صلوٰة العيد وهذا الرجل يرى تكبير ابن مسعود رضي الله عنهما فكبر الامام غير ذلك اتبع الامام الا اذا كبر الامام تكبيرا لم يكبره أحد من الفقهاء فحينئذ لا يتابعه كذا في المحيط. (محمد زبیر حق نواز)

اسٹیل ملز کراچی لیبر شفٹ میں کام کرتے ہیں، اور ایک شفٹ کی ڈیوٹی سے فراغت کے نصف گھنٹے بعد دُوسری شفٹ کی ڈیوٹی پر حاضر ہوتی ہے، اس مناسبت سے ہمارے ہاں عیدین کی نمازیں بھی دو مرتبہ ایک ہی جگہ ادا کی جاتی ہیں، جس کی صورت مندرجہ ذیل ہے:-

۱:- ایک ہی جگہ میں ایک مسجد میں دو مرتبہ صلوٰۃِ عید نصف، نصف گھنٹے اور وقفے کے بعد ایک امام کی اقتداء میں ادا کی جاتی ہے، جبکہ امام ایک ہے اور مقتدی پہلی صلوٰۃ میں ایک شفٹ کے لوگ ہوتے ہیں اور دُوسری مرتبہ اقتداء کرنے والے دُوسری شفٹ کے لوگ ہوتے ہیں۔

۲:- ایک ہی جگہ اور ایک مسجد میں دو مرتبہ جماعتِ عیدین اس طرح ہوتی ہے کہ اوّل مرتبہ پہلی شفٹ ایک امام کی اقتداء میں اور دُوسری شفٹ دُوسرے امام کی اقتداء میں ادا کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک جگہ اور ایک مقام میں صلوٰۃِ عیدین کی جماعتِ اوّل اور جماعتِ ثانیہ ایک ہی امام کی اقتداء میں جائز ہے یا ناجائز؟ جبکہ پہلی صورت میں مقتدی تبدیل ہوگئے لیکن امام ایک ہی ہے، اور دُوسری صورت میں امام بھی مختلف اور مقتدی بھی مختلف ہیں، لیکن عیدگاہ و جائے نماز ایک ہے، تو کیا ایک عیدگاہ میں جماعتِ ثانیہ سے صلوٰۃِ عیدین جائز ہوگی یا نہیں؟ اور ان دونوں میں سے کون سی نماز صحیح ہوگی؟

جواب:- مسئولہ دو صورتوں میں پہلی صورت یعنی ایک ہی امام کے پیچھے دو الگ الگ جماعتیں بالکل جائز نہیں اور اس صورت میں دُوسری جماعت کے لوگوں کی نماز بھی نہیں ہوگی،(۱) اور دُوسری صورت بھی بغیر شدید اور ناگزیر مجبوری کے اختیار کرنی دُرست نہیں،(۲) لہٰذا یا تو ایک ہی امام کے پیچھے تمام افراد کے بیک وقت نماز ادا کرنے کا انتظام کیا جائے یا اگر دو جماعتیں کسی وجہ سے ناگزیر ہوں تو دو الگ الگ مسجدوں یا عیدگاہوں میں دو الگ الگ اماموں کے پیچھے ادا کی جائیں۔

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۱۳/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۷/۱۷۸۷ ہ)

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۱ ص:۵۷۹، ۵۸۰ (ولا یصح اقتداء) .... مفترض بمتنفل .... الخ.
نیز دیکھئے: فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۲۲۴ (سوال نمبر ۱/۲۶۸۷)۔

(۲) کیونکہ ایک ہی جگہ میں تعدّدِ صلوٰۃِ عید دُرست نہیں۔ وفی البحر الرائق باب العیدین ج:۲ ص:۱۶۲ فاذا فاتت مع امام وأمکنه أن یذهب الی امام اخر فانه یذهب الیه لأنه یجوز تعددها فی مصر واحد فی موضعین وأکثر اتفاقًا.
نیز دیکھئے: امداد الاحکام ج:۱ ص:۷۴۳۔ (محمد زبیر حق نواز)

جگہ کی تنگی کی بناء پر ایک ہی جگہ عید کی دو جماعتوں کا حکم

سوال:- ایک مسجد میں عیدین کے موقع پر جگہ کی تنگی کی وجہ سے اور مستقل الگ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے یا نہ کرسکنے کی وجہ سے عید کی نماز اسی مسجد میں جہاں پہلی جماعت ہوتی ہے، دُوسری جماعت مذکورہ شکایات کی بناء پر جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جگہ کی تنگی کی بناء پر اگر ایک ہی جگہ عید کی دو جماعتیں کرلی جائیں تو عدمِ جواز کی کوئی وجہ نہیں، حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ''ظاہر عبارات فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدّدِ نمازِ عید مطلقاً جائز ہے، ایک موضع میں ہو یا دو موضع میں، جیسا کہ طحطاویؒ حواشی مراقی الفلاح میں لکھتے ہیں: ولو قدر بعد الفوات مع الامام علی ادراکها مع غیره فعل، للاتفاق علی جواز تعددها''۔[1] (مجموعة الفتاویٰ ج:۱ ص:۳۴۹)۔[2]

واللہ اعلم

۱۴۰۶/۵/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۳۷/۲۷۰ ب)

نمازِ عید کے بعد دُعا ہو یا خطبے کے بعد؟

سوال:- عید الفطر کے دن ایک امام صاحب نے جو کہ عالم بھی ہیں، اثناءِ تقریر میں کہا کہ عیدین کی نمازوں کے سلام پھیرتے ہی دُعا مانگنا سنت ہے، اس بات کی تحقیق میں علم الفقہ دیکھی، اس میں یہ عبارت درج تھی: ''بعد نماز عیدین کے یا بعد خطبے کے دُعا مانگنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب سے منقول نہیں، اگر ان حضرات نے کبھی دُعا مانگی ہوتی تو ضروری نقل کی جاتی، لہٰذا بغرضِ اتباع نہ مانگنا بہتر ہے۔'' (ص:۲۹۰) یہ عبارت مولوی صاحب کی تغلیط کے لئے کافی ہے۔ بہشتی زیور میں اس کے برعکس عبارت مذکور ہے، یعنی ''صحابہ و تابعین سے منقول نہیں، مگر چونکہ ہر نماز کے بعد دُعا مسنون ہے اس لئے عیدین میں بھی دُعا مانگنا مسنون ہوگا'' اس کی وضاحت فرمادیں تاکہ اطمینان ہو۔

جواب:- ان مولوی صاحب نے جو بات کہی ہے وہ صحیح ہے، عیدین میں نماز کے بعد دُعا اجتماعی مسنون ہے، خطبے کے بعد مسنون نہیں، حقیقت وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھی ہے کہ اگرچہ خاص عیدین میں نماز کے بعد دُعا مانگنا روایات سے ثابت نہیں،[3] لیکن چونکہ ہر نماز کے بعد دُعا کرنا ثابت

---

(۱) حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص:۳۹۲ (طبع نور محمد کتب خانه).

(۲) مجموعہ فتاویٰ عبدالحیؒ ج:۱ ص:۳۲۷ (طبع ایچ ایم سعید)۔

(۳) عید کے اجتماع میں دُعا کا ذکر بخاری شریف ج:۱ ص:۱۳۴ کی اس روایت میں ملتا ہے: قالت أم عطية أمرنا أن نخرج فيخرج الحيض والعواتق وذوات الخدور فيشهدن جماعة المسلمين ودعوتهم ويعتزلن مصلاهم۔ لیکن نماز یا خطبے کے بعد کی کوئی تعیین روایات میں نہیں ملتی، لہٰذا دیگر نمازوں پر قیاس کرتے ہوئے نمازِ عید کے بعد ہی دُعا کا موقع معلوم ہوتا ہے جیسا کہ دیگر حضراتِ اکابرؒ نے بھی یہی لکھا ہے۔ دیکھئے: امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۴۰۵ تا ۴۰۷، وامداد المفتین ص:۴۰۸ (طبع دار الاشاعت) وفتاویٰ دار العلوم ج:۸ ص:۲۳۱، و ج:۵ ص:۲۳۱۔

ہے اس لئے اس میں عیدین بھی شامل ہیں، اور خطبے کے بعد دُعا کرنے کا ثبوت کہیں نہیں ہے اور اکابرِ دیوبند کا معمول بھی یہی رہا ہے، اور بہشتی زیور فقہی اعتبار سے ''علم الفقہ'' کے مقابلے میں زیادہ مستند اور معتبر کتاب ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۳/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۳۵۷ ب)

نمازِ عید میں تکبیرات چھوڑ کر امام سورۂ فاتحہ شروع کردے تو کیا حکم ہے؟

سوال:- عید الفطر کی نماز میں امام صاحب نے نیت باندھ کر ثناء پڑھ کر الحمد شریف پڑھنا شروع کردیا، اس کے بعد پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا، لقمہ ملنے پر امام صاحب نے الحمد شریف کو روک کر دو زائد تکبیریں کہہ کر پھر سے الحمد شریف شروع کی، ایک تکبیر پھر بھی رہ گئی، کیا اس صورت میں نماز ہوئی یا نہیں؟

جواب:- عید کی تکبیراتِ زوائد واجب ہیں، اگر امام بھول جائے اور انہیں چھوڑ کر سورۂ فاتحہ شروع کردے تو جب تک قراءت مکمل نہ ہوئی ہو یاد آنے یا کسی کے لقمہ دینے پر تکبیریں کہنی چاہئیں اور تکبیروں کے بعد قراءت ازسرِنو کرنی چاہئے، لہٰذا امام صاحب نے یہ کام تو صحیح کیا کہ سورۂ فاتحہ روک کر تکبیریں کہیں، لیکن ایک تکبیر چھوڑ دی، قاعدے سے اس پر سجدۂ سہو لازم ہونا چاہئے تھا، لیکن عیدین میں سجدۂ سہو لازم نہیں ہوتا، اس لئے مذکورہ نماز ہوگئی۔

فی رد المحتار: ان بدأ الامام بالقراءة سهوًا فتذكر بعد الفاتحة والسورة يمضى فى صلاته، وان لم يقرأ الا الفاتحة كبّر وأعاد القراءة لزوما۔ (۱)

وفيه أيضًا: ان العود الى التكبير قبل اتمام القراءة ليس لأجل المستحب الذى هو الموالاة، بل لأجل استدراک الواجب الذى هو التكبير (شامى باب العيدين)۔ (۲)

وفى الدر المختار (والسهو فى صلوٰة العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواء) والمختار عند المتأخرين عدمه فى الأوليين لدفع الفتنة كما فى جمعة البحر واقره المصنف وبه جزم فى الدر (شامى باب سجود السهو)۔ (۳)

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۳۵۳ ہ)

(۱، ۲) رد المحتار ج:۲ ص:۱۷۳ (طبع سعيد).

(۳) رد المحتار ج:۲ ص:۹۲ (طبع سعيد). (محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

﴿فصل فی المسائل الجدیدۃ والمتفرقۃ المتعلقۃ بالصلوٰۃ﴾
(نماز سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

نماز میں اسپیکر کا استعمال

سوال:- احقر کی مسجد میں جمعہ کے دن قریبی خطیب سے شدید آواز تقریر کی سخت مشوش ہے، احبابِ خصوصی کی رائے ہے کہ اگر صرف اندرونِ مسجد کا ہارن استعمال کیا جائے تو تمام نمازیوں کی نماز سکون سے ادا ہوگی۔ ورنہ تمام نمازی خطیب صاحب کی تقریر سے پریشان رہتے ہیں، بعض بزرگانِ دین نماز اور خطبے میں اندرونِ مسجد کا ہارن استعمال کرنا بھی پسند نہیں کرتے، اس لئے احقر بھی نماز اور خطبے میں یہاں آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال نہ کرتا تھا، لیکن تمام نمازیوں کے اضطراب اور تشویش کے پیشِ نظر آپ سے مراجعت ہے کہ اندرونِ مسجد کے ہارن سے اگر خطبہ اور نمازِ جمعہ ادا کی جائے تو کیا کوئی شرعی قباحت ہے؟ جبکہ احتیاطاً مکبّرین کا انتظام بھی رکھا جائے کہ اگر خدانخواستہ بجلی فیل ہو تو نماز میں خلل نہ ہو، اور آلۂ مکبّر الصوت وہ ہے جو بٹن کے پاس لگا لیتے ہیں۔ والسلام

(المستفتی: مولانا) حکیم محمد اختر (صاحب مدظلہم)
خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ، گلشن اقبال کراچی

جواب:- نماز میں آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال جائز ہے، اور اس سے نماز فاسد بھی نہیں ہوتی، تاہم اگر کوئی بعض علماء کے اختلاف کی بناء پر احتیاط کرے تو اچھا ہے، لیکن استعمال کرنے والوں پر نکیر نہ کرنی چاہئے، بشرطیکہ وہ حدود کے اندر استعمال کرتے ہوں۔ مسئلے کی علمی تحقیق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی کتاب ''آلاتِ جدیدہ'' میں موجود ہے۔[1]

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اندر کا مکبّر الصوت کھولنے میں شرعی قباحت نہیں ہے۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی
۱۴۰۵/۵/۲۱ھ
(فتویٰ نمبر ۳۸/۸۰۹ ج)

---

(۱) اور خود حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے آرہا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

کیا لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہوجاتی ہے؟

سوال:- آلۂ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) پر فرض نماز جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کیوں؟ کریم آباد بلاک نمبر۴ کی مسجد میں یہ مسئلہ انتہائی نزاعی صورت اختیار کرگیا ہے، دو گرہوں میں شدید کشیدگی ہے۔

جواب:- لاؤڈ اسپیکر پر نماز فرض جائز ہے اور بلاکراہت ہوجاتی ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ ضرورت کے بغیر لاؤڈ اسپیکر استعمال نہ کیا جائے، اس مسئلے کے تفصیلی دلائل مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے ''آلۂ مکبّر الصوت'' میں موجود ہیں، یہ رسالہ ''آلاتِ جدیدہ'' میں طبع ہوا ہے، تفصیل کے لئے اس کو دیکھ لیا جائے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۶/۱۰/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۷/۲۴۲۱ ہ)

کیا لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھنے میں زیادہ ثواب ہے؟

سوال:- کیا جہری نمازیں لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا زیادہ ثواب ہے جبکہ آواز دُور دُور تک جاتی ہے؟

جواب:- جب تک ضرورت نہ ہو نماز بغیر لاؤڈ اسپیکر کے پڑھنی چاہئے، لاؤڈ اسپیکر پر نماز کا جواز تو ضرورت کے حالات میں ہے، بلاوجہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال پسندیدہ نہیں، بالخصوص جبکہ اس سے دُور دُور آواز جاتی ہو جہاں لوگ نیند یا دُوسرے کاموں میں مشغول ہوں، تو اس کے استعمال کی کراہت اور بڑھ جاتی ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۱۹/۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۲۲ ج)

مسجد میں خانۂ کعبہ ومسجدِ نبوی کی تصاویر آویزاں ہوں تو ایسی صورت میں نماز کا حکم

سوال:- اکثر مسجدوں میں کعبہ شریف اور مدینہ منوّرہ کی تصویریں آویزاں ہوتی ہیں، اس حالت میں نماز میں کوئی نقص تو نہیں ہوگا؟

جواب:- نماز تو ہوجاتی ہے، لیکن اس کی تصویریں نمازی کے سامنے ہونا کچھ بہتر نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۱۶ھ

---

(۱) اور خود حضرتِ والا دامت برکاتہم کا تفصیلی فتویٰ آگے آرہا ہے۔ (مرتب عفی عنہ)

مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کے شرعی اَحکام

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ آلۂ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) تراویح کے لئے اس قدر تیز استعمال ہوتا ہے کہ پورے محلے میں اس کی آواز پہنچ جاتی ہے، جس میں حسبِ ذیل قباحتیں معلوم ہوتی ہیں:-

۱:- محلے کی خواتین کو نماز ادا کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

۲:- محلے کے مریض اور ضعفاء جن کو علاجاً جلد سونا ضروری ہو، نہیں سو سکتے۔

۳:- تلاوت کو ادب سے سماعت کا اہتمام محلّہ والوں سے نہیں ہوتا۔

۴:- سجدۂ تلاوت کا اگر وجوب لاؤڈ اسپیکر سے ہوتا ہے تو اہلِ محلّہ کے ضعفاء اور خواتین پر سجدۂ تلاوت واجب کرنا اور ان کی طرف سے اس کی ادائیگی کے اہتمام کا فقدان یا مشکل ہونا۔

اس سلسلے میں شریعت کے اَحکام سے از راہِ کرم مطلع فرمایئے، بینوا توجروا۔

العارض

(مولانا) حکیم محمد اختر عفا اللہ عنہ

مدرسہ اشرف المدارس، گلشن اقبال کراچی

جواب:- تراویح میں لاؤڈ اسپیکر اس قدر اُونچی آواز سے استعمال کرنا کہ جس سے سوال میں مذکورہ قباحتیں لازم آتی ہوں، جائز نہیں۔ چنانچہ فقہائے کرامؒ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ذکر اللہ اتنی آواز سے کرنا کہ جس سے کسی کی عبادت یا نیند میں خلل آتا ہو صحیح نہیں، نیز مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ نماز میں ہیں اور بہت **بلند آواز سے تلاوت فرما رہے ہیں**، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی نماز میں ہیں اور **آہستہ** آواز سے تلاوت فرما رہے ہیں، پھر جب دونوں حضرات حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے فرمایا کہ: میں تمہارے پاس سے گزرا تو تم نماز میں تھے اور آہستہ تلاوت کر رہے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے اس ذات کو سنادیا ہے جس سے میں سرگوشی کر رہا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: میں تمہارے پاس سے گزرا تو تم نماز میں تھے اور زور سے تلاوت کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ: میں اونگھنے والوں کو بیدار کر رہا تھا اور شیطان کو دھتکار رہا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکرؓ! تم اپنی آواز (کچھ) بلند کرو۔ اور حضرت

عمرؓ سے فرمایا: اپنی آواز کچھ پست کرو۔ (مشکوٰۃ شریف ج:۱ ص:۱۷۰، باب ما یقول اذا قام اللیل)۔[۱]

اس حدیث شریف سے بھی معلوم ہوگیا کہ اتنی بلند آواز سے تلاوت کرنا کہ جس سے بیماروں کے آرام اور خواتین کی نمازوں میں خلل ہوتا ہو صحیح نہیں، اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے، اور لاؤڈ اسپیکر کا استعمال بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت کرنا چاہئے۔

قال الشامی: وفی حاشیة الحموی عن الامام الشعرانی أجمع العلماء سلفًا وخلفًا علٰی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرها الا أن یشوش جهرهم علٰی نائم أو مصل أو قارئ. اهـ (ج:۱ ص:۴۴۴)۔[۲]

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی

۲۱ر ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ[۳]

نماز میں (آلۂ مکبّر الصوت) اسپیکر کے استعمال کی شرعی حیثیت

سوال:- نومبر ۱۹۹۰ء کے رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کی، ایک چیز نے مجھ کو بڑا مکدّر کیا، وہ تھا نماز کے دوران لاؤڈ اسپیکر کا عدمِ استعمال۔ اس سے اتنی خرابیاں پیدا ہوئیں کہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں لوگوں کی نمازیں خراب ہوئیں، تین دن تک اکثر لوگوں کے سامنے زیادہ تر ایک ہی موضوع زیرِ بحث رہا کہ بھائی میں سجدے میں تھا، اور میں رُکوع میں تھا، اور پتہ نہیں کہ امام صاحب اس وقت کس حالت میں تھے؟ کافی لوگوں نے کئی کئی اوقات کی نمازیں لوٹائیں، مزید یہ کہ خشوع جو نماز کی جان ہے سرے سے مکبّر کی آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے مفقود ہوجاتا تھا، میرے سمیت اکثر حضرات سجدہ اور رُکوع میں کان لگائے رہتے کہ تکبیر سن سکیں۔ اکثر حضرات کو امام سے پہلے سر اُٹھا کر دیکھتے بھی دیکھا گیا، وہ یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اگلی صف کا کیا حال ہے؟ اتنے بڑے اجتماع میں لاؤڈ اسپیکر اگر دورانِ نماز استعمال کرلیا جائے تو کیا نماز زیادہ بہتر طریقے پر ادا نہیں ہوگی؟ کیا کچھ شرعی رُخصت اس سلسلے میں نہیں ہے؟ اگر ہے تو اس سے اجتناب کیوں؟

جواب:- نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے مسئلے پر مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کا مستقل رسالہ ''آلۂ مکبّر الصوت کے شرعی اَحکام'' شائع ہوچکا ہے،[۴] جس میں حضرت

---

(۱) (طبع قدیمی کتب خانه).

(۲) رد المحتار فی رفع الصوت بالذکر ج:۱ ص:۶۶۰ (طبع سعید).

(۳) یہ فتویٰ ''البلاغ'' کے شمارہ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ سے لیا گیا ہے۔ (از مرتب)

(۴) ''آلاتِ جدیدہ کے شرعی اَحکام''۔

قدس سرہٗ نے یہ تحقیق فرمائی ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت پر نماز پڑھانے سے نماز بلا کراہت ہوجاتی ہے، اور پاکستان و ہندوستان کے دُوسرے جلیل القدر علماء نے جن میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ وغیرہ بھی داخل ہیں، اسی فتویٰ کی تصدیق فرمائی ہے۔ البتہ ساتھ ہی حضرت مفتیٔ اعظم قدس سرہٗ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ نماز جتنی سادگی سے ادا کی جائے اور اس میں خارجی آلات کا استعمال جتنا کم سے کم کیا جائے، اور بندے کا براہ راست تعلق اپنے اللہ سے جتنا بلاواسطہ ہو اتنا ہی بہتر ہے، نیز آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال سے لاؤڈ اسپیکر کے خراب ہوجانے وغیرہ کی صورت میں بعض مفاسد بھی سامنے آئے تھے، اس لئے مذکورہ رسالے میں مشورہ یہی دیا گیا تھا کہ جہاں تک ہوسکے اس کے بغیر نماز پڑھنی چاہئے، تاہم اگر نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہوجائے گی۔ بعض دُوسرے اہلِ فتویٰ مثلاً حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ نے اپنی تحریر میں اور زیادہ توسع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ''جبکہ امام کی آواز سامعین کو نہ پہنچتی ہو تو ان کو آواز پہنچادینا غلو نہیں، بلکہ تحصیلِ مقصود ہے، بالخصوص جبکہ تحصیلِ مقصود بآسانی ہو، دُشواری سے نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت سے آواز کا بلند ہونا اور دُور دُور تک پہنچنا، بناءِ محراب و بناءِ گنبد سے زیادہ آسان ہے، اور بناءِ محراب و بناءِ گنبد بلانکیر مدّتِ مدیدہ سے رائج ہے، اور اس سے بھی رفعِ صوتِ امام مقصود ہے ..... مگر نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال دو شرطوں سے جائز ہے، ایک یہ کہ لاؤڈ اسپیکر اعلیٰ قسم کا ہو کہ امام کو اس کی طرف منہ کرنے کی ضرورت نہ ہو کہ توجہ الیٰ غیر اللہ مقصودِ صلوٰۃ کے منافی ہے، دُوسرے مکبّرین کا انتظام مکمل ہو، تاکہ میکروفون فیل ہوجائے تو نماز میں گڑبڑ نہ ہو۔'' (آلاتِ جدیدہ ص:۷)

اس تشریح سے واضح ہوا کہ آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال نماز میں ان شرطوں کے ساتھ جائز ہے، البتہ جہاں مکبّرین سے کسی انتشار کے بغیر کام چلا سکتا ہو، وہاں زیادہ بہتر اور مناسب یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر استعمال نہ کیا جائے، تاکہ علماء کے قول پر کسی ادنیٰ کراہت کے بغیر نماز ہوجائے۔ لیکن جو صورت آپ نے سوال میں لکھی ہے، اگر وہ صحیح ہے کہ مجمع کی کثرت کی وجہ سے لاؤڈ اسپیکر کے بغیر زیادہ انتشار پیدا ہوا، تو جہاں ایسا اندیشہ ہو، وہاں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال یقیناً زیادہ مناسب اور بہتر ہوگا اور اس کے ساتھ نماز کے بلاکراہت دُرست ہوجانے میں کوئی شبہ نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۸/۷/۱۴۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۱۰/۷/۱۴۱۱ھ)

الجواب صحیح

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

تراویح میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا حکم اور اسپیکر میں تراویح کے دوران آیتِ سجدہ آنے والی ہو تو کیا کیا جائے؟

سوال:- میں جس مسجد میں قرآن سنا رہا ہوں وہ مسجد چھوٹی ہے، اور امام کی آواز مقتدیوں تک بآسانی پہنچ جاتی ہے، اس کے باوجود آٹھ سال سے اس مسجد میں لاؤڈ اسپیکر پر تراویح ہو رہی ہے اور اکثریت کی رائے بھی یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر حسبِ سابق تراویح ہوتی رہے لیکن ایک دو آدمی اس کے مخالف ہیں، اور وہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے تراویح پڑھانے پر زور دیتے ہیں۔

اسی اثناء میں ایک دو روز لاؤڈ اسپیکر خراب رہا تو متصل کی دُکانوں اور ہوٹل سے ریکارڈنگ کی آوازیں اس قدر آتی رہیں کہ تراویح پڑھنا دُشوار ہوگیا، منع کرنے کے بعد بھی وہ نہ مانے، اس کے علاوہ اگر لاؤڈ اسپیکر پر نماز نہ پڑھی جائے تو قریب کی مسجد کی آوازیں بھی خلل انداز ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے، اگر ہم اپنی مسجد میں حسبِ سابق لاؤڈ اسپیکر پر تراویح پڑھتے رہیں، تو ان خللوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں، لیکن ایک دو آدمی جھگڑا کرتے ہیں کہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے تراویح پڑھو، کل رات تو اس پر جھگڑے کی نوبت زیادہ آگئی تھی، ان حالات میں شرعاً کیا حکم ہے؟

۲:- آیتِ سجدہ اگر تراویح کی رکعتوں میں آجائے تو کیا لاؤڈ اسپیکر بند کرکے پڑھنی ہوگی یا حسبِ سابق دُوسری رکعتوں کے، یہ بھی لاؤڈ اسپیکر پر پڑھی جاتی رہے؟

جواب ۱:- سوال میں آپ نے جو حالات لکھے ہیں ان کے پیشِ نظر لاؤڈ اسپیکر پر تراویح پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں[1]، البتہ بہتر یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز اتنی پست رکھی جائے کہ مسجد سے باہر دُور تک آواز نہ جائے۔

۲:- اگر مسجد کے باہر آواز نہ جاتی ہو یا بہت ہلکی جاتی ہو تب تو آیتِ سجدہ بھی لاؤڈ اسپیکر پر پڑھ لیں، ورنہ آیتِ سجدہ پڑھتے ہوئے اپنی آواز نسبتہً پست کردے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جن دو رکعتوں میں آیتِ سجدہ آنے والی ہو لاؤڈ اسپیکر بند کردیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۹/۲۶ھ

(فتویٰ نمبر ۹۹۱/ ۲۸ ج)

ریل میں دورانِ سفر نماز کیسے پڑھی جائے؟

سوال:- ریل میں دورانِ سفر نماز کیسے پڑھی جائے، بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر؟ نیز یہ بتایئے کہ

---

(۱) تفصیل سابقہ فتویٰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

دورانِ سفر اگر قبلے کی طرف رُخ صحیح نہ ہوتو کیا نماز ہوجائے گی؟

جواب:- کھڑے ہوکر ہی پڑھنا واجب ہے،[1] اور قبلے کی طرف رُخ کرنا فرض ہے، اس کے بغیر نماز نہ ہوگی۔ اگر رُخ معلوم نہ ہوتو معلوم کرنے کے لئے اپنی سی پوری کوشش کریں، اور جس طرف گمان غالب ہو، ادھر رُخ کرکے نماز پڑھ لیں۔

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۲۱/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵/۵۸)

ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنا جائز ہے

سوال:- ہوائی جہاز میں سفر کے دوران نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟ جہاز میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:- جائز ہے۔[2]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۴۱۲/۱/۸ھ

(فتویٰ نمبر ۶۵/۵۸)

بے نمازی کا حکم

سوال:- بے نمازی کا کیا حکم ہے؟ سنا ہے بے نمازی کتے سے بھی بدتر ہے؟ کیا اس کا جھوٹا جائز ہے؟

جواب:- بے نمازی فاسق ہے، لیکن کسی مسلمان کو کتے سے بدتر کہنا دُرست نہیں۔[3]

فقط واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۱۱ھ

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

***

(۱) وفی تنویر الأبصار ج: ۱ ص: ۴۴۴، ۴۴۵ (طبع سعید) من فرائضها .... ومنها القيام فی فرض لقادر عليه.

(۲) تفصیل کے لئے امداد الفتاویٰ ج: ۱ ص: ۳۹۴ تا ۳۹۶ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفی مشكوة المصابيح، باب حفظ اللسان والغيبة والشتم ج: ۲ ص: ۴۱۱ (طبع قديمی كتب خانه) سباب المسلم فسوق وقتاله كفر.

کتاب الجنائز

(نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین کے مسائل)

۱:- نمازِ جنازہ پڑھانے میں کس امام کو مقدم کیا جائے گا؟
۲:- مرد نہ ہونے کی صورت میں کیا عورت پر نمازِ جنازہ پڑھنا لازم ہے؟

سوال:- هل امام الجمعة مقدم علىٰ امام مصلى العيد لصلوٰة الجنازة أم امام مصلى العيد مقدم علىٰ امام الجمعة؟ مع الحوالة.

جواب:- لم أر من صرح بهٰذا والذى ينبغى أن يقدم امام الجمعة لان الرضاء به أتم وأكثر من امام مصلى العيد وهو العلة فى التقديم فى صلوٰة الجنازة، والله اعلم.

سوال:- اذا نقل الميت من موضعه الىٰ موضعة أخرىٰ لضرورة فأيها أحق بالامامة؟ امام موضعة الميت أم امام موضعة الذى نقل فيها الميت؟

جواب:- امام الحىّ الذى كان يسكنه الميت أولىٰ من امام الحىّ الذى انتقل اليه لأن علة تقدم امام الحىّ ان الميت رضى بالصلوٰة خلفه حال حياته فينبغى أن يصلى عليه بعد وفاته كما صرح به الشامىؒ فى رد المحتار[1] والحلبىؒ فى شرح المنية[2] (ص: ۵۴۱) وهٰذه العلة انما توجد فى امام الحىّ الذى كان الميت يسكنه دون الحىّ الذى انتقل فيه.

سوال:- اذا مات الرجل فى نساء ليس فيها أحد من الرجال فعلى المرأة صلوٰة الجنازة أم لا؟

جواب:- نعم لا مانع من وجوب صلوٰة الجنازة على النساء اذا لم يكن فى الحىّ رجل غير أنه لا يجوز لهن غسله وانما عليهن التيمم، لما فى الدر المختار ماتت بين رجال أو هو بين نساء يممه المحرم فان لم يكن فالأجنبى بخرقة.[3] (شامى).

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۵/۲۳ھ
(فتویٰ نمبر ۱۹/۶۱۳ الف)

الجواب صحیح
محمد شفیع عفا اللہ عنہ

---

(۱) وفى الدر المختار ج:۲ ص:۲۲۰ (طبع ايچ ايم سعيد) امام الحىّ وفى الشامية تحته .... وانّما كان أولىٰ، لأن الميت رضى بالصّلوٰة خلفه فى حال حياته فينبغى أن يصلّى عليه بعد وفاته .... الخ.

(۲) غنية المتملى ص:۵۸۵ (طبع سهيل اكيڈمى لاهور).

(۳) الدر المختار ج:۲ ص:۲۰۱ (طبع سعيد).

جنازہ لے جاتے وقت چالیس قدم گن کر میّت کو ایصالِ ثواب کرنے کا حکم

سوال:- میّت کا جنازہ اُٹھاتے وقت ہمارے ہاں عوام میں یہ مروّج ہے کہ چالیس قدم تک گنے جاتے ہیں اور میّت کو اس کا ثواب پہنچایا جاتا ہے، کیا شرعی طور پر اس کا کوئی جواز ہے؟

جواب:- اس طرح قدم گننے اور ان کا ثواب پہنچانے کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں، یہ رسم واجب الترک ہے۔

واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۰۹۶ ج)

مردے کو دو مرتبہ غسل دینے کی رسم

سوال:- ہمارے یہاں رواج ہے کہ مردے کو دو مرتبہ غسل دیا جاتا ہے، ایک غسل انتقال کے وقت فوراً قرآن پڑھنے کے لئے دیا جاتا ہے، اور دُوسرا غسل جنازہ ادا کرتے وقت اگر اوّل غسل ٹھیک ہوا بھی ہو، کوئی نجاست وغیرہ ظاہر نہ بھی ہو، تب بھی دُوسرا غسل ضرور دیتے ہیں، شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب:- مردے کو صرف ایک مرتبہ غسل دینا مشروع ہے اور یہ کام وفات کے بعد جلد از جلد ہونا چاہئے،[1] دو مرتبہ غسل دینے کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں ہے، یہ طریقہ واجب الترک ہے۔

واللہ اعلم

۱۳۹۸/۶/۱۲ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۵۹۱ ب)

بیوی کے انتقال کے بعد شوہر کے لئے اس کا چہرہ دیکھنا کیسا ہے؟

سوال:- ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوجائے تو کیا اس کا خاوند بعد از وصال اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اور جنازہ بھی اُٹھا سکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح عورت اپنے خاوند کے چہرے کو دیکھ سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:- شوہر کے لئے اپنی بیوی کا چہرہ مرنے کے بعد دیکھنا بالاتفاق جائز ہے، البتہ اسے چھونے یا غسل دینے سے فقہائے حنفیہ نے منع کیا ہے، اور بیوی اپنے شوہر کے مرنے کے بعد اسے

---

(۱) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید) یندب دفنه فی جهة موته وتعجیله وفی الشامیة تحته (قوله وتعجیله) أی تعجیل جهازه عقب تحقق موته .... الخ.

دیکھ بھی سکتی ہے اور غسل بھی دے سکتی ہے۔

لما فی الدر المختار: ویمنع زوجها من غسلها ومسها لا من النظر الیها علی الأصح، وهی لا تمنع من ذٰلک.(شامی)۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۱۴۷ الف)

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال:- آدم جی نگر کی مکہ مسجد کو تعمیر ہوئے ۱۵ سال تقریباً ہوگئے، تب سے جنازے کی نماز مسجد کے میدان میں ہوا کرتی تھی، امام صاحب کی امامت کے آخری ایام میں محراب کے بیچ میں کھڑکی توڑ کر دروازہ بنادیا گیا اور محراب کے باہر چار فٹ اُونچا چبوترہ بنایا گیا، اب چبوترے پر جنازہ رکھ دیا جاتا ہے اور محراب کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، جنازہ کی نماز مسجد میں پڑھی جاتی ہے، نئے امام صاحب نے جنازے کی نماز کا یہ طریقہ بند کردیا ہے اور پہلے کی طرح نماز کھلے میدان میں ہونے لگی ہے، مولانا مفتی محمد اسماعیل صاحب نے گجراتی کتاب میں جو فتویٰ کی کتاب ہے، لکھا ہے کہ جنازے کی نماز کسی حالت میں مسجد میں پڑھنا مذہبِ حنفی میں مکروہِ تحریمی ہے۔ اب کون سا طریقہ دُرست تھا؟ بہشتی گوہر میں مسئلہ کیا لکھا ہے؟ اور کہا جاتا ہے کہ حرمین میں مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے، آپ واضح فرمائیں کیا حکم ہے؟

جواب:- میّت کو محراب سے باہر رکھ کر اگر نمازِ جنازہ مسجد کے اندر پڑھی جائے تو راجح قول کے مطابق یہ صورت بھی مکروہ ہے، البتہ آس پاس نمازِ جنازہ پڑھنے کے لئے کوئی اور جگہ نہ ہو تو مجبوراً فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن چونکہ صورتِ مسئولہ میں مسجد کے ساتھ مسجد ہی کا کھلا میدان موجود ہے اس لئے جس مسجد کے بارے میں سوال ہے وہاں مسجد کے اندر بلا عذر نماز پڑھنا مکروہ ہے، نئے امام صاحب کا طریقہ دُرست ہے جو نمازِ جنازہ کھلے میدان میں پڑھاتے ہیں، ایسا ہی کرنا چاہئے،

لما فی الدر المختار: واختلف فی الخارجة عن المسجد وحده أو مع بعض القوم والمختار الکراهة مطلقًا خلاصة .... وهو الموافق لاطلاق حدیث أبی داؤد من صلّی علٰی میّت فی المسجد فلا صلٰوة له، (وقال الشامیؒ انما تکره فی المسجد بلا عذر فان کان فلا، شامی)۔[2]

بہشتی گوہر،[3] امداد الفتاویٰ[4] وغیرہ سب میں مسئلہ اسی طرح ہے، اور جب مسجد کے ساتھ کھلی جگہ

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج:۲ ص:۲۲۵، ۲۲۶ (طبع سعید).

(۳) بہشتی گوہر ص:۹۴ مسئلہ نمبر ۱۷ (طبع میر محمد کتب خانہ)۔ (۴) امداد الفتاویٰ ج:۱ ص:۵۳۳، ۵۳۴۔

موجود ہے تو مکروہِ تحریمی، مکروہِ تنزیہی کی بحث میں نہیں پڑنا چاہئے، باہر ہی نماز پڑھنی چاہئے۔ حرمین شریفین کے امام صاحب، مذہب میں حنبلی ہیں، اور حنبلی مذہب کے اندر مسجد میں نمازِ جنازہ جائز ہے۔[1]

واللہ سبحانہ اعلم

۱۳۹۷/۶/۲۰ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۶۴۳ ب)

مسجد میں نمازِ جنازہ کا حکم (فارسی)

سوال:- درصحن مسجد پنج وقتی یا درصحن جامع مسجد بصورت غیر معتاد نمازِ جنازہ جائز بلا کراہت است یا نہ؟

جواب:- نمازِ جنازہ درمسجد جائز نیست کذا فی کتب الفقہ۔[2]

الجواب صحیح

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۲/۲۸ھ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۳۲۶ الف)

لحد گر جانے کی وجہ سے دوبارہ قبر بنانے کا حکم

سوال:- میّت کو دفن کر کے لحد میں رکھ دیا، اور لحد میّت کے اُوپر گر گئی، اب اکثر لوگ چاہتے ہیں کہ لحد صاف کر دیں یا کوئی اور قبر کھود کر دفن کریں، اس میّت کے بارے میں غسل اور دوبارہ کفن کا کیا حکم ہے؟

جواب:- غسل تو دوبارہ نہیں دیا جائے گا، لیکن لحد گر جانے کی وجہ سے دوبارہ قبر بنانے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر قبر پر مٹی نہیں ڈالی گئی تھی تب تو مردے کو نکال کر دوبارہ قبر بنانے کی اجازت ہے۔

لأنه ليس بنبش كما فى البدائع، ولو وضع لغير القبلة فان كان قبل اهالة التراب عليه وقد سردوا اللبن ازالوا ذٰلک لأنه ليس بنبش وان اهيل عليه التراب ترک ذٰلک لأن النبش حرام. (بدائع ج:۱ ص:۳۱۹)۔[3]

اور اگر مٹی ڈال دی گئی تھی تو مردے کو منتقل نہ کیا جائے بلکہ اس کو وہیں باقی رکھتے ہوئے لحد کی مرمت کر دی جائے۔

---

(۱) وفى المغنى لابن قدامة مع الشرح الكبير ج:۲ ص:۳۵۸ (طبع دار الكتاب العربى بيروت) ولا بأس بالصلوٰة على الميّت فى المسجد اذا لم يخف تلويثه .... الخ.

(۲) حوالے کے لئے دیکھئے پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر۲ تا۴، وامداد المفتين ص:۴۴۵۔ (محمد زبیر)

(۳) (طبع ايچ ايم سعيد).

لما فی الدر المختار ولا یخرج منه بعد اهالة التراب الا لحق اٰدمی۔[1]

وفی ردّ المحتار وأما نقله بعد دفنه فلا مطلقًا. (شامی ج:۱ ص:۶۰۲)۔[2]

اورمرمت کے لئے قبر کو کچھ کھودنا پڑے تو اس کی اجازت ہے، لما فی تنقیح الحامدیة:-

سئل فیما.اذا قرر القاضی زیدا المعماری فی حفر قبور الموتٰی وتعمیرها واصلاحها للاحتیاج لذٰلک لأهلتیه واتقانه، ویرید بعض الحفارین منعه من ذٰلک بلا وجه شرعی فهل یمنع المعارض (الجواب) نعم یمنع. (تنقیح الحامدیة ج:۱ ص:۸)۔[3]

واللہ اعلم

۱۳۹۷/۱/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۱۵۶/ ۲۸ الف)

میّت کو غسل دینے کے بعد جسم سے خون نکلنے کی صورت میں شرعی حکم

سوال:- میّت کو غسل دینے کے بعد اگر کان سے خون نکل آئے تو رُوئی کا فوس کان میں خون کے بند ہونے کے لئے رکھنا جائز ہے؟ اسی طرح بدن کے دُوسرے اجزاء میں بھی؟

جواب:- غسل دینے کے بعد اگر جسم کے کسی حصے سے خون وغیرہ نکلے تو چونکہ غسل کا لوٹانا واجب نہیں ہے،[4] اس لئے اسے محض صاف کردینا کافی ہے، تاہم اگر کان وغیرہ میں رُوئی رکھ دی جائے تو کچھ حرج نہیں۔ ولا بأس بجعل القطن علٰی وجهه وفی مخارقه کدبر وقبل وأذن وفم. (الدر المختار علٰی هامش الشامی ج:۱ ص:۸۵۳)۔[5]

واللہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۳۸۸/۱/۲۹ھ

الجواب صحیح

محمد عاشق الٰہی بلندشہری

(فتویٰ نمبر ۱۷۳/ ۱۹ الف)

میّت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم

سوال:- بہت ساری دُشواریوں اور مشکلات کے پیشِ نظر ہر علاقے سے تعلق رکھنے والوں نے اپنی انجمنیں اور رفاہی سوسائٹیاں بنالیں اور انجمن یا سوسائٹی کے ہر رکن پر باقاعدگی سے ماہوار

---

(۱) الدر المختار ج:۲ ص:۲۳۷، ۲۳۸ (طبع سعید).

(۲) شامی ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید).

(۳) (طبع المکتبة الحبیبیة کوئٹه). وفی التاتارخانیة ج:۲ ص:۱۷۰ اذا خربت القبور فلا بأس بتطیینها لما روی أن النبی صلی الله علیه وسلم مر بقبر ابنه ابراهیم فرأی فیه حجرا سقط منه فسده وأصلحه ثم قال: من عمل عملًا فلیتقنه. وفی حاشیة اعلاء السنن ج:۸ ص:۲۶۶ (طبع ادارة القرآن) نقلًا عن المغنی لابن قدامة عن ابن عمرؓ أنه کان یتعاهد قبر عاصم ابن عمر، قال نافع توفی ابن له، وهو غائب فقدم فسألنا عنه فدللناه علیه فکان یتعاهد القبر، ویأمر باصلاحه.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۱۹۷ (طبع ایچ ایم سعید) ولا یعاد غسله ولا وضوءه بالخارج منه.

(۵) الدر المختار ج:۲ ص:۱۹۸ (طبع مذکور).

چندہ مقرّر کردیا جو باقاعدگی سے دیا اور لیا جاتا ہے، اور ہر انجمن کے سالانہ انتخابات ہوتے ہیں، جس میں انتظامیہ کے ممبر چنے جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اب تمام گاؤں کی سوسائٹیوں اور انجمنوں کو ملاکر پورے علاقے کے نام سے یہاں کراچی میں ایک فیڈریشن بنائی گئی ہے، جس کا نام ''یونائیٹڈ سنّی ویلفیئر فیڈریشن'' ہے، فیڈریشن کو چلانے کے لئے ہر ایک سوسائٹی سے ممبران لئے جاتے ہیں جن کا باقاعدہ کوٹہ مقرّر ہے، اور ہر سوسائٹی فیڈریشن کو مقرّرہ چندہ ماہانہ دیتی ہے اور اس طرح فیڈریشن کا نظام بہ طریقہ احسن چلتا ہے، بعض اوقات فیڈریشن متعلقہ سوسائٹیوں سے ہنگامی چندہ یا رُقوم بھی وصول کرتی ہے۔

اب مندرجہ ذیل دو مسئلے اس کی روشنی میں عنایت فرمادیں۔

ا:- ہماری فیڈریشن کی زیرِ نگرانی اور اخراجات پر اگر خدانخواستہ ہمارے علاقے کا کوئی شخص یہاں کراچی میں حادثاتی یا طبعی موت مرا ہو اور فیڈریشن میں شامل کسی بھی سوسائٹی کا باقاعدہ ممبر اور رکن ہو اور متعلقہ سوسائٹی اس کی تصدیق کرے تو ایسے شخص کی لاش کو ہماری فیڈریشن پورے کفن اور ضروری چیزوں کے ساتھ اہتمام سے بذریعہ ہوائی جہاز گھر پہنچانے کا انتظام کرتی ہے، اور اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی لاش کی دیکھ بھال اور گھر پہنچانے کے لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ لاش اس کے لواحقین کے پاس بحفاظت پہنچائی جائے، یاد رہے کہ ہمارے علاقے کا یہاں سے فاصلہ کم از کم ایک ہزار میل ہے، مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے:-

الف:- کیا یہاں کراچی سے اتنی دُور متوفی کے آبائی گاؤں میں اس کے لواحقین کے پاس لاش کو پہنچانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

ب:- اگر ہے تو شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

ج:- اگر نہیں ہے تو بھی شرعاً اس کی حیثیت کیا ہے؟

جواب دیتے وقت لاش بھیجنے کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو مدِنظر رکھا جائے، چونکہ بعض اوقات جب علاقے اور قوم کا کوئی شخص یہاں طبعی یا حادثاتی موت کا شکار ہوجاتا تھا تو اپنے کسی شخص یا علاقے کے آدمی سے کوئی رابطہ نہ ہونے کی بنا پر وہ متوفی لاوارث قرار پاتا اور لاوارث سمجھ کر یہاں ہی دفن کردیا جاتا اور اس کے لواحقین کو کچھ خبر بھی نہ ہوتی۔

نیز علاقے سے متعلق کئی نئے حضرات بسلسلۂ روزگار یہاں کراچی آتے ہیں، لیکن تعلق کا کوئی آدمی نہ ملا یا ملازمت نہ ملی تو بہت پریشانی ہوتی ہے، اپنا آدمی یا کوئی رفاہی ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے ایسے لوگوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے، دریافت طلب یہ ہے کہ اتنے دُور اپنے علاقے میں اپنے گاؤں

کے نادار اور غریب لوگوں کی مدد اس طریقے سے شرعاً جائز ہے؟

جواب: – مردے کو دفن سے پہلے موت کی جگہ سے اُٹھا کر دُوسرے شہر لے جانا مکروہ ہے، البتہ بعض فقہاء نے اس کو جائز بھی کہا ہے، لہٰذا اس عمل کو عام معمول بنالینا دُرست نہیں کہ فتویٰ کراہت ہی پر ہے، البتہ کسی خاص واقعے میں کوئی شدید ضرورت داعی ہو تو بعض دُوسرے فقہاء کے قول پر عمل کرکے میّت کو منتقل کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ قال فی شرح المنیة: ویستحب فی القتیل والمیت دفنه فی المکان الذی مات فیه فی مقابر أولئک القوم وان نقل قبل الدفن قدر میل أو میلین فلا بأس به، قیل هٰذا التقدیر من محمد یدل علٰی أن نقله من بلد الٰی بلد لا یجوز أو مکروه ولأن مقابر بعض البلدان ربما بلغت هٰذه المسافة ففیه ضرورة ولا ضرورة فی النقل الٰی بلد اٰخر وقیل یجوز ذٰلک ما دون السفر .... ولا یکره فی مدة السفر أیضًا. (کبیری جنائز متفرقات).[1] وقال الشامی (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قیل مطلقًا وقیل الٰی ما دون مدة السفر وقیده محمد بقدر میل أو میلین، لأن مقابر البلد ربما بلغت هٰذه المسافة فیکره فیما زاد، قال فی النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر. (شامی)۔[2]

واللہ اعلم

۹/۸/۱۳۸۹ھ

(فتویٰ نمبر ۲۸/۹۱۷ ج)

نمازِ جنازہ شروع کرنے سے پہلے امام کا نیت وغیرہ بتانا

(دار الافتاء دار العلوم کراچی کے ایک صاحب کے فتویٰ پر مستفتی کا اِشکال اور اس کا جواب)

سوال:– آپ کا فتویٰ ۱۴/ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ کو ملا جس میں یہ لکھا تھا کہ:–

''اس فعل کو اگر سنت سمجھ کر کیا جائے تو واقعۃً بدعت ہے، اس لئے کہ خیر القرون میں اس کا ثبوت نہیں ملا، لیکن اس زمانے میں دین کی طرف رغبت بالکل نہیں ہے، لوگوں کو نمازِ جنازہ اور عیدین وغیرہ کی نیت تک نہیں آتی، اس لئے انہیں بتادینے میں کوئی حرج نہیں۔'' اگر کسی کو مسئلہ بتلانے کے لئے تیمّم کرکے دِکھلایا لیکن دِل میں اپنے تیمّم کرنے کی نیت نہیں ہے بلکہ اس کو دِکھانا مقصود ہے اس کا تیمّم نہ ہوگا، کیونکہ تیمّم ہونے میں تیمّم کرنے کا ارادہ ہونا ضروری ہے، جب ارادہ نہ ہو صرف بتلانا اور دُوسرے کو دِکھلانا مقصود ہو تو تیمّم نہ ہوگا، سائل نے لکھا تھا کہ امام کا نیتِ نمازِ عیدین و جنازہ بتلادینا تلقین من الخلدج ہے، اس لئے نماز فاسد ہوتی ہے، اور نیت نماز شروع کرنے سے پہلے بتلائی جاتی

---

(۱) غنیة المتملی ص:۶۰۷ (طبع سهیل اکیڈمی لاهور).

(۲) فتاویٰ شامیة ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع ایچ ایم سعید). میت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے سے متعلق حضرتِ والا دامت برکاتہم کا مفصل و مدلل فتویٰ آگے ص:۵۷۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

ہے، اگر نیت بتلانا جہالت کی وجہ سے کوئی حرج نہیں رکھتا تو پانچ وقت کی نمازوں میں بھی بتلانا چاہئے، جبکہ خیر القرون اور صحابہؓ سے اس کا ثبوت نہیں کہ عیدین و جنازہ کی نماز میں مسلمانوں کو امام نے نیت جہراً اور بلند آواز سے پڑھ کر سنائی ہو، بلکہ نیت کے الفاظ حدیث سے ثابت نہیں ہیں، مجھے آپ کا جواب تسلی بخش نظر نہ آیا۔ (خلاصہ از سوال و جواب مستفتی)

جواب: - آپ کی تحریر غور سے بہ نیتِ قبول پڑھی لیکن گزشتہ فتویٰ میں جو بات لکھی تھی اس میں تبدیلی نہیں ہوئی، جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہونے کا تعلق ہے، ثابت تو زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا بھی نہیں ہے، اس کے باوجود فقہاءؒ نے تلفظ بالنیۃ کو نہ صرف جائز بلکہ بہتر قرار دیا ہے۔

فی الدر المختار[1] والتلفظ بها مستحب هو المختار وقيل سنة يعنى أحبه السلف أو سنة علماءنا اذ لم ينقل عن المصطفٰى ولا الصحابة ولا التابعين بل قيل بدعة۔

اس کے ماتحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: وقد استفاض ظهور العمل به فى كثير من الاعصار فى عامة الأمصار فلا جرم انه ذهب فى المبسوط والهداية والكافى الى انه ان فعله ليجمع عزيمة قلبه فحسن فيندفع ما قيل انه يكره. (شامی ج:۱ ص:۲۷۸)[2] اور جب تلفظ بالنیۃ کو بہتر کہا گیا تو اگر امام مقتدیوں کو نیت بتادے تو اس میں شرعاً کوئی اَمر مانع نہیں، اِلّا یہ کہ اس کو سنتِ نبویہ یا واجب و لازم سمجھ لیا جائے تو وہ بدعت ہوجائے گا، لیکن محض اس خیال سے کہ لوگوں کو الفاظِ نیت معلوم ہوجائیں اگر امام بتادے تو کچھ حرج نہیں، اور امام جب نیت کے الفاظ بتارہا ہو ان الفاظ سے امام کی نیت متحقق نہ ہوگی، بلکہ نماز کے وقت اسے باقاعدہ نیت کرنی پڑے گی، لہٰذا تیمّم کی جو مثال آپ نے دی ہے، وہ اس صورت میں صادق نہیں آتی، ھذا ما عندی۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۰/۲/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۶۳/۲۸ الف)

میّت کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم

سوال: - اگر کسی شخص کا کراچی میں انتقال ہو تو میّت کو پنجاب بھیجنا جائز ہے؟

---

(۱) ج:۱ ص:۴۱۵، ۴۱۶ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) شامی بحث النية ج:۱ ص:۴۱۶ (طبع سعيد). وفى اعلاء السنن ج:۲ ص:۱۴۹ (طبع ادارة القرآن كراچی) واباحه بعض لما فيه من تحقيق عمل القلب وقطع الوسوسة وما روى عن عمرؓ انه ادب من فعله فهو محمول على انه انما زجر من جهر به فاما المخافتة به فلا بأس بها فمن قال من مشائخنا ان التلفظ بالنية سنة لم يرد بها سنة النبى صلى الله عليه وسلم بل سنة المشائخ لاختلاف الزمان وكثرة الشواغل على القلوب. وفى الهندية ج:۱ ص:۶۵ ولا عبرة للذكر باللسان فان فعله لتجتمع عزيمة قلبه فهو حسن كذا فى الكافى.

جواب:- دفن سے پہلے میّت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر منتقل کرنے کے بارے میں فقہائے حنفیہ میں اختلاف ہے، بعض حضرات اسے جائز کہتے ہیں اور بعض مکروہِ تحریمی بتاتے ہیں، لہٰذا شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

قال فی شرح المنیة: ویستحب فی القتیل والمیّت دفنه فی المکان الذی مات فیه فی مقابر أولئک القوم وان نقل قبل الدفن قدر میل أو میلین فلا بأس به قیل هٰذا التقدیر من محمد یدل علٰی أنّ نقله من بلد الٰی بلد لا یجوز أو مکروه ولأن مقابر بعض البلدان ربما بلغت هٰذه المسافة ففیه ضرورة ولا ضرورة فی النقل الٰی بلد اٰخر وقیل یجوز ذٰلک ما دون السفر لما روی أن سعد بن أبی وقاص مات فی قریة علٰی أربعة فراسخ من المدینة فحمل علٰی اعناق الرجال الیها وقیل لا یکره فی مدة السفر أیضًا. (کبیری ص:۵۶۳، مسائل متفرقة من الجنائز)۔(۱)

واللہ اعلم

۱۳۸۹/۷/۵ھ

میّت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر منتقل کرنے کا حکم

اور مجتہد فیہ اُمور میں نکیر کے درجات

(حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ کی تدفین سے متعلق تفصیلی فتویٰ)

باسمه سبحانه وتعالٰی

بقیة السلف عارف باللہ محی السنة برکة العصر محترم المقام واجب الاحترام حضرتِ والا ہردوئی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ!

بعدہٗ معروض خدمتِ اقدس میں نہایت عاجزانہ اور پُرخلوص گزارش یہ ہے کہ حضرت ہر انسان کا مقدر دُنیا میں آنے سے قبل لکھا جاچکا ہے، یہاں تک کہ اہلِ علم حضرات سے بارہا سنا رُوح قبض ہونے کا وقت ومقام اور جہاں انسان کو دفن ہونا ہے وہاں کی مٹی بھی مقرّر ہے، چاہے انسان دُنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، اس کی موت وہاں اس کو کھینچ کر لے جائے گی جہاں دفن ہونا ہے اور وہاں کی مٹی اس کو وہاں کھینچ لے جائے گی۔ اس کی تائید وتصدیق حضرت مولانا قاری سیّد صدیق احمد باندویؒ کے وصال سے ہوتی ہے، حضرت کو باندھا (باندہ) سے جب لکھنؤ لے جانے کا فیصلہ ہوا تو حضرت نے انکار فرمایا اور فرمایا: یہ موت کی تکلیف ہے، آگے یہ فرمایا: میرا سلام سب ملنے والوں کو کہہ دینا اور سب

(۱) غنیة المتملی ص:۶۰۷ (طبع سہیل اکیڈمی لاہور) تفصیل کے لئے اگلا مفصل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

مل کر مدرسہ کا خیال رکھنا۔ اتنا فرما کر ذکر میں مشغول ہوگئے یہاں تک کہ آپ کو لکھنؤ لے جایا گیا، وہاں تھوڑی ہی دیر کے بعد رُوح کو اپنے پیدا کرنے والے کے سپرد کردیا، (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) پھر وہاں سے حضرتِ والا کو ہتھورہ لانے کی تیاری ہونے لگی، اس موقع پر حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم نے انکار فرمایا کہ حضرت کو یہیں دفن کردیا جاوے، اور حضرتِ والا نے بھی اس بات پر اصرار فرمایا ہے کہ حضرت کو ہتھورہ نہ لے جایا جائے، ہزار کوششوں کے باوجود ایسا نہیں ہوسکا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ موت اور مٹی کو اپنے مقام پر کھینچنے میں دخل ہے، ان تمام باتوں پر یقین کے باوجود پھر کوئی انسان اس ضد پر اَڑ جائے کہ جہاں رُوح قبض ہوئی ہے وہیں دفن کیا جائے گا تو میں جنازہ میں شریک ہوں گا ورنہ نہیں، اور اس بات پر قسم کھالینا کہ میں اس مقام پر کبھی نہیں جاؤں گا جہاں اس کو دفن کیا ہے، اس ضد پر اَڑے رہنا کیا یہ صحیح ہوگا؟ حضرتِ والا سے مؤدّبانہ، عاجزانہ التماس ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہم لوگوں کی رہبری فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ خدا حافظ گستاخی معاف

محتاجِ دُعا عبدالخالق
جامع مسجد رسلی کرود بھوپال

مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی کی طرف سے جواب

جواب:- ہر مسلمان کے لئے جیسے تقدیری اُمور پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح تشریعی اُمور پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، البتہ بندوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ذریعہ صرف تشریعی اُمور کا مکلّف بنایا ہے، تکوینی اُمور کا مکلّف نہیں بنایا ہے، "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا"[1]، لہٰذا کسی مسلمان کی موت کہاں ہوئی یا کہاں ہونی چاہئے؟ مسلمان اس کا مکلّف نہیں ہے، البتہ موت واقع ہوجانے کے بعد میّت کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہئے؟ اس کو علمائے کرام سے معلوم کرنے کے بعد اس کے موافق معاملہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ فتاویٰ محمودیہ ج:۲ ص:۴۰۳ (طبع کتب خانہ مظہری) یعنی فتاویٰ حضرت فقیہ الأمت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی علیہ الرحمۃ میں ہے: اصل یہ ہے کہ آدمی کا جس بستی میں انتقال ہو اسی بستی میں اس کو دفن کیا جاوے، اگر اس نے وصیت کی ہو کہ مجھ کو فلاں جگہ دفن کرنا تو اس وصیت پر عمل کرنا لازم نہیں، یہ وصیت باطل ہے۔ یندب دفنه فی جهة موته أی فی مقابر أهل المكان الذی مات فيه أو قتل (شامی ج:۱ ص:۶۰۲)۔[2]

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کو انتقال کے بعد دُوسرے مقام پر لے جاکر دفن کیا گیا، جہاں

---

(۱) سورة البقرة:۲۸۶.

(۲) فتاوی شامية مطلب فی دفن الميت ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع سعيد).

انتقال ہوا وہاں دفن نہیں کیا گیا تو حضرت عائشہؓ ایک سفر میں جاتے ہوئے جب ان کی قبر پر گزریں تو فرمانے لگیں: اگر میرا بس چلتا تو تم یہاں دفن نہ کئے جاتے، بلکہ جہاں انتقال ہوا تھا وہیں دفن ہوتے۔ تاہم اس مسئلے میں اتنی تنگی نہیں ہے، امام محمد علیہ الرحمۃ نے میل دو میل کو مقامِ وفات سے حسبِ مصالح دُور لے جاکر دفن کرنے کی بھی گنجائش بتائی ہے، ولا بأس بنقله قبل دفنه قيل مطلقًا وقيل الىٰ ما دون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل أو ميلين لأن مقابر البلد ربما بلغت هٰذه المسافة فيكره فيما زاد قال فى النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر. (فتاویٰ شامی ج:۱ ص:۶۰۲)۔[1]

نیز فتاویٰ دار العلوم میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مفتیٔ اعظم علیہ الرحمۃ نے اس سوال کے جواب میں کہ نقلِ میّت کیا حرام ہے یا مکروہِ تحریمی یا تنزیہی ہے؟ عباراتِ فقہاء نقل کرکے لکھا ہے کہ: اُن عبارات سے واضح ہے کہ قبل دفن نقلِ میّت میں اختلاف ہے، بعض جائز کہتے ہیں، اور بعض ناجائز اور مکروہ، اور ظاہراً مکروہ سے مراد ان کی مکروہِ تحریمی ہے، اور صاحبِ نہر کا اس کو ھو الظاھر کہنا اس کی ترجیح کو مقتضی ہے (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ج:۵ ص:۳۸۰، طبع دار الاشاعت کراچی)۔

اور احسن الفتاویٰ یعنی فتاویٰ فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب کراچی میں تصریح ہے کہ نقلِ میّت مکروہِ تحریمی ہے، نیز آگے کچھ ارشاد ہے: وقال شمس الأئمة السرخسىؒ وقول محمد فى الكتاب لا بأس أن ينقل الميّت قدر ميل أو ميلين بيان ان النقل من بلد الىٰ بلد مكروه،[2] قاله قاضى خان وقال العلامة الطحطاوى رحمة الله عليه مكروه أى تحريما[3] وقد جزم فى التاجية بالكراهة وفى التجنيس وذكر أنه اذا مات فى بلدة يكره نقله الىٰ أخرىٰ لأنه اشتغال بما لا يفيد وفيه تأخير دفنه وكفىٰ بذٰلك كراهة. البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۵۔[4]

نقلِ میّت میں تأخیرِ تدفین وخطرۂ فسادِ میّت کے علاوہ آج کل مزید مندرجہ ذیل مفاسد پیدا ہوگئے ہیں:-

۱:- اس کا التزام ہونے لگا ہے۔ ۲:-مصارفِ کثیرہ و مشقتِ شدیدہ کا تحمل۔ ۳:-آبائی قبرستان میں دفن کرنے کا التزام اور اس پر اصرار سے یہ عقیدہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مقام میں دفن ہونے والی اموات کی آپس میں ملاقات ہوتی ہے، حالانکہ یہ عقیدہ غلط ہے۔ ۴:-جنازے کو منتقل کرنا عموماً نمازِ جنازہ کے تکرار کا سبب بنتا ہے جو ناجائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ ج:۴ ص:۲۱۸)۔[5]

---

(۱) فتاوىٰ شامية مطلب فى دفن الميت ج:۲ ص:۲۳۹ (طبع سعيد).
(۲) شرح السير الكبير رقم: ۳۰۴ ج:۱ ص:۲۳۶ (طابع مولانا نصر الله منصورؒ).
(۳) حاشية الطحطاوى علىٰ مراقى الفلاح ص:۳۳۷ (طبع نور محمد كتب خانه).
(۴) منحة الخالق علىٰ هامش البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۵ (طبع ايچ ايم سعيد).
(۵) احسن الفتاوىٰ باب الجنائز ج:۴ ص:۲۰۸، ۲۰۹ (طبع ايچ ايم سعيد).

اور بہشتی زیور میں مذکور ہے کہ قبل دفن کے نعش کا ایک مقام سے دُوسرے مقام میں دفن کرنے کے لئے لے جانا خلافِ اَوْلیٰ ہے، جبکہ دُوسرا مقام ایک دو میل سے زیادہ نہ ہو، اور اگر اس سے زیادہ ہو تو جائز نہیں، اور بعد دفن کے نعش کھود کر لے جانا تو ہر حال میں ناجائز ہے (بہشتی زیور ج:۱۱ ص:۱۰۲)۔

نیز مشکوٰۃ شریف میں ہے: عن جابرؓ قال: لما كان يوم أحد جاءت عمتي بأبي لتدفنه في مقابرنا فنادى منادي رسول الله صلى الله عليه وسلم ردوا القتلىٰ الىٰ مضاجعهم۔[1]

اور اسی طرح سننِ ابوداؤد شریف میں ج:۲ ص:۱۰۲ پر ہے۔[2]

(وقال في شرح هٰذا الحديث) وكذا من مات في موضع لا ينقل الىٰ بلد اٰخر قاله بعض علمائنا وقال في الأزهار الأمر في قوله صلى الله عليه وسلم ردوا القتلىٰ للوجوب۔ مرقات شرح مشکوٰۃ شریف ج:۲ ص:۳۷۴،[3] وبذل المجهود ج:۴ ص:۱۹۷۔[4]

ان مذکورہ بالا کتابوں سے واضح ہوا کہ ایک جگہ سے دُوسری جگہ میّت کو منتقل کرنا ناجائز اور منکرِ شرعی ہے، اس کی اصلاح کی سعی ہر ایک کے ذمہ بشرطِ قدرت ہے، جس کی توضیح بھی حضراتِ فقہاء نے فرمائی ہے، اگر عامی شخص ہے تو بشرطِ قدرت کرے اور صبر کرے، اگر مقتداء ہے تو نکیر کے ساتھ علیحدگی اختیار کرے، اصلاح کی خاطر ترکِ کلام اور ترکِ تعلق بھی کرسکتا ہے اور اس پر قسم بھی کھا سکتا ہے۔ وفي الهداية فان قدر على المنع منعهم وان لم يقدر يصبر وهٰذا اذا لم يكن مقتدىٰ فان كان ولم يقدر علىٰ منعهم يخرج ولا يقعد لأن في ذٰلك شين الدين وفتح باب المعصية على المسلمين .... الىٰ لقوله تعالىٰ: فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ، وهذا كله بعد الحضور ولو علم قبل الحضور لا يحضر. هداية ج:۴ ص:۴۵۵ (طبع مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)۔

اور حضرت مولانا عبدالحی فرنگی علیہ الرحمۃ اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: قوله في ذٰلك شين الدين لأن المقتدىٰ امام في الدين وفعل امام الدين علىٰ خلاف الدين استخفاف بالدين في نظر الناظرين. هامش الهداية ج:۴ ص:۴۵۵ (طبع مذکور)۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہراتؓ سے ان کی

---

(۱) مشكوة المصابيح باب دفن الميّت الفصل الثاني ج:۱ ص:۱۴۸ (طبع قديمي كتب خانه).
(۲) سنن أبي داؤد ج:۲ ص:۹۵ (طبع مكتبه حقانيه ملتان).
(۳) مرقاة المفاتيح شرح مشكوة المصابيح رقم الحديث:۱۷۰۴ ج:۴ ص:۱۸۳ (طبع مكتبه حبيبيه كوئٹه).
(۴) بذل المجهود كتاب الجنائز ج:۱۴ ص:۱۳۲ (طبع دار الريان للتراث قاهرة).

اصلاح کی خاطر ایک دفعہ ایک ماہ تک ترکِ تعلق رکھا[1]، اور ابوداؤد شریف جلد دوم ص:۳۳۳[2] میں ہے کہ حضرت زینبؓ کے حضرت صفیہؓ کو ایک سخت جملہ کہہ دینے کی وجہ سے ان کی اصلاح کی خاطر دو ماہ سے بھی زائد ترکِ تعلق رکھا، اور بخاری شریف جلد دوم ص:۸۹۷[3] میں ہے کہ: حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ایک جملہ کہہ دینے کی وجہ سے حضرت عائشہؓ نے زندگی بھر کلام نہ کرنے کی قسم کھالی تھی، اور پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان کی بہت خوشامد کی اور دُوسرے حضرات سے سفارش کرائی تب حضرت عائشہؓ نے ان کو معاف کیا اور قسم کے خلاف کرنے کی وجہ سے چالیس غلام آزاد کئے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے بیٹے سے ایک جملے کی وجہ سے جس سے حدیث کی مخالفت کا وہم ہوتا تھا، ترکِ تعلق کرلیا، پھر تا حیات ان سے کلام نہیں فرمایا، مشکوٰۃ شریف ج:۱ ص:۹۷[4]۔ پس کسی پر شرعی نکیر کرنا اور ان سے ترکِ تعلق کرنا یا اس کی قسم کھالینا جبکہ وہ اس کے عقد میں بھی ہو اور اُمید ہو کہ وہ اپنی اصلاح کریں گے، بلاشبہ دُرست ہے بلکہ بعض صورتوں میں ضروری اور لازم ہے، کما لا یخفی، اور قسم کھا کر پھر مصالح کی بنا پر اس کے توڑنے اور اس کے کفارہ ادا کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے، اور یہ حدیثِ مذکور سے ثابت ہے۔

تنبیہ:- ضد کہتے ہیں ناحق پر اَڑنے کو، اور کسی دینی مسئلے پر اَڑنا ضد نہیں بلکہ عین اتباعِ شریعت ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

العبد شفقت اللہ
۷رشعبان ۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح
منظور احمد المظاہری
مفتی مدرسہ جامع العلوم کانپور

الجواب صحیح
ابرار الحق
۸رشعبان ۱۴۱۸ھ

صح الجواب بلا ارتیاب
محمد حنیف غفرلہٗ

الجواب صحیح
محمد انعام اللہ
مفتی مدرسہ امدادیہ مرادآباد

الجواب صحیح
سبیل احمد غفرلہٗ

الجواب صحیح
فہیم احمد نگینوی
نائب مفتی مدرسہ اشرف المدارس

الجواب صحیح
محمد فاروق غفرلہٗ
مفتی دار العلوم میرٹھ

واصاب المجیب فیما اجاب

احقر کو اس جواب سے حرف بحرف اتفاق ہے، فقط واللہ اعلم
العبد نظام الدین مفتی دار العلوم دیوبند

الجواب صواب
محمد عبداللہ پھولپوری

بندہ کو اس جواب کے ہر ہر جز سے اتفاق ہے
مقصود احمد انبیٹھوی مظاہر العلوم سہارنپوری

---

(۱) الصحیح للبخاریؒ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا رأیتم الھلال فصوموا .... الخ. رقم الحدیث: ۱۸۱۱ و ۱۸۱۲ ج:۲ ص:۲۷۵ (طبع دار ابن کثیر یمامۃ بیروت)

(۲) أبو داؤد باب ترک السلام علی أھل الأھواء ج:۴ ص:۱۹۹ (طبع دار الفکر).

(۳) صحیح بخاری شریف باب الھجرۃ ج:۲ ص:۸۹۷ (طبع قدیمی کتب خانہ).

(۴) مشکوۃ المصابیح قبیل باب تسویۃ الصفوف ج:۱ ص:۹۷ (طبع مذکور).

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کا فتویٰ

حامدًا ومصليًا ومسلمًا، اما بعد! یہ کہ جوابِ استفتاء اَمرِ منکر پر نکیر کرنے کی حد تک مدلل اور اقرب الی التحقیق ہے، البتہ میّت کے دفنانے کے بعد اس مقام پر نہ جانے کا حلف اُٹھانا محتاجِ دلیل ہے، اس لئے کہ منکر کا سبب میّت نہیں، میّت کی تدفین کے بعد مقامِ دفن پر نہ جانے کی قسم سے ضد کا شائبہ ہوسکتا ہے۔

کتبہ

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ

محمد عبدالمجید دین پوری عفی عنہ
دار الافتاء جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
۱۴۱۸/۱۱/۲۶ھ

دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کا فتویٰ

الجواب باسم ملہم الصواب، ہردوئی سے لکھا ہوا جواب صحیح ہے، بنوری ٹاؤن کے جواب میں جو ضد کے شائبہ کو ظاہر کیا گیا ہے وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ حالف کا مقصد میّت سے دُشمنی اور اس کے مدفن سے ضد نہیں بلکہ اہلِ میّت کو اس منکر کے ارتکاب پر تنبیہ کرنا اور اس کے غم میں شریک نہ ہونے کا اظہار ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
احمد

الجواب صحیح
موسیٰ

عبدالواحد
دار الافتاء والارشاد ناظم آباد
۳ر ذوالحجہ ۱۴۱۸ھ

فتویٰ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

(دار الافتاء جامعہ دار العلوم کراچی)

(مذکورہ بالا تمام فتاویٰ اُستاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کئے گئے، حضرتِ والا دامت برکاتہم نے اس کا جو جواب لکھا وہ درج ذیل ہے۔) (مرتب)

جواب: – سب سے پہلے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم بحیثیت مسلمان تکوینی اُمور کے مکلّف نہیں، بلکہ اَحکامِ شریعت کے مکلّف ہیں، لہٰذا اگر کسی شخص کے بارے میں یہ مقدر ہو کہ وہ فلاں جگہ پر دفن ہوگا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس جگہ دفن کرنا شرعاً جائز یا مناسب تھا، لہٰذا صورتِ مسئلہ میں یہ استدلال دُرست نہیں ہے کہ چونکہ حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ کو اس شہر میں دفن نہیں کیا گیا جہاں ان کی وفات ہوئی بلکہ دُوسرے شہر لے جایا گیا، لہٰذا شرعاً بھی ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ البتہ اصل دار و مدار اس

بات پر ہے کہ شرعاً میّت کو ایک شہر سے دُوسرے شہر لے جا کر دفن کرنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے، خود فقہائے حنفیہ کے بھی اس میں مختلف اقوال ہیں، بعض حضرات اس کو جائز کہتے ہیں اور بعض مکروہ، جن میں سے بعض نے اس کے مکروہِ تحریمی ہونے کی بھی تصریح کی ہے، لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ میّت کو اسی شہر کے قبرستان میں دفن کرنا چاہئے جہاں اس کا انتقال ہوا ہو، اور بلاعذر دُوسرے شہر کی طرف منتقل نہیں کرنا چاہئے، لہٰذا اگر کسی بزرگ نے اس شرعی مسئلے پر عمل کے لئے میّت کو دُوسرے شہر لے جانے سے منع کیا، جبکہ ہمارے زمانے میں اس نقل مکانی پر دُوسرے متعدّد مفاسد بھی مرتب ہونے لگے ہیں تو اس کو موردِ طعن بنانا ہرگز دُرست نہیں، بالخصوص جبکہ اس بزرگ کی حیثیت ایک مقتدا کی ہو اور وہ لوگوں کی اصلاح اور تربیت کی خاطر ایسا کرے، یہ اور بات ہے کہ شریعت میں نکیر کے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں اور کسی غلط بات پر نکیر اس کی نکارت اور مفاسد کے بقدر ہی ہونی چاہئے۔

صورتِ مسئولہ میں نکیر کے لئے جو نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار اور میّت کی قبر پر نہ جانے کی قسم کھانا مذکور ہے، اس میں کوئی بات شرعاً ناجائز نہیں، کیونکہ نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے، اس لئے کسی کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہ کرنے کو جبکہ دُوسرے لوگوں نے اس کی نماز پڑھی ہو، ناجائز نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کسی قبر پر جانا کوئی واجب نہیں ہے، اس لئے وہاں نہ جانے کا عزم ظاہر کرنا یا اس پر قسم کھانا ایسا اَمر ہے کہ اس کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔ رہی یہ بات کہ اس مسئلے میں نکیر جس درجے کی کی گئی وہ زیادہ مناسب تھی یا اس سے کم درجے کی نکیر بھی کافی ہوسکتی تھی؟ تو اس میں آراء مختلف ہوسکتی ہیں، اور مختلف حالات میں اس کا جواب مختلف ہوسکتا ہے، لہٰذا جس درجے کی نسبتاً سخت نکیر سوال کے پہلے جواب میں مذکور ہے اس کو بھی شرعاً ناجائز نہیں کہا جاسکتا، اور اس سے نرم درجے کی نکیر بھی اُصولاً جائز اور کافی ہے، جیسا کہ درج ذیل دلائل سے واضح ہے۔

ایک شہر سے دُوسرے شہر لے جانے کا شرعی حکم
اور مجتہد فیہ مسائل میں نکیر کے درجات

ورأينا هٰذا مبنى علٰى ما يأتى:-

١:- ان المسئلة فيها أقوال مختلفة للفقهاء الحنفية فضلا عن غيرهم من المالكية والحنابلة كما هو ظاهر من العبارات الملحقة.

٢:- من ذهب الى الكراهة فالظاهر من عبارات القوم أنه أراد التنزيهية ولم يصرح

بکونها تحریمیة الا الطحطاوی فی حاشیته علٰی مراقی الفلاح ولعله أخذ ذٰلک باطلاق الکراهة وقد صرح من هو أقدم منه بکونه خلاف المستحب کما یظهر من العبارات الملحقة.

۳:- ولئن سلم أن الکراهة تحریمیة ولا شک أن العمل به أحوط فلا اقل من أن المسئلة محل خلاف بین الفقهاء الحنفیة ومثل هٰذه الأمور المجتهد فیها لا تستحق التشدد فی الانکار کما تستحقه المحرمات القطعیة.

۴:- الانکار ینبغی أن یکون علٰی من یرتکب المنکر وینبغی أن یتوجه التأدیب الیه ولا شک أن فی الصورة المسئولة انما نقل المیت أهله فلا انکار علی المیت فترک الصلٰوة علیه أو الحلف علٰی عدم الذهاب الٰی قبره متوجه الی المیت الذی هو برئ عن عهدة نقله ولا سیما اذا کان عالمًا ورعًا یقتدی به الناس ومن المعروف أن الحلف لا یصار الیه الا عند الضرورة قال فی المحیط الأفضل فی الیمین باللہ تعالٰی تقلیلها وفی تکثیر الیمین المضافة الی المستقبل تعریض اسم اللہ تعالٰی للهتک.

(طحطاوی علی الدر ج:۲ ص:۳۲۴، طبع مکتبة عربیه کوئٹه، وبهشتی زیور ج:۳ ص:۲۶۷)

۵:- وقد أنکرت عائشةؓ علٰی نقل أخیها عبدالرحمٰن بن أبی بکرؓ الٰی غیر المکان الذی توفی فیه لٰکنها زارت قبره ولم تترک الزیارة لأجل نقله الٰی ذٰلک المکان.

واللہ سبحانہ اعلم

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۴۱۹/۲/۵ھ

(فتویٰ نمبر ۳۰۹/۲۳)

الجواب صحیح
محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح
سبحان محمود

اختلاف العلماء فی جواز نقل المیّت

المالکیة والحنابلة صرحوا بجواز نقل المیت من بلد الٰی اٰخر قال الدردیر فی شرحه لمختصر خلیل الشرح الصغیر "وجاز نقله أی المیت من مکان الٰی اٰخر وان من بلد لاٰخر قبل دفنه أو بعده لمصلحة کان یخاف علیه أن یأکله البحر أو السبع وکرجاء برکته للمکان المنقول الیه أو زیارة أهله أو لدفنه بین أهله ونحو ذٰلک (ان لم تنتهک حرمته) بانفجاره أو نتانته. (ج:۱ ص:۵۶۶، طبع دار المعارف مصر)

وقال ابن قدامة فی المغنی:-

وقال أحمد ما أعلم بنقل الرجل یموت فی بلده الٰی بلد اٰخر بأساً، وسئل الزهری

عن ذٰلک فقال قد حمل سعد بن أبی وقاص وسعید بن زید من العقیق الی المدینة وقال ابن عیینة مات ابن عمر هنا فأوصی أنه لا یدفن هٰهنا وأن یدفن بسرف. (ج:۲ ص:۳۹۰).[1]

وأما مذهب الشافعیة فما جاء فی شرح الاقناع:-

ویحرم نقل المیت قبل دفنه من محل موته الٰی محل أبعد من مقبرة محل موته لیدفن فیه الا أن یکون بقرب مکة أو المدینة أو بیت المقدس.

وفی حاشیته:-

المراد بالقرب مسافة لا یتغیر المیت فیها قبل وصوله والمراد بمکة جمیع الحرم ولا ینبغی التخصیص بالثلاثة بل لو کان بقرب مقابر أهل الصلاح والخیر فالحکم کذٰلک لأن الشخص یقصد الجار الحسن. (أوجز المسالک ج:۴ ص:۲۵۳ طبع ادارہ تالیفات اشرفیه ملتان) ومثله فی تحفة المحتاج لابن حجر هیتمی. (ج:۳ ص:۲۰۲، ۲۰۳)

اختلاف الأقوال فیما بین الحنفیة:

قال فی الدر المختار:-

ولا بأس بنقله قبل دفنه.

وقال ابن عابدین تحته:-

(قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قیل مطلقًا وقیل الٰی ما دون مدة السفر وقیده محمد بقدر میل أو میلین لأن مقابر البلد ربما بلغت هٰذه المسافة فیکره فیما زاد قال فی النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر. (ج:۲ ص:۲۳۹ طبع سعید)

تحقیق کراهة النقل:

قد مرّ عن رد المحتار أنه یکره نقل المیت قبل الدفن وذکر الطحطاوی فی حاشیته علٰی مراقی الفلاح (ص:۳۳۷ طبع نور محمد کتب خانه) أنها تحریمیة ولٰکن الظاهر أنه فهم التحریم من اطلاق لفظ الکراهة ولٰکن یظهر من کتب الفقهاء الحنفیة أنهم انما أرادوا الکراهة التی هی ضد المستحب ویظهر ذٰلک من العبارات الآتیة.

قال العلامة بحر العلوم رحمه الله فی رسائل الأرکان:-

النقل بعد نبش القبر کما هو المتعارف الیوم مکروه تحریمًا أشد الکراهة لأن نبش القبر واخراج المیت لا یجوز لأنه قد سلم الی الله تعالٰی وأما قبل النبش فمکروه والأفضل أن

---

(۱) المغنی لابن قدامة ج:۳ ص:۴۴۳ (طبع دار عالم الکتب، ریاض).

لا ينقل. (رسائل الأركان ص: ۱۵۹ طبع قديم مطبع يوسفى فرنگى محل لكهنؤ)

فصرح العلامة رحمه الله بأن النقل بعد الدفن مكروه تحريمًا ثم ذكر مسألة النقل قبل الدفن فأطلق الكراهة ولم يقيدها بالتحريم فظهر أنه أراد به ما هو دون الكراهة التحريمية ولذلك أعقبه بقوله: "الأفضل أن لا ينقل".

وانما ذكروه من انه حيث أطلق الكراهة فالمراد به التحريمية ليست بكلية قال ابن عابدينؒ نقلا عن البحر:-

المكروه فى هذا الباب نوعان أحدهما ما كره تحريمًا وهو المحمل عند اطلاقهم الكراهة .... ثانيهما المكروه تنزيهًا ومرجعه الىٰ ما تركه أولىٰ وكثيرًا ما يطلقونه كما فى شرح المنية فحينئذ اذا ذكروا مكروهًا فلا بد من النظر فى دليله فان كان نهياً ظنياً يحكم بكراهة التحريم الا لصارف للنهى عن التحريم الىٰ الندب فان لم يكن الدليل نهيًا بل كان مفيدًا للترك الغير الجازم فهى تنزيهية.

(رد المحتار ج: ۱ ص: ۱۳۲ طبع سعيد، قبيل مطلب فى الاسراف فى الوضوء)

وانما استدل علىٰ كراهة النقل أولا بما روى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال فى شهداء أحد: "ردوا القتلىٰ الىٰ مضاجعهم". (رواه أحمد والترمذى وأبوداوٗد والنسائى)

ولكن قال الامام السرخسى رحمه الله فى شرح هذا الحديث:-

وهذا حسن ليس بواجب وانما صنع هذا رسول الله صلى الله عليه وسلم لأنه كره المشقة عليهم بالنقل مع ما أصابهم من القرح. (شرح السير الكبير ج: ۱ ص: ۲۳۴ فقره نمبر ۳۰۱)

والدليل الثانى للكراهة هو حديث عائشةؓ حيث قالت عند زيارة قبر أخيها عبدالرحمٰن ابن أبى بكرؓ الذى نقل من الحبش الىٰ مكة: "والله لو حضرتك ما دفنت الا حيث مت" وقد علق عليه الامام السرخسىؒ بقوله:-

وفيه دليل أن الأولىٰ أن يدفن القتيل والميت فى المكان الذى مات فيه فى مقابر أولئك القوم. (شرح السير الكبير ج: ۱ ص: ۲۳۶ رقم: ۳۰۳)

واستدل الامام السرخسىؒ بحديث عائشةؓ علىٰ أن الأولىٰ عدم النقل والنقل خلافه فهو مكروه تنزيهًا.

وانما أخذ الفقهاء الحنفية الكراهة من قول الامام محمدؒ فى السير الكبير ولو نقل ميلًا أو ميلين أو نحو ذلك فلا بأس به فاستنبطوا من هذا القول أن النقل الىٰ ما زاد مكروه

ولذٰلک قال السرخسی رحمه الله:-

وفی هٰذا بیان أن النقل من بلد الٰی بلد مکروه لأنه قدر المسافة التی لا یکره النقل فیها بمیل أو میلین وهٰذا لأنه اشتغال بما لا یفید فالأرض کلها کفات للمیت قال الله تعالٰی: اَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ کِفَاتًا أَحْیَآءً وَّأَمْوَاتًا. إلا أن الحی ینتقل من موضع الٰی موضع لغرض له فی ذٰلک وذٰلک لا یوجد فی حق المیت ولو لم یکن فی نقله الا تأخیر دفنه أیا ما کان کافیا فی الکراهة. (شرح السیر الکبیر ج:۱ ص:۲۳۶، ۲۳۷ فقره نمبر ۳۰۴)

وقد سبق أن الامام السرخسیؒ جعل عدم النقل أولٰی فظاهر أن مراده من الکراهة هنا التنزیهیة وما یدل علٰی کون الکراهة تنزیهیة أن کثیرًا من الفقهاء صرحوا بعدم الإثم فی النقل ومن مقدمتهم صاحب الهدایة کما ذکره ابن الهمامؒ عنه فقال:-

قال المصنف فی التجنیس: فی النقل من بلد الٰی بلد لا اثم، ثم ذکر عن صاحب الهدایة نفسه أنه قال:-

اذا مات فی بلدة یکره نقله الٰی أخریٰ لأنه اشتغال بما لا یفید.

(فتح القدیر ج:۲ ص:۱۰۱، ۱۰۲ طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه)

فظهر بهٰذا أن المراد بالکراهة ما یجتمع مع عدم الاثم وهو الکراهة التنزیهیة لذٰلک ذکر کثیر من الفقهاء عدم الإثم بدون التصریح بالکراهة وانما ذکروا أن المستحب أن یدفن فی المکان الذی مات فیه.

قال ابن نجیمؒ:-

ولم یتکلم المصنف علٰی نقل المیت من مکان الٰی اٰخر قبل دفنه قال فی الواقعات والتجنیس: القتیل أو المیت یستحب لهما أن یدفنا فی المکان الذی قتل أو مات فیه فی مقابر أولئک القوم لما روی عن عائشة رضی الله عنها أنها زارت قبر أخیها عبدالرحمٰن بن أبی بکرؓ وکان مات بالشام وحمل من هناک فقالت: لو کان الأمر فیک بیدی ما نقلتک ولدفنتک حیث مت. لٰکن مع هٰذا اذا نقل میلًا أو میلین أو نحو ذٰلک فلا بأس وان نقل من بلد الٰی بلد فلا إثم فیه. (البحر الرائق ج:۲ ص:۱۹۵ طبع رشیدیه کوئٹه)

وقال العلامة الأفندی فی مجمع الأنهر:-

ویستحب فی القتیل والمیت دفنه فی المکان الذی مات فی مقابر أولئک المسلمین وإن نقل قبل الدفن إلی قدر میل أو میلین فلا بأس به وکذا لو مات فی غیر بلده

يستحب تركه فان نقل الى مصر اخر فلا بأس به. (مجمع الأنهر ج:۱ ص:۱۸۷).[1]

وراجع أيضًا فتاوىٰ تاتارخانية ج:۲ ص:۱۷۵ (طبع ادارة القرآن) وتعليق الشيخ أبى الوفاء الأفغانى علىٰ كتاب الآثار ج:۲ ص:۲۰۴.[2]

ولقد أطال الشيخ علىّ القارى رحمه الله وأحسن فى التوفيق بين العبارات بعبارة نوردها بتمامها:-

أما اذا أرادوا نقله قبل الدفن أو تسوية اللبن فلا بأس بنقله نحو ميل أو ميلين قال فى التجنيس لأن المسافة الى المقابر قد تبلغ هٰذا المقدار وقال السرخسىؒ قول محمد بن سلمة ذٰلک دليل علىٰ أن نقله من بلد الىٰ بلد مكروه والمستحب أن يدفن كل فى مقبرة البلدة التى مات بها، ونقل عن عائشةؓ أنها قالت حين زارت قبر أخيها عبدالرحمٰن وكان مات بالشام وحمل منها: ولو كان الأمر فيک الىّ ما نقلتک ولدفنتک حيث مت. ثم قال فى التجنيس فى النقل من بلد الىٰ بلد لا إثم لما نقل أن يعقوب عليه الصلوٰة والسلام مات بمصر ونقل عنه الى الشام وموسىٰ عليه الصلوٰة والسلام نقل تابوت يوسف عليه الصلوٰة والسلام بعد ما أتى عليه زمان من مصر الى الشام ليكون مع ابائه ولا يخفىٰ أن هٰذا شرع من قبلنا ولم تتوفر فيه شروط كونه شرعًا لنا إلا انه نقل عن سعد بن أبى وقاص أنه مات فى ضيعة علىٰ أربعة فراسخ من المدينة فحمل علىٰ أعناق الرجال اليها وفيه أنه نقل حين موته لا بعد دفنه فلا دخل له فى القضية ويمكن أن يحمل نقل يعقوب ويوسف عن عذر وأيضًا فلا تنافى بين الإثم والكراهة اذا الكراهة محمولة على التنزيه وهو خلاف الأولىٰ الا لعارض قال صاحب الهداية وذكر أن من مات فى بلدة يكره نقله الىٰ أخرىٰ لأنه اشتغال بما لا يفيد بما فيه تأخير دفنه وكفىٰ بذٰلک كراهة قلت فاذا كان يترتب عليه فائدة من نقله الىٰ أحد الحرمين أو الىٰ قرب قبر أحد من الأنبياء أو الأولياء أو ليزوره أقاربه من ذٰلک البلد وغير ذٰلک فلا كراهة إلا ما نص عليه من شهداء أحد أو من فى معناهم من مطلق الشهداء والله اعلم. (مرقات ج:۴ ص:۷۳).[3]

مسئلة النكير على الأمور المجتهد فيها

قد صرح غير واحد من الفقهاء والمحدثين بأنه لا ينبغى التشدد فى النكير على الأمور التى اختلف فيها الفقهاء. فى الأحكام السلطانية للماوردى ص:۳۱۵:-[4]

---

(۱) مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ج:۱ ص:۲۷۶ (طبع دار الكتب العلميه، بيروت).
(۲) (طبع مذكور).
(۳) مرقاة شرح مشكوة ج:۴ ص:۱۸۳، ۱۸۴ (طبع مكتبه حقانيه پشاور).
(۴) ص:۲۵۳ (طبع دفتر تبليغات اسلامى حوزه علميه قم).

أما المعاملات المنكرة كالزنا والبيوع الفاسدة وما منع الشرع منه مع تراضى المتعاقدين به اذا كان متفقًا علىٰ حظره فعلى والى الحسبة انكاره والمنع منه والزجر عليه وأمره فى التأديب مختلف بحسب الأحوال وشدة الحظر وأما ما اختلف الفقهاء فى حظره واباحته فلا مدخل له فى إنكاره إلا أن يكون مما ضعف الخلاف فيه وكان ذريعة إلىٰ محظور متفق عليه كربا النقد فالخلاف فيه ضعيف وهو ذريعة إلى ربا النساء المتفق علىٰ تحريمه فهل يدخل فى انكاره بحكم ولايته أو لا؟ علىٰ ما قدمناه من الوجهين وفى معنى المعاملات وان لم تكن منها عقود المناكح المحرمة ينكرها ان اتفق العلماء علىٰ حظرها ولا يتعرض لإنكارها ان اختلف الفقهاء فيها الا أن يكون مما ضعف الخلاف فيه وكان ذريعة إلىٰ محظور متفق عليه كالمتعة فربما صارت ذريعة إلىٰ استباحة الزنا.

وفى المرقاة ج:۸ ص:۸۶۳ (طبع مكتبه حقانيه پشاور): وما يتعلق بالاجتهاد لم يكن للعوام مدخل فيه لأن انكاره علىٰ ذٰلک للعلماء ثم العلماء انما ينكرون ما أجمع عليه الأئمة وأما المختلف فيه فلا انكار فيه لأن علىٰ أحد المذهبين كل مجتهد مصيب وينبغى للآمر والناهى أن يرفق ليكون أقرب الى تحصيل المطلوب.

وفى شرح مسلم للنووىؒ ج:۱ ص:۵۱ (طبع قديمى كتب خانه): ثم انه انما يأمر وينهىٰ من كان عالمًا بما يأمر به وينهىٰ عنه وذٰلک يختلف باختلاف الشئ فان كان من الواجبات الظاهرة والمحرمات المشهورة كالصلوٰة والصيام والزنا والخمر ونحوها فكل المسلمين علماء بها وان كان من دقائق الأفعال والأقوال ومما يتعلق بالاجتهاد ولم يكن للعوام مدخل فيه ولا لهم انكاره بل ذٰلک للعلماء ثم العلماء انما ينكرون ما أجمع عليه أما المختلف فيه فلا انكار فيه لأن علىٰ أحد المذهبين كل مجتهد مصيب وهٰذا هو المختار عند كثير من المحققين أو أكثرهم وعلى المذهب الآخر المصيب واحد والمخطئ غير متعين لنا والإثم مرفوع عنه لٰكن ان مذهبه علىٰ جهة النصيحة إلى الخروج من الخلاف فهو حسن محبوب مندوب إلىٰ فعله برفق فان العلماء متفقون على الحث على الخروج من الخلاف اذا لم يلزم منه اخلال بسنة أو وقوع فى خلاف اٰخر وذكر أقضى القضاة أبو الحسن الماوردى البصرى الشافعى فى كتابه الأحكام السلطانية خلافا بين العلماء فى أن من قلده السلطان الحسبة هل له أن يحمل الناس علىٰ مذهبه فيما اختلف فيه الفقهاء اذا كان المحتسب من أهل الإجتهاد أم لا يغير ما كان علىٰ مذهب غيره والأصح أنه لا يغير لما ذكرناه ولم يزل الخلاف

فی الفروع بین الصحابة والتابعین فمن بعدهم رضی الله عنهم أجمعین ولا ینکر محتسب ولا غیره علٰی غیره وکذٰلک قالوا لیس للمفتی ولا للقاضی أن یعترض علٰی من خالفه اذا لم یخالف نصًا أو إجماعاً أو قیاساً جلیاً، والله تعالٰی أعلم.

وفی إکمال إکمال المعلم ج:۱ ص:۱۵۴ (طبع دار الکتب العلمیة بیروت): ثم ما اشتهر حکمه کالصلٰوة وحرمة الزنا یستوی فی القیام به العلماء وغیرهم وما دق من الأفعال والأقوال فانما یقوم به العلماء ثم العلماء لا یغیرون الا ما اتفق علیه ولا یغیرون فی مسائل الخلاف لأنه ان کان کل مجتهد مصیبًا فواضحٌ وکذٰلک علٰی أن المصیب واحد لأن المخطئ غیر اٰثم نعم یندب إلی الخروج من الخلاف للاتفاق علٰی رجحان الخروج منه.

وفی أصول الفقه الاسلامی للزحیلی ج:۲ ص:۱۰۹۶ (طبع دار احسان دمشق): قد أجمع الصحابة علٰی ترک النکیر علٰی من خالف منهم فی المسائل الفقهیة کإرث الجد مع الإخوة ومسألة العول ونحوها من مسائل الفرائض وغیرها فکانوا یتشاورون ویتفرقون مختلفین ولا یعترض بعضهم علٰی بعض ولا یمنع أحدهم الأٰخر من افتاء العامة ولا یمنع العامة من تقلیده ولا یمنعه من الحکم باجتهاده وهٰذا کما قال الغزالی: متواتر تواترًا لا شک فیه مع انهم کانوا فیما قام علیه الدلیل القاطع یبالغون فی التأثیم والتشدید کما فعلوا فی تخطئة الخوارج.

وفی الهندیة ج:۵ ص:۳۵۳ (طبع مکتبه رشیدیه کوئٹه): ویقال الأمر بالمعروف بالید علی الأمراء وباللسان علی العلماء وبالقلب لعوام الناس وهو اختیار الزندویسی کذا فی الظهیریة: الأمر بالمعروف یحتاج الٰی خمسة أشیاء، أوّلها العلم لأن الجاهل لا یحسن الأمر بالمعروف، والثانی أن یقصد وجه الله تعالٰی واعلاء کلمته العلیا، والثالث الشفقة علی المأمور فیأمر باللین والشفقة، والرابع أن یکون صبورًا حلیما، والخامس أن یکون عاملا بما یأمره کیلا یدخل تحت قوله تعالٰی: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ، ولا یجوز للرجل من العوام أن یأمر بالمعروف للقاضی والمفتی والعالم الذی اشتهر لأنه اساءة فی الأدب ولأنه ربما کان به ضرره فی ذٰلک والعامی لا یفهم ذٰلک کذا فی الغرائب.

اسی طرح منکر میں وہ تمام بُرائیاں اور مفاسد داخل ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ناجائز قرار دینا معلوم ومعروف ہے، اس مقام پر واجبات اور معاصی کے بجائے معروف و منکر کا عنوان اختیار کرنے میں شاید یہ حکمت بھی ہو کہ روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل میں ہوگا جو

اُمت میں مشہور ومعروف ہیں اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں، اجتہادی مسائل جن میں اُصولِ شرعیہ کے ماتحت مختلف رائیں ہوسکتی ہیں، ان میں یہ روک ٹوک کا سلسلہ نہ ہونا چاہئے، افسوس ہے کہ عام طور پر اس حکیمانہ تعلیم سے غفلت برتی جاتی ہے اور اجتہادی مسائل کو جدال کا میدان بنا کر مسلمانوں کی جماعت کو ٹکرایا جاتا ہے، اور اس کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا جاتا ہے، اور اس کے بالمقابل متفق علیہ معاصی اور گناہوں سے روکنے کی طرف توجہ بہت کم دی جاتی ہے۔ (از معارف القرآن ج:۲ ص:۱۴۱)

واللہ سبحانہ اعلم

پیدائش کے فوراً بعد مرنے والے بچے کے نام رکھنے، نمازِ جنازہ اور تجہیز وتکفین کے اَحکام

سوال ۱:- ایک عورت کا پانچ ماہ کا حمل ساقط ہوگیا، پیدائش کے بعد دائی بتاتی ہے کہ بچے نے سانس لیا اور فوراً ہی فوت ہوگیا، بچے کے اعضاء دُرست تھے، جس سے مذکر ومؤنث کی شناخت ہوتی تھی، مگر بہت ہی کمزور وناتواں تھا۔ زید کہتا ہے کہ اس بچے نے دُنیا میں آکر سانس لیا ہے لہٰذا اس کے سب کام انجام دیئے جائیں، مثلاً غسل، کفن، نمازِ جنازہ اور قبر بھی بنائی جائے۔

۲:- جب غسل کے لئے آدمی آیا تو اس نے اپنے تجربے کی بناء پر کہا کہ اس نے سانس ہرگز نہیں لیا، اس کی ہیئت اور حالت ایسی نہیں کہ اس میں جان پڑی ہو، اگر اس کے سب کام کئے تو آپ گنہگار ہوں گے، لہٰذا اس بچے کو بغیر غسل اور بغیر نماز کے قبرستان کے ایک گوشے میں گڑھا کر کے دبا دیا جائے۔

۳:- اگر یہ سب کام ضروری تھے تو اَب چونکہ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی تو کیا اس کی غائبانہ نماز پڑھی جائے جبکہ نمازِ جنازہ میں میّت کا سامنے ہونا شرط ہے؟ اور سنتے ہیں کہ بڑے لوگوں کی نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھی جاتی ہے، اور اس سلسلے کی ایک بات یہ ہے کہ ایسے بچوں کا نام رکھنا ضروری ہے؟ بکر کہتا ہے کہ نام رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ حشر میں نام سے پکارا جائے گا، خواہ ولادت مردہ ہو یا زندہ، نام رکھنا ضروری ہے۔ آپ ان سب باتوں کے بارے میں اَحکام بیان فرمائیں۔

جواب ۱:- بچے نے سانس لیا ہو یا نہ لیا ہو، جب اس کے تمام اعضاء بن چکے تھے تو اسے غسل تو ہر حالت میں دینا چاہئے تھا اور اس کا نام بھی رکھنا چاہئے تھا، البتہ سانس نہ لینے کی صورت میں نماز ضروری نہیں تھی، لیکن جب قابلِ اعتماد دائی گواہی دے رہی ہے کہ بچے نے سانس لیا ہے تو اس کی گواہی معتبر ہے، اور اس کے بعد اس کو غسل دینا، نام رکھنا، کفن دینا، نمازِ جنازہ پڑھنا سب ضروری تھا

اورقبر بھی ہر حالت میں ضرور بنانی چاہئے تھی، کما فی رد المحتار، ولو شهدت القابلة أو الأم على الاستهلال تقبل في حق الغسل والصلوٰة عليه لأن خبر الواحد في الديانات مقبول اذا كان عدلا. (شامي ج: ۱ ص: ۵۹۴) وفي الدر المختار ومن ولد فمات يغسل ويصلّى عليه۔[1]

۲:- دائی اگر قابلِ اعتماد تھی تو اس کے مقابلے میں غسل دینے والے کا قول معتبر نہیں تھا۔

۳:- اگر دفن کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور تجربہ کار لوگ یہ بتاتے ہیں کہ غالب گمان یہ ہے کہ میّت پھولی پھٹی نہ ہوگی تو اس کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھنا واجب ہے، قبر پر جاکر اس طرح نماز پڑھ لیں جس طرح میّت کو سامنے رکھ کر نماز پڑھی جاتی ہے، اور اگر زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور غالب گمان یہ ہے کہ میّت پھٹ گئی ہوگی تو پھر نماز نہ پڑھیں۔

لما في الدر المختار (وان دفن) واهيل عليه التراب (بغير صلوٰة) أو بها بلا غسل أو ممن لا ولاية له (صلّى على قبره) استحسانًا ما لم يغلب على الظن تفسخه من غير تقدير هو الأصح.[2] وفي رد المحتار (قوله صلّى على قبره) أي افتراضًا في الأوليين وجوازًا في الثالثة۔

۴:- جی ہاں! نام رکھنا ضروری ہے جیسا کہ نمبر ا میں گزرا۔ واللہ اعلم

۱۳۹۸/۲/۶ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۲۵۹ الف)

دارالحرب میں مرنے والے مسلمان پر شرعی اَحکام جاری ہوں گے

سوال:- ایک آدمی نے دارالحرب میں اسلام قبول کیا، مگر وہ وہاں کوئی ایسے آدمی کو نہیں پاتا کہ جو اسے قرآن پڑھائے اور فرائض اور واجبات سکھائے، اسی حالت میں چھ ماہ گزرنے کے بعد وہ شخص مرجاتا ہے، آیا اس پر دین کے اَحکام جاری ہوں گے یا نہیں؟ اور اگر جاری ہوں گے تو اس کو کس طرح ادا کیا جائے؟

جواب:- اس صورت میں اس شخص کو چاہئے تھا کہ وہ دارالحرب سے ہجرت کرکے ایسی جگہ اقامت اختیار کرنے کی کوشش کرتا جہاں دینی معلومات حاصل ہوسکتی ہوں، بہرحال وہ مسلمان ہے اور اسلامی اَحکام اس پر جاری ہوں گے، اب جبکہ اس نومسلم کا انتقال ہوچکا ہے اس سے ہمدردی رکھنے

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج: ۲ ص: ۲۲۷، ۲۲۸ (طبع ایچ ایم سعید).

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ج: ۲ ص: ۲۲۴، وفي الهندية ج: ۱ ص: ۱۶۵ (طبع مكتبه ماجديه) الفصل الخامس كتاب الجنائز، ولو دفن الميت قبل الصلوٰة أو قبل الغسل فانه يصلّى على قبره إلى ثلاثة أيام والصحيح أن هذا ليس بتقدير لازم بل يصلّى عليه ما لم يعلم أنه قد تمزق .... الخ. (مرتب)

والوں کو چاہئے کہ بس قدر ہو سکے اسے ایصالِ ثواب کریں۔

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۴/۴ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع

(فتویٰ نمبر ۲۲/۴۶۷ الف)

دفن کے وقت کفن کی گرہ کھولنے کی حکمت میں
حاشیہ شرح وقایہ اور دیگر فقہاءؒ کی عبارات میں تضاد کی تحقیق

سوال:- شرح وقایہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ کفن کی گرہ کھولنے میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سوال و جواب کے وقت آسانی سے مردہ بیٹھ سکے، درایۃً اور روایۃً یہ کہاں تک صحیح ہے؟ لحد ہو یا شق، حقیقی طور پر بیٹھنا تو اس میں ممکن ہی نہیں، آپ واضح فرمائیں۔

جواب:- حاشیہ شرح وقایہ[1] کے اس بیان کا مأخذ معلوم نہیں ہوسکا، تمام فقہائے کرامؒ اس حکم کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ گرہ باندھنا انتشار کے خوف سے تھا، اور اب یہ خوف نہیں رہا، اس لئے کھول دی جائے، کذا فی شرح الوقایۃ،[2] والهداية،[3] والدر المختار۔[4]

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۸۸/۱/۱۹ھ

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(فتویٰ نمبر ۱۹/۱۴۳ الف)

---

(۱) وفی حاشية شرح الوقاية ج:۱ ص:۲۱۰ (طبع ايچ ايم سعيد) ويحل للاستغناء فانه انما عقد خيفة انتشار الكفن ليسهل عليه الجلوس فی القبر عند سؤال الملكين.

(۲) وفی شرح الوقاية ج:۱ ص:۲۱۰ (طبع سعيد) ويحل العقدة أی العقدة التی علی الكفن خيفة الانتشار.

(۳) وفی الهداية فصل فی الدفن ج:۱ ص:۱۸۲ (طبع مكتبه شركت علميه) (ويحل العقدة) لوقوع الأمن من الانتشار.

(۴) وفی الدر المختار ج:۲ ص:۲۳۶ (طبع سعيد) وتحل العقدة للاستغناء عنها وفی الشامية (قوله للاستغناء عنها) لأنها تعقد لخوف الانتشار عند الحمل.

﴿فصل فی إیصال الثواب﴾
(ایصالِ ثواب سے متعلق مسائل کا بیان)

سوال:- جولوگ گھروں پر قرآن خوانی کراتے ہیں ان کو قرآن کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ پھر اس مردے کے لئے جس کے لئے قرآن خوانی کرائی ہے اسے ثواب ملے گا یا نہیں؟

اگر اللہ کے نام پر کپڑا یا پیسہ دیا جائے، ہماری نیت اس مردے کی رُوح کو ثواب پہنچانے کی ہو تو کیا اسے ثواب ملے گا یا نہیں؟ ہم روزانہ تلاوتِ قرآنِ پاک یا دُرود شریف، کلمۂ طیبہ پڑھ کر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تمام انبیاء تک اور تمام مسلمانوں کو جو رحلت کر چکے ہیں ان کو ایصالِ ثواب کریں تو کیا ان کو ثواب ملے گا یا نہیں؟

۲:- اگر کسی شخص کا ذاتی کاروبار یا مکان کا کرایہ آتا ہو، وہ اسے چھوڑ کر انتقال کر جائے تو اس شخص کے لئے یہ اثاثہ جو اس کی اولاد استعمال کرتے ہیں، کیا یہ صدقۂ جاریہ ہوگا یا نہیں؟

جواب ۱:- نفلی عبادات، خواہ وہ تلاوتِ قرآن ہو یا نفلی نماز ہو یا صدقہ ہو، اس کا ثواب کسی مردے کو پہنچایا جاسکتا ہے اور اس کو ثواب پہنچتا بھی ہے،[۱] اور خود ایصالِ ثواب کرنے والے کو بھی ثواب ملتا ہے،[۲] لیکن اس کے لئے طریقہ ایسا اختیار کرنا چاہئے جس میں نام ونمود اور دِکھاوا وغیرہ نہ ہو۔ آج کل گھروں پر باقاعدہ لوگوں کو جمع کر کے جو قرآن خوانی کی جاتی ہے اس میں اکثر نام ونمود ہوتا ہے اور ناجائز رسمیں ہوتی ہیں، اس لئے اس سے پرہیز کر کے میّت کو ثواب پہنچادیں، روزانہ جو تلاوت یا تسبیح وغیرہ پڑھتے ہیں اس کا ثواب تمام وفات شدہ مسلمانوں کو پہنچایا جاسکتا ہے،[۳] اس میں کوئی حرج نہیں،

(۱ تا ۳) ایصالِ ثواب کے ثبوت کے لئے چند قرآنی آیات یہ ہیں:- فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ. (سورة محمد: ۱۹)، وفی سورة الحشر: ۱۰ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. وفی سورة نوح: ۲۸ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ.

کتبِ تفاسیر میں درج ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:- روح المعانی ج:۲۷ ص:۶۶، ۶۷ (طبع مکتبہ رشیدیہ لاهور)، معارف القرآن ج:۷ ص:۲۱۹، وفی صفة التفاسیر ج:۳ ص:۳۲۳ (طبع مکتبہ فاروقیہ پشاور): رَبِّ اغْفِرْ لِيْ، بدأ بنفسه ثم بأبويه ثم عمم لجميع المؤمنين والمؤمنات ليكون ذلك أبلغ وأجمع، وفی كشف الخفاء ومزيل الألباس ج:۲ ص:۳۷۱ رقم:۲۶۳۰ (طبع مؤسسة الرسالة بيروت) من مر بالمقابر فقرأ احدى عشرة مرة قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ثم وهب أجره الأموات أُعطِيَ من الأجر بعدد الأموات .... الخ .....(باقی اگلے صفحہ پر)

بلکہ ان شاء اللہ موجبِ ثواب ہوگا۔

(گزشتہ سے پیوستہ).....اور چند احادیثِ مبارکہ یہ ہیں:-

وفی الصحیح للبخاریؒ باب اذا قال داری صدقة .... الخ رقم: ۲۶۰۵ ج:۳ ص:۱۰۱۳ (طبع دار ابن کثیر یمامة بیروت) عن ابن عباسؓ أن سعد بن عبادةؓ توفیت أمّه وهو غائب عنها فقال: یا رسول اللہ! ان أمّی توفیت وأنا غائب عنها أینفعها شئ ان تصدقت به عنها؟ قال: نعم! قال: فانی أشهدک ان حائطی المخراف صدقة علیها.

وفی مشکوٰة المصابیح ج:۱ ص:۱۴۱ (طبع قدیمی کتب خانه) عن معقل بن یسار قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: اقرؤا سورة یٰسین علیٰ موتاکم. رواه أحمد وأبوداوٗد. وفی شرح الصدور للسیوطیؒ ص:۱۳۵ (مطابع الرشید مدینة المنورة) أخرج أبو القاسم سعد بن علی الزنجانی فی فوائده عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من دخل المقابر ثم قرأ فاتحة الکتاب و قُل هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ و اَلْهٰکُمُ التَّکاثُرُ ثم قال: اَللّٰهم انی قد جلعت ثواب ما قرأت من کلامک لأهل المقابر من المؤمنین والمؤمنات کانوا شفعاءَ له الی اللہ تعالیٰ. وفیه أیضًا ص:۱۳۵ عن أنسؓ أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال: من دخل المقابر فقرأ سورة یٰسین خفف اللہ عنهم وکان له بعدد من فیها حسنات. وفیه أیضًا ص:۱۳۲ أخرج الطبرانی فی الأوسط والبیهقی فی سننه عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: ان اللہ لیرفع الدرجة للعبد الصالح فی الجنة فیقول: یا ربّ أنّٰی لی هٰذه؟ فیقول: باستغفار ولدک لک. ولفظ البیهقی: دُعاء ولدک لک. وأخرجه البخاری فی الأدب عن أبی هریرةؓ موقوفًا. وفیه أیضًا ص:۱۳۵ عن أحمد بن حنبلؒ قال: اذا دخلتم المقابر فاقرؤا بفاتحة الکتاب والمعوذتین و قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ واجعلوا ذٰلک لأهل المقابر فانه یصل الیهم.

وفی الصحیح للامام مسلمؒ باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته رقم: ۱۶۳۱ ج:۳ ص:۱۲۵۵ (طبع دار احیاء التراث العربی بیروت) عن أبی هریرةؓ أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال: ثم اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الّا من صدقة جاریة أو علم ینتفع بها أو ولد صالح یدعو له. وراجع أیضًا مرقاة المفاتیح ج:۴ ص:۸۲ (طبع مکتبه امدادیه ملتان).

وفی شرح العقائد ص:۱۷۲ (طبع قدیمی کتب خانه) وفی دعاء الأحیاء للأموات وصدقتهم أی صدقة الأحیاء عنهم أی عن الأموات نفع لهم أی للأموات خلافًا للمعتزلة.

ان آیاتِ قرآنیہ اور احادیث وکتبِ عقائد کی عبارات کی بناء پر حضراتِ فقہائے کرامؒ نے اس عقیدۂ ایصالِ ثواب کو دُرست قرار دیا ہے، اور نہ صرف اس کا اثبات فرمایا بلکہ اسے مستحسن قرار دیا، چنانچہ کتبِ فقہ میں ہے:-

وفی الهدایة، باب الحج عن الغیر ج:۱ ص:۲۹۶ (طبع مکتبه شرکت علمیه) ان الانسان له أن یجعل ثواب عمله لغیره صلوٰة أو صومًا أو صدقة أو غیرها عند أهل السنة والجماعة.

وفی الشامیة ج:۲ ص:۲۴۳ مطلب فی القراءة للمیت واهداء ثوابها له، صرح علمائنا فی باب الحج عن الغیر بأن للانسان أن یجعل ثواب عمله لغیره صلوٰة أو صومًا أو صدقة أو غیرها کذا فی الهدایة .... الأفضل لمن یتصدق نفلًا أن ینوی لجمیع المؤمنین والمؤمنات لأنها تصل الیهم ولا ینقص من أجره شئ هو مذهب أهل السنة والجماعة (وفیه بعد أسطر) وفی البحر: من صام أو صلّی أو تصدق وجعل ثوابه لغیره من الأموات والأحیاء جاز، ویصل ثوابها الیهم عند أهل السنة والجماعة، کذا فی البدائع.

وفی معارف السنن ج:۵ ص:۲۸۶ (طبع ایچ ایم سعید) وقد تعرض فی الهدایة الی مسألة الاثابة واهداء الثواب فقال الأصل فی هٰذا الباب أن الانسان له أن یجعل ثواب عمله لغیره صلوٰة أو صومًا أو صدقة وغیرها عند أهل السنة والجماعة. وفیه أیضًا ج:۵ ص:۲۹۱ ثم ان الشافعیؒ لا یجوز اهداء ثواب تلاوة القرآن ولا یصح عنده الاثابة فیما عدا الدعاء والصدقة ولٰکن الشافعیة أفتوا بایصال ثواب التلاوة ویجوز عندنا اهداء ثواب کل شئ .... وتبین أن مذهب أبی حنیفةؒ فی هٰذا الصدد أوسط المذاهب .... الخ. (محمد زبیر حق نواز عفا اللہ عنہما)

۲:- اگر کسی شخص نے اس نیت سے کمایا ہو کہ یہ میرے بچوں یا عزیزوں کے کام آئے تو اِن شاء اللہ اس پر صدقۂ جاریہ کا ثواب ملنے کی اُمید ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۰۱/۱۰/۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۳۲/۱۶۰۳ ج)

ایصالِ ثواب کے لئے صدقۂ جاریہ میں کون سی چیز بہتر ہے؟

سوال ۱:- صدقۂ جاریہ کے لئے مندرجہ ذیل چیزوں میں سے کون سی بہتر ہے؟

الف:- مسجد کی تعمیر میں حصہ لینا، ب:- دینی مدرسہ کی امداد کرنا، ت:- کنواں تعمیر کرنا، ج:- یا اور کوئی کام جس سے مرحوم کو ثوابِ دارین حاصل ہو۔

۲:- لوگ کہتے ہیں کہ انسان سے گناہِ کبیرہ اور صغیرہ سرزد ہوں تو ۹۰ ہزار مرتبہ کلمہ شریف یعنی "لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھ کر مرحوم کو اس کا ثواب دے دیں یا بخش دیں تو اس کے سارے گناہ اللہ معاف کر دیتا ہے، اور اسے عذابِ دوزخ سے نجات دیتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

۳:- ثواب سے کیا مراد ہے؟ قرآن پڑھ کر ثواب مرحوم یا مرحومہ کو پہنچا دینے سے عذاب ختم ہو جاتا ہے؟

۴:- مجھے پڑھنے کے لئے ایسی چیز بتا دیں کہ اس کو پڑھوں اور عذابِ قبر سے محفوظ رہوں۔

۵:- کلامِ پاک یا تیس پارے مسجد میں رکھوا دیں تو کیا مرحومہ کو ثواب ہوگا؟

۶:- میری اہلیہ ہارٹ فیل ہونے سے اللہ کو پیاری ہوگئی، نمازِ تہجد ادا کرنے کے بعد نمازِ فجر کے وقت نماز کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ اس کا انتقال ہوگیا، ایسی عورت کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب ۱:- یہ تمام اُمور خیر ہی خیر ہیں، اور صدقۂ جاریہ کے لئے ایسے کام کا انتخاب کرنا بہتر ہے جس کی ضرورت بھی زیادہ ہو اور جس کا فائدہ عرصے تک لوگ اُٹھاتے رہیں، اپنے حالات کے لحاظ سے اس کا فیصلہ ہر شخص کو خود کرنا چاہئے۔

۲:- سارے کے سارے گناہ معاف ہونے کی تو کوئی ضمانت نہیں، لیکن کلمۂ طیبہ یا قرآن شریف پڑھ کر جتنا زیادہ سے زیادہ ثواب میّت کو پہنچا سکتے ہوں، بہتر ہے۔[1]

۳:- اس کا جواب بھی وہی ہے، تلاوتِ قرآن کا ایصالِ ثواب کیا جائے تو ہر حرف پر دس نیکیاں میّت کو ملتی ہیں، لہٰذا جتنا زیادہ سے زیادہ ایصالِ ثواب کیا جائے گا میّت کے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوگا،[2] اور عذاب میں کمی ہوتی چلی جائے گی، لیکن عذاب سے رہائی کی مکمل ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔

(۱،۲) دلائل اور حوالے کے لئے سابقہ فتویٰ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

۴:- قرآن مجید کی تلاوت جتنی زیادہ ممکن ہو، کریں، خاص طور سے سورۂ ملک (یعنی "تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ") روزانہ پڑھا کریں، حدیث میں ہے کہ یہ سورت عذابِ قبر سے انسان کو محفوظ رکھنے میں مددگار ہوتی ہے، نیز "سُبْحَانَ اللہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَاللہُ اَکْبَرُ" اور اِستغفار کثرت سے کیا کریں، اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

۵:- دونوں سے ثواب حاصل ہوگا۔[1]

۶:- آپ کی اہلیہ کی وفات جس انداز سے ہوئی وہ قابلِ رشک ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی اُمید رکھنی چاہئے کہ اِن شاء اللہ وہ جنتی ہیں، لیکن ساتھ ہی ایصالِ ثواب میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔

واللہ اعلم

۹/۱/۱۳۹۷ھ

(فتویٰ نمبر ۲۹/۶۱ الف)

عقیدۂ ایصالِ ثواب

سوال:- قرآن میں اس بات کی وضاحت ہے کہ ہر انسان کے نیک عمل کا جو ثواب ہوگا اس کا صرف کرنے والا حق دار ہے، وہ دُوسرے کو نہیں دیا جاسکتا، لیکن مسلمان دھڑلے سے ایصالِ ثواب کر رہے ہیں، یہاں تک کہ حجِ بدل بھی کرتے یا کرالیتے ہیں، کیا ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے؟

جواب:- قرآنِ کریم نے یہ فرمایا ہے کہ: "انسان کو بطورِ حق صرف اسی عمل کا اَجر ملے گا جو اس نے خود کیا ہو"۔[2] لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کے استحقاق سے زائد کوئی اَجر اپنی رحمت سے دے دیں تو یہ اس کے خلاف نہیں،[3] چنانچہ احادیث میں جو ایصالِ ثواب کا ثبوت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی اسی رحمت کی بنیاد پر ہے، احادیث چونکہ قرآنِ کریم کی تفسیر ہیں اور قرآنِ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا معلّم بنا کر بھیجنے کا ذکر فرمایا ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر مستند ترین تفسیر ہے۔

واللہ اعلم

۴/۸/۱۴۲۲ھ

(فتویٰ نمبر ۵۰۵/۱۰)

---

(۱) صفحہ نمبر ۵۸۸ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) "وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" (سورۃ النجم: ۳۹).

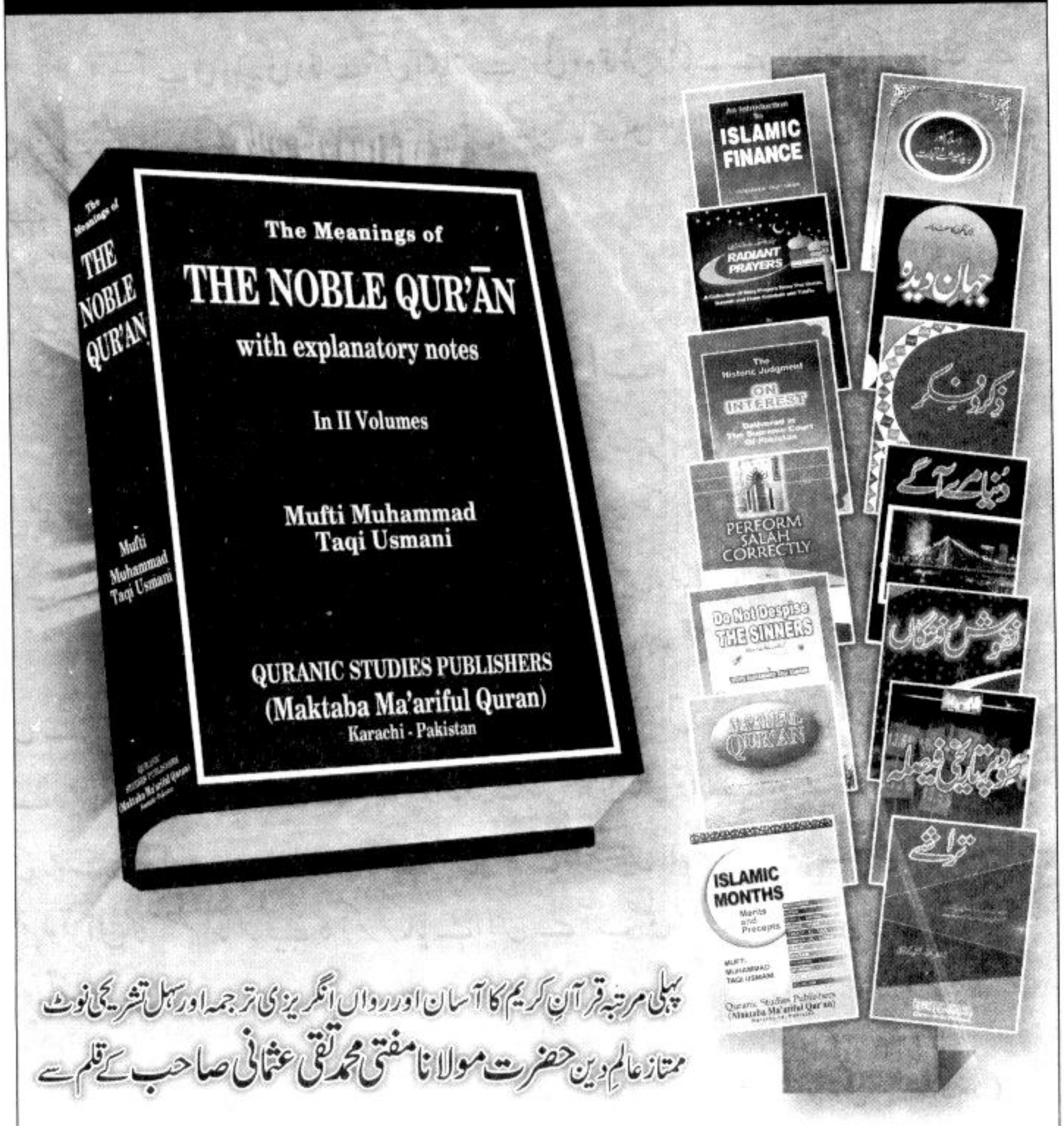
(۳) وفی شرح الصدور للسیوطیؒ باب فی قراءۃ القران للمیت أو علی القبر ص: ۱۳۴ (طبع مطابع الرشید مدینۃ المنورۃ) لیس للانسان الا ما سعٰی، من طریق العدل فأما من باب الفضل فجائز أن یزیدہ اللہ تعالٰی ما شاء قالہ الحسین بن الفضل، وکذا فی مرقاۃ المفاتیح ج: ۴ ص: ۸۲ (طبع مکتبہ امدادیہ ملتان). نیز ایصالِ ثواب سے متعلق مزید تفصیل اور خاص طور پر آیتِ مذکورہ کے مفہوم کے لئے مذکورہ کتاب شرح الصدور للسیوطیؒ باب فی قراءۃ القران للمیت أو علی القبر ص: ۱۳۴ اور سابقہ فتویٰ اور حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ (محمد زبیر حق نواز)

The Meanings of

THE NOBLE QUR'ĀN

by

Mufti Muhammad Taqi Usmani



پہلی مرتبہ قرآنِ کریم کا آسان اور رواں انگریزی ترجمہ اور سہل تشریحی نوٹ

ممتاز عالمِ دین حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے قلم سے

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

(Quranic Studies Publishers)

فون : 5031565 - 5031566 ای میل : mm.q@live.com